READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
PAK Society LIBRARY OF PAKISTAN
ONE SITE ONE COMMUNITY
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

www.paksociety.com

07 سرگزشت
پیش گو
ادارہ
ایک صفحہ میں مکمل، مختصر
ایک نادر روزگار کا تعارف

08 گفت و شنید
شہرِ خیال
مدیرِ اعلیٰ
آپ کی باتیں آپ کے خیال آپ کے مشورے اور آپ کے سوال

16 شخصیت
نفسیات دان
ڈاکٹر ساجد امجد
اس کے نظریات نے پوری دنیا کو چونکا دیا

43 خراجِ تحسین
نواب سپاہی
غلام حسین میمن
آزادی کے ایک بے لوث سپاہی کی جیون کتھا

53 معلومات
دلچسپ دریافتیں
دانیہ صدیقی
کبھی کبھی ایسی دلچسپ دریافتیں بھی سامنے آتی ہیں

59 فلم نگری
گولڈن اسٹار
انور فرہاد
پاکستانی فلم کے ایک بڑے اداکار کا زندگی نامہ

93 صحافت
روزنامہ پیسہ
شکیل صدیقی
وطن کی آزادی کے لیے زمین تیار کرنے والے اخبار کا تذکرہ

101 تحقیق
ازم
منظر امام
سوشلزم کمیونزم اسلامک ازم، یہ سب کیا ہیں

107 مناظر پاکستان
اوندھی بستی
شاہد لطیف
سندھ کے ایک عجیب و غریب گاؤں کا تذکرہ

111 سفر کہانی
شمشال سے ٹورنٹو
ندیم اقبال
جابدو بیانی کا شہکار ایک الگ انداز کی داستان

135 واقعات
فلم ساز
کاشف زبیر
ہالی ووڈ کے ایک معروف ہدایت کار و فلم ساز کی داستان

151 تحریر خاص
حسِ مزاح
ثنا ثاقب
مزاح کی حس کا زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے

159 دلچسپ واقعات
باپ کے بغیر
کشمالہ حسن
اس دنیا میں کیا کچھ نہیں ہوتا، اسی کی تحریری تصویر

ماہ نامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوقِ طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں، کسی بھی فرد یا ادارے کے لئے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورتِ دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔
● تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded from Paksociety.com

حادثات 161

زندگی کی جیت

فرزانہ نگہت

وہ عورت زندگی کی خاطر موت سے لڑتی رہی

تذکرہ 165

نام

عائشہ انور

ایک مشہور اداکار کے نام کی دلچسپ کتھا

فنِ موسیقی 167

سرچھا گل

ایاز راہی

پاکستان کے قومی ترانے کو سر سے نوازنے والے کا تذکرہ

معاشرت 170

ناسور

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

ایک معصوم نوجوان کی خون رنگ لہو گرما دینے والی داستان

پہلی سچ بیانی 210

نقب

انیلہ

اس کی سہیلی نے اسے حیران کن دھوکا دیا

دوسری سچ بیانی 221

مقتول ساتھی

زریں قمر

اس کی کوشش نے ایک بے قصور کو پھانسی سے بچالیا

تیسری سچ بیانی 231

رانگ نمبر

ڈاکٹر ظفر احمد خان

کبھی کبھی رانگ نمبر واقعی زندگی کو رانگ وے میں بدل دیتی ہے

چوتھی سچ بیانی 241

بدگمان

وردہ خان

بدگمانی رشتوں کی تباہی کا ایک ذریعہ ہے

پانچویں سچ بیانی 247

ناگن

اختر شہاب

اس کی زندگی ایک تماشا سا بن گئی ہے

چھٹی سچ بیانی 255

سونا ڈبل

عاطر شاہین

نوسر بازوں نے انسانی زندگی میں زہر گھول رکھا ہے

ساتویں سچ بیانی 259

ادھورا رشتہ

وسیم اشرف

وہ اس ادھورے رشتے پر بھی خوش ہے

آٹھویں سچ بیانی 271

شریکِ سفر

غلام رضا جعفری

اسے ایک ایسی شریکِ سفر ملی جو انوکھی فطرت کی تھی

نویں سچ بیانی 281

نجات

زویا اعجاز

ایک عجیب سی مگر دلچسپ سچ بیانی

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

پیش گو

13 ستمبر 1879ء کی رات آہستہ آہستہ ڈھل رہی تھی۔ قصبہ اسلام نگر پوری طرح اندھیرے کی چادر میں لپٹا ہوا تھا' اس بڑی سی حویلی کے ایک کمرے سے نوزائدہ بچے کے رونے کی تیز آواز ابھری اور کمرے کے باہر کھڑی عورتوں کے چہرے کھل اٹھے۔ اندر سے گنگا مائی نے آواز دی "مبارک ہو مالک! بیٹا ہوا ہے۔" یہ خبر فوراً ہی مردانے میں پہنچادی گئی۔ اس گول مٹول بچے کا نام شوکت علی خان رکھا گیا۔ وہ گھر بھر کی آنکھوں کا تارا تھا، اس حویلی کا اجالا تھا۔ وہ حویلی کسی معمولی آدمی کی نہ تھی' شجاعت علی خاں کی تھی اور بدایوں ضلع میں ان کے نام کا ڈنکا بجتا تھا۔ شجاعت علی خاں خاندانی رئیس تھے۔ ان کے اجداد برسوں پہلے کابل سے نقل مکانی کر کے ہندوستان آئے تھے۔ اس زمانے میں ہند کی شہنشاہیت شاہ عالم ایسے زیرک بادشاہ کے پاس تھی۔ اس نے ان لوگوں کی خوب قدر افزائی کی اور نواب بشارت علی خاں کو بدایوں کی گورنری کا عہدہ دے دیا۔ وہی جاگیر شجاعت علی خاں تک آئی تھی۔ شجاعت علی خاں کی آنکھوں میں حاکمیت کا خواب تھا اور یہ خواب انگریزوں کی عمل داری کے سبب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ اب بادشاہوں کا دور نہیں تھا کہ بہادری دکھا کر باجگوار بن جاتے۔ جاگیر بھی اب تھوڑی رہ گئی تھی اس لیے کہ میرٹھ سے سپاہیوں نے جب آزادی کا پہلا بگل بجایا تھا اور پھر دہلی آکر بہادر شاہ ظفر کی رسم تاج پوشی ادا کی تھی اور غداروں کی وجہ سے وہ جہاد شکست کی کہر میں ڈوب گیا تھا تو اس کا اثر شجاعت علی خاں کے خاندان پر بھی پڑا تھا لیکن وہ دوررس نگاہوں کے حامل تھے انہوں نے انگریزوں کی حکومت میں شامل ہوجانے کا فیصلہ کرلیا تھا اور پولیس انسپکٹر کے عہدے پر فائز ہوگئے تھے۔

اس عہدے کا ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ ان کے اندر کی حاکمیت کے جذبے کو تسکین ملنے لگی تھی۔ اسی دوران میں شوکت علی خاں پیدا ہوئے تو ان کی پوری توجہ بیٹے کی طرف ہوگئی۔ بڑی دھوم دھام سے شوکت علی خاں کی رسم بسم اللہ ہوئی اور پھر اسے مکتب میں بٹھادیا گیا۔ مکتب میں عربی' اردو اور فارسی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ فارسی کو اس زمانے میں دفتری زبان کا درجہ حاصل تھا۔ وہ بھی دل لگا کر فارسی پڑھ رہا تھا مگر اس کی پوری توجہ حافظ رومی کے کلام پر مرکوز تھی۔

ابتدائی تعلیم اور پھر ثانوی تعلیم! ہر درجے میں اپنا نمایاں مقام بنا کر شوکت علی خاں نے استادوں کو بھی اپنی جانب متوجہ کرلیا تھا۔ لیکن اب انہیں اور آگے پڑھنا تھا اسی لیے شوکت علی خاں کو کالج کی تعلیم کے لیے بریلی بھیج دیا گیا۔ بریلی کالج میں پہنچ کر شوکت علی خاں کو اپنے خیالات کے اظہار کا بہتر موقع ملا اور وہ شعر گوئی کی دنیا میں قدم جمانے کی کوشش کرنے لگا۔ آہستہ آہستہ شوکت علی خاں کی شاعری اپنی جگہ بنانے لگی۔ ان کی شاعری کالج کی چار دیواری سے نکل کر شہر بھر میں پھیل گئی تھی۔ اس کی واحد وجہ ان کے اشعار میں نمایاں غم و یاس کی تصویر کشی تھی۔ انہوں نے زندگی کو غم سے عبارت سمجھ لیا تھا اور اس غم سے زندگی کا عرفان حاصل کرنے کی جستجو میں تھے۔ دراصل وہ ایک حساس دل کے مالک تھے زندگی کی راحتوں سے محروم کر کے غم کا خوگر بنا لیا تھا اور وہ حصول غم کو حصول عشرت سے تعبیر کرنے لگے تھے۔ ان کا غم محفل جذباتی نہیں تھا اس میں عقل و ہوش مندی بھی تھی۔ ان کا غم صرف آنسو نہیں بہاتا تھا بلکہ سوچتا اور سمجھتا بھی تھا۔ تصور الم اشک و آہ سے کہیں بلند تھا۔ وہ زندگی کو دیوانے کا خواب ہی نہیں' موت کو زندگی کا ہوش سمجھتے تھے۔ ان کا غم ایک حوصلہ مند انسان کا غم تھا' ایک باشعور آدمی کا غم جس کی زندگی نزع کے عالم میں گزری تھی لیکن وہ ان وسعتوں سے کبھی غافل نہیں رہے۔ ان کے ہاں اسی غم نے ایک مخصوص فضا اور مخصوص لب ولہجہ پیدا کردیا تھا جس کی مدد سے اردو شاعروں کے بے پناہ ہجوم میں بھی ان کی آواز پہچان لی جاتی تھی۔ نقادوں نے انہیں سوز خواں' بیوہ عالم اور یاسیت کا امام کہنا شروع کردیا تھا۔ 1908ء میں انہوں نے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کرلی' وکالت کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد پریکٹس کے لیے لکھنؤ کو منتخب کیا۔ یہ شہر بڑا بھی تھا اور موزوں بھی لیکن یہ شہر ان کے لیے سازگار ثابت نہ ہوا۔ وکالت چل نہ سکی۔ گھسٹتی ہوئی اس وکالت کو انہوں نے کئی سال تک کھینچا لیکن جب حالات بہت زیادہ خستہ ہوگئے تو پھر نقل مکانی کی ٹھانی۔ وہ بریلی آئے بریلی آکر سوچا تھا کہ اب قسمت یاوری کرے گی۔ مگر یہاں بھی اقبال مندی حاصل نہ ہوئی اور وہ اسی طرح غربت کے شکنجے میں جکڑے رہے۔ بریلی میں بھی جب قسمت نے ساتھ نہ دیا تو انہوں نے پھر ایک بار نقل مکانی کا ارادہ کیا۔ اس بار انہوں نے اکبر آباد کو منتخب کیا تھا لیکن اس شہر میں وہ زیادہ دن نہ ٹھہر سکے اور پھر دکن کی جانب ہجرت کرنے کا ارادہ کرلیا۔ 1926ء میں وہ حیدرآباد پہنچے مہاراجا سرکشن پرشاد نے انہیں اپنے دربار میں شامل کرلیا۔ کشن پرشاد کا تخلص شاد تھا اور وہ نظام حیدرآباد کی سلطنت کے صدر تھے۔ انہی دنوں ان پر کوہ غم ٹوٹ پڑا۔ سکھ دکھ کی ساتھی' ہر غم میں ساتھ نبھانے والی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان کا ساتھ چھوڑ گئی۔ ابھی اس غم کے گرداب سے وہ نکل بھی نہ پائے تھے کہ ایک اور کوہ الم ٹوٹ پڑا۔ حیدرآباد کی ادبی محفلوں کی سرپرستی فرمانے والے' مہاراجا سرکشن پرشاد وفات پاگئے۔ 1940ء کا ذکر ہے۔ شام کے وقت وہ اپنے دوست قاضی عبدالغفار کے گھر پہنچے۔ اس ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے قاضی عبدالغفار لکھتے ہیں۔ "ایک دن شام کو آئے' مسکراتے ہوئے اپنی جیب سے ایک پرچہ نکالا' کہنے لگے بھئی قاضی! بس ایک چیز سنانے آیا ہوں۔ انتظار کررہا تھا کہ کب یہ لکھی جائے گی آخر آج صبح چار مصرعے موزوں ہوگئے۔ میں نے کہا" آخر ہے کیا کہ تم صرف اس کے سنانے کے لیے گھر سے چل کر آگئے جبکہ ہمیشہ ہم تمہاری خوشامدیں کیا کرتے ہیں اور تم دو مصرعے نہیں سناتے ہو۔"

وہ کہنے لگے "ذرا سن تو لو یہ میری قطعہ تاریخ وفات ہے۔"

طغیان ناز بیں کہ بہ لوح مزار او | ثبت است سال رحلت فانی "خدانہ داشت"

(خدانہ داشت سے سن 1360ھ نکلتا ہے) میں (قاضی عبدالغفار) نے پوچھا "یہ کیا کہہ دیا۔" کہنے لگے "بس کچھ نہ کہو' یہ بالکل صحیح تاریخ ہے۔ "خدانہ داشت" سے گھبرا گئے اور "طغیان ناز" کو نہیں دیکھتے۔ 26 اگست 1941ء کو بالآخر ان کی تمنا پوری ہوگئی۔ یعنی 1360ھ میں وہ راہی ملک عدم ہوگئے۔ اس عظیم شاعر' اپنی موت کی پیش گوئی کرنے والے کو' ہم فانی بدایونی کے نام سے پہچانتے ہیں

☆☆☆

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

جلد 27 ❖ شمارہ 07 ❖ اگست 2017ء

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مدیرہ اعلیٰ : عذرا رسول

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قارئین کرام!
السلام علیکم!

ایک بزرگ جن کی عمر نوے پچانوے سے کم نہ ہوگی، ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ خانقاہ سے کبھی باہر نکلے ہی نہیں۔ ایک دن کچھ لوگ ان کے پاس آئے اور کہا۔ ”ہمیں حکمت بھری باتیں بتائیں۔“

بزرگ نے اپنی مندی مندی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”اُدھر میرے منہ میں دیکھو کیا نظر آتا ہے؟“ ان میں سے ایک نے دہانے کے اندر تک نظر دوڑائی اور کہا۔ ”زبان دِکھ رہی ہے۔ ایک دو دانت بھی ہیں۔“ بزرگ نے کہا۔ ”دانت اور زبان میں پہلے کون آیا؟“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”یہ تو سیدھی سی بات ہے کہ زبان بچے کے ساتھ آتی ہے اور دانت بعد میں نکلتے ہیں۔“ بزرگ نے کہا۔ ”گویا زبان زیادہ عمر کی ہوئی۔ اب یہ بتاؤ کہ ان دونوں میں نرم کون ہے اور سخت کون ہے؟“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”سیدھی سی بات ہے۔ دانت سخت اور زبان نرم ہوتی ہے۔“ بزرگ نے مسکرا کر کہا۔ ”کچھ سمجھ میں آیا؟ دانت بعد میں نکلا لیکن سخت ہونے کی وجہ سے پہلے گر گیا اور زبان نرم ہوتے ہوئے بھی ساتھ رہی۔ اس لیے یاد رکھنا سخت بنو گے تو جلد مٹ جاؤ گے اور نرم رہو گے تو آخر تک زندہ رہو گے۔“

لیکن اس وقت ہمارا معاشرہ بالکل الٹ چل رہا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جو نرمی، شائستگی، رواداری اور تحمل ہمارے معاشرے کی پہچان تھی وہ دم توڑنے لگی ہے۔ کیا ہم تباہی کی طرف جا رہے ہیں؟ اگر ہمارا معاشرہ نہ بدلا تو ہم بھی دانت کی مثال بن جائیں گے۔ اس لیے ہمیں نرم بننا ہوگا۔

معراج رسول

شعبہ اشتہارات
منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789

❖❖❖

قیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ زرِ سالانہ 800 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول
مقام اشاعت: C-63، فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن
مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200
Phone :35804200 Fax :35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

MEMBER
APNS
CPNE

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

شہرِ خیال

مدیر اعلیٰ

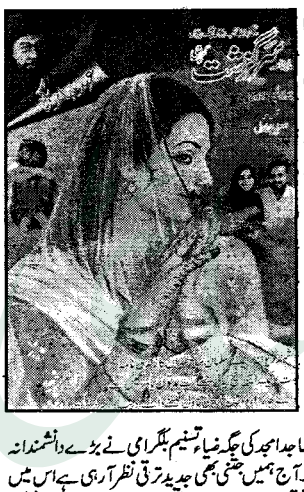

☆رانا محمد شاہد کا تبصرہ بورے والا سے۔ ”جولائی کا شمارہ عید سے قبل مل گیا تھا۔ ہم پاکستانیوں کی اجتماعی عید بھی کیا گئی۔ پہلے پاراچنار، کوئٹہ اور کراچی میں دہشت گردی کے واقعات ہوئے اور پھر احمد پور شرقیہ میں ٹینکر کا ہولناک واقعہ ہو گیا۔ اداریے میں معراج رسول صاحب نے جس نکتے کی طرف اشارہ کیا وہی نفسیات احمد پور شرقیہ واقعے میں نظر آتی ہے۔ جب سیاستدان لوٹ مار کی دولت سے حج و عمرہ کریں گے تو غریب آدمی بھی جو کر سکتا ہے وہ کرے گا۔ یک نکتی سرگزشت میں شیخ سعدیؒ کی کہانی گویا کوزے میں دریا بند کر دیا۔ واقعی شیخ سعدی کی داستان و بوستان نے انسانی کردار کے حوالے سے بے بہا خزانے دیئے۔ ”شہرِ خیال“ میں نزاہت اقبال مہورہ کرسی صدارت پر تھے۔ آپ کا مطالعہ زبردست ہے۔ مختلف شعراء کی زندگیوں کے مخفی پہلوؤں پر کوئی دلچسپ تحریر لکھیں۔ ”شہرِ خیال“ میں ندیم اقبال کا ای میل پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ عبدالبار رومی آپ آج کل رابطے میں نہیں ہیں۔ ذیشان شیخ میرے ذہن میں نہیں آ رہا اگر آپ کے پاس میرا نمبر تھا تو رابطہ کر لیتے۔ سعید احمد چاند مختصر تبصرے کے ساتھ موجود تھے۔ منشی محمد عزیز اب باقاعدگی سے آئیے گا۔ محمد سلیم قیصرانی دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو جلد رہائی نصیب فرمائے۔ سیف اللہ بھائی ویسے پرندے اتنی جگہ نہیں گھیرتے کہ اس کے لیے مکین پریشان ہوں۔ ہاں ان کا خیال رکھنا اور دیکھ بھال کرنا اتنا آسان بھی نہیں۔ اس دفعہ بھی طاہرہ گلزار اور سدرہ پانو ناگوری غیر حاضر تھیں۔ اس دفعہ ڈاکٹر ساجد امجد کی جگہ ضیاء تسنیم بلگرامی نے بڑے دانشمندانہ انداز میں ”دانشمند دیوانہ“ لکھ کر پوری کی۔ ابنِ الہیثم کی زندگی پر ایک بہترین سرگزشت تھی۔ آج ہمیں جتنی بھی جدید ترقی نظر آ رہی ہے اس میں مسلمان سائنسدانوں کا کلیدی کردار ہے۔ زویا اعجاز ”عشق کامل“ جیسی خوب صورت روحانی تحریر کے ساتھ موجود تھیں۔ حضرت اویس قرنیؓ کی ایمان افروز زندگی تمام مسلمانوں کے لیے سرچشمۂ ہدایت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عشق تو انہیں تھا ہی ان کی اپنی والدہ سے محبت کی مثالیں بھی دی جاتی ہیں۔ واقعی جن کی منزل عشقِ حقیقی ہو انہیں دنیا اور دنیا کی باتوں سے کیا لینا۔ اسلامی تاریخی ناول نگاری میں نسیم حجازی کا کوئی ثانی نہیں۔ انہوں نے بہت خوب صورت ناول تحریر کیے۔ وسیم بن اشرف نے ان کی زندگی کے اہم گوشوں سے آگاہ کیا۔ خصوصاً لکھنے کے حوالے سے انہیں جن مشکلات سے گزرنا پڑا اسے پڑھ کر ان کی قدر و منزلت اور بڑھ گئی۔ تنویر ریاض کی تحریر ”قوالی“ دلچسپ اور معلوماتی تھی۔ انہوں نے قوالی کی تاریخ اور پاکستان کے تقریباً تمام ہی معروف قوالوں کے بارے میں مختصر مختصر لکھا۔ سرور انور اردو ادب کا ایک معتبر نام۔ راشد لطیف نے اس بڑے شاعر کی زندگی، رزبردست تحریر لکھی۔ فلمی گیتوں میں تو وہ ایک منفرد مقام رکھتے ہی تھے مگر ان کے لکھے ملی نغموں نے ایک سحر طاری کر دیا۔ سوہنی دھرتی اللہ رکھے، اپنی جان نذر کروں اپنی وفا پیش کروں اور جگ جگ جیے ان کے لازوال قومی نغمے تھے۔ انور فرہاد اس دفعہ ”شہنشاہِ جذبات“ محمد علی کی زندگی کی سرگزشت لکھ لائے۔ اتنی تفصیلی اور زبردست انداز سے اس عظیم اداکار کی کہانی لکھنے پر انور فرہاد مبارک باد کے مستحق ہیں۔ سلسلی اعوان کا شمار اردو ادب کی بہترین لکھاریوں میں ہوتا ہے۔ خصوصاً خوب صورت سفرناموں میں وہ الگ ہی انداز رکھتی ہیں۔ اس دفعہ ٹالسٹائی جیسے بڑے مصنف کی بیوی کی کتھا سنا رہی تھیں۔ ندیم اقبال کا سفرنامہ دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ ان مصائب و مشکلات کا بھی خوب صورتی سے احاطہ کر رہا ہے جو دیارِ غیر میں پاکستانیوں کو پیش آتی ہیں۔ خالد قریشی کی کبوتر کی اقسام پر دلچسپ تحریر تھی۔ سرگزشت ایک اور خاص نمبر لا رہا ہے یہ اعلان پڑھ کر خوشی ہوئی۔“

☆سید امتیاز حسین بخاری کی شمالی سرگودھا سے آمد۔ ”کافی ماہ کے بعد آپ کی خدمت عالیہ میں حاضر ہونے کی جسارت کر رہا ہوں۔ میں ماہنامہ سرگزشت .... باقاعدگی کے ساتھ غور و فکر اور عمیق نظر سے پڑھتا ہوں لیکن ادبی اور صحافتی مصروفیات کی وجہ سے ہر بار خط نہیں لکھ سکتا۔ سرگودھا میں سرگزشت بہت ہی لیٹ آتا ہے اور مقررہ تاریخ پر نہیں ملتا ہے۔ خصوصی توجہ دے کر ہماری اس شکایت کا ازالہ کریں۔ باقی ماہنامہ سرگزشت ماجھا بالا اور وسطی مشرقی پنجاب کے حریت پسندوں کو تو بڑے تفاخر سے پیش کر رہا ہے لیکن چکڑالہ ضلع میانوالی کے حریت پسندوں کو نظر انداز کر رہا ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں ماجھا بالا اور چکڑالہ میانوالی ہی واحد علاقے تھے جو سبھی دلیر اور شجاع جنگ جو حریت پسندوں کے علاقے تھے۔ میں نے اپنے قلم برداشتہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

مضمون سرزمین چکڑالہ کے حریت پسند میں یہ سب اجاگر کرنے کی کاوش کی ہے۔ میں اگرچہ جانتا ہوں کہ یہ مضمون ناقابلِ اشاعت ہے اور سرگزشت کے معیار سے ہم آہنگ نہیں ہے لیکن میں نے صرف یہ بات آپ کے مطالعہ میں لانے کی سعی پیہم کی ہے تاکہ آپ کو بخوبی علم ہو سکے کہ حریت پسند صرف ماجھا بالا میں نہیں تھے بلکہ سرزمین چکڑالہ میں بھی تھے اور ان سے بھی زیادہ معروف تھے۔ ان کی شہرت پورے ہندوستان میں تھی۔ برطانوی حکومت ان سے لرزہ براندام رہتی تھی۔ بین الاقوامی شہرت یافتہ نغمہ نگار اور کہانی نویس حزیں قادری نے ملک طورا خان اعوان پر بھی ایک فلمی کہانی لکھی تھی اور احمد راہی تنویر نقوی مشیر کاظمی نے نغمے لکھنے پر آمادگی ظاہر کر دی تھی مگر کوئی فلم ساز یہ کہانی فلمانے پر رضامند نہ ہوا۔ اس کہانی میں ملک طورا خان اعوان کو افسانوی انداز میں پیش کیا گیا ہے مگر وہ حقیقت تھا افسانہ نہیں تھا۔ چراغ بالی پر ایک فلم بنائی گئی ہے جو میں نے دیکھی ہے وہ بھی افسانوی ہے اور حقیقت سے دور ہے مگر میں نے جو مضمون لکھا ہے وہ حقیقت کے قریب ہے، افسانہ نہیں ہے۔ جو کچھ میں نے بزرگوں سے سنا ہے وہ من وعن لکھ دیا ہے۔ ان حریت پسندوں کا ریکارڈ تھانوں میں تو موجود ہے مگر تاریخی کتابوں میں موجود نہیں ہے اگر ہوتا تو اس سے استفادہ کیا جا سکتا تھا۔ بین الاقوامی شہرت یافتہ مفرور اور حریت پسند ملک محمد عالم اعوان کو میں نے 1964ء میں چکڑالہ میں دیکھا تھا میں اس وقت جماعت ہفتم کا طالب علم تھا۔ اتنا شعور نہیں تھا جب شعور آیا تو وہ بوڑھے ہو چکے تھے۔ یہ 1970ء کی بات ہے اور پھر وہ چند سالوں کے بعد وفات پا گئے۔ یادداشت بوڑھا ہونے کی وجہ سے کمزور ہو گئی تھی وہ جھک کر لاٹھی کے سہارے چلتے تھے لیکن میں نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ ان کے انتہائی قریبیوں سے حاصل کیا ہے۔ ملک طورا خان اعوان ہمارے نزدیکی گاؤں چک نمبر 37 شمالی میں ہزاروں بار آئے۔ وہ چار فٹ قد کے تھے۔ لیکن انتہائی دلیر تھے۔ محمد عرف ممدو جسیم توانا اور مضبوط جسم رکھتے تھے اور چھ فٹ قد رکھتے تھے۔ غضب کے بہادر تھے۔ رائفل اور کارتوس بنانے کا فن جانتے تھے۔ اکثر لوہے کی کرسیاں بناتے تھے۔ لاوہ کے ایک جاگیردار کو لوہے کی کرسیاں بنا کر دیں مگر اس نے مزدوری بہت ہی کم دی اس پر ان کو بہت دکھ ہوا۔ اس نے اپنے فن آہن گری سے رائفل بنائی اور جاگیردار کو جب وہ میانوالی سے لاوہ گھر آ رہا تھا نمل کے پہاڑوں سے نیچے جہاں اب نمل ڈیم ہے جو 1903ء میں بنایا گیا تھا وہاں اس نے گھوڑے پر سوار جاگیردار کو قتل کر دیا اور مفرور ہو گیا۔ ملک عالم خان اعوان ساڑھے پانچ فٹ قد رکھتے تھے اور جسمانی طور پر توانا اور مضبوط تھے مگر میں نے ان کو عالم پیری میں دیکھا۔ چکڑالہ میں اس وقت کافی تعداد میں مفرور تھے مگر یہ کسی کو بھی ساتھ نہیں ملاتے تھے۔ یہ تین ہی اکٹھے اپنے ٹارگٹ اور ہدف تک آتے تھے اور کارروائی کرتے تھے۔ کارروائی سے پہلے پولیس اور متعلقہ ٹارگٹ کو ضرور بتاتے تھے۔ ماضی قریب میں چکڑالہ سے ملک سرخرو اعوان اور ڈھرنال سے محمد خان اعوان ڈاکو نامی گرامی بہادر اور شجاع گزرے ہیں جو کہ کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ (ڈاکو اور حریت پسندوں میں فرق ہوتا ہے)۔“

☆ منشی محمد عزیز میئے نے لڈن وہاڑی سے لکھا ہے۔ ”یک صفحی داستان شیخ سعدیؒ پر تھی۔ سچ بتاؤں کہ جولائی کے شمارے کی ہر تحریر ایک سے بڑھ کر ایک تھی اور مجھے سمجھ نہیں آتی کہ کس تحریر کو ٹاپ پر رکھوں، بہر حال اپنی ناقص رائے کے مطابق زویا اعجاز کی ”عشق کامل“ ٹاپ پر رہی اور اسے ابتدائی صفحات پر لگنا چاہیے تھا۔ ضیاء تسنیم بلگرامی بہت عرصے بعد سرگزشت میں حاضر تھیں۔ ابن الہیثم واقعی ہوش مند دیوانا تھا جو کہ اپنی چالاکی کی بدولت عراق سے مصر شفٹ ہو گیا لیکن افسوس کہ اپنے خواب کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ ہوائے حجاز ایک کرائم رپورٹر کے قلم سے اتنا عمدہ اور اعلیٰ مضمون! واہ وسیم بن اشرف۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ بہت خوب، نسیم حجازی کے یہ سب ناول میں نے اس عمر میں پڑھے تھے جس عمر میں بچے شیخ چلی، ٹارزن اور عمرو عیار کی کہانی پڑھتے ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ وہ میرے فیورٹ لکھاری بن چکے تھے اور ان کے حالاتِ زندگی سے آگاہی حاصل کرنا میرا خواب تھا جو کہ سرگزشت کی بدولت شرمندۂ تعبیر ہوا۔ ”قوالی“ کے عنوان سے تنویر ریاض ایک سیر حاصل مضمون لائے۔ بہت اچھا لگا قوالوں کے بارے میں جان کر لیکن مہر علی شیر علی قوال برادران کا ذکر نہیں تھا۔ شاعر خوشنوا بھی بہت اچھی یادوں پر مشتمل تحریر تھی۔ شاہد لطیف صاحب کی ”شہنشاہ جذبات“ انور فرہاد کے قلم کا شاہکار محمد علی واقعی صحیح معنوں میں ہر لحاظ سے ”شہنشاہِ جذبات“ تھے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ ”صلے کا دودھ“ ایک سبق آموز تحریر تھی۔ بے شک اللہ کسی کی چھوٹی سی نیکی کا صلہ اس کی توقع سے بڑھ کر دیتا ہے۔ ”شمشال سے ٹورنٹو“ کے سفرنامے میں گھر بیٹھ کر مین ہیٹن کی مکمل سیر کر لی اور ساتھ میں سرجی کی کہاوتیں، کیا بات ہے۔ ”ناسور“ کے آخر میں سسپنس پیدا ہو گیا ہے لیکن میرے خیال میں عاصمہ کے گھر سے بھاگنے والی بات غلط ہے۔ سرورق کی کہانی ”قیمت“ خود پسند اور انا پرست لڑکیوں کے لیے سبق آموز تحریر ہے۔ ”چھتنار درخت“ ایک باہمت اور پرعزم لڑکے کی داستان جس نے اپنی محنت سے منزل حاصل کر لی۔ کبیر عباسی کی ”دیر آید“ فضول خرچ افراد کے لیے سبق آموز تحریر ہے۔ مغرور کا انجام خلافِ توقع تھا۔ حیرت انگیز، عاجز میں شیر علی بے چارہ سیاسی کارکن بن کر حرام موت مارا گیا۔ اعجاز احمد، مہربان کے توسط سے فراڈیے اور دو نمبر لوگوں سے محتاط رہنے کا مشورہ دے رہے تھے۔ ”انتقام“ میں مریم سراپا انتقام بنی نظر آئی جس نے اپنی ہمت اور شوہر کی مدد سے دشمنوں کو کیفر کردار تک پہنچا دیا۔ ”شہرِ خیال“ کی صدارت نزاہت افشاں کے نام تھی۔ مبارک باد قبول فرمائیں۔ اعجاز حسین سٹھار، رانا محمد شاہد، آفتاب نصیر اشرفی اور سید محمد رضا شاہ نقوی نے بھی بھرپور تبصرہ کیا۔ میرا خط بھی شاملِ اشاعت تھا۔ بہت شکریہ۔ ندیم اقبال سر! آپ کے سفرنامے واقعے بہت دلچسپ اور مزے کے ہیں جنہیں بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔“

☆ محمد عمران خان ڈیلی ناندار بھکر سے رقمطراز ہیں۔ ”منی کہانی میں معراج رسول صاحب نے معاشرے کو آئینہ دکھایا۔ ہر طاقت ور کمزور کو اور کمزور اپنے سے کمزور تر کو دبانے کے چکر میں ہے۔ ہمارا معاشرہ نہ جانے کس طرف چل نکلا ہے لیکن اگر سوچیں تو ہم اچھے معاشرے کی طرف بڑھنے کا دعویٰ کرنے کے حقدار بھی نہیں ہیں، حالات کا رونا کب تک روئیں۔ ”شہرِ خیال“ میں اعجاز حسین سٹھار صاحب نے میدان مار لیا۔ اعجاز حسین سٹھار ہماری حاضری اب انشاء اللہ مستقل ہو گی۔ ملک ثاقب شاد، غلام حسین ضیاء، عبدالجبار رومی، رانا محمد شاہد، عریشہ، آفتاب احمد نصیر اور سدرہ بانو ان سب کے تبصرے بھی خوب تھے۔“

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

☆ اریشہ کی سمندری سے گل افشانی۔ ’’اس بار معمول میں ہلکی سی تبدیلی آئی اور ڈائجسٹ چاند رات کو مل گیا۔ سرورق عید کے رنگوں سے سجا تھا۔ مہندی، عید مبارک کے ساتھ گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا خفا سا بچہ شاید سب کو یہ تاثر دے رہا تھا کہ عید کی خوشیوں میں اہم اکثر مستحق اور محروم لوگوں کو بھول جاتے ہیں۔ ’’نشترِ خیال‘‘ میں مجھے یاد رکھنے کا شکریہ۔ سبھی احباب کے تبصرے اچھے تھے۔ داستان گو میں شیخ سعدی کا ذکر پڑھ کر دل چاہا کہ ان پر تفصیلی مضمون پڑھا جائے۔ کیا ماضی میں ایسا کوئی مضمون یا کہانی شائع ہوئی ہے۔ سال اور مہینا بتا دیں تو نوازش ہوگی۔ (دسمبر 1996۔ عنوان حکایتِ سعدی)۔ دانش مند دیوانہ اچھی تحریر تھیں لیکن ذرا تشنگی سی محسوس ہوئی۔ تنویر ریاض کی قوالی بہت پسند آئی۔ امجد صابری مرحوم کا ذکر ایک بار پھر افسردہ کر گیا۔ ’’شہنشاہ جذبات‘‘ پڑھ کر بھی بہت مزہ آیا۔ ’’صلے کا دودھ‘‘ کافی شاندار ہے۔ ’’دکھی عورت‘‘ نے بھی دکھی کیا۔ ’’پیام بر‘‘ سے ذرا سی بوریت محسوس ہوئی۔ پہلی سچ بیانی ناسمجھ عورتوں کے لیے ایک بہترین آئینہ تھی۔ فرمان خان کی ’’معذور‘‘ بھی پسند آئی۔ عاجز، مہربان، غلط راستہ، محسن اور انتقام بھی اچھی تھیں۔ اختتام پر تفصیلی ذکر کروں گی شمارے کی بہترین تحریروں کا ’’عشق کامل‘‘ جگ بیتیوں میں بہترین تحریر ہے۔ ایک ایسے عاشق رسولؐ کی سرگزشت جو زیارت رسولؐ کی سعادت حاصل نہ کرنے کے باوجود صحابی کا درجہ پانے میں کامیاب ہوئے۔ اسلامک ہسٹری ٹچ کرنا بہت دل گردے کا کام ہے کیونکہ بہت اختلافات ہیں روایات میں۔ تحریر میں کہیں بھی کسی ایک مسلک یا فرقہ کے لیے جانبداری محسوس نہیں ہوئی۔ بابویہ اور خسرو کی یثرب آمد، لوہار سے گفتگو اور مسجد نبوی کے مناظر کا بیان آنکھیں نم کر گیا۔ بہت ایمان افروز تحریر تھی۔ کئی جگہ پر آنسو ضبط کیے۔ ناقابلِ فراموش تحریر تھی۔ ’’ہوائے حجاز‘‘ دوسرے نمبر پر رہی۔ نسیم حجازی کو بہت نہیں تو تھوڑا بہت پڑھا ہے۔ ان کا کشتی میں سفر والا واقعہ ناول ’’پردیسی درخت‘‘ میں بھی موجود تھا۔ بہت خوشگوار حیرت ہوئی۔ ’’شمشال سے ٹورنٹو‘‘ اچھی جا رہی ہے۔ کبیر عباسی کی دیر آید سچ بیانیوں میں بہترین تھی۔ عورتوں کے لیے بہت سبق آموز اور گھریلو معاملات میں کفایت شعاری، سمجھداری اور کمپرومائز سیکھنے کا درس۔ عورتیں ہی گھر بناتی ہیں اور وہی گھر بگاڑتی بھی ہیں۔ اسپیشل نمبر کی نوید سنی۔ انتظار بڑھ گیا ہے۔ اکثر قارئین دوسری سلسلہ وار کہانی کا ذکر کرتے ہیں کیا ہی اچھا ہو کہ ایک اور کہانی شامل کر لی جائے۔ اگر یہ کہانی زویا اعجاز یا کبیر عباسی سے لکھوائی جائے تو زیادہ بہتر رہے گا۔‘‘

☆ راحت وفا راجپوت لکھتی ہیں۔ ’’کہانی ارسال خدمت ہے۔ یہ کہانی کس طرح پوری ہوئی ہے۔ یہ بھی ایک الگ کہانی ہے۔ شکر ہے مکمل ہوگئی۔ اب اللہ سے دعا ہے کہ آپ کو پسند آجائے۔ کوئی غلطی ہوگئی ہو تو آپ درست کر لیجیے گا۔ اسکول سے تو چھٹیاں ہوگئی ہیں مگر گھر کے اتنے ڈھیر سارے کام ہوتے ہیں کہ وقت نکالنا ہی بہت بڑا مسئلہ ہے۔‘‘

☆ آفتاب احمد نصیر اشرفی کی کورنگی کراچی سے آمد۔ ’’جس ملک میں کروڑوں اربوں کا غبن چند فیصد کی ریکوری کے بعد جائز ہو جاتے ہیں۔ جہاں جیل کی تلاشی لی جائے تو دولت مند قیدی عیش و عشرت کی زندگی گزار رہے ہوں جس ملک میں سیاسی رہنما جو رکن اسمبلی بھی ہو اپنی گاڑی سے ڈیوٹی پر موجود پولیس افسر کو کچل دے اور سینہ ٹھونک کر دیت کی آفر کر کے لواحقین کی تحقیر کرے، وہاں ایک پولیس والا غریب پھل فروش کے ٹھیلے سے چند پھل لینے میں ندامت کیونکر محسوس کرے گا۔ آپ بھی اپنا دل نہ جلایا کریں اور نہ بے ثبات دنیا کے حکمرانوں کو بے شمار ثمرات سمیٹنے پر کڑھا کریں کہ ان کا حج و عمرہ و روزہ کیونکر مقبول ہوگا۔ خدا آپ کو لمبی عمر بھی دے اور صحت بھی کہ آپ اپنے حصے کی شمع جلا کر اپنے انسان ہونے کا حق ادا کر رہے ہیں۔ ’’نشترِ خیال‘‘ میں داخلے سے پہلے ’’داستان گو‘‘ کی سنی۔ کافی متاثر کن داستان تھی۔ شیخ سعدیؒ کی حکایات روزانہ ہی کسی نہ کسی حوالے سے نظر سے گزرتی رہتی ہیں اور ہم حکمت کے موتی چنتے رہتے ہیں۔ ’’نشترِ خیال‘‘ ساتھیوں کی جگمگاہٹ سے قوس قزاح کا منظر پیش کر رہا تھا۔ تمام نامی گرامی ستارے اپنی اپنی روشنی بکھیر رہے تھے۔ نزاہت انشال غیر محتاط تنقید کے باوجود سب سے نمایاں تھے۔ اعجاز حسین سٹھاران کے قریب ترین حریف تھے۔ پری زاد واحد خاتون رکن تھیں۔ ندیم اقبال کو اپنے درمیان پا کر ہم تو بہت فخر اور خوشی محسوس کرتے ہیں اور انجم فاروق ساحلی بھی ایسی ہی خوشی دیتے ہیں۔ کبھی مانسہرہ کے ایاز راہی بھی ہمارے اپنے تھے۔ رانا محمد شاہد کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح پُرمغز تھا۔ خوشی ہوئی کہ وہ بھی ماہانہ شخصیات کی جدائی پر ہماری طرح افسردہ تھے۔ احمد خان توحیدی نے ڈاکٹر صاحب سے جناب الیاس سیتاپوری کی سرگزشت کی فرمائش کی ہمیں بہت اچھا لگا۔ عبدالجبار رومی انصاری، اویس شیخ، ذیشان شیخ، محمد ابراہیم، م انور اور سعید چاند کے خیالات بھی بہت بھائے۔ منشی محمد عزیز مئے کی سرگزشت کے لیے بھاگ دوڑ کو سلام۔ اپنا تبصرہ پڑھ کر محظوظ ہونا ہمارا حق تھا ہی سید محمد شاہ بھی خط چھپوانے کے حقدار لگے۔ محمد سلیم قیصر، جیل کی زندگی کو آپ نے مثبت لیا ہوا ہے اور آپ کے تبصروں میں اس کی جھلک نمایاں ہے۔ کراچی کی سینٹرل جیل کی رینجرز تلاشی کے بعد جو تصویر سامنے آتی ہے اگر ملتان میں بھی وہی سب کچھ ہے تو پھر جیل جانے کی عبرت تو نہ ہوئی نا۔ محمد ابراہیم کو خوش آمدید۔ فقیر غلام حسین ضیاء کشف القبور کو صحیح علم قرار دے رہے تھے اور ساتھ ہی اپنی سند بھی عطا فرما رہے تھے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ حنیف ادیب ساغر صدیقی کے فین ہیں جان کر ان کی دردمندی کے قائل ہوگئے۔ امیر حمزہ اشرف کی خواہش پر ان کے دوست وارث اور شاہ زیب ’’نشترِ خیال‘‘ میں حاضر ہوں ہم سب انہیں ویلکم کہیں گے۔ سیف اللہ کو بھی سلام۔ ’’نشترِ خیال‘‘ میں دبی دبی سرگوشیوں سے محسوس ہو رہا ہے کہ ایک اور سلسلے وار کہانی کی تلاش شروع ہو رہی ہے۔ اٹھائیس معرکۃ الآراء کتابوں کا مصنف ابن الہیثم اگر دریائے نیل پر عرق ریزی سے کام کر کے منصوبہ بندی نہ کرتا تو مشہور زمانہ نہر سوئز ہرگز تیار نہ ہوتی۔ ایک ہزار سال بعد ابن الہیثم کا منصوبہ کامیاب ہوا۔ ذہانت ہو تو ایسی ہو۔ ’’عشق کامل‘‘ حضرت اویس قرنیؓ کے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کامل عشق کی روح پرور داستان تھی جو ہمارے اعمال کے لیے عبرت انگیز کہ امت کی سرخروئی کے لیے ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

قربانی واخلاص کی انتہا کردی، ایک عاشق صادق کو ہماری بخشش کا امین بنادیا اور ہم ہیں کہ آلائشوں سے آلودہ ہیں نسیم حجازی کا تذکرہ سرپرائز تھا ایک شاندار مصنف کے عہد میں ہمارا اس کی تخلیق سے مستفید ہونا ہمارے لیے اعزاز سے کم نہیں۔ ''قوالی'' میں سب ہی نمایاں نام تھے جنھوں نے اپنے اپنے ادوار میں ہمیں روحانی طور پر سرشار کیا۔ ''شاعرِ خوش نوا'' مسرور انور کے مقبول گیتوں کی فہرست نے تو حیران کردیا۔ کیسے کیسے گیت انہوں نے لکھے۔ ''شہنشاہ جذبات'' محمد علی کی داستان حیات سرگزشت ہی کی بدولت ہمیں ازبر ہوچکی ہے۔ داستان گو کا فرض ہے کہ پبلک پراپرٹی فنکاروں کی زندگی کے ہر پہلو پر بات کریں۔ محمد علی سے پہلے زیبا صاحبہ کی شادی اداکار سدھیر سے بھی ہوئی تھی اور اپنی جس بیٹی ثمینہ کو انہوں نے شادی کے بعد محمد علی سے شیئر کیا۔ کیا وہ اداکار سدھیر کی ہی بیٹی ہیں یا زیبا صاحبہ کی کسی اور سے بھی شادی ہوئی تھی؟ بلاشبہ فلم انڈسٹری کی علی زیبا جوڑی کی خوب صورتی کی مثال دنیا بھر میں کہیں اور نہیں مل سکے گی۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' تک حسبِ معمول شاندار جب کہ ''ناسور'' حسب توقع...... ''بے وقت موت نمبر'' کا شدت سے انتظار ہے۔''

☆امیر حمزہ اشرف کی خوشہ چینی کوٹ رب نواز ملتان سے۔ ''سرگزشت گرم ترین اور حبس زدہ ماحول میں ملا۔ سرورق عید کی مناسبت سے ٹھیک تھا۔ مجھے سرگزشت سے اسی طرح عشق ہے جس طرح بھنورے کو پھول سے، چکور کو چاند سے اور مور کو ساون سے۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں اگر سرگزشت میری زندگی میں نہ آتا تو زندگی کتنی بے رنگ اور بور ہوتی۔ اس بار کا اداریہ میرے تو بالکل بھی پلے نہیں پڑا، پتا نہیں انکل کیا پیغام دے رہے تھے۔ ''شہرِ خیال'' میں تانکا جھانکا، کرسی صدارت اس بار نزابت افشال کے حصے میں آئی۔ مبارکاں جی۔ کچھ نئے دوست حاضر تھے پری زاد جہاں، محمد ابراہیم اور ذیشان شیخ صاحبان کو تہہ دل سے خوش آمدید۔ اس بار میرے ہم شہری محمد سلیم قیصر بھی اپنے پیارے سے تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔ باجی طاہرہ گلزار اس دفعہ بھی غیر حاضر تھیں۔ خوب صورت تحریر ''عشقِ کامل'' پڑھی۔ محترمہ زویا اعجاز نے حضرت اویس قرنیؓ سے متعلق ایمان افروز مضمون لکھ کر ہمارے علم اور حرارت ایمانی میں اضافہ کیا، اگر اسی طرح ہر ماہ سرگزشت میں کوئی نہ کوئی اسلامی تحریر شامل کی جائے تو کیا ہی بات ہے۔ وسیم بن اشرف کی تحریر ''ہوائے حجاز'' میں بعض مقامات پر بہت الجھاؤ تھا اس لیے تحریر کے صحیح لطف سے محروم رہے۔ پڑھنے کے بعد تشنگی باقی رہی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی ''ناسور'' زبردست جارہی ہے۔ سچ بیانی ''غلط راستہ'' پڑھی۔ عورت بھی خدا کی عجیب تخلیق ہے۔ کہیں انتہائی وفادار، شرم وحیا کا پیکر اور کہیں انتہائی خودغرض اور مکرو فریب کی علامت۔ رابعہ ایک شاطر عورت تھی جو مردوں کو بے وقوف بنا کر پیسے اینٹھتی تھی۔ بہت عبرتناک سچ بیانی تھی۔ ''دیرآید'' بوڑھی بیوی کی بے لگام خواہشات اور شاہ خرچی نے ایک خوددار شوہر کو رشوت جیسی لعنت لینے پر مجبور کردیا کہانی پڑھنے کے فوراً بعد ہاتھ بے اختیار دعا کے لیے اٹھ گئے۔ اے میرے پروردگار بندۂ ناچیز کو شریکِ حیات صبروشاکر دینا ورنہ ہمیں تو کنوارہ رہنا منظور ہے۔ باقی تحریریں بھی زبردست تھیں۔ بھائی عمران جونانی، احسان سحر، ناصر حسین رند، محمد احمد رضا، باجی بشریٰ افضل، صائمہ نور آپ سب لوگ کہاں گم ہیں آپ سب کے بنا یہ محفل ادھوری سی ہے۔ پلیز اپنی خیریت سے آگاہ کریں۔ آخر میں سب کو السلام علیکم۔''

☆نزابت افشال کا خط مہورہ فتح جنگ سے۔ ''فیض صاحب نے کہا تھا کہ ''جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے'' عید سے ایک دن قبل سرگزشت کو پاکر ہمیں بھی یہی محسوس ہوا۔ اس بار یک صفحی سرگزشت میں بلبل شیراز شیخ سعدیؒ کے بارے میں پڑھنے کو ملا۔ سعدیؒ پر ہم پہلے بھی پڑھ چکے ہیں، جن دوستوں نے نہیں پڑھا تھا، وہ جی بھر کے مستفید ہوں گے۔ بوستان سعدی اور گلستان سعدی ہم نے ششم ہی میں پڑھ لی تھیں۔ اداریہ سرکاری اہل کاروں کی فرعونیت کو خوب صورتی سے عیاں کررہا تھا۔ اس بار ڈاکٹر صاحب کی بجائے تسنیم صاحب کی تحریر پڑھنے کو ملی۔ اچھی تحریر تھی۔ ابن الہیثم حیرت انگیز دماغ رکھتا تھا۔ پن ہول کیمرا انہوں ہی نے ایجاد کیا تھا۔ ان کی تعلیمات وہدایات کی روشنی میں ہی ''راجر بیکن'' نے دوربین ایجاد کی۔ راجر بیکن نے اپنی تصنیفات میں جگہ جگہ ابن الہیثم کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ ''عشقِ کامل'' میں زویا اعجاز نے نامور صحابی حضرت اویس قرنیؓ کے حالات زندگی کو بہت ہی شاندار انداز میں تحریر کیا۔ ان کی زندگی ہمیں اطاعت رسول کا درس دیتی ہے۔ ''ہوائے حجاز'' اچھی تحریر تھی لیکن نسیم حجازی پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ انہوں نے قرونِ اولیٰ کے مسلمان ہیروز کا ذکر اس طرح کیا کہ ان کے ساتھ رومانوی قصے بھی منسوب کردیئے جنہیں پڑھ کر آدمی سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ کیا ہمارے نامور ہیروز ایسے ہی تھے؟ اس سے ناول کی ضخامت تو بڑھتی ہے لیکن اعتراض بالا درست معلوم ہونے لگتا ہے۔ ''قوالی'' پر تنویر ریاض کی تحریر زبردست تھی۔ ''شاعرِ خوش نوا'' زبردست معلوماتی تحریر تھی لیکن مختصر تھی۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' اپنے عروج پر ہے۔ باقی تحریریں بھی ماشاءاللہ بہترین تھیں۔ ''ناسور'' واقعی میں ناسور بنتی جارہی ہے۔ نعمان نے فہیم کی بات نہ مانی اب دیکھیئے کیا ہوتا ہے۔ ''قیمت'' بہترین کہانی تھی۔ سیما صاحبہ نے والدین کی بات نہ مانی اب وہ جتنی بھی قیمت ادا کریں وہ کم ہے۔ ویسے صفدر کی فطری کاہلی اور سستی کو دیکھ کر بھی اس عقل کی اندھی کو ہوش نہ آیا حیرت کی بات ہے۔ ''دیرآید'' زبردست تحریر تھی۔ لالچی لوگوں کے منہ پر طمانچہ تھی۔ ''معذور'' میں نسیم صاحب نے بہت اچھا کیا اور ذیشان جیسے گھٹیا دوست بلاشبہ لعنت کے مستحق ہیں اور ساتھ میں نسیم صاحب کی بیوی بھی۔ عاجز بھی سبق آموز تحریر تھی۔ واقعی موت بہت سے بڑبولوں کا منہ بند کردیتی ہے۔ مہربان اور غلط راستہ بھی بہترین کہانیاں تھیں۔ ''محسن'' اچھی تحریر تھی لیکن سلیم ناصر نے اپنے محسن کی جان لے کر خود کو قاتل محسن بنادیا۔ سب سے بڑھ کر سبق آموز کہانی تھی ''چھتنار درخت'' اس کو پڑھ کر مجھے اپنے ایک اسٹوڈنٹ جمشید تنہا کی یاد آگئی کیونکہ آج سے سات سال قبل وہ بھی اسی طرح میرے پاس آیا تھا۔ اب تو وہ بفضل خدا اور اپنی محنت کے سبب پاک آرمی میں ہے اور خوش ہے۔ ''شہرِ خیال'' میں خود کو صدارت پر فائز دیکھ کر بے اختیار میاں محمود بخش کا یہ شعر یاد آگیا کہ ''میں گلیاں دا روڑا کوڑا، محل چڑھایا سائیاں'' اکبر کا شعر ویسے ہی درست ہے جیسے کہ میں نے لکھا ہے۔ میرے پاس کلیات اکبر کا قدیم اور مستند ترین نسخہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ہے۔ اعجاز حسین ستھار، ندیم صاحب، احمد خان توحید، عبدالجبار رومی اور امیر حمزہ یاد کرنے کا شکریہ۔ پری زاد جہاں فرام سیالکوٹ آپ میرے نام کا مطلب خود تلاش کریں۔ یاد کرنے کا شکریہ۔ رانا بھائی میں خود تحریر لکھنا چاہتا ہوں لیکن کیا کیا جائے کہ غم روزگار سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ منشی محمد عزیز صاحب یاد کرنے کا شکریہ۔ لیجیے سید محمد رضا شاہ یعنی حکیم صاحب بھی موجود ہیں یعنی اب ہم ان سے پوچھ سکتے ہیں کہ للہ بتائیں ''آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟'' آخر میں ایک اہم غلطی کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہوں گا کہ ماہ جون میں محترم ایاز راہی کی تحریر ''کتب خانے'' چھپی تھی۔ وہ صفحہ نمبر 153 سطر نمبر 3 پر لکھتے ہیں ''چشم فلک نے دکھ سے آنکھیں میچ لیں'' عرض کرتا چلوں کہ فقرہ ہذا گرائمر کی رو سے سراسر غلط ہے۔ درست فقرہ یوں ہونا چاہیے تھا کہ ''فلک نے دکھ سے آنکھیں میچ لیں۔''

☆ ایم اے حفیظ کا خلوص نامہ گوجرانوالہ سے۔ ''سرگزشت 19 جون کو ہی مل گیا۔ بڑے آرام سے مطالعہ بھی مکمل ہو گیا۔ پھر فوری طور پر خط لکھنے لگ گیا۔ اداریہ ہر بار کی طرح مختصر مگر پُر اثر تھا۔ یک صحی داستان گو بس ٹھیک تھی۔ ''شہر خیال'' میں سب پرانے ساتھی جلوہ گر تھے۔ دونے تو بابو دولت کا ذکر بھی کیا، شکریہ۔ سچ بیانیاں سب اچھی تھیں تاہم ''چھتنار درخت'' کا نمبر پہلا اور ''قیمت'' کا دوسرا نمبر۔ ''معذور'' جیسی کہانی برسوں پہلے پڑھی تھی جس میں معذور شخص نے سب گھر والوں کو سوئی گیس سے موت کا نشانہ بنایا تھا۔ ایک اور کہانی ''انتقام'' حیرت انگیز لگی۔ ضیاء تسنیم بلگرامی کا ''دانش مند دیوانہ'' اچھا رہا۔ ضیاء تسنیم بلگرامی کے لکھنے کا اپنا انداز ہے۔ یقین کیجیے تقریباً 35 سال بعد ضیا تسنیم بلگرامی کی کوئی تحریر پڑھ سکا ہوں۔ آخری بار شاید 1979ء کے آس پاس فرعون پر ''خداوند کا باغی'' کے نام سے پڑھی تھی۔ زویا اعجاز کا کارنامہ ''عشق کامل'' بے مثال رہا۔ ایسے مضامین لکھنا تلوار کی دھار پر چلنے کے برابر ہوتے ہیں۔ کیونکہ ایسے مضامین میں غلطی کی گنجائش نہیں ہوتی۔ بہت عمدہ تحریر تھی۔ ''ہوائے حجاز'' وسیم بن اشرف کا تاریخی ناول نگار جناب تسیم حجازی پر مضمون بھی تاریخی ہی تھا۔ بہت زیادہ معلومات سے بھرپور بہت اعلیٰ بہت عمدہ۔ ''شاعر خوشنوا'' نامور نغمہ نگار جناب مسرور انور پر شاہد لطیف نے قلم اٹھایا اور کمال کر دیا۔ اُمید ہے شاہد لطیف صاحب آیندہ بھی سرگزشت کے قارئین کو محظوظ کرتے رہیں گے۔ محمد علی کے فن کا انور فرہاد نے حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ''دُکھی عورت'' نے دکھی کر دیا۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' میں ندیم اقبال، شہباز فخری اور سرجی اچھے کردار ہیں۔ دیکھا میں نہ کہتا تھا ندیم اقبال، نسرین کے لیے دل میں نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ اس تعلق پر تمنا بھائی نے محتاط طریقے سے ندیم اقبال کو خبردار کیا۔ اب ''ناسور'' کی بات ہو جائے۔ پچھلی قسط نے اختتام پر دل دھڑکا دیا تھا۔ نئی قسط نے حوصلہ دیا۔''

☆ سدرہ بانو ناگوری کی آمد کراچی سے۔ ''عید کا موقع ہے اور گرمی اس قدر شدید کہ اہل کراچی حیران و پریشان ہیں کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ حادثات اور سانحات سے بھی فضا سوگوار اور دل بوجھل ہے۔ لالچ، ہوس، غلط فہمیاں اور کچھ قسمت کی خرابیاں کہ ہنستے بستے لوگوں کی ایک بڑی تعداد آگ کے شعلوں کی نذر ہو گئی۔ ''شہر خیال'' میں ہمارا خط نہیں تھا یہ اس سال میں دوسری بار ہوا ہے۔ یہ یقیناً محکمہ ڈاک والوں کی کرم نوازی ہے۔ سلیم قیصر نے بھی حاضری لگوا کر اپنی خیریت سے آگاہ کیا، شکریہ جی۔ رب تعالیٰ آپ کے لیے آسانیاں فرمائے۔ ندیم اقبال آپ خود بہت نائس ہیں، خدا ہمیں وہی دیتا ہے جس کی ہم اس سے توقع رکھتے ہیں۔ آپ نے خدا سے اچھی توقعات رکھیں تو اس نے آپ کو بہترین نوازا، تبصرے کی پسندیدگی کا شکریہ۔ نزاکت افشال اپنے خوب صورت نام کی طرح تبصرہ بھی خوب کرتے ہیں۔ رانا شاہد اور باقی سبھی ساتھیوں کے تبصرے خوب تھے۔ اس بار ابتدائی صفحات پر ضیاء بلگرامی تھیں۔ زویا اعجاز کی ''عشق کامل'' نے ایمان کو تر و تازہ کر دیا۔ دلوں میں اترتی یہ تحریر بہت عمدگی سے لکھی گئی ہے اس کے لیے زویا اعجاز صاحبہ داد و تحسین کی مستحق ہیں۔ سلمیٰ اعوان جی یہ لفظوں کے تانے بانے بننے کا گر کہاں سے سیکھا آپ نے، بھئی جب بھی لکھتی ہیں کمال کر دیتی ہیں ویلڈن۔ آپ کی نئی آنے والی کتاب کی بھی بہت بہت مبارک باد۔ ندیم اقبال کی ''شمشال سے ٹورنٹو'' میں امریکا کے کچھ نئے رنگ الگ ہی انداز میں دیکھنے کو ملے۔ امریکا جو کتنوں کے ہی خوابوں میں بستا اور آنکھوں میں بچتا ہے غربت اور مفلسی نے اسے بھی نہیں بخشا مگر یہ بھی تو دیکھنے کو وہاں سہولتیں اور راحتیں کتنی ہیں۔ وہاں کسی کی دل آزاری نہیں ہوتی، لوگ اگر شین کی طرح کام کریں تو اس کا صلہ بھی پورا پورا پاتے ہیں۔ وہاں تفریح کے کتنے ہی مواقع ہیں۔ یہ امریکا کی خوش قسمتی ہے کہ اسے اچھے حکمران ملے، ہمارے یہاں لاکھ نعمتیں سہی مگر یہاں انسان کی قدر نہیں۔ ہم لوڈ شیڈنگ، پانی، بجلی، گیس اور مہنگائی میں ایسے الجھے ہیں کہ ہمیں خود کو سلجھانے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ چند تفریح کے مقام ہیں بھی تو ان کا حال بھی کھلی کتاب کی طرح سب کے سامنے ہے۔ انگریز چاند پر پہنچ گئے اور ہم ابھی تک عید کے چاند پر ہی متفق نہیں ہو پائے ہیں۔ ہم ٹوٹے بکھرے اور بھٹکے ہوئے لوگ کہ جن کا حال یہ ہے کہ اس وطن میں ہر چیز نظر آتی ہے او کے، بہت خوش ہے یہ قوم اپنا بھی کچھ کھو کے۔ محمد علی کہ جن کی فلموں کے تذکرے امی اور نانی کی زبانی بہت سنے مگر ان پر پہلی بار پڑھا گو کہ تشنگی برقرار ہے ان پر تو جتنا لکھا جائے اتنا کم ہے۔ ''ناسور'' پڑھ کر دل سرشار ہو گیا کہ ایڈووکیٹ زنیرہ حادثے میں بچ گئی ہیں۔ ''صلے کا دودھ'' اس شمارے کی سب سے عمدہ تحریر تھی۔ پہلی سچ بیانی بس یونہی گزارے لائق تھی۔ پڑھی لکھی سمجھدار عورت اگر بے وقوفی پر اتر آئے تو اسے اس کی قیمت تو چکانی پڑتی ہے۔ ''بے وقت موت نمبر'' پڑھ کر چوکے۔ ارے یہ کیا انکل یہ کیسا موضوع ہے ہم مسلمان ہیں اور اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اپنے مقررہ وقت پر ہم سبھی کو مرنا ہے۔'' (یہ عنوان دنیاوی نظریہ کا حامل ہے۔ سرگزشت کا ہر نمبر الگ طرح کا ہوتا ہے)۔

☆ نصر اللہ خان کا خط داؤد خیل میانوالی سے۔ ''آپ کا منفرد رسالہ سرگزشت عرصہ بیس سال سے پڑھ رہا ہوں... کوئی اور رسالہ پسند نہیں آتا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ہے لیکن خط پہلی دفعہ لکھ رہا ہوں۔ اس ماہ کی سچ بیانی ''براوقت'' اچھی اور دل موہ لینے والی کہانی ہے۔ سقوط کے المیے سے کہانیاں زیادہ دیا کریں کیونکہ جب مشرقی حصے میں خونریزی ہو رہی تھی تو ان لوگوں نے اپنے علاقے کی حفاظت کے لیے جان قربان کردی۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' نہایت خوب صورتی اور روانی سے جاری ہے۔ اچھا سلسلہ ہے۔ فلم نگری کے انور فرہاد بھی کافی اچھا لکھتے ہیں۔ شکاریات کے سلسلے میں کوئی نہ کوئی کہانی ہر ماہ دیا کریں۔ آپ کی نوازش ہوگی۔ باقی تمام پرانے قارئین کو سلام و دعا عرض ہے۔''

☆ بہاولپور سے کلیم اللہ ایڈووکیٹ ہائی کورٹ سے قم طراز ہیں۔ ''ماہنامہ سرگزشت کو معاشرہ کے ہر طبقے میں یکساں پذیرائی حاصل ہے۔ علم و ادب کی اشاعت، شعور آگہی کی ذہنوں تک رسائی کے ساتھ پاکستان کی قومی زبان اردو کو ملک کے چاروں صوبوں، کشمیر، پاکستان سے باہر مقبول عام بنانے کی مساعی کے ساتھ انسانیت، محبت اور اخوت کی آبیاری کے لیے سرگزشت ایک اہم اور بڑا نام ہے۔ محترمہ صائمہ اقبال ہر ماہ شخصیات کا تعارف کراتی ہیں جو ایک مقبول سلسلہ ہے۔ ماہ جون کی شخصیات میں جماعت اسلامی کے میاں طفیل کا طویل تعارف ہے۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف پاکستان قومی اتحاد (پی این اے) کی تحریک کے ہراول دستے میں میاں طفیل شامل تھے۔ یہاں تک بالکل سچ لکھا ہے مگر مضمون نگار نے انتہائی غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ بھٹو سے مذاکرات کے لیے جو کمیٹی بنائی گئی اس میں نوابزادہ نصراللہ خان، پروفیسر غفور احمد اور میاں طفیل شامل تھے۔ سچ یہ ہے کہ مذاکراتی ٹیم میں دور دور تک میاں طفیل کا نام و نشان نہ تھا۔ بلکہ سابق وزیراعلیٰ سرحد مفتی محمود اس مذاکراتی ٹیم کے تیسرے رکن اور سربراہ تھے۔ مضمون نگار نے غلط معلومات دے کر پاکستان اور پاکستان سے باہر ہزاروں قارئین کی دل آزاری کی ہے۔ مذاکراتی ٹیم کے اراکین کا نام بچے بچے کو ازبر ہے۔ چالیس سال گزرنے کے باوجود اس تحریک کو یاد کر کے لوگوں کا خون کھول اٹھتا ہے۔ نیز انصاف، توازن اور پیشہ وارانہ اخلاقیات کا تقاضا تھا کہ دھاندلی کے ذکر کے ساتھ یہ بھی لکھا جاتا کہ انتخابی دھاندلی کے نام سے چلنے والی تحریک کو نہایت چابک دستی اور عیاری سے تحریک نظام مصطفیٰ میں تبدیل کردیا گیا۔ جب کہ صرف چار سال قبل مفتی محمود، پروفیسر غفور احمد اور بڑی تعداد میں علماء 1973ء کا اسلامی جمہوریہ پاکستان کا اسلامی آئین قومی اسمبلی میں اپنی منظوری کے دستخط ثبت کر کے پاکستان بھر میں نافذ کر آئے تھے اور یہ علمائے کرام اسی قومی اسمبلی میں احمدی فرقہ کو پاکستان میں کافر قرار دے چکے تھے۔ کیونکہ آئین میں نظام مصطفیٰ مکمل طور پر موجود تھا اس لیے تحریک سوائے امریکی ایجنڈا آگے بڑھانے کے اور کچھ نہ تھی۔ سب کو علم ہے کہ اس تحریک کے دوران امریکا پاکستان میں امریکی ڈالروں کا اتنا بڑا سیلاب لے آیا تھا کہ مارکیٹ میں ڈالر نکلے نکلے کا ہو گیا تھا اور بہت سارے نامور سیاسی لوگوں کے ضمیر ڈالروں کے اس سیلاب میں غرق ہو گئے تھے۔ سرگزشت ایک قومی اور تفریحی رسالہ ہے۔ ساکھ اور اعتماد ہی کسی ادارے کا سرمایہ اور قیمتی متاع ہوتی ہے۔ لوگوں کو سچ بتانا ہے تو پھر پورا بتائیں ادھورا سچ سوائے دکھ کے کچھ نہیں دیتا۔ توقع ہے کہ آپ اس خط کو قرعہ اشاعت میں جگہ دیں گے۔''

☆ محمد عارف کراچی کا نامہ بھکر سے۔ ''جون 2017ء کے سرگزشت میں میری کہانی ''جیسی کرنی'' کی اشاعت اور پرچہ مارکیٹ میں آنے سے پہلے معاوضہ کی ادائیگی کا ڈھیروں شکریہ۔ آپ نے تو مزدور کی مزدوری اس کا پسینا خشک ہونے سے پہلے ادا کرنے کی مثال قائم کردی۔ شاید بلکہ یقیناً یہی وجہ ہے کہ آپ ایک طویل عرصے سے ڈائجسٹوں کی دنیا کے امام چلے آرہے ہیں اور آپ نے اس میدان میں اپنی مستقل اور مسلسل جدوجہد سے اپنے والد مرحوم کے نقش قدم کو روشن تر کردیا ہے۔ اللہ آپ کو مزید کامیابیاں عطا فرمائے اور آپ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے قارئین کی مطالعاتی تسکین کا بدستور اہتمام کرتے رہیں۔ آخر میں ایک شکوہ کہ آپ نے میری مطبوعہ کہانی کے تعارفی خط میں میرے نام کے ساتھ شہر کا نام کوئٹہ لکھ دیا ہے جب کہ میرا تعلق بھکر پنجاب سے ہے چنانچہ ہو سکے تو میری اس وضاحت کو آئندہ شمارے میں شائع کردیجیے تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے، بہت شکریہ۔''

☆ رضا احمد اعوان، دریا خان بھکر سے لکھتے ہیں۔ ''بعد از خیریت آپ کی خیریت کا طالب ہوں۔ جون کا شمارہ ہاتھوں میں ہے۔ میں بہت دیر تک ٹکٹکی باندھے سرورق کی حسینہ کو دیکھتا رہا جو آنکھیں بند کیے کسی کے خیالوں میں گم تھی۔ لہٰذا اس کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھا اپنے ''شہر خیال'' میں سدرہ بانو ناگوری آستین چڑھائے رضوانہ قریشی صفحہ کو کھری کھری سنا رہی تھیں۔ ''نایاب پرندے'' بہت معلوماتی تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ جب پرندے نایاب ہونے لگیں تو یہ چڑیا گھر کی زینت بننے لگتے ہیں۔ پرندے کائنات کی خوب صورتی اور انسان کے دوست ہیں اور ایک ہم ہیں کہ موقع ملتے ہی انہیں ذبح کر ڈالتے ہیں۔ اسی لذت کام و دہن کی وجہ سے پرندوں کی مختلف اقسام کو ختم کردیا ہے۔ لاہور کے ایک گمنام ہدایت کار عزیز گل پر بھی لکھیے جن کے کریڈٹ پر چند یادگار فلمیں ہیں۔ ندیم اقبال کی ''شمشال سے ٹورنٹو'' واقعی ایک جداگانہ انداز کی تحریر ہے۔ ''ناسور'' میں ایڈووکیٹ زنیرہ کا نعمان کے بارے میں پریشان ہونا ظاہر کرتا ہے کہ وہ نعمان سے محبت کرنے لگی ہیں۔''

☆ انور عباس شاہ کی تشریف آوری دریا خان بھکر سے۔ ''شمارہ ہمیں وقت پر مل تو چکا ہے لیکن شومئی قسمت مصروفیات کچھ ایسی رہیں کہ اس کا معمولی سا مطالعہ کر سکے لہٰذا اس دفعہ کسی قسم کا تبصرہ کرنے سے قاصر ہیں۔ کافی عرصے سے ہم مطالبہ کر رہے تھے۔ ماہ اگست میں آزادی نمبر نکالنا چاہیے لیکن فی الحال کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ ایم اے راحت بھی ہم سے جدا ہو چکے ہیں۔ خداوند کریم ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے (آمین)۔ ناولوں کی دنیا میں تہلکہ مچا دینے والی اس ہستی نے دل موہ لینے والے بہت سے ناول لکھے خاص طور پر صدیوں کا بیٹا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کا تو جواب ہی نہیں۔ ''شہرِ خیال'' میں بھی کافی رونق چھائی ہوئی تھی۔''

☆ سعید احمد چاند کراچی سے طلوع ہیں۔ ''سرورق بڑا پیارا تھا۔ اداریے سے محظوظ ہوتے ہوئے شیخ سعدیؒ کے مفصل حالات سے ''داستان گو'' میں پڑھا۔ نزاہت افشاں مہورہ فتح جنگ کو مسندِ ادارت پر دیکھ کر خوشی ہوئی۔ موصوف نے اچھے موضوعات پر روشنی ڈالی ہے۔ اعجاز حسین سٹھار کے علاوہ جن لوگوں کے تبصرے دلگیر لگے وہ یہ ہیں۔ ندیم اقبال، عبدالجبار رومی انصاری، اویس شیخ، ذیشان شیخ، محمد ابراہیم، منشی محمد عزیز مئے، آفتاب احمد نصیر اشرفی، ایم انور، سید محمد رضا شاہ، انجم فاروق ساحلی، امیر حمزہ اشرف، سیف اللہ ملک۔ ان قارئین اور دوسرے لوگوں کو میرا اسلام۔ محمد سلیم قیصر، فقیر غلام حسین، حنیف ادیب۔ ''دانشمند دیوانہ'' ضیاء تسنیم بلگرامی کا۔ وسیم بن اشرف کا ''ہوائے حجاز'' تنویر ریاض کا ''قوالی'' راشد لطیف کا ''شاعر خوش نوا'' انور فرہاد کا ''شہنشاہ جذبات'' ندیم اقبال کا ''شمشال سے ٹورنٹو'' خالد قریشی کا ''پیام بر'' ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کا ''ناسور'' سچ بیانیوں میں سیما مقدر کی ''قیمت'' زرین قمر کی ''چھتنار درخت'' کبیر عباسی کا ''دیر آید'' فرحان خان منڈی بہاؤالدین کا ''معذور'' اعجاز احمد کا ''مہربان'' ناظم بخاری کا ''غلط راستہ'' سلیم ناصر کا ''محسن''۔ ''بیت بازی'' میں سارے اشعار اچھے تھے۔ ڈاکٹر روبی بھکر والی اس دفعہ بھی غیر حاضر ہیں۔''

☆ سیف اللہ ملک وال کا تجزیہ۔ ''معراج رسول کی کہانی ایک سچی آواز ہے جس کی تردید نہیں کی جاسکتی۔ شیخ سعدی کے حالات سے آگاہی ہوئی ''دانشمند دیوانہ'' سے علم میں آیا کہ نہر سوئز منصوبے کا خاکہ ہزار سال پہلے بن چکا تھا۔ اللہ نے کیسے کیسے عقلمند زندگی کے ہر شعبے میں پیدا کیے ہیں جن کی صلاحیتیں پڑھنے پر انسان حیران رہ جاتا ہے۔ اب اویس قرنیؓ کے عشق کو دیکھ لیں اور اس عشق کی انتہا کی سمجھ اگر آجائے تو پتا چل جاتا ہے کہ عشق کامل کیا ہوتا ہے۔ نسیم حجازی کے تین چار ناول تو عرصہ ہوا پڑھے تھے لیکن حالات زندگی اور جدوجہد کے بارے میں پہلی دفعہ تفصیل سے پڑھا۔ وسیم کا شکریہ۔ ''قوالی'' کے بارے معلومات موجود تھیں لیکن تشنہ کیونکہ بہت سے قوال حضرات کا ذکر نہیں ہوسکا یقیناً مضمون کی طوالت اور پرچے کے صفحات کی گنجائش بھی دیکھنی ہوتی ہے۔ بہرحال جو بھی لکھا ہے پسند آیا۔ شاعر خوش نوا میں واقعی شاعر کی خوش نوائی واضح ہے۔ محمد علی تو شہنشاہِ جذبات تھے۔ اکثر فلموں میں ان کے ادا کیے ہوئے فقرے آج بھی ضرورت کے وقت ہر آدمی استعمال کرتا ہے۔ اللہ کی مرضی اور حکمت دیکھیں کہ ایک امام مسجد کے ہونہار سپوت نے شوبز میں ترقی کی اور انتہا کی بلندیوں تک پہنچا۔ زیبا بیگم سے شادی مرتے دم تک نبھائی اور ایک دوسرے کے وفادار بن کے رہے۔''

☆ فقیر غلام حسین ضیاء کی بھکر سے ضیاء پاشی۔ ''بھکر ضلع کے عزیز دوستوں کے محبت نامے پڑھے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ ہم ایک جگہ کے رہنے والے کبھی ایک جگہ اکٹھے نہ ہوسکے۔ بھلا ہو سرگزشت کا ''شہرِ خیال'' کے عنوان سے اپنے ادبی رسالے میں میل ملاپ کے لیے خصوصی جگہ دی۔ ہمیں بھی چاہیے کہ اپنے دلوں میں ایک دوسرے کو جگہ دیں۔ ''دانشمند دیوانہ'' کے عنوان سے ضیاء تسنیم بلگرامی نے ایک عظیم مسلم سائنس دان ابن الہیثم جو 354 ہجری میں ابوعلی محمد کے نام سے بصرے کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے جس نے سائنس کی دنیا میں بے شمار نظریے دیئے مگر ان نظریات کو عملی شکل یورپ کے سائنس دانوں نے دی۔ افسوس اس بات کا ہے کہ فاطمی خلیفہ الحاکم کی سخت طبیعت اور موت کے خوف سے بڑی تکلیف دہ زندگی گزار کر دنیا سے رخصت ہوا۔ مصر کے اسوان ڈیم کا منصوبہ مسلم سائنس دان ابن الہیثم کی ابتدائی سوچ کا نتیجہ ہے جسے عملی جامہ انگریزوں نے پہنایا۔ اس عظیم سائنس دان کو تنگ نظر خلیفہ کی بجائے اگر کوئی فراخ دل حاکم ملتا تو سائنس مزید ترقی کرتی۔ زویا اعجاز نے حضرت خواجہ اویس قرنیؓ کی سیرت پاک ''عشقِ کامل'' کے عنوان سے تحریر فرمائی۔ ''ہوائے حجاز'' محترم نسیم حجازی کی داستان زندگی پر لکھی گئی ہے جنہوں نے خوابیدہ قوم کو اپنی تحریروں کے ذریعے جگایا ہے۔ نسیم حجازی مرحوم کا آج کے پاکستان کے نام ایک خط صفحہ 65 پر تحریر ہے۔ اسے ضرور پڑھیے۔ ہندو بنیے نے مسلمانوں پر کیا کیا ظلم ڈھائے۔ تنویر ریاض کی تحریر ''قوالی'' شائقین کے لیے نہایت اچھی تحریر ہے۔ فلمی دنیا سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے انور فرہاد نے ''شہنشاہ جذبات'' محمد علی کی زندگی پر بہت اچھی اور دلچسپ تحریر لکھی۔ ''ناسور'' ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی تحریر کردہ کہانی ایک سیدھے سادھے نوجوان کی ہے جو درندوں کے جال میں پھنس گیا ہے پولیس افسر نے اس پر سنگین الزامات کی دفعات ڈال کر کے انتقامی حربوں میں اسے الجھا دیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی ''ناسور'' کے خالق ہیں یا ''گرداب بلا'' کے۔ بھٹی صاحب کہانی کو بڑے عجیب موڑ پر لے آئے ہیں۔ ''قیمت'' سیما صفدر کی تحریر کو سرورق پر مزین کیا گیا۔ ''چھتنار درخت'' کے عنوان سے ایک بہت بڑے مسئلے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ کبیر عباسی کی تحریر ''دیر آید'' اچھی اور نصیحت آموز ہے۔ ''غلط راستہ'' کے عنوان سے تحریر ناظم بخاری کا عطیہ ہے۔ جیسا کہ کہانی کا عنوان ہے ''غلط راستہ'' تو جناب غلط راستہ اختیار کرنے کا انجام ٹھوکر کھانا ہے۔ ''محسن'' سلیم ناصر کی تحریر ہے۔ احسان نے سمندر میں خودکشی کرنے والے نوجوان کو موت کے منہ سے بچایا۔ احسان صاحب تو بچ گئے مگر احسان کا بدلہ خوب دیا۔ ''انتقام'' مریم کی تحریر ہے۔ مظلوم کے ساتھ ظلم کا انتقام قدرت کی طرف سے ہوتا ہے۔''

☆ فاروق انجم ساحلی کا خط لاہور سے۔ ''ابن الہیثم اور نسیم حجازی کا زندگی نامہ خوب تھا۔ یک صفحی سرگزشت بھی دلچسپ تھی۔ شیخ سعدیؒ حکایات اور شاعری کے حوالے سے بڑی شخصیت تھے۔ مدیر سرگزشت آپ بیتیوں کا انتخاب محنت اور عرق ریزی سے کرتے ہیں تاکہ کہانی فرسودہ نہ ہو اس کے علاوہ جدت اور تنوع کو مدنظر رکھتے ہوئے خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ خطوط کی محفل دلچسپی سے بھرپور تھی۔ جن احباب نے تذکرہ قلم بند کیا۔ ان کا بے حد مشکور ہوں۔ پیامبر معلومات سے بھرپور تھی۔ کائنات کے خارجی زاویے میں پرندے آسمان کی زینت ہیں۔ صلے کا دودھ،

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

شاعرِ خوش نوا، دکھی عورت متاثر کن تحریریں تھیں۔ آپ بیتیوں میں قیمت، چھتنار، غلط راستہ خوب تھیں۔''

☆ رضا احمد اعوان کی سرگزشت کی پذیرائی، دریا خان بھکر سے۔ ''اس بار عید کے رنگ پھیکے پڑ گئے اور ہم نے سارا دن گھر میں گزارا۔ کیونکہ ملک عزیز میں عید سے چند روز پہلے احمد پور شرقیہ اور پارہ چنار میں دلخراش سانحات نے غمزدہ کردیا اور دل خون کے آنسو روتا رہا۔ پہلا واقعہ ہماری قومی سوچ کی عکاسی کرتا ہے کہ جہاں کوئی مفت کی چیز ملے، بے خوف و خطر اٹھالو۔ یہ تعلیم کی کمی، جہالت کی نشانی اور تربیت سے عاری قوم کی سوچ کی مظہر ہے۔ سوال یہ ہے کہ آخر ہم لوگ کسی سانحہ سے سبق کیوں نہیں سیکھتے؟ دوسرا واقعہ پارہ چنار کا ہے کہ معصوم لوگ عید کی خریداری کررہے تھے کہ اچانک بم بلاسٹ ہوئے اور کئی گھرانے اپنے پیاروں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ضیاء تسنیم بلگرامی کی ''دانشمندانہ دیوانہ'' زویا اعجاز کی ''عشق کامل'' وسیم بن اشرف کی ''ہوائے حجاز'' تنویر ریاض کی ''قوالی'' اور راشد لطیف کی ''شاعرِ خوش نوا'' پسندیدہ تحریریں تھیں۔ ہمارے فیورٹ اداکار محمد علی پر انور فرہاد کی تحریر ''شہنشاہ جذبات'' بے حد پسند آئی۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' اور ''ناسور'' بہت اچھی جارہی ہیں۔ سچ بیانیوں میں قیمت، مہربان اور غلط راستہ بالترتیب پہلے دوسرے اور تیسرے نمبر پر رہیں۔ ''شہرِ خیال'' میں رانا محمد شاہد، عبدالجبار رومی انصاری، اولیس شیخ، منشی محمد عزیز میئے، سید محمد رضی شاہ نقوی کے تبصرے پسند آئے۔''

☆ غضنفر عباس مرزا کا نامہ اسلام آباد سے۔ ''بحیثیت ایک سینئر سٹیزن کے (قیام پاکستان کے وقت میں ڈیڑھ سال کا تھا) آپ کے قیمتی وقت سے چند منٹ لے رہا ہوں۔ ویسے تو میں ڈائجسٹ کا بھی سینئر سٹیزن ہوں۔ ڈائجسٹ سے پہلا تعارف جب میں کالج کا اسٹوڈنٹ تھا تو ریڈر ڈائجسٹ سے ہوا۔ پھر الطاف حسن کا اردو ڈائجسٹ آیا۔ پھر عنایت اللہ صاحب کا سیارہ ڈائجسٹ شامل مطالعہ ہوا۔ سید محمد تقی صاحب اور رئیس امروہوی کا عالمی ڈائجسٹ کے نام سے وہ بھی لائبریری کا حصہ بنا۔ شکیل عادل زادہ کا سب رنگ جس میں واقعی سب رنگ تھے۔ جاسوسی ڈائجسٹ کا جب اجراء ہوا تو وہ ایک علیحدہ رنگ لیے ہوئے تھا۔ اس میں خوفناک کہانیاں اور ہندو متھالوجی جو کہ پاکستانیوں کے نوجوانوں کے لیے علیحدہ چیز تھی۔ پھر ایک رسالے کے اجراء کا جاسوسی ڈائجسٹ میں اعلان چھپا جس کے لیے قارئین سے نام تجویز کرنے کا کہا تھا۔ چند مہینے اسی سسپنس میں گزرے۔ میں نے زندگی میں پہلا خط ادارے کو لکھا کہ اب تو اتنا زیادہ سسپنس پیدا ہوگیا ہے کہ اس جریدے کا نام سسپنس ڈائجسٹ ہی رکھ دیں۔ میں اس وقت پاکستان آرڈیننس فیکٹریز میں انجینئر تھا میرے پاس جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ کے پہلے شمارے سے رسائل موجود تھے۔ افسوس جب میں واہ سے اسلام آباد شفٹ ہوا تھا تو میرے رسائل اور ادبی کتب سے لبریز تین کارٹن غائب ہوگئے۔ میرے لیے یہ بہت بڑا نقصان تھا۔ پھر میری زندگی میں سرگزشت ڈائجسٹ شامل ہوا۔ سرگزشت میں وہ سب کچھ ہے جو کہ مجھ جیسا قاری پڑھنا چاہتا ہے۔ سرگزشت میں شخصیت پوچھنے کے سلسلے میں ہمیشہ درست جواب لکھا۔ جگر مرادآبادی کی شخصیت کے لیے درست جواب بھی دیا تھا۔ جس وقت جناب جگر مرادآبادی کا انتقال ہوا تھا میں اس وقت میٹرک میں تھا۔''

☆ وحید ریاست بھٹی نے نکر سیداں سے لکھا ہے۔ ''سب سے پہلے میں اُن کرم فرماؤں سے اظہارِ تشکر کرنا چاہوں گا، جو گاہے بگاہے اس فقیر کو یاد کرتے رہے، ہاں اِن سطور میں یہ بیان کرتا چلوں کہ سال 2016ء کا تجزیہ بوجوہ والد صاحب کی علالت کے تحریر نہ ہوسکا، جس پر آپ تمام حضرات سے معذرت خواہ ہوں، زندگی رہی تو انشاء اللہ تعالیٰ سال 2017ء کا تجزیہ آپ کی خدمت میں ضرور پیش کروں گا۔ اب آتے ہیں ''شہرِ خیال'' کی جانب، کرسیٔ صدارت پر بے شک ''نزاہت افشاں'' براجمان تھے، اور انہوں نے اچھا تبصرہ تحریر کیا، باقی احباب نے بھی کھلے دل سے شمارے پر اِظہارِ خیال فرمایا۔ محترمی ''ندیم اقبال'' کو بھی ''شہرِ خیال'' کا باسی بنا دیکھا تو ایک خوش کُن منظر دل میں انگڑائی لیتا محسوس ہوا۔ عیدالفطر کی ڈھیر ساری چھٹیوں میں ''مطالعہ سرگزشت'' سے بڑھکر اور کیا سویٹ ڈش ہوسکتی تھی؟ سو ہم خُوب خُوب اِس ڈش سے محظوظ ہوئے۔ ''داستان گو'' میں حضرت شیخ مصلح الدین المعروف شیخ سعدیؒ کے متعلق بہت کچھ جاننے کا موقع ملا، اس کے بعد وسیم بن اشرف کی تحریر ''ہوائے حجاز'' پڑھی، مسلمانوں کے عہدِ رفتہ کو آواز دینے والے اور تاریخ جیسے خشک مضمون کو افسانوی اور تہذیبی رنگ میں پیش کرنے میں مہارت تامہ رکھنے والے عظیم لکھاری جناب ''نسیم حجازی'' کے حوالے سے پہلی بار پڑھا، یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ مرحوم ملک وقوم کے انتہائی خیر خواہ اور غمگسار تھے، ویلڈن وسیم بن اشرف، اس کے بعد ''قوالی'' پر تنویر ریاض کی تحریر پڑھی، اچھی تحریر تھی مگر کچھ کچھ تشنگی کا احساس ہوتا رہا، قوالی حضرت امیر خسرو سے پہلے بھی صوفیاء کے ہاں متداول ومقبول رہی ہے، گو اس کے قواعد وضوابط خاصے دقیق تھے، مزید تفصیل کے لیے ''کشف المحجوب، کتاب اللمع، عوارف المعارف اور دیگر سلاسل کی کتب اس بات پر شاہد ہیں، عزیز میاں قوال کی معروف قوالیوں کی فہرست میں ''آدمی ہے بے نظیر، آدمی ہے بے نظیر، یہ ہے میکدہ یہاں رند ہیں اور ہر گھڑی التجا نہیں ہوتی'' کو نہ پاکر، نیز راحت فتح علی خان کی وجہ شہرت بننے والی قوالیوں ''سیدی مُرشدی، یانبی یانبی اور جانے یاعلی'' کے متعلق محترم مصنف نے اشارہ تک کرنا گوارا نہ کیا، آگے بڑھے تو شاہد لطیف کی مختصر سی تحریر ''شاعر خوشنوا'' مسرور انور کا بڑا مقام طے کرتی نظر آئی، واقعی وہ ایک بڑے شاعر تو تھے ہی، مگر اُس سے بڑے وہ انسان تھے، اس کے بعد جناب انور فرہاد صاحب ''شہنشاہِ جذبات'' مرحوم محمد علی کو خراج تحسین پیش کررہے تھے۔ ''دُکھی عورت'' میں مُلک کی نامور مصنفہ سلمیٰ اعوان کے قلم کا جادو سر چڑھ کر بولا، دیارِ غیر میں مقیم ''ندیم اقبال'' اپنے دوسرے سفرنامہ کو تمام تر صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد بھی قارئین کی دلچسپی کا محور بنائے رکھنے میں کامیاب نظر آرہے ہیں۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

DOWNLOADED FROM
PAKSOCIETY.COM

نفسیات دان

ڈاکٹر ساجد امجد

اس نے عمر بھر جس کی آرزو کی ایسے ہی لمحے وبال گزرے لیکن وہ اپنی عزم صمیم کی بدولت شیشہ ہو کر بھی پتھر سے ٹکراتا رہا۔ دنیا نے اسے جھکانا چاہا لیکن وہ ثابت قدم رہا۔ اس کے نظریے دنیا بھر میں گونج رہے تھے اور لوگ اسے گالیاں دے رہے تھے۔ اس کے نظریے کو باطل قرار دے کر اسے شیطان کا گماشتہ کہہ رہے تھے۔

گزشتہ صدی کے ایک بہت بڑے نفسیات دان کا زندگی نامہ

میں اس وقت نوجوان بھی تھا۔ خوب صورت بھی اور خوش لباس بھی اور اس وقت تو ''فر'' کی شاندار ٹوپی بھی میرے سر پر تھی۔ فٹ پاتھ پر میں یوں چل رہا تھا جیسے چاند پر چہل قدمی کر رہا ہوں لیکن میری یہ خوش فہمی اس وقت دور ہوگئی جب سامنے سے آتے ہوئے ایک عیسائی نے میری قومیت کو للکارا۔ ''یہودی کتے! ذرا فٹ پاتھ چھوڑ کر چل۔''

اس نے صرف یہ کہنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ مجھے دھکا بھی دیا۔ اس کے دھکے سے میں تو نہیں گرا البتہ میری قیمتی ٹوپی کیچڑ میں گر گئی۔

بچہ بڑے غور سے یہ داستان سن رہا تھا۔ اس نے پہلی مرتبہ دخل اندازی کی۔ ''پھر آپ نے کیا کیا؟''

''میں کیا کر سکتا تھا۔ میں نے ٹوپی اٹھائی اور جھاڑ کر دوبارہ سر پر رکھ لی۔''

بچے نے غصے کے عالم میں اپنی دونوں مٹھیاں بھینچ لیں۔ ''مجھے آپ کا یہ بزدلانہ رویہ ہرگز پسند نہیں آیا۔ آپ کو اس عیسائی کو اس کی اس بدتمیزی کا مزہ چکھانا چاہیے تھا۔''

''اگر تم نے اس وقت کا قصبہ ''فرائی برگ'' دیکھا ہوتا تو تم مجھ سے یہ فضول سوال نہیں کرتے۔ دیکھتے بھی کیسے۔ تم تو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے اور میں تمہارا باپ نہیں بنا تھا۔ میں یہودی تھا اور وہ شخص عیسائی۔ ہم یہودی تعداد میں اتنے کم تھے کہ عیسائیوں سے دبنا پڑتا تھا۔''

''آخر اس عیسائی کو آپ کے ساتھ دشمنی کیا تھی۔''

''پہلی دشمنی تو یہی تھی کہ میں یہودی تھا اور دوسری دشمنی یہ کہ میں اسے خوش حال دکھائی دے رہا تھا۔ عیسائی تو یہ چاہتے تھے کہ تمام یہودی مفلوک الحال رہیں۔''

اس کا باپ اپنی صفائی میں بہت کچھ کہہ رہا تھا لیکن بچے کا ذہن کہیں اور تھا۔ اسے اپنے باپ کی بزدلی اور بے بسی پر شدید غصہ آ رہا تھا۔ اسے یہ بھی یاد آ رہا تھا کہ اس کا باپ جو اسے عیسائیوں کے خلاف شدید نفرت کا سبق دیتا رہتا ہے اس نے خود ایسی بزدلی کا مظاہرہ کیا تھا۔

وہ پہلے ہی باپ سے ناخوش تھا، یہ قصہ سننے کے بعد رہی سہی عزت بھی جاتی رہی۔ وہ اپنے باپ سے خوش کیوں

DOWNLOADED FROM
PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

Downloaded from Paksociety.com

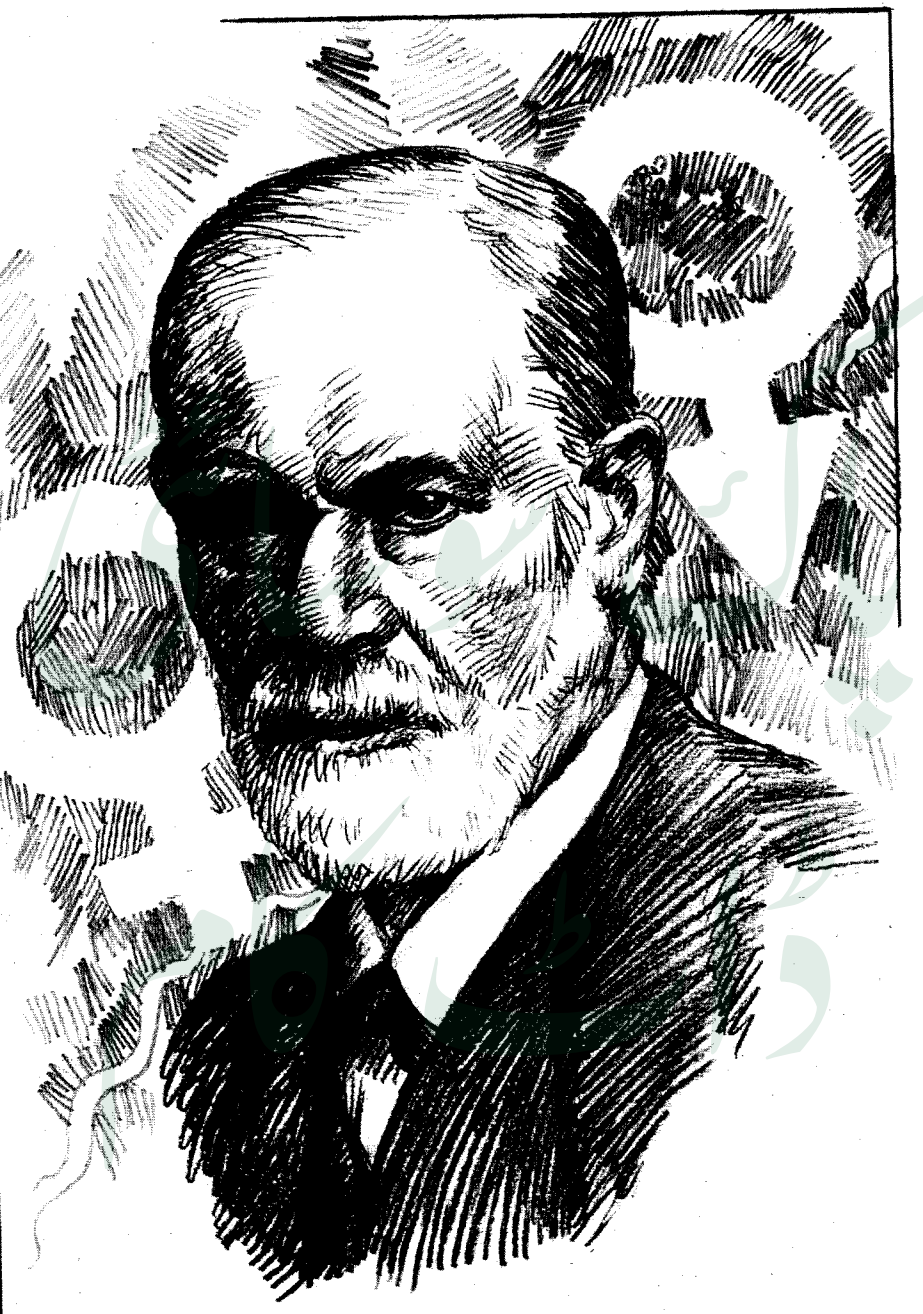

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

نہیں تھا؟ اس کی ایک وجہ باپ کی بے جا ڈانٹ ڈپٹ تھی۔ وہ جب سات سال کا تھا اسے کسی کام سے والدین کے کمرے میں جانا پڑا۔ وہ اجازت لیے بغیر بیڈ روم میں گھستا چلا گیا۔ اس کا باپ اس کی اس حرکت پر شدید غصے میں آ گیا۔

''بے ہودہ بچے نکل جا میرے کمرے سے۔ جانور ہو تم پورے جانور۔'' پھر انہوں نے اس کی والدہ کو مخاطب کیا۔ ''یہ لڑکا کبھی کسی قابل نہ ہو سکے گا۔ زندگی بھر کچھ نہیں سیکھ سکتا۔ اسے کمرے ہی سے نہیں گھر سے بھی نکال دو۔''

اس کی ماں خاموشی سے اپنے بستر سے اتری اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اسے باہر نکل جانے کی تلقین کرنے لگیں۔ ''جاؤ اپنے کمرے میں چلے جاؤ۔ اس وقت تمہارا باپ غصے میں ہے۔''

وہ کمرے سے نکل آیا۔ اس کے باپ کی گرج دار آواز اب بھی اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ اس کے باپ کا طعنہ کہ وہ کسی قابل نہیں بن سکتا اور نہ کچھ سیکھ سکتا ہے۔ اس کے لیے چیلنج بن گیا۔ اس نے عزم کیا کہ ایک نہ ایک دن وہ اپنے باپ کو دکھا دے گا کہ وہ قابل ہو سکتا ہے۔ وہ اپنے باپ کو بڑا آدمی بن کر دکھائے گا۔ آگے چل کر واقعی وہ ایک بڑا آدمی بن گیا۔

یہ ''بڑا آدمی'' ماہر نفسیات سگمنڈ فرائیڈ تھا جس کی نفسیاتی دریافتوں نے یورپ کے اخلاقی و علمی نظریات میں انقلاب عظیم برپا کر دیا۔ اس سے پہلے علم نفسیات چند دائروں تک محدود اور الجھا ہوا تھا۔ ذہنی عوامل پر نظری، بحثیں ہوتی تھیں۔ ہپناٹزم اور تنویم شدہ بازی اور سحر کاری کے کارنامے سمجھے جاتے تھے۔ ان کی بنیادیں ایک حد تک علمی حقائق پر استوار ضرور تھیں اور ان کو بعض بیماریوں میں کام بھی لایا جاتا تھا مگر ان کے ماہرین خود ان کے بارے میں گہرا علم نہ رکھتے تھے۔ فرائیڈ نے سب سے پہلے لاشعور کو دریافت کر کے انسانی افعال و کردار کی نئے انداز سے تعبیر کرتے ہوئے انسانی شخصیت کی بنیاد جنس کو قرار دیا اور یوں اس نے تحلیل نفسی کے ذریعے ذہنی بیماریوں کے علاج میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔

☆.....☆

وہ 6 مئی 1856ء کو فرائی برگ موراویا (چیکوسلوواکیہ) کے ایک ادنیٰ متوسط درجے کے یہودی گھرانے میں پیدا ہوا۔ اس کا نام سگمنڈ فرائیڈ رکھا گیا۔

فرائی برگ موراویا ایک مختصر سا قصبہ تھا جہاں پانچ ہزار جرمن اور چیک باشندے آباد تھے۔ اس وقت یہ آسٹرو ہنگرین شہنشاہیت کا ایک حصہ تھا۔

جس گھر میں فرائیڈ پیدا ہوا تھا وہ پکی اینٹوں سے تعمیر کردہ دو منزلہ مکان تھا۔ اس کی چھت سلیٹ کی تھی اور آرائش سے عاری بالکل سادہ سا گھر تھا۔ دو عورتیں اس کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔ ایک ملازمہ ''نینی'' تھی۔ دوسری اس کی ماں امیلیا تھی جس کی شفقت نے فرائیڈ کے بچپن کو چمکا دیا تھا۔

سگمنڈ جب پیدا ہوا تو اس کے سر پر بالوں کا ایک گھونسلا سا تھا۔

وہ بوڑھی کسان عورت جس کے ہاتھوں سگمنڈ کی پیدائش کا مرحلہ ہوا تھا۔ ان بالوں کو دیکھ کر ہنس پڑی تھی۔ امیلیا نے بستر پر لیٹے لیٹے پوچھا تھا۔ ''تم ہنس کیوں رہی ہو۔''

''میں ہنس نہیں رہی ہوں۔ اس بچے کے عظیم مستقبل پر خوش ہو رہی ہوں۔''

''تم نے اس بچے میں ایسی کیا بات دیکھ لی؟''

''یہ دیکھو اس کے سر پر بالوں کا گھونسلا بنا ہوا ہے۔ یہ خوش بختی کی علامت ہے۔ تمہارا بیٹا مستقبل میں بہت بڑا آدمی بنے گا اور دنیا میں نام پیدا کرے گا۔''

اس کے باپ جیکب فرائیڈ نے اس بچے کو دیکھ کر برا سا منہ بنایا تھا۔ ''اس کے سر پر سیاہ بالوں کا گھونسلا دیکھ رہی ہو۔ یہ تو ہم میں سے معلوم ہی نہیں ہوتا۔ یہ تو عرب دکھائی دیتا ہے عرب۔''

''ہاں یہ میرا ننھا عرب ہی تو ہے۔'' اس کی ماں نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

☆.....☆

جیکب فرائیڈ کپڑا تیار کرنے والی ایک مل کا مالک تھا۔ سگمنڈ کی ماں سے اس نے دوسری شادی کی تھی جو اس سے آدھی عمر کی تھی۔ اس کے گھر کے قریب ہی اس کے بڑے بیٹے عمانویل کا گھر بھی تھا جو اس کی پہلی بیوی سے تھا۔ عمانویل شادی شدہ تھا۔ اس کے دو بچے بھی تھے۔ گویا سگمنڈ کی پیدائش سے قبل ہی جیکب دادا بن چکا تھا۔

جیکب کی عمر ایسی نہیں تھی کہ وہ سگمنڈ کی پیدائش کی خبر سن کر بہت زیادہ خوشی کا اظہار کرتا جب کہ امیلیا کا یہ پہلا بچہ تھا اس لیے وہ خوشی سے بے قابو ہو گئی اور نہایت توجہ اور

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

پیار... سے اس کی پرورش کرنے لگی۔

سگمنڈ کو اپنی ماں کی بھرپور توجہ حاصل تھی لیکن باپ کا تحکمانہ رویہ اس کے لیے ناقابل فہم تھا۔ کوئی اور بچہ ہوتا تو ممکن ہے اس کی پروا بھی نہ کرتا لیکن وہ بے حد حساس تھا۔ باپ کی سرد مزاجی دیکھ کر کڑھتا رہتا تھا۔ ماں اور باپ دونوں کے متضاد رویوں نے اس کے ذہن کو الجھا دیا تھا۔ اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا کہ اس کی ماں اس سے اتنی محبت کیوں کرتی ہے اور باپ اتنی سختی سے کیوں پیش آتا ہے۔

تضادات کے اس اندھیرے میں اس کے سوتیلے بھائی عمانویل کا بیٹا جان اس کے لیے روشنی کی لکیر تھا۔ وہ ایک سال اس سے بڑا تھا لیکن یہ کوئی ایسا فرق نہیں تھا۔ دونوں دوست بن گئے تھے۔ دونوں آپس میں کھیلتے کودتے تھے۔ اسی کھیل کود میں اکثر لڑائی بھی ہو جاتی تھی۔ یہ جھگڑے جب جیکب کے سامنے پہنچتے تو جیکب ہمیشہ جان کی طرفداری کرتا اور سگمنڈ سے بری طرح پیش آتا۔

باپ کے اس رویے نے اس کے ذہن کو الجھا دیا تھا۔ وہ سوچا کرتا کہ جب جیکب میرا باپ ہے تو میری طرف داری کیوں نہیں کرتا۔ عمانویل تو کبھی اپنے بیٹے جان سے اس طرح پیش نہیں آتا۔ یہ سوچتے سوچتے باپ کی طرف سے اس کے دل میں نفرت پیدا ہونے لگتی تھی۔

ایک دن ایسا ہی ایک واقعہ پیش آیا اور وہ بھاگ کر ماں کی گود میں چڑھ گیا۔

''آپ کے جوشوہر ہیں وہ میرے باپ ہی ہیں نا۔''

''تم کیسے بچے ہو۔ یہ کیا سوال کر رہے ہو۔''

''وہ ہر وقت مجھے ڈانٹتے رہتے ہیں۔''

''تمہاری بھلائی کے لیے ڈانٹتے ہیں۔''

''کیا عمانویل کو اپنے بیٹے کی بھلائی عزیز نہیں۔ وہ تو جان کو نہیں ڈانٹتے۔''

''بس بچے ایسی باتیں نہیں کرتے۔''

وہ ماں کے کہنے سے چپ تو ہو گیا لیکن اس کے دل میں باپ کی طرف سے جو نفرت پیدا ہو گئی تھی اس میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ اس کی عمر دو سال سے کچھ ہی زیادہ ہوئی ہو گی۔ عام بچہ ان باتوں پر غور بھی نہیں کرتا لیکن وہ غیر معمولی بچہ تھا۔ ایسی باتیں سن کر اس کی ماں کو یقین ہونے لگا تھا کہ وہ بڑا آدمی ضرور بنے گا۔

فرائیڈ کی طرح اس کی جائے پیدائش بھی پُراسرار تھی۔ فرائی برگ کا مطلب آزاد پہاڑ ہے۔ یہ بستی دریا کے کنارے آباد تھی۔ یہ دریا گرمیوں میں سوکھ جاتا تھا لیکن برسات میں کناروں سے باہر ہو جاتا تھا۔ شہر کے وسط میں گرجا گھر تھا جس کی گھنٹیوں کی آواز کانوں میں رس گھولا کرتی تھی۔

اس بستی کی پچانوے فیصد آبادی رومن کیتھولک تھی وہاں مشکل سے دو فیصد یہودی تھے۔ فرائیڈ کا خاندان بھی یہودی تھا۔ یہودی لوگ چونکہ اقلیت میں تھے اس لیے سیاست سے دور ہی رہتے تھے لیکن ملکی حالات نے یہودیوں کو بھی سیاست کی لپیٹ میں لے لیا۔ جب ملک میں آزادی کی تحریک چلی تو جرمنوں نے جو حکومت کر رہے تھے یہودیوں کو مورد الزام ٹھہرایا اور ان پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جانے لگے۔

فرائیڈ خاندان بھی سیاست سے الگ تھلگ رہا تھا لیکن لبرل انقلاب جو بحالی کے ردِعمل کے طور پر وجود میں آیا تھا، نے جو سیاسی صورتِ حال پیدا کر دی تھی، اس نے چیک قومیت کو آسٹروی سیاست کی سب سے زیادہ فعال قوت بنا دیا تھا اور چیک قومیت رکھنے والوں کے دلوں میں جرمنوں کے خلاف شدید نفرت پیدا کر دی تھی۔ یہودی جو زبان اور قومیت کے اعتبار سے جرمن تھے چیک قومیت رکھنے والوں کے نزدیک سخت قابلِ نفرت اور واجب القتل گردانے گئے۔

یہ سب فرائیڈ کی پیدائش سے پہلے کی باتیں تھیں۔ فرائیڈ کی پیدائش کے وقت اس کا خاندان معاشی بدحالی کا شکار ہو گیا۔

صنعتی انقلاب نے اس خاندان کو معاشی طور پر کمزور کر دیا۔ یورپ میں ہر جگہ ہاتھ کے کام کی جگہ مشینیں لینے لگیں۔ جیکب فرائیڈ کی مل مسلسل خسارے سے دوچار رہنے لگی۔ جب سگمنڈ فرائیڈ تین سال کی عمر کو پہنچا تو آسٹرو اٹالین جنگ چھڑ گئی۔ اب فرائی برگ میں فرائیڈ خاندان کے لیے اپنی گرتی ہوئی معاشی حالت کی بحالی کا کوئی سامان باقی نہیں رہا۔

اسی سال فرائیڈ خاندان نے ہجرت کی۔ عمانویل اور اس کے بیوی بچے برطانیہ چلے گئے۔ جیکب نے بیوی اور دو بچوں (فرائیڈ اور بیٹی اینا) کو ساتھ لیا۔ پہلے ان لوگوں نے گھوڑا گاڑی میں طویل سفر کیا۔ اس کے بعد ریل گاڑی میں سوار ہو گئے۔ یہ ٹرین انہیں فرائی برگ سے ہمیشہ کے لیے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

جدا کر کے وی آنا لے آئی۔

وی آنا کو جرمن شہروں کی ملکہ کہا جاتا تھا۔ اس میں بہ یک وقت کئی قومیں رہتی تھیں۔ بڑے اخباروں کے دفاتر تھے۔ یہی وہ شہر تھا جہاں موزاری جیسا عظیم موسیقار رہا کرتا تھا۔ ہیڈن نے بھی اسی جگہ مذہبی گیت بنائے۔ مختصر یہ کہ وی آنا موسیقی کا گھر تھا۔ عیش ونشاط کا گڑھ تھا۔ یہاں کے لوگ زندگی کو بھرپور طریقے سے گزارنے کو اپنا مقصد سمجھتے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہنگامہ آرائیوں کے سوا اس شہر میں کچھ ہے ہی نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سب جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری تھی، سب اوپری رونق تھی۔ یہ معاشرہ اندر سے کھوکھلا ہو چکا تھا۔ اخلاقیات کا دیوالیہ نکل چکا تھا۔ یہاں کے لوگ فضول خرچ اور ریاکار تھے۔ منافقت ان کے مزاج کا حصہ بن چکی تھی۔ قانونی عدالتیں موجود تھیں۔ حکومت تھی لیکن حکومت کی باگ ڈوران لوگوں کے ہاتھ میں تھی جو طبقہ امراء سے تعلق رکھتے تھے۔

جس وقت سگمنڈ وی آنا پہنچا تو اس وقت فرانزز جوزف کی حکومت تھی۔ یہ بادشاہ بے حد خودسر تھا اور رعایا سے الگ تھلگ رہنے کا عادی تھا۔ طبقہ امراء کے ہاتھ میں حکومت تھی۔ بادشاہ برائے نام تھا۔ یہ طبقہ نہایت طاقت ور تھا۔ یہ طبقہ ہر اس تحریک کو دبا دیتا تھا جو عوام کی بھلائی کے لیے اٹھتی تھی۔ یہ طبقہ قدیم جاگیرداری نظام کی مثال تھا۔

طبقہ امراء سے تعلق رکھنے والے زیادہ تر یہودی تھے اور ان کی بالادستی اور امیری عام لوگوں بلکہ خود بادشاہ کو ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ وی آنا والے اسٹیج اور تھیٹر کے دلدادہ تھے۔ محافل موسیقی پر جان دیتے تھے مگر موسیقاروں کو معاشرے میں کوئی معزز حیثیت حاصل نہیں تھی۔

1867ء میں جب فرائیڈ خاندان کو وی آنا میں رہتے ہوئے سات سال گزر گئے تو آئین کی رو سے یہودیوں کو آسٹروی شہریوں کے مساوی حقوق عطا کر دیے گئے پھر بھی وی آنا میں یہودیوں سے شدید نفرت قائم رہی۔ یہودیوں نے تجارت و معیشت پر اپنی گرفت قائم کر لی تھی۔ اسی امر نے عوام کو ان کے خلاف کر رکھا تھا۔ ان کے ساتھ اجنبیوں کی طرح برتاؤ کیا جاتا تھا۔

یہودی اپنے لیے ہمیشہ معاشرے میں بلند مقام حاصل کرنے کے تمنائی رہا کرتے تھے۔ اس لیے وہ ان علوم پر زور دیا کرتے تھے جن کی بدولت وہ بلند عہدوں تک پہنچ سکیں۔ ان کے ہاں سائنسی علوم پر زور دیا جاتا تھا۔ وہ اس پھل کے ذائقے کا مزہ بھی چکھ رہے تھے۔ ڈاکٹر، وکلاء، جج، اداکار، اخبار نویس سب کے سب یہودی تھے۔ اس کے باوجود وی آنا کی نوّے فیصد آبادی کے سامنے ان کی سماجی حیثیت صفر تھی۔

سگمنڈ فرائیڈ جیسا ذہین اور حساس لڑکا گرد و پیش کے حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ خاموشی سے ان تبدیلیوں پر غور کر رہا تھا جو صنعتی انقلاب کی بدولت برپا ہو رہی تھیں۔ اس کے سامنے کی بات تھی کہ پرانے صنعتی نظام نے آخری ہچکی لی اور نئے صنعتی نظام نے اس کی جگہ لے لی۔ نئے اور پرانے نظاموں کی کشاکش نے اس کے کردار پر نہایت گہرا اثر مرتب کیا۔

انہی دنوں وہ وی آنا کے یہودیوں کی سماجی حیثیت سے بھی بخوبی آگاہ ہو گیا۔ بعد میں اس نے جو نظریات پیش کیے ان میں سے بہت سے وہ تھے جو اس نے وی آنا کے اس وقت کے معاشرے میں رہتے ہوئے اخذ کیے تھے۔

وہ جس معاشرے میں پلا بڑھا تھا اس میں یہودیوں کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ اسی امر نے سگمنڈ میں اپنی آزادی، وقار اور اپنی انا کے تحفظ کا احساس پیدا کر دیا اور پھر یہ احساس شدت اختیار کرتا چلا گیا۔

☆.....☆

اس کی عمر اب گیارہ سال کی ہو گئی تھی۔ اب وہ اپنی ماں کے ساتھ سیر کے لیے باہر جانے لگا تھا۔ ایک روز اس کی ماں اسے ایک شاندار ریستوران میں لے گئی۔ ابھی انہیں وہاں بیٹھے ہوئے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ایک مفلوک الحال بوڑھا شخص ریستوران میں داخل ہوا۔ سگمنڈ کی ماں کو وہ بوڑھا خاصا دلچسپ دکھائی دیا۔ یہ بوڑھا مختلف میزوں پر جاتا تھا اور تھوڑے سے پیسے لے کر لوگوں کو ان کی قسمت کا حال بتا رہا تھا۔ دلچسپ بات یہ بھی تھی کہ وہ قسمت کا حال اشعار کے ذریعے بتا رہا تھا۔ کھڑے کھڑے کچھ اشعار موزوں کرتا تھا۔ ان اشعار میں قسمت کا حال چھپا ہوا تھا۔ سگمنڈ کی ماں نے تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد اس بوڑھے کو اپنی میز پر بلایا۔

''کیا تم میرے بیٹے سگمنڈ کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہو؟''

''کیوں نہیں۔'' اس بوڑھے نے سگمنڈ کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

سگمنڈ کی ماں نے چند سکے اس بوڑھے کے ہاتھ پر

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

رکھ دیے۔ اس بوڑھے نے چند شعر پڑھے جس میں سگمنڈ کے بڑا آدمی بننے کی پیش گوئی کی گئی تھی۔

''تیرا بیٹا دنیا میں نام کرے گا۔''

چیزیں ایجاد کرے گا۔

ایسی جیسا کوئی دوسرا ہو

یہ تو مشکل ہوگا

مشکل ہوگا

نوعمر سگمنڈ پر تو اس پیش گوئی کا کوئی اثر نہ ہوا لیکن اس کی ماں بہت خوش ہوئی۔ اس دن کے بعد سے وہ اس کا لاڈلا بچہ بن گیا۔ اب اس کی شفقت میں فخر و غرور بھی شامل ہوگیا جو اسے سگمنڈ پر ہونے لگا تھا۔

سگمنڈ کی پیدائش کے وقت بوڑھی کسان عورت نے بھی یہی پیش گوئی کی تھی اور اب یہ بوڑھا فقیر بھی یہی نوید سنا رہا تھا۔ اس کی ماں نے اسی وقت سوچ لیا تھا کہ وہ سگمنڈ کے بڑا آدمی بننے میں بھرپور مدد کرے گی اور اسے بھرپور آسائش فراہم کرے گی۔

وی آنا پہنچ کر فرائیڈ کا خاندان شہر کے جس حصے میں جا کر رہائش پذیر ہوا تھا وہ گلوکن گاسے کہلاتا تھا۔ علاقہ بھی ایسا تھا جہاں نچلا طبقہ رہتا تھا۔ سگمنڈ یہاں کبھی خوش نہ رہ سکا۔ اسے فرائی برگ کے حسین مناظر یاد آتے تھے۔ اگر اس کی ماں یہاں نہ ہوتی تو شاید وہ اس گھر سے ہی بھاگ جاتا۔ اس کی ماں اسے برابر احساس دلاتی رہتی تھی کہ اسے ایک دن بڑا آدمی بننا ہے۔ اس لیے اسے پڑھائی میں دل لگانا چاہیے۔

اس کا باپ سخت گیر تھا لیکن اس کی تعلیم کی طرف سے وہ بھی غافل نہیں تھا۔ وہ اسے روز شام کے وقت لے کر بیٹھتا اور پڑھاتا۔ اس نے اپنے باپ ہی سے انجیل کے اسباق پڑھے۔ انجیل میں جب اس نے سرجری کے بارے میں پڑھا تو اسے ڈاکٹر بننے کا شوق ہوا۔

''کیا میں ڈاکٹر بن سکتا ہوں۔'' اس نے ایک روز اپنے باپ سے کہا۔

''ابھی تو نہیں لیکن جب کچھ اور تعلیم حاصل کرلو گے تو یقیناً ڈاکٹر بن جاؤ گے۔''

''کتنی تعلیم حاصل کرنی ہوگی۔''

''یہ میں تمہیں ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد بتاؤں گا۔''

''پھر آپ مجھے جمنازیم میں کیوں داخل نہیں کرا دیتے۔''

''تمہاری ماں تمہیں خود سے جدا کرنا ہی نہیں چاہتی۔''

''میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ ہر وقت ان کے پاس بیٹھا رہوں لیکن پڑھنا بھی تو ضروری ہے۔'' اس کے بے حد اصرار پر اسے جمنازیم میں داخل کرا دیا گیا۔

جمنازیم میں جن لڑکوں کو اس نے اپنا دوست بنایا وہ کھیل کود کے شوقین ہونے کی بجائے پڑھائی اور علمی و نظریاتی بحثوں کے شوقین لڑکے تھے۔ وہ اپنی ٹولی کو ننھے مفکرین کا نام دیا کرتا تھا۔ اس کے ان ساتھیوں کو کھیل کود سے غرض نہیں تھی۔ یہ سب جب مل کر بیٹھتے تو آسٹریا اور فرانس کے درمیان چھڑنے والی جنگ پر باتیں کرتے۔ انہوں نے یورپ کا ایک بڑا سا نقشہ کہیں سے حاصل کرلیا تھا جس میں جنگ زدہ علاقے نمایاں تھے۔ انہی دنوں اسے یورپ اور امریکا میں آزادی کی تحریکوں سے دلچسپی پیدا ہونے لگی تھی۔ اسے امریکا کے بارے میں شدید تجسس پیدا ہوا۔ اس نے امریکا سے متعلق کتابیں پڑھنا شروع کردیں۔

اسی عرصے میں اس کا ایک بھائی پیدا ہوا۔ اس بچے کا نام رکھنے کے لیے اس کے باپ نے سب سے مشورہ کیا۔ سگمنڈ فرائیڈ نے اپنے بھائی کا نام مشہور یونانی فاتح الیگزینڈر سکندر اعظم کے نام پر الیگزینڈر تجویز کیا۔ اس نے الیگزینڈر کے بارے میں تمام کتابیں پڑھ رکھی تھیں۔ وہ اس کا بڑا مداح تھا۔ اس نام کو سب نے پسند کیا اور اس کے بھائی کا نام الیگزینڈر ہوگیا۔

اسی طرح وہ ہنی بال اور نپولین کو بے حد پسند کرتا تھا۔ ان ناموں کی پسندیدگی اس کی ذہنی کیفیت کا پتا دیتی تھی۔ یہ ایک یہودی لڑکے کے ان لوگوں کے بارے میں تاثرات تھے جو غیر یہودیوں کے ظلم و ستم کے خلاف اپنی نسل کے تحفظ کے لیے مصروف کار رہے تھے۔ یہ عیسائیوں کے خلاف اس کا غصہ تھا جو ان فاتحین کو پسند کرا رہا تھا۔ وہ ظلم کا مقابلہ طاقت سے کرنا چاہتا تھا گو بعد میں یہ رویہ اسے ترک کرنا پڑا۔

وہ ''ایڈی پس'' الجھن میں مبتلا ہوگیا تھا۔ یہ وہ مسئلہ ہے جس میں کسی بچے کو اپنے ماں باپ میں سے کسی ایک کے ساتھ شدید نفرت اور دوسرے کے ساتھ شدید محبت ہو جایا کرتی ہے۔ وہ اپنی ماں سے شدید محبت کرتا تھا اسی لیے اپنے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

باپ کو اپنا رقیب سمجھنے لگا تھا اور پھر یہ نفرت بڑھتی ہی چلی گئی تھی۔

نفسیاتی تکتے سے فرائیڈ اور اس کے باپ کے درمیان حریفانہ چپقلش جو خفیہ اور دبی دبی تھی، کا سبب آسانی سے سمجھ آجانے والا ہے مگر اس کی تمام الجھنوں کو ایک الجھن ''ایڈی پس'' الجھن میں سمیٹ دینا بے انصافی ہوگی۔ انسانی نفسیات الجھنوں اور پے چیدگیوں سے بھرپور ہوا کرتی ہے۔ فرائیڈ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھا۔

☆.....☆

وقت کے ساتھ ساتھ اس کا خاندان بڑھتا گیا۔ اس کے اور بہن بھائی اس دنیا میں آگئے تو ''گلوگن گاسے'' کا چھوٹا سا اپارٹمنٹ تنگ دکھائی دینے لگا۔ اس میں تمام افراد کا آرام سے رہنا مشکل ہوگیا۔ اب یہ خاندان ایک چھ کمروں کے اپارٹمنٹ میں منتقل ہوگیا۔ تین بیڈروم چھ بچوں نے آپس میں بانٹ لیا۔ ایک چھوٹا سا کمرا اکیلے سگمنڈ کے حصے میں آیا۔ خاندان کے پاس تیل کا ایک لیمپ تھا وہ بھی اسے دے دیا گیا اور یہ سب سہولتیں اسے اس کی ماں کی بدولت مل رہی تھیں۔ اس لیے بھی کہ وہ بڑا بیٹا تھا اور اس لیے بھی کہ وہ ذہین اور ہوشیار طالب علم ثابت ہو رہا تھا۔ اسے پڑھائی پر مکمل توجہ دینے کے لیے خاموشی اور تنہائی کی ضرورت تھی۔

اس کی ماں اس کی ضرورت کو اپنے باقی بچوں کی ضروریات پر مقدم سمجھتی تھی اور انہیں ہر طرح سے پورا کیا کرتی تھی۔

اس کا کمرا نہایت تنگ تھا اور اس میں ہوا کا گزر بھی مشکل سے ہوتا تھا لیکن وہ خوش تھا کہ اسے پڑھنے کے لیے تنہائی میسر آگئی ہے۔ وہ نہایت سادہ زندگی گزار رہا تھا۔ کم عمری کے باوجود وہ یانا کی پُرتعیش زندگی میں شریک نہیں تھا۔ گھر میں بھی سب سے الگ تھلگ ہی رہتا تھا۔ شاذ ہی کھانے کی میز پر سب کے ساتھ شریک طعام ہوا کرتا تھا۔ زیادہ تر کھانا اپنے کمرے ہی میں منگوا لیتا تھا جہاں وہ کتابی کیڑے کی مانند رات گئے تک اپنی کتابوں میں مگن رہتا تھا۔

اس کی ماں اکثر کہا کرتی تھی کہ بڑا آدمی بننے کی یہی نشانیاں ہیں۔ وہ اپنے پڑھا کو دوستوں کو بھی اسی کمرے میں بلا لیتا تھا اور پھر وہ علمی و نظریاتی بحثوں میں مشغول رہا کرتے۔

کچھ دنوں سے اس کی بہن اینا کو موسیقی کا شوق چرایا تھا۔ اپنے اس شوق کو پورا کرنے کے لیے وہ پیانو خرید لائی تھی۔ نیا نیا شوق تھا۔ ہر وقت پیانو کی آواز گونجتی رہتی تھی۔ سگمنڈ فرائیڈ نے کچھ دن تو اس شور کو برداشت کیا اور پھر وہ ماں کے سامنے جا کر کھڑا ہوگیا۔

''میں اینا کے پیانو سے تنگ آگیا ہوں۔ بس اب بہت ہوگیا۔ یا تو پیانو اس گھر میں رہے گا یا میں یہ گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔''

اس کی شفیق ماں اس کی کوئی بات نہیں ٹالتی تھی۔ اس نے پیانو کہیں بھجوا دیا۔ اب اینا کی باری تھی۔ وہ منہ بسورتی ہوئی ماں کے پاس پہنچ گئی۔

''کیا میں آپ کی بیٹی نہیں ہوں۔ آپ نے ایک شکایت پر مجھے میرے شوق سے محروم کر دیا۔''

''تمہارا شوق فضول ہے۔ پیشگوئیوں کے مطابق سگمنڈ کو بڑا آدمی بننا ہے۔ اسے پڑھنے کے لیے تنہائی چاہیے۔ اس لیے پیانو بھجوا دیا۔''

اینا کو اپنی ماں کی اس حرکت پر ہمیشہ دکھ ہوتا رہا۔ اس کے کہنے کے مطابق وہ ایک بہترین پیانو نسٹ بنتے بنتے رہ گئی۔

☆.....☆

جمنازیم میں سگمنڈ نے آٹھ سال گزارے۔ اسے ہم ہائی اسکول بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کا حافظہ زبردست تھا۔ جس کتاب کو وہ ایک بار پڑھ لیتا تھا اسے حرف بہ حرف دہرا سکتا تھا اور جس لیکچر کو سن لیتا اسے لفظ بہ لفظ لکھ لیتا تھا۔

کتابیں پڑھنے اور جمع کرنے کا اسے جنون تھا۔ ہمیشہ کتب فروشوں کا مقروض رہتا تھا۔ اس کا گھرانا نہایت تنگدستی سے دن گزار رہا تھا لیکن وہ کتابوں میں ایسا مگن تھا کہ اسے یہ خیال بھی نہ آتا تھا کہ اس کا باپ کن مشکلوں سے دن گزار رہا ہے۔ وہ تو بس نئی سے نئی کتاب کی تلاش میں رہتا تھا۔ کوئی موضوع بھی سامنے نہیں تھا۔ فلسفہ، مذاہب، تاریخ، سائنس جو کتاب ہاتھ لگتی اسے پڑھنا اس پر فرض ہو جاتا تھا۔

بے تحاشا مطالعے کے باوجود وہ یہ طے نہ کر سکا کہ اسے کیا بننا ہے۔ اس کے پیچھے اس کا یہ جذبہ پوشیدہ تھا کہ وہ ہر علم کی گہرائی تک پہنچے لیکن ظاہر ہے یہ ناممکن تھا۔

جب اس نے ہائی اسکول پاس کرلیا تو اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ ڈاکٹر بن جائے۔ اس لیے نہیں کہ علم طب سے اسے کوئی خاص دلچسپی تھی بلکہ اس لیے کہ یہ بہترین ذریعہ آمدن تھا اور اس لیے بھی کہ اس طرح وہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

نیچرل سائنس کا مطالعہ بھی کرسکتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ نیچرل سائنس ہی انسانی زندگی کی گتھیاں سلجھا سکتی ہے۔

وہ ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا کہ ڈارون کے نظریہ ارتقاء نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی۔ یہی کوئی سترہ سال کہ ڈارون کا نظریہ معرض وجود میں آیا۔ یہ ایسا زبردست تحقیقی انکشاف تھا جس نے پورے یورپ میں تہلکہ مچادیا۔ اس نے محسوس کیا کہ دنیا میں اب بھی بے شمار تحقیقات اور دریافتیں ہونا باقی ہیں۔ یہ ایسا سلسلہ ہے جو کبھی ختم نہ ہوگا۔

انہی دنوں اس نے گوئٹے کا ایک مضمون پڑھا۔ اس مضمون میں نیچر کے گن گائے گئے تھے۔ نیچر کی فیاضیوں کا ذکر تھا اور نیچر سے انسان کے رابطے پر زور دیا گیا تھا۔

یہ مضمون پڑھنے کے بعد جب اس نے گوئٹے کے بارے میں مزید معلومات جمع کیں تو وہ یہ جان کر حیران رہ گیا کہ گوئٹے اور اس کے درمیان حیرت انگیز مماثلت ہے۔ گوئٹے بھی اس کی طرح جرمن تھا۔ گوئٹے کے بال بھی سیاہ تھے۔ سگمنڈ کی طرح گوئٹے کی پیشانی پر بھی بالوں کا گھونسلا تھا جو عظمت کی نشانی خیال کیا جاتا تھا۔

گوئٹے بھی اس کی مانند بیس اکیس سالہ ماں کا بیٹا تھا۔ اس کا باپ بھی اس کے باپ کے مانند چڑچڑا ادھیڑ عمر اور سخت گیر شخص تھا۔ فرائیڈ کی طرح گوئٹے کے دل میں بھی ایک کشمکش موجود تھی۔ ایک طرف ادب سے لگاؤ تھا تو دوسری طرف سائنسی علوم سے۔

گوئٹے کے نظریات نے اس پر اتنا اثر کیا کہ اس نے نیچر کے معمے سلجھانے کی کوشش سائنس کے ذریعے سے کی۔ یہ نیچر طبعی نہیں بلکہ انسانی تھی۔ اس لیے جب فرائیڈ نے فیصلہ کرلیا کہ وہ آگے پڑھے گا تو اس کے باپ نے باوجود تنگدستی اور مفلوک الحالی کے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس کے باپ نے باوجود سخت گیر ہونے کے فرائیڈ سے کہہ رکھا تھا کہ تمہیں اپنی مرضی کا پیشہ اختیار کرنا ہوگا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب نفسیات نے ابھی جنم ہی لیا تھا اور صرف تجرباتی حقائق پر زور دیا جاتا تھا۔ محض نظریوں اور خیالات پر کوئی توجہ نہ دیتا تھا۔ تجربے کی کسوٹی پر پرکھے بغیر کسی نظریے کو قابل قبول نہ سمجھا جاتا تھا۔ سائیکاٹری نظام کی خرابیوں کا علم محدود تھا۔ اس کی خانہ بندی اور تعریف غیر مکمل تھی۔

نوجوان فرائیڈ سائنس کی راہ سے فطرت کے اسرار و رموز کی تحقیقات کرنا چاہتا تھا۔ اس پر فطرت کے پیچیدہ رازوں اور معموں کو حل کرنے اور ان پر سے پردہ اٹھانے کا شدید جوش اور اشتیاق پیدا ہوگیا تھا۔ وہ انسان کے جسمانی مطالعے کی بجائے اس کا ذہنی مطالعہ کرنا چاہتا تھا۔

اس کا باپ چاہتا تو یہی تھا کہ وہ کوئی منفعت بخش پیشہ اختیار کرلے لیکن اس کے مستقبل کے پروگرام کے بارے میں جاننے کے بعد اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں کیا۔

اس نے وی آنا کی یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ ان دنوں یونیورسٹی میں بھی یہودیوں کے خلاف نفرت زوروں پر تھی لیکن اس نے اس تعصب کی پروا نہ کی لیکن سوچتا ضرور تھا کہ ایسا کیوں ہے۔ اسے ابتداء میں تو یوں لگتا تھا جیسے وہ اس یونیورسٹی میں زیادہ دن نہ رہ سکے گا لیکن پھر اس نے احساس کم تری کو احساس فخر میں بدل لیا۔ اسے اپنے یہودی ہونے پر فخر ہونے لگا۔ وہ اس شان سے چلتا تھا جیسے یونیورسٹی فتح کرنے آیا ہے۔ کوئی غیر یہودی اس سے بات کرنے کی کوشش بھی کرتا تو وہ اس کی طرف حقارت سے دیکھتا اور آگے بڑھ جاتا۔ اس عدم تعاون سے اس نے ایک سبق سیکھا اسے پتا چل گیا کہ حزب مخالف میں ہونے سے کیا فائدہ ہوتا ہے۔ تنہائی بہت کچھ سکھاتی ہے۔ جب کوئی سہارا نہیں ہوتا تو آدمی خود کھڑا ہونا سیکھتا ہے۔ ایک جذبہ اس میں یہ بھی پیدا ہوا کہ وہ ہر قیمت پر غیر یہودیوں کو نیچا دکھائے گا۔ خود اعتمادی نے اسے آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا۔ وہ کسی کا سہارا ڈھونڈے بغیر اپنے کام میں لگا رہا۔

تین سال تک وہ یونیورسٹی میں نیچرل سائنس کے مختلف شعبوں کے چکر لگاتا رہا۔ کبھی ایک طبعی علم اور کبھی دوسرے طبعی علم کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا تاکہ کائنات کی گتھیاں سلجھا سکے۔ شعبہ کیمسٹری میں اس نے پوری تندہی سے کام کیا۔ بڑی محنت کی لیکن خاطر خواہ کامیابی نہ ہوسکی پھر حیوانیات کو چنا۔ اس میں بھی کامیابی نہ ہوئی۔

سائنسی دنیا سے یہ تعارفی سلسلہ اس وقت ٹوٹ گیا جب اسے برطانیہ کے سفر کا اتفاق ہوا۔ اس کا تعلیمی ریکارڈ نہایت شاندار تھا۔ اس لیے باپ نے خوشی سے اجازت بھی دے دی اور سفر خرچ بھی دیا۔ پہلی مرتبہ باپ کی طرف سے اس کے دل میں نرم گوشہ پیدا ہوا لیکن اب بھی باقی تھی۔

اس کے دو سوتیلے بھائی عمانویل اور فلپ ان دنوں مانچسٹر میں تھے۔ اس کا سوتیلا بھتیجا بچپن کا ساتھی جان بھی وہیں تھا۔ وہ بھی اب اس کی طرح جوان ہوچکا تھا۔

عمانویل تو بھائی (سگمنڈ) کو دیکھ کر ایسا خوش ہوا کہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

باپ کے نام ایک لمبا چوڑا خط لکھ دیا جس میں سگمنڈ کی شائستگی اور تعلیمی حالت کی تعریف کی گئی تھی۔ فرائیڈ کو باپ کے بارے میں جو غلط فہمیاں تھیں انہیں بھی دور کیا اور باپ کی مشکلات اس طرح بیان کیں کہ اس کی تلخیاں جاتی رہیں۔

گھر سے باہر بھی انگلینڈ کی دنیا اس کے لیے نیا تجربہ تھا۔ یہاں وہ یہودی نہ تھا بلکہ دوسرے انسانوں کی طرح عام انسان تھا۔ یہاں کی مذہبی رواداری نے اس پر نہایت خوشگوار اثر مرتب کیا۔

چھٹیوں کے دن گزارنے کے بعد جب وہ ویانا واپس آیا اور یونیورسٹی جانے لگا۔ قدرت اسے کچھ بنانا چاہتی تھی لہٰذا اب اسے ایسا استاد اور ایسی سائنس مل گئی جو اس کی مرضی کے مطابق تھے یعنی اسے ارنسٹ بروک کی فیزیالوجیکل لیبارٹری میں کام کرنے کا موقع میسر آ گیا۔ ارنسٹ بروک ایک ماہر اور نامور ماہر جسمانیت تھا اور یونیورسٹی کا بہترین استاد تھا۔ اس کے معاونین سگمنڈ ایکسنر اور فلیشل مارکسو تھے۔ فلیشل کے ساتھ اس کی دوستی ہوگئی۔ فرائیڈ اس لیبارٹری میں اس قدر منہمک ہو گیا کہ اسے گریجویشن کرنا اور ڈگری لینا بھی بھول گیا اور تقریباً چھ سال (1882ء تک) بروک کے ساتھ کام کرتا رہا۔

اپنے مستقبل کو تابناک بنانے کی اُمید میں اس نے بروک کی تجربہ گاہ میں اندھا دھند محنت کرتے ہوئے اپنی جوانی کے چھ بہترین سال گزار دیے۔ بروک اسے جو بھی مسائل حل کرنے کے لیے دیا کرتا تھا وہ اپنی محنت اور قابلیت سے انہیں حل کر دیتا تھا۔

اس نے تحقیقاتی کام اس انہماک سے انجام دیے کہ اپنی دیگر مصروفیات حتیٰ کہ پڑھائی کو بھی قریب قریب نظر انداز کر دیا۔

بروک اسے اپنا معاون بنانے کی ٹریننگ دے رہا تھا۔ اس نے اس جوہر قابل کو پہچان لیا تھا۔ بروک جب اس کی طرف دیکھتا تھا اس کی آنکھوں میں توصیفی چمک نظر آتی تھی۔ اسے پورا یقین تھا کہ بروک اس کی دلچسپی اور محنت کو دیکھتے ہوئے ضرور تاحیات معاون بنا لے گا لیکن ہوا اس کے برعکس۔ بروک نے اس کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ ایک روز بڑی بے رخی سے کہہ دیا کہ لیبارٹری میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ وہ اسے معاون نہیں بنا سکتا۔ فرائیڈ کے صدمے کی انتہا نہیں تھی۔ ایک تو ڈگری پانے میں دیر ہوئی کیونکہ وہ پڑھائی کی طرف سے غافل ہو گیا تھا اور دوسرے جس پیشے کا وہ انتخاب کرنا چاہتا تھا اور جس کے لیے اس نے شبانہ روز محنت کی تھی وہ یکدم ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

لیبارٹری چھوڑنے کے بعد اس کے سامنے اچانک معاشی مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اب تک اس کا باپ اس کا خرچ برداشت کر رہا تھا لیکن اب معاشی حالات سنوارنے اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی وجہ سامنے آ گئی۔ گریجویشن کے بعد اس کی منگنی ایک لڑکی مارتھا سے طے ہوگئی۔ مارتھا کا خاندان ہمبرگ سے وی آنا آیا تھا۔ اب فرائیڈ کے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو اور خود کمائے۔ اس نے وی آنا کے جنرل اسپتال میں ملازمت اختیار کر لی جہاں جلد ہی اسے جونیئر ریزیڈنٹ فزیشن بنا دیا گیا۔ وہاں بھی اسے بروک کے مانند ایک ایسا شخص مل گیا جو اپنے کام سے عشق کرتا تھا۔ اس کا نام ڈاکٹر تھیوڈور میرٹ تھا جو مشہور سائیکاٹرسٹ تھا۔ وہ دماغی اناٹومی پر کام کرتا تھا، اس نے اس کام کے لیے انسٹی ٹیوٹ قائم کر رکھا تھا۔ یہ وہ کام تھا جس سے فرائیڈ کو بھی حقیقی دلچسپی تھی۔ اس نے یہاں چھ ماہ تک شاگرد کی حیثیت سے کام کیا۔

اس کے ساتھ ساتھ اس نے اپنی شادی کے لیے رقم جمع کرنے کے خیال سے دماغی و اعصابی بیماریوں کا مطالعہ بھی شروع کر دیا۔ ان دنوں وی آنا میں اس برانچ آف میڈیسن میں چند ایک ہی اسپیشلسٹ موجود تھے کیونکہ اس وقت تک علم طب کی اس شاخ کو اتنا اہم نہ سمجھا جاتا تھا۔ ان حالات میں فرائیڈ نے اپنا استاد آپ بننے کا فیصلہ کیا۔ پھر جلد ہی اس کے ذہن میں چارکوٹ کا نام آیا۔ یہ شخص علوم نفسیات میں خصوصی شہرت کا مالک تھا لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس کا شاگرد بننے کے لیے اسے پیرس کا سفر کرنا پڑ رہا تھا لیکن اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔ اس کے موجودہ استاد سینزٹ نے اسے مشورہ دیا کہ وہ دماغی اناٹومی پر لیکچر دے کر پیسے کمائے۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ ممکن ہے اس پیشکش کو ٹھکرا دیتا لیکن اس وقت وہ ضرورت مند تھا۔ اسے پیرس جانے کے لیے سفر خرچ درکار تھا۔

چارکوٹ نے اسے یہ پیشکش بھی کی تھی کہ وہ اس کی لیبارٹری میں کام کرتا رہے۔ وہ اسے اپنی جگہ بھی دینے کو تیار تھا لیکن فرائیڈ نے اس پیشکش کو بھی ٹھکرا دیا۔

''میری منزل یہ لیبارٹری نہیں۔ میں بہت آگے جانا چاہتا ہوں۔''

''میں بہت بوڑھا ہو چکا ہوں۔ اب تم میری جگہ لو۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''میں پتھر نہیں کہ ایک جگہ پڑا رہوں۔ مجھے آپ سے ہمدردی ہے لیکن میں آپ کے لیے اپنا مستقبل دھندلا نہیں کرسکتا۔''

اس کے اس دوٹوک جواب پر اس کا مہربان سینئر اس کا دشمن بن گیا لیکن اب فرائیڈ کی شہرت اتنی ہوگئی تھی کہ وہ اس کا کچھ بگاڑ نہ سکا۔ بالآخر اس کا سابق محسن بروک جس نے کبھی اسے اپنا معاون بنانے سے انکار کردیا تھا اس کے کام آیا۔ اس کی سفارش پر اسے وظیفہ مل گیا۔ وہ اب اس قابل ہوگیا تھا کہ پیرس جاسکے۔

''اب تم سمجھ گئے ہوگے کہ میں نے تمہیں اپنا معاون کیوں نہیں بنایا تھا۔'' بروک نے کہا۔ ''اگر تم میرے پاس رہتے تو خود پر آگے جانے کے راستے بند کرلیتے۔ میں تمہاری اہلیت کا قائل ہوں اس لیے پیرس جانے کا مشورہ دے رہا ہوں۔''

فرائیڈ نے بروک کا شکریہ ادا کیا اور پیرس جانے کے لیے روانہ ہوگیا۔

دبلا پتلا سیاہ بالوں والا انتیس سالہ فرائیڈ جب پیرس پہنچا تو یہاں کی رونقیں اور رنگینیاں دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ ویانا اور پیرس کا مقابلہ ہی کیا تھا۔ شفاف سڑکوں پر بے فکر شہری اس طرح گھوم پھر رہے تھے جیسے طے شدہ پروگرام کے مطابق اس نے دماغی امراض کے شفا خانے سال پیٹریری اسپتال میں داخلہ لے لیا۔

یہ اسپتال چارکوٹ کی وجہ سے طب نفسی اور طبیعات کے ماہرین کا مرکز بنا ہوا تھا۔ چارکوٹ نے علاج معالجہ کے لیے ہپناٹزم کا طریقہ اختیار کر رکھا تھا اور یہ اس کا خصوصی طریقہ تھا۔

چارکوٹ کا سب سے اہم کارنامہ یہ تھا کہ اس نے میڈیکل پریکٹس میں ہپناٹزم کو ایک نمایاں اور قابل قدر مقام دلایا تھا۔ ہپناٹزم کا ماخذ مسمریزم ہے اور مسمریزم کو لوگوں نے دھوکا اور مکاری سمجھ رکھا تھا البتہ انیسویں صدی کے وسط میں ایک انگریز ڈاکٹر اور ایک فرانسیسی ڈاکٹر نے ہپناٹزم کے ذریعے مریضوں کو بے ہوش کر کے کئی کامیاب علاج کیے۔ اس علاج کو پرکھنے کے لیے چارکوٹ نے سال پیٹریری میں ہپناٹزم کا اسکول کھولا۔ اس اسکول میں ہپناٹزم کے بارے میں تحقیق کا کام شروع ہوگیا۔

یہ چارکوٹ کے تحقیقی کاموں کی بدولت ہی ہوا کہ ہپناٹزم کو ایک باقاعدہ طریقہ علاج کے طور پر تسلیم کیا جانے لگا۔

سال پٹریری میں رہتے ہوئے اسے ایک انڈر گریجویٹس کی حیثیت سے نفسیات کی اعلیٰ تعلیم اور بیش بہا تجربات کا موقع ملا۔ اس نے اپنی توجہ زیادہ تر نیوراسس پر مرکوز رکھی تھی۔ یہ علوم نفسیات کی وہ شاخ تھی جسے طویل عرصے سے نظرانداز کیا جارہا تھا۔

پیرس میں اس کا کوئی واقف کار نہیں تھا۔ مصروفیت ایسی تھی کہ دوست بنانے کی فرصت بھی نہیں تھی۔ وہ اسپتال سے تنہا اپنی رہائش گاہ جایا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ کسی نے اس کا نام لے کر پکارا۔ پیچھے پلٹ کر دیکھا تو کوئی بھی نہیں تھا۔ ذرا آگے چلا تو پھر کسی نے پکارا۔ آواز مانوس تھی لیکن پہچان میں نہیں آرہی تھی۔ ایسا کوئی بھی نہیں تھا جسے وہ جانتا ہو۔ ظاہر ہے اس نے اسے وہم قرار دیا اور کوئی پروا نہیں کی۔ دو تین دن کے وقفے کے بعد پھر یہی آواز سنائی دی۔

ان آوازوں کو لے کر اس نے اپنا تجزیہ خود کرنا شروع کردیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ اس کی تنہائی ہے جو اسے پکارتی ہے یعنی اس کے اندر دبی ہوئی یہ خواہش اسے آواز دیتی ہے کہ کوئی اس کی تنہائی کا ساتھی ہو۔ گھر سے اتنی طویل جدائی اور دوری نے اس میں یہ احساس پیدا کردیا تھا۔ اکیلے پن کے احساس نے اس کے دل میں تحفظ اور گرمجوشی کے حصول کی خواہش پیدا کردی تھی۔ ان حالات میں اس کے ذہن میں کسی کے زیر سرپرستی آنے کا خیال بھی پیدا ہوا لیکن اس خیال کو اس نے ذہن سے جھٹک دیا۔ اس نے عزم کیا کہ وہ اپنی تنہائی کا مسئلہ خود سلجھائے گا۔ اس نے چارکوٹ کو خط لکھا کہ وہ اس کی کتابوں کا ترجمہ جرمن زبان میں کرنے پر تیار ہے۔ چارکوٹ نے اس پیشکش کو منظور کرلیا۔ فرائیڈ نے پہلے ایک کتاب کا ترجمہ کیا پھر دوسری کا اس بہانے چارکوٹ سے ملاقاتیں بھی بڑھ گئیں۔ آہستہ آہستہ اس کا شمار چارکوٹ کے دوستوں میں ہونے لگا۔

چارکوٹ کی شخصیت نے فرائیڈ کو بے حد متاثر کیا۔ وہ صرف ہپناٹزم ہی سے متاثر نہ ہوا تھا بلکہ ہسٹریا کے علاج کے طریقوں سے بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ چارکوٹ نے تجربوں سے یہ بھی ثابت کیا تھا کہ صرف عورتیں ہی ہسٹریا کی مریض نہیں ہوتیں بلکہ مرد بھی ہوتے ہیں۔ چارکوٹ کی ایک خوبی اسے بہت پسند آئی کہ وہ کسی چیز کو اس وقت تک درست تسلیم نہ کرتا تھا جب تک اسے مختلف تجربات اور حقائق کی کسوٹی پر پوری طرح پرکھ نہ لیتا۔

فرائیڈ اپنی تحقیقات کو بھی چارکوٹ کے نمونے پر آگے بڑھانے کا متمنی تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جس طرح لوگ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

چارکوٹ کا تذکرہ کرتے ہیں انہی الفاظ سے اس کا تذکرہ بھی کیا جائے۔

☆.....☆

1886ء کے موسم بہار کا آغاز ہو چکا تھا۔ سبزہ لہلہایا اور درختوں پر نئے شگوفے کھلنے لگے تو اس کے دل میں بھی نئے موسموں نے انگڑائی لی۔ اسے اپنی منگیتر مارتھا یاد آرہی تھی جو اس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ اس کی یاد بھلانے کا اسے یہی ایک طریقہ سوجھا کہ اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ کام میں منہمک رکھے۔ اس کے ساتھ ہی خود کو سیر و تفریح میں مشغول رکھنے لگا۔ اسے مارتھا سے جلد از جلد شادی کرنے کی خواہش ضرور تھی لیکن یہ بوجھ اٹھانے کے لیے اس کے پاس رقم اب بھی نہیں تھی۔ اس کی اب تک کی عمر حصول علم میں بسر ہوئی تھی۔ اگر میں عام ڈاکٹر کی حیثیت سے پریکٹس شروع کردوں تو پھر میرے عزائم کا کیا ہوگا۔ اس نے بڑے دکھ سے سوچا۔ شادی کے لیے بے قرار ضرور تھا لیکن پھر یہ بھی سوچتا تھا کہ ازدواجی زندگی اس کی ترقی میں رکاوٹ بن جائے گی۔ جیسا کہ پہلے ایک مرتبہ ہو چکا تھا۔ پیرس آنے سے ایک سال قبل وہ کوکین پر تجربہ کر رہا تھا لیکن اسے مارتھا کی یاد آئی۔ مارتھا کی کشش نے سب کچھ بھلا دیا اور وہ تجربہ بیچ میں چھوڑ کر ہمبرگ روانہ ہوگیا۔ جہاں مارتھا رہتی تھی۔ جاتے ہوئے وہ اپنے دوست (آنکھوں کے ڈاکٹر) سے کہہ گیا کہ کوکین کے ٹیکے سے آنکھوں کا آپریشن کیا جاسکے گا۔ جب وہ ہمبرگ سے واپس آیا تو اس کی حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی جب اسے یہ معلوم ہوا کہ اس کے دوست نے اس تجربے کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کر خود کو اس تحقیق کا ذمہ دار قرار دے دیا ہے اور ساری شہرت و نیک نامی کا مالک بن بیٹھا ہے۔ اس کے ہاتھ سے یہ اعزاز چھن گیا کہ وہ اس عظیم دریافت کا سہرا اپنے سر باندھ سکتا۔

اسے یہ افسوس اس وقت بھی ہو رہا تھا جب وہ پیرس میں تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ اب وہ شادی کرلے لیکن یہ سوچ کر اب بھی رکا رہا تھا کہ کہیں کوئی ایسا ہی واقعہ پھر پیش نہ آجائے۔ مارتھا کی قربت اسے عظیم دریافتوں سے روک نہ لے۔

اس وقت تو اس کے اس صدمے نے انتہا کو چھو لیا تھا جب کچھ عرصے بعد اس کا باپ آنکھوں کی بیماری کا شکار ہوا۔ اس کا آپریشن بھی اس کی دریافت کوکین کے ٹیکے سے ہوا اور وہ اپنے باپ کو یہ نہ بتا سکا کہ یہ ٹیکا تمہارے اس بیٹے کی ایجاد ہے جسے تم ناکارہ کہتے تھے جس کے لیے تم نے یہ تک کہہ دیا تھا کہ یہ لڑکا دنیا میں کچھ نہیں کرسکتا۔

اسے افسوس ہوتا رہا کہ اس نے وقتی جذبے کے تحت اپنی ایک اہم ترین دریافت کا راز اپنے دوست کو بتا دیا۔ وہ اس کا ذمہ دار مارتھا کو قرار دیتا رہا۔ شادی کے بعد بھی مارتھا سے اس کی ناراضی کم نہ ہوئی۔ کم از کم اس معاملے میں حالانکہ مارتھا کا اس میں قصور نہیں تھا۔

اب پھر وہ اس وقتی جذبے کے زیر اثر تھا۔ یہ جذبہ تھا شادی کی خواہش۔ مارتھا چار سال سے اس کی منتظر بیٹھی تھی۔

وہ ایک مرتبہ پھر پیرس سے وی آنا کی طرف جا رہا تھا۔ وی آنا پہنچ کر اسے ملازمت کی تلاش ہوئی۔ جن دنوں اس پر پیرس جانے کی دھن سوار تھی اسے وی آنا میں دماغی بیماریوں کے شعبے میں ایک اچھے عہدے کی پیش کش ہوئی تھی۔ اس نے بہتر سمجھا کہ شادی اور گرہستی کا بکھیڑا سنبھالنے سے پہلے اپنے آپ کو اس دوران میں پریکٹس کے لیے تیار کرلے۔

اس نے جلد ہی وی آنا میں عصبی بیماریوں کے اسپیشلسٹ کی حیثیت سے ایک مضبوط مقام بنا لیا۔ بالآخر 1886ء کے موسم خزاں میں مارتھا سے اس کی شادی ہوگئی۔

مارتھا کا خاندان پڑھے لکھے یہودیوں کا خاندان تھا۔ اس کا دادا ہیمبرگ کا چیف تھا۔ اس کے بیٹے جرمن یونیورسٹیوں میں پڑھاتے تھے۔ یہودی ہونے کے باوجود انہیں پروفیسر شپ حاصل ہوگئی تھی۔ یہ ان کی قابلیت کا ثبوت تھا۔

ہیمبرگ میں پلنے بڑھنے کے سبب مارتھا میں جفاکشی اور محنت جیسی صلاحیتیں پیدا ہوگئی تھیں اور وی آنا میں اپنی گھریلو ذمہ داریاں پوری کرنے کے لیے بالکل آمادہ تھی۔ چنانچہ جب وہ شادی کر کے فرائیڈ کے گھر آئی تو فرائیڈ کو جلد ہی یہ احساس ہوگیا کہ اس نے ایک مثالی عورت سے شادی کی ہے۔ وہ گھر میں برتن دھونے صفائی کرنے کھانے پکانے کے تمام کام اپنے ہاتھ سے کرتی تھی۔ اسے احساس تھا کہ سگمنڈ فرائیڈ کوئی معمولی آدمی نہیں۔

فرائیڈ خوش قسمت تھا کہ اسے مارتھا سے ویسی ہی محبت حاصل ہوئی جو بچپن میں اسے اپنی ماں سے ملا کرتی تھی۔ اس پر یہ مقولہ صادق آتا تھا کہ ہر بڑے آدمی کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔

معالج کی حیثیت سے فرائیڈ کو شروع میں سوائے مخالفت اور نفرت کے کچھ نہ ملا۔ جب بھی ہسٹریا کے بارے میں اس نے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اپنے نظریات پیش کیے ڈاکٹروں نے اس کا مذاق اڑایا۔

اس نے جب وی آنا کے قدامت پسند ممبران کے سامنے اپنے نئے طبی نظریات پر مبنی رپورٹ پیش کی۔ اس رپورٹ میں اس نے چارکوٹ کی تجربہ گاہ میں جو کچھ دیکھا اور سیکھا تھا اس کا تذکرہ تھا۔ اس رپورٹ میں اس نے ان مردوں کا بھی تذکرہ کیا جو ہسٹریا میں مبتلا تھے۔ میڈیکل سوسائٹی کے ممبران کے لیے یہ بالکل نئی بات تھی۔ انہوں نے اس کا تمسخر اڑایا۔

''آپ ایسی احمقانہ باتیں کیوں کررہے ہیں۔ ہسٹریا کا لفظ ---------- ہسٹرون سے نکلا ہے جس کا مطلب ہے ''رحم'' اور رحم صرف عورتوں کے جسم میں ہوتی ہے لہٰذا ہسٹریا صرف عورتوں کا مرض ہے اس کا مردوں سے کیا تعلق؟ اس نے ثبوت کے لیے ایک ایسے مرد کو تلاش کیا جو ہسٹریا میں مبتلا تھا اور اسے سوسائٹی کے سامنے لاکر کھڑا کردیا اس پر بھی بہت سوں نے چپ سادھ لی اور اس نظریے میں دلچسپی نہیں لی۔''

اس کے فوراً بعد سیزٹ نے جو دماغی تشریح کے انسٹی ٹیوٹ کا مربی تھا اس نے فرائیڈ کو اپنی لیبارٹری سے نکال دیا۔ اب اس کے پاس کوئی جگہ نہ رہی جہاں وہ لیکچر دے سکے۔ اسے عقلی اور تحقیقی زندگی سے بالکل محروم کردیا گیا۔

جہاں تک اس کی پریکٹس کا تعلق تھا اس کے پاس دو چیزیں تھیں ایک ہپناٹزم اور دوسرا بجلی کا علاج۔ اس پریکٹس سے جو آمدنی ہوتی تھی۔ وہ اس کے بڑھتے ہوئے کنبے کے لیے ناکافی تھی۔

ہپناٹزم کو وی آنا کے طبی حلقوں میں حقارت سے دیکھا جاتا تھا۔ فرائیڈ کا چونکہ طریقہ علاج یہی تھا اس لیے اسے بھی حقارت سے دیکھا جاتا۔ اس میں کچھ پیشہ وارانہ حسد بھی تھا کیونکہ اس کی شہرت تیزی سے پھیل رہی تھی اور وہ یہودی بھی تھا۔

ہپناٹزم میں کامیابی نے اسے یہ راہ سجھائی کہ نا میاتی عصبی بیماریوں کے علاج کے لیے اسے عام طریقہ ترک کر کے ہپناٹزم کو استعمال میں لانا چاہیے چنانچہ اس نے ہپناٹزم کے طرائق کو کام میں لاکر عصبی بیماریوں کا علاج شروع کردیا۔ طریق علاج نے اسے بے پناہ شہرت دی۔ اس کی آمدنی میں بھی اضافہ ہونے لگا لیکن اس دوران اسے ہپناٹزم کی خامیوں سے آگاہ ہونے کا موقع بھی ملا۔ اس نے دیکھا کہ بعض مریض اس کی کوشش کے باوجود حالت تنویم (تنقید) میں نہیں آتے تھے یا ان پر قدر ہپناٹک حالت طاری نہیں ہوتی تھی جتنی اسے درکار ہوتی۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اس نے ہپناٹزم کی تعلیم حاصل کی ہے وہ ادھوری ہے یا کوئی نہ کوئی کمی رہ گئی ہے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اس عمل کی تعلیم کا اور گہرا مطالعہ کرے۔ اپنی ادھوری تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ نینسی فرانس .... کے میڈیکل کالج میں چلا گیا جہاں ہپناٹزم کے متبادل طریقہ علاج کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس نے یہاں محض چند ہفتوں کے قیام ہی میں نمایاں کامیابی حاصل کرلی اور ان ذہنی الجھنوں اور مسائل کی بھول بھلیوں سے نکلنے میں کامیاب ہوگیا جن میں اسے سابقہ استاد چارکوٹ نے لاکھڑا کیا تھا۔

یہ اس کی لگن ہی تھی جو اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ لیے پھر رہی تھی۔

نینسی سے واپسی پر اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ ماضی سے مکمل طور پر ناتا توڑ کر آزادانہ طور پر تحلیل نفسی پر تحقیقات کرنے کی کوشش کرے گا۔

اس نے مختلف تجربات کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مریض کو ہپناٹز کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ اگر مریض کو موقع دیا جائے تو وہ اپنے ماضی کے تجربات بیان کرے، اس عمل سے ہی مریض کا علاج ہوجاتا ہے۔ اسی کا نام تحلیل نفسی ہے۔

اب وہ مریضوں کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے انہیں اپنی بیماری کی وجوہات سے آگاہ کرنے کی ہدایت دینے لگا تھا۔

اس طریقہ کار کے مطابق علاج کرنے کے دوران اس نے جو تجربات حاصل کیے ان کی بناء پر اس نے بے حد اہم دریافتیں کیں اور نفسیاتی نظریات قائم کیے۔ اس کی اہم ترین دریافتوں میں خاندان کے فرد کی شخصیت قائم کرنے میں بنیادی کردار، خاندان اور خاص طور پر باپ کا بچے کی طرف جارحانہ رویہ، لاشعور کا انسانی زندگی میں اہم کردار اور بچے میں ماں کے ذریعے معاشرتی اقدار اور روایات کے منتقل ہونے کا طریقہ کار شامل ہیں۔

اس کی پہلی دریافت انسانی کردار کے لاشعوری محرکات تھے۔ اس نے بتایا کہ پیدائش پر بچے میں صرف لاشعوری جبلی خواہشات اور ضروریات موجود ہوتی ہیں جن کی بچہ فوری تسکین چاہتا ہے۔ ان خواہشات کو اس نے لاذات یا (id) کا نام دیا جب بچہ ایک سال کا ہوتا ہے تو اس میں اچھے برے کی تمیز پیدا ہوجاتی ہے۔ اس کے بڑے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اسے ایسے کاموں سے منع کرتے ہیں جنہیں وہ برا سمجھتے ہیں۔ اس عمر میں اس میں ''انا'' (Ego) پیدا ہو چکی ہوتی ہے لہٰذا وہ ماں باپ کے ڈانٹنے سے اس عمل کو ماں باپ کے سامنے نہیں کرتا لیکن ان کی غیر موجودگی میں اس عمل کو بار بار دہراتا ہے۔ بار بار منع کرنے سے بچے کی یہ خواہش اس کے لاشعور میں چلی جاتی ہے۔

فرائیڈ کی ایک اور اہم دریافت یہ تھی کہ بچے میں فطرتی خواہشات پائی جاتی ہیں اور والدین ان خواہشات کو دباتے ہیں اس صورت حال کے لیے فرائیڈ نے ایڈی پس کامپلکس کا نظریہ پیش کیا۔ اس نظریے کے تحت لڑکے میں اپنی ماں سے متعلق خواہشات پائی جاتی ہیں۔ وہ والد کو اپنا رقیب سمجھتا ہے۔ لڑکیوں کے لیے اس نے الیکٹرا کامپلکس کا نظریہ وضع کیا یعنی لڑکی کا رجحان باپ کی طرف ہوتا ہے۔ جب بچہ ذرا بڑا ہوتا ہے تو بچے کو قابو میں رکھنے کے لیے بچے کو کسی خدا کے تصور کے لیے نفسیاتی طور پر تیار کیا جاتا ہے۔ اب وہ ایسے خدا کے تصور میں ایک جابرانہ حاکم دیکھتا ہے جو اسے سزا و جزا دیتا ہے۔ فرائیڈ نے تاریخی مطالعے سے بھی یہ نتیجہ نکالا کہ انسان میں کسی خدا کا تصور اسی وقت پیدا ہوا جب اس نے فطرت کے مقابلے میں خود کو بے بس دیکھا۔

فرائیڈ نے انسانی نفسیات میں لاشعوری محرکات دبی ہوئی خواہشات اور والدین کے کردار کو بخوبی سمجھا۔ اس کے نظریات کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ اس نے انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں مغربی یورپی سرمایہ دارانہ نظام کی حقیقتوں کی پوری اور بھرپور ترجمانی کی۔

یہ اور اس قسم کی دوسری دریافتوں کے باوجود اس کی کوئی عزت افزائی نہ ہو سکی۔ بچپن میں اسے غیر یہودی معاشرے کی طرف سے جو دھتکار ملی تھی اس کا سامنا اب بھی تھا مگر فرائیڈ کو اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ ہر طرف سے بے نیاز اپنے تحقیقاتی کاموں میں لگا ہوا تھا۔ اس نے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ انسان کا ہر مسئلہ جنس کے گرد گھومتا ہے لیکن اسے کوئی ماننے کو تیار نہیں تھا۔ اس انکار میں بیشتر حصہ اس خیال کا تھا کہ ایک یہودی کے پیش کردہ نظریات کو کیوں قبول کیا جائے۔ اسے یقین تھا کہ وہ اپنے نظریات اور دریافتوں کو کسی دن دنیا سے منوا کر رہے گا۔ اگر زندگی میں قبولیت نہیں بھی ملی تو اس کے مرنے کے بعد دنیا ضرور انہیں قبول کرے گی۔

اب اس نے تحلیل نفسی کے میدان میں نئے تجربات کرنے شروع کر دیے اور ان کے لاشعور کی ترجمانی کرنے لگا۔

فرائیڈ مسلسل دس برس تک تنہا کام کرتا رہا۔ اس عرصے میں اسے بہت شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے نظریات قبول کرنا تو درکنار کسی نے اس سے ہمدردی کا اظہار تک نہ کیا لیکن ان حالات میں فرائیڈ نے ثابت قدمی کا ثبوت دیا اور اپنے نظریات کو ترک کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔

اس کی محنت رنگ لائی۔ اس کا اکیلا پن آہستہ آہستہ اختتام کو پہنچنے لگا۔ اب دبے لفظوں میں لوگ اسے تحلیل نفسی کا بانی کہنے لگے تھے۔ اگر مخالفت تھی تو لفظ ''جنس'' پر تھی۔ اس سے کہا جاتا تھا کہ وہ جنس کا کوئی مترادف لفظ تلاش کر لے لیکن فرائیڈ نے اس مشورے کو قبول نہیں کیا۔

وہ اب بھی ثابت قدم تھا۔

اس کی ثابت قدمی رنگ لائی۔ ڈاکٹروں، ادیبوں اور سائنس دانوں کا ایک چھوٹا سا گروپ اس کے گرد اکٹھا ہونے لگا اور پھر یہ تعداد بڑھتی گئی۔

یہ گروپ فرائیڈ کا لیکچر سننے اس کے گھر جایا کرتا تھا تو اہلِ وی آنا ان کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ اہل وی آنا بدستور بے گانگی اور سرد مہری کا رویہ رکھے ہوئے تھے اور معزز سوسائٹی میں تو اس کا نام لیا ہی نہیں جاتا تھا۔ خواتین کی محافل میں تو اس کا نام آتے ہی چہرے شرم سے سرخ ہو جاتے تھے۔

دنیائے طب کا ایک باحیثیت شخص ''ونگز وان'' جو یونیورسٹی کا باقاعدہ پروفیسر تھا (فرائیڈ کو مکمل پروفیسر شپ کبھی نہ ملی) اور سائیکاٹری کا ماہر تھا، فرائیڈ کے خلاف اس کے مخالف گروپوں کی قیادت کیا کرتا تھا۔

فرائیڈ کے لیکچر ہفتے کی شام کو کرینکسن ہاؤس پاگل خانے سے ملحق سائیکاٹرک کلینک کے لیکچر ہال میں ہوا کرتے تھے۔ اس پاگل خانے میں پاگلوں کو لوہے کی زنجیروں سے باندھ کر رکھا جاتا تھا کیونکہ انیسویں صدی تک پاگلوں کے علاج کا کوئی بہتر طریقہ دریافت نہیں ہوا تھا۔

لیکچر ہال میں فرائیڈ کے لیکچر کے وقت چند ہلکی روشنی کے بلب جلا دیے جاتے تھے۔ اس کی میز کے سامنے بینچوں کی قطاریں تھیں جس پر اس کے مخالفین بیٹھ کر اس کا لیکچر سنتے تھے۔

ہانز ساچن نامی سائیکاٹرسٹ اس کے گروپ میں شامل ہوا تو فرائیڈ کی طاقت بہت بڑھ گئی۔ اس نے فرائیڈ کے خوابوں کی تعبیر کا مطالعہ کر رکھا تھا۔ اس کتاب ہی نے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اسے مزید نفسیاتی علوم حاصل کرنے کی خواہش دلائی اور وہ فرائیڈ کی طرف کھنچ کر آ گیا۔ جب تک اس نے فرائیڈ کو نہیں دیکھا تھا اس وقت تک فرائیڈ کا عجیب سا نقشہ اس کے ذہن میں تھا مگر جب اس نے فرائیڈ کو دیکھا تو اس کی پروقار شخصیت نے اس پر جادو سا کر دیا۔ 1904ء کے لگ بھگ فرائیڈ ایک ادھیڑ عمر کا سنجیدہ شخص تھا۔ اس کے چہرے پر چھوٹی سی ڈارک براؤن داڑھی تھی۔ قد درمیانہ اور جسم دبلا پتلا تھا۔ اس کی آنکھیں بھوری اور چمکدار تھیں۔ پیشانی فراخ اور بہت خوب صورت تھی۔ ہانز ساچن نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا تو وہ صاف ستھرے سلیقے اور مہارت سے سلے ہوئے سیاہ رنگ کے قیمتی سوٹ میں ملبوس تھا۔ اس پر اس نے سیاہ ٹائی لگائی ہوئی تھی۔ اس کی چال ڈھال میں نہایت تیزی اور پھرتی تھی حالانکہ اس وقت تک وہ ادھیڑ عمر کا ہو چکا تھا۔

فرائیڈ اپنے لیکچر کبھی لکھ کر نہ لاتا تھا۔ حوالے کے نوٹس تک اس کے پاس نہیں ہوتے تھے۔ اس کے باوجود وہ دو گھنٹے تک مسلسل لیکچر دیتا رہتا تھا۔ تحلیل نفسی کی تکنیک اور تھیوری مشکل چیزیں تھیں مگر جن طریقوں سے وہ ان پر لیکچر دیتا تھا اس سے سننے والوں کو کوئی دشواری پیش نہ آتی تھی۔

لیکچر کے بعد سارا گروپ فرائیڈ کے ہمراہ صحن میں نکل آیا کرتا تھا۔ پھر باہر آ کر گھر جانے کے لیے ٹیکسی پکڑتا تھا۔

اسے ٹیکسی پکڑنے کی جلدی ہوتی تھی کیونکہ اس کے پہنچنے سے پہلے ہی اس کے چند مخصوص دوست اس کا انتظار کر رہے ہوتے تھے۔ وہ ان کے ساتھ تاش کھیلا کرتا تھا جو وی آنا کا مقبول ترین کھیل تھا۔

اس کی شخصیت کی طرح اس کا گھر بھی پُراسرار اور دلچسپ تھا۔ یہ گھر وی آنا کی مضافاتی پہاڑیوں کے دامن میں واقع تھا اور خاصی بلندی پر تھا۔ یہ نہایت خاموش اور پُرسکون جگہ تھی۔ نچلی منزل پر اس کا خاندان رہتا تھا اور اوپری منزل پر اس کا کمرۂ مشاورت تھا۔ جو کمرے اس کے تصرف میں تھے ان میں ایک ویٹنگ روم، ایک کمرۂ مشاورت اور ایک لائبریری تھی۔ وہ یہیں بیٹھ کر لکھنے پڑھنے کا کام کرتا تھا۔ ان کمروں میں صرف ایک کھڑکی تھی۔ ضرورت پڑنے پر کمرے کو گرم کرنے کا انتظام تھا۔ اس کی اسٹڈی میں ایک میز بچھی تھی اس پر ایک ..... ایش ٹرے رکھی تھی۔ وہ دن بھر میں کم از کم بیس سگار پیتا تھا۔ اس کی انگلیاں کبھی سگار سے خالی نہیں رہتی تھیں۔ وہ یہاں ہر بدھ کی شام کو اور ہفتے کی شام کو لیکچر دیا کرتا تھا۔ باقی دنوں میں وہ رات گئے تک جاگ کر اپنے کام میں مصروف رہتا تھا۔

تحلیل نفسی میں دلچسپی رکھنے والوں کے نزدیک اس کا گھر سائنس کے مقدس گھر کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس گروپ کے افراد وہ تھے جو فرائیڈ کی ہر بات پر سر تسلیم خم کرتے تھے۔ اسے ایسے لوگ ہرگز پسند نہ تھے جو تنقید کرنے، بحث کرنے اور کٹ حجتی کرنے کے عادی تھے۔ جو لوگ اس کی مطلق العنانی پسند نہ کرتے انہیں وہ یا تو خود نکال دیتا یا وہ خود اسے چھوڑ کر چلے جاتے۔

فرائیڈ کی کوشش رنگ لا رہی تھیں۔ اسے اپنی تحقیقات میں کامیابی نصیب ہوئی۔ 1910ء میں تحلیل نفسی کی بین الاقوامی انجمن کی بنیاد رکھی گئی۔

تحلیل نفسی کی کانفرنس منعقد ہوئی تو یہ پہلا موقع تھا جب مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والے اور وی آنا کے سائیکا ٹرسٹوں کے علاوہ لندن مڈل ایسٹ اور پیرس کے سائیکا ٹرسٹ بھی شامل تھے۔ اس کانفرنس میں جہاں اور باتیں ہوئیں وہیں یہ فیصلہ بھی ہوا کہ ایک باقاعدہ رسالہ نکالا جائے۔

فرائیڈ کی تحریک تحلیل نفسی اب آسٹریا اور سوئٹزرلینڈ میں ہی نہیں بلکہ امریکا میں بھی مقبولیت حاصل کرتی جا رہی تھی۔ برطانیہ، کینیڈا اور ہندوستان میں بھی یہ تحریک دل عزیزی حاصل کر رہی تھی۔

فرائیڈ کے نظریات کو سب سے زیادہ پذیرائی امریکا میں ملی۔ وہ ڈاکٹر برل تھا جو زیورچ سے امریکا روانہ ہوا تھا۔ اس نے جب نیویارک میں پہلے پہل تحلیل نفسی کا پرچار کرنا شروع کیا تھا مگر اسے شدید مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر رفتہ رفتہ اس کی باتیں لوگوں کے دلوں کو لگنے لگیں اور تحلیل نفسی کا نظریہ قبولیت کا شرف حاصل کرتا چلا گیا۔ کلارک یونیورسٹی نے فرائیڈ اور اس کے اہم ترین ساتھی ژنگ کو یونیورسٹی کی بائیسویں سالگرہ کی تقریبات میں مدعو کیا گیا اور انہیں دعوت دی کہ وہ تحلیل نفسی پر لیکچر دیں۔ یہ فرائیڈ کی بہت بڑی کامیابی تھی۔

جب فرائیڈ کلارک یونیورسٹی پہنچا تو یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ فیکلٹی نہ صرف اس کے کاموں سے واقف تھی بلکہ طلبہ کو ان پر لیکچر دینے کے کام بھی برابر جاری تھے۔ امریکا نے اس کے ہر کام کو کسی قسم کے تعصب کے بغیر قبول کر لیا تھا۔

وہ نہایت مطمئن ہو کر امریکا سے وی آنا واپس آ گیا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ امریکا کے بارے میں اس کی رائے کبھی اچھی نہیں رہی تھی۔ اس گرمجوشی کے استقبال کے بعد بھی امریکا کے بارے میں اس کی منفی رائے تبدیل نہ ہو سکی۔ اس کے چند سالوں بعد ژنگ نے خطوط کے ذریعے اسے امریکی معاشرے کی جنسیت زدگی اور مرد و زن کے آزادانہ تعلقات کے متعلق تفصیلات لکھنی شروع کیں تو اسے امریکا سے اور بھی زیادہ نفرت ہوگئی۔ وہ عورت کی برتری کا شدید مخالف تھا اور یہی بات اسے امریکا کے بارے میں مخالفت پر آمادہ کرتی تھی۔

اس نے جب دوسری تحلیل نفسی کانگریس بلوائی۔ اس کانفرنس کے لیے ژنگ نے جو محنت کی اس کے بعد فرائیڈ کو یقین ہوگیا کہ ژنگ کی صورت میں اسے ایک سچا ساتھی مل گیا ہے۔ اگر ژنگ اسی طرح تحریک تحلیل نفسی کی جدوجہد جاری رکھے گا تو ایسی صورت میں مجھے نظریاتی تحقیقات پر کام کرنے کے لیے خاصی فرصت مل جائے گی۔

وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ ژنگ میرے نزدیک میرے بیٹے کی طرح ہے۔

اب اسے یہودی اور غیر یہودی کی بحث کا سامنا تھا۔ اس کے یہودی دوستوں کو یہ پسند نہیں تھا کہ کوئی غیر یہودی اتنے اختیارات کا حامل ہو جتنا ژنگ ہو چکا تھا (ژنگ غیر یہودی تھا) خود فرائیڈ کو بھی یہ احساس ہونے لگا تھا کہ اس نے ژنگ کا انتخاب کر کے غلطی کی ہے۔ اسے جلد ہی معلوم ہوگیا کہ ژنگ بہترین نگراں اور منتظم نہیں ہے۔ ژنگ جرمن زبان میں نکلنے والا ایک سائیکالوجیکل رسالہ چلا رہا تھا۔ اس کا تمام اسٹاف غیر یہودیوں پر مشتمل تھا۔

ژنگ سے فرائیڈ کے تعلقات کشیدہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ژنگ نے ایک مضمون چھاپا جس میں اس نے فرائیڈ اور ایڈلر پر الزام لگایا کہ وہ غلط اور منفی قسم کے نفسیاتی علوم کی ترویج میں مصروف تھے۔ اس طرح تحریک تحلیل نفسی کے دستوں کے سربراہوں کے درمیان اقتدار کی کشاکش غیر محسوس طریقے سے شروع ہوگئی۔ فرائیڈ، ژنگ اور ایڈلر تینوں ایک دوسرے پر غلبہ پانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔

ایڈلر ایک بلند حوصلہ ذہین اور قابل شخص تھا لیکن اس کے جو نفسیاتی نظریات تھے ان سے فرائیڈ خوش نہیں تھا۔ اسی طرح ایڈلر اس کے نظریات کو نہیں مانتا تھا اور لاشعور کی طرف توجہ بھی نہیں دیتا تھا۔ ایڈلر کے اپنے پیروکاروں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہو چکا تھا جو زیادہ تر سوشلسٹ اور فرائیڈ کے کٹر مخالف تھے۔ فرائیڈ اور ایڈلر کے حامیوں کے درمیان شدید جھگڑے ہونے لگے۔ فرائیڈ نے بہت چاہا کہ مصالحت ہو جائے مگر اسے ناکامی ہوئی لہٰذا تھک ہار کر فرائیڈ نے ایڈلر سے کہا کہ وہ اپنے نظریات اپنے مخالفین کے سامنے پیش کرے۔ اس کے لیے اسے تین دن دیئے گئے چنانچہ تین دن تک مسلسل ایڈلر اپنے حامیوں اور مخالفوں کے سامنے اپنے نظریات کی وضاحت کرتا رہا۔ اس کے بعد ان نظریات پر بحث و تمحیص کا دروازہ کھل گیا جو جلد ہی تلخی کا رنگ اختیار کر گیا۔ اس صورت حال سے گھبرا کر ایڈلر نے سوسائٹی سے استعفیٰ دے دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے بیشتر حامی بھی مستعفی ہوگئے۔

1911ء میں جب چوتھی کانگریس منعقد ہوئی تو تحلیل نفسی کی فضاؤں میں ایک مرتبہ پھر جنگ کے بادل چھانے لگے۔ اسی دوران ژنگ کی ایک کتاب شائع ہوئی جس سے اس نے خوابوں کو الہامی درجہ دیا تھا۔ اس کتاب کی اشاعت سے فرائیڈ بے حد برافروختہ ہوا کیونکہ وہ خوابوں کو الوہیت کا درجہ دینے کے خلاف تھا۔ اس نے کانگریس میں اس کتاب کی مذمت کی اور اس کتاب کے حامی اور مخالف اراکین کو باہم مباحثے کی دعوت دی گئی۔ یہ مباحثہ کم اور لڑائی جھگڑا زیادہ تھا۔

اس نے ژنگ سے بڑی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں لیکن اسے سخت مایوسی ہوئی۔ اسے ژنگ پر شدید غصہ تھا کیونکہ اس جھگڑے کے پیچھے اس کی سازشیں کام کر رہی تھیں۔

ژنگ اور اس کے راستے الگ ہوگئے۔

ژنگ سے علیحدگی اس کے لیے ناخوشگوار ترین سبق تھا۔ یہ صدمہ اسے عمر بھر رہا۔

ایڈلر اور ژنگ اس کے دو سپاہی تھے۔ یہ دونوں جب ہاتھ سے نکل گئے تو تحلیل نفسی کی تحریک کو سخت دھچکا پہنچا مگر اس میں اتنی جان تھی کہ پھر بھی زندہ رہی۔

فرائیڈ نے اپنے باپ کی موت کے بعد عزم کیا تھا کہ اب وہ کسی سرپرست کو تلاش نہیں کرے گا لیکن ژنگ اور ایڈلر کے چلے جانے کے بعد اس نے یہ عزم کیا کہ اب وہ کسی کو اپنا جانشین نہیں بنائے گا اور نہ کسی سے توقعات وابستہ کرے گا۔

اس کی عمر ستاون سال تھی۔ ایک مرتبہ وہ پھر تنہا رہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

گیا۔ اس وقت اس کے چھ بچے اور ایک بیوی تھی لیکن وہ اکیلا تھا۔ اپنے اندر اکیلا۔

یہ تنہائی اس کے لیے نئی چیز نہیں تھی۔ وہ بچپن سے اکیلا اور سب سے الگ تھلگ تھا۔ اسے اپنی بیوی سے بھی کوئی ایسی جذباتی وابستگی نہیں تھی۔ جسمانی تقاضے پورے کرنے کے سوا بیوی سے اسے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس نے اپنی ماں کو اس انداز میں دیکھا تھا کہ اس کا باپ ایک جابر مرد تھا اور ماں کا ایمان شوہر، گھر اور بچوں کی نگہداشت تھا۔ وہ بھی اپنی بیوی سے یہی توقع رکھتا تھا۔ کبھی کبھی اپنے اس رویے پر پشیمان بھی ہوتا تھا۔ اس کے دوستوں پر بھی اس کا یہ مزاج عیاں تھا۔ وہ بھی اس کے اس خودغرضانہ رویے پر اسے ملامت کیا کرتے تھے۔ یہ ضرور تھا کہ اسے اپنے بچوں سے بے پناہ محبت تھی لیکن اس محبت میں وہ بہت محتاط تھا۔ وہ اکثر اپنے بچوں کے ساتھ کھیلتے یا انہیں سیر کرانے کے لیے اپنا کام ادھورا چھوڑ دیا کرتا تھا۔ اپنے باپ کی طرح وہ بھی اپنے بچوں سے توقع کرتا تھا کہ وہ اس کا احترام کریں۔ ان بچوں سے یہ بھی توقع رکھتا تھا کہ وہ مکمل یہودی بنیں، سائنسی اعتبار سے وہ ہر مذہب کو رد کر چکا تھا۔ مذہب اس کے نزدیک صرف شناخت کے لیے تھا اور اس کی شناخت تھی یہودی ہونا، وہ اپنے بچوں کی بھی ایسی تربیت کر رہا تھا جو انہیں یہودی بنا دے۔ عبادت گزار یہودی نہیں بلکہ محض یہودی۔ غیر یہودیوں کے مقابلے میں شناخت کی حد تک یہودی۔

وہ اپنے بچوں کی طرح اپنے شاگردوں میں بھی حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی اور خود پسندی کو پسند نہیں کرتا تھا۔ ژنگ کے رخصت ہو جانے کے بعد تو وہ اور بھی محتاط ہو گیا تھا۔ اس کی مصروفیات بھی بڑھ گئی تھیں۔ تحلیل نفسی کی تمام تر ذمہ داریاں اس کے کندھوں پر آ گئی تھیں۔ اپنے مخلص شاگردوں کے ذریعے اس تحریک کو آگے بڑھا رہا تھا۔ اسے اس سلسلے میں خاصی کامیابی ہوئی تھی۔ اس نے لاشعور کی طاقت کو منوا لیا تھا۔

لاشعوری ذہن کی طاقت کی دریافت کے ساتھ ہی فرائیڈ کے لیے فزیالوجیکل نفسیات کے دور کا خاتمہ ہو گیا اور اس نئے دور کا آغاز ہوا جو انسانی زندگی کے اسرار کی دریافتوں سے تعلق رکھتا ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے آغاز کے ساتھ ہی فرائیڈ کے نظریات کی قبولیت کا دور شروع ہو گیا۔ تحلیل نفسی کے بارے میں لوگوں میں جو اختلافات تھے وہ ختم ہوتے گئے۔ دباؤ اور مزاحمت کے نظریات کی مدافعت کی مختلف صورتیں مثلاً ردعمل، تذلیل اور پُرفریب توجیح وغیرہ سب تسلیم کر لیے گئے۔ البتہ ایڈی پس الجھاؤ کے متعلق فرائیڈ نے جو نظریہ پیش کیا تھا وہ بدستور متنازعہ تھا۔

فرائیڈ نے یہ نظریہ بھی پیش کیا تھا کہ انسان کو ذہنی مریض بنانے میں وراثت سے زیادہ اس کے ماحول کا حصہ ہوتا ہے۔

جنگ عظیم شروع ہوئی تو اس کی مصروفیات بھی متاثر

قارئین متوجہ ہوں
پرچا نہیں ملتا
کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔
☆ بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔
رابطے اور مزید معلومات کے لیے
ثمر عباس 0301-2454188
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی
مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں
35802552-35386783-35804200
ای میل: jdpgroup@hotmail.com

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ہونے لگیں۔ وہ کسی معقول وجہ کے باوجود بھی جنگ کو ضروری سمجھنے کے خلاف تھا۔ وہ جنگوں کو مقاصد کے حصول کا ذریعہ نہیں بلکہ انسانیت کا قتل عام سمجھتا تھا۔

اسے ایک ذاتی دھچکا یہ لگا کہ جنگ چھڑتے ہی لازمی فوجی ملازمت کی اسکیم آ گئی۔ اس اسکیم کے تحت اس کے دو بیٹوں مارٹن اور اولیور کو بھی جرمنی کی طرف سے فوج میں بھرتی کرلیا گیا۔ فرائیڈ نے جب انہیں جنگ کے لیے رخصت کیا تو وہ یہ سوچ کر سخت افسردہ تھا کہ انہیں محاذ جنگ سے زندہ سلامت واپس آنا نصیب بھی ہوتا ہے یا نہیں۔

دوسرا دھچکا یہ تھا کہ تحلیل نفسی تحریک کی سرگرمیاں ماند پڑ گئیں کیونکہ اس کے بیشتر پیروکار اور شاگرد محاذ پر بھجوا دیئے گئے۔

جنگ نے طول کھینچا تو وی آنا میں خوراک اور ایندھن دونوں کی شدید قلت ہوگئی۔ فرائیڈ کی اسٹڈی برف خانہ بنی رہتی تھی۔ اشیائے خورونوش کی کمی کے سبب مارتھا کو گھر کی غذائی ضروریات پوری کرنے میں اپنے سگھڑاپے اور حسن انتظام کے باوجود اکثر شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

☆.....☆

وہ جنگ کے دوران اپنے بیٹوں کو خواب میں دشمن سپاہیوں سے لڑتے، زخمی ہوتے اور مرتے ہوئے دیکھا کرتا تھا لیکن ان برے خوابوں کی تعبیر الٹی نکلی۔ اس کے دونوں بیٹے زندہ سلامت جنگ کے خاتمے پر گھر لوٹ آئے۔

وہ مطمئن ہوگیا۔ وطن پرستی کا جو جذبہ کچھ دنوں کے لیے سرد پڑ گیا تھا پھر سے اس کا لہو گرمانے لگا۔ وہ پھر یہ کہتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ''میری زبان جرمن ہے میرا کلچر جرمن ہے لیکن پھر اچانک جرمن اور آسٹریلین میں یہودیوں کے خلاف نفرت اور تعصب کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ایک مرتبہ پھر یہ کہنے پر مجبور ہوگیا۔ ''میں نہ جرمن ہوں نہ آسٹریلوی، میں تو صرف ایک یہودی ہوں۔'' اس کے باوجود اس کے فلسفوں تصورات و تفکرات اس کے طرز تحریر معاشرت سب میں جرمن اثرات نمایاں تھے۔ اسے جرمن ہونے پر فخر تھا لیکن جنگ کہیں بھی ہو وہ اس کا مخالف تھا۔ اس نے اپنے خیالات کی ترسیل کے لیے ایک کتابچہ تحریر کیا جس میں اس نے لکھا۔

''جنگ، بنی نوع انسان کے قتل عام، دنیا کی آبادی کم کرنے اور اس کے حسن کو غارت کرنے کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس کے نتائج شرح اموات میں زیادتی، وبائی امراض کے پھیلاؤ، بھوک اور غربت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ایک جنگ کے بعد تباہ شدہ ملک کو دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں بڑا عرصہ لگا کرتا ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ جنگیں نہ لڑی جائیں۔''

اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا رہا کہ ہمیں اس اُمید پر زندہ رہنا چاہیے کہ ہسٹری کا غیر جانب دارانہ فیصلہ یہ ثبوت مہیا کردے گا کہ یہ قوم جس کی زبان میں ہم لکھ رہے ہیں اور جس کی فتح کے لیے ہمارے عزیز برسرپیکار ہیں ایک ایسی قوم تھی جس نے بین الاقوامی قوانین کی سب سے کم خلاف ورزی کی۔

کٹر یہودی ہونے کے باوجود اس کی اپنی نفسیات یہ تھی کہ اس کے دل میں یہودیت ترک کرنے کی خواہش ابھرتی تھی۔ اس کام کے لیے اس نے روم جانے کا ارادہ کیا لیکن اس کے ساتھ ہی اس کے دل میں یہ خیال بھی ابھرتا تھا کہ اس طرح وہ اپنی قوم اور خاندان سے غداری کا مرتکب ہوگا۔ وہ خود شعور ولاشعور کے نظریے کا شکار ہوگیا۔ اس کی یہ خواہش اس کے لاشعوری ذہن کے نہاں خانوں میں دبی رہی۔ وہ روم گیا ضرور لیکن اس سیاحت کے دوران وہ صرف ایک چیز سے متاثر ہوا اور یہ تھا مائیکل انجلو کا بنایا ہوا حضرت موسیٰؑ کا مجسمہ تھا۔ مسیحت کی جائے پیدائش اور مضبوط مرکز میں اپنے پیغمبر کا مجسمہ دیکھ کر فرائیڈ کی عجیب حالت ہوئی۔ اس مجسمے نے مسیحیت کے ہاتھوں پہنچنے والے زخموں پر مرہم رکھ دیا۔

اسے اپنے آپ میں اور موسیٰ علیہ السلام میں سخت مشابہت نظر آئی۔ اس کے باغی پیروکاروں نے اس کی تعلیمات کو جھٹلا دیا تھا بالکل اسی طرح جس طرح موسیٰ علیہ السلام کا مجسمہ بنانے والوں نے مجسمہ تو بنا دیا لیکن اسے جھٹلا دیا جبھی تو مسیحیت وجود میں آئی۔

فرائیڈ کے پیروکاروں کو بھی موسیٰ علیہ السلام اور فرائیڈ میں مشابہت نظر آئی۔ ان کے نزدیک موسیٰ علیہ السلام کے مانند فرائیڈ بھی انسانیت کا ایک مخلص رہنما تھا۔ اسے اپنے مشن کا بخوبی علم تھا۔ اسے بھی موسیٰ علیہ السلام کے مانند بے شمار رکاوٹوں اور مشکلات و مصائب کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جن لوگوں کو فرعون سے نجات دلائی تھی ان لوگوں نے ان کی عدم موجودگی میں ان کی تعلیمات کو پس پشت ڈال کر سامری کی اطاعت قبول کرلی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام انہیں دوبارہ راہِ راست پر لائے تھے۔ فرائیڈ بھی اپنے لیے یہی چاہتا تھا کہ اس کے بعد

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

http://paksociety.com

عہدِ وفا

ایمان پریشے کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا مُنفرد ناول، مُحبت کی داستان جو معاشرے کے رواجوں تلے دب گئی، پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

بُجھ نہ جائے دِل دیا

سعدیہ عابد کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا شاہکار ناول، مُحبت، نفرت، عداوت کی داستان، پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

قفس کے پنچھی

سعدیہ عابد کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا شاہکار ناول، علم و عرفان پبلشرز لاہور کے تعاون سے پاکستان انٹرنیشنل بُک فیئر میں (3 تا 7 اگست 2017)، **کتابی شکل** میں جلوہ افروز ہو رہا ہے، خریدنے کے لئے تشریف لائیں۔ آن لائن پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

جہنم کے سوداگر

مُحمد جبران (ایم فِل) کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا ایکشن ناول، پاکستان کی پہچان، دُنیا کی نمبر 1 ایجنسی آئی ایس آئی کے اسپیشل کمانڈو کی داستان، پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

شہیدِ وفا

مُسکان احزم کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا ناول، پاک فوج سے مُحبت کی داستان، دہشت گردوں کی بُزدلانہ کاروائیاں، آرمی کے شب و روز کی داستان پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

آپ بھی لکھئے:

کیا آپ رائٹر ہیں؟؟؟۔ آپ اپنی تحاریر پاک سوسائٹی ویب سائٹ پر پبلش کروانا چاہتے ہیں؟؟؟
اگر آپکی تحریر ہمارے معیار پر پُورا اُتری تو ہم اُسکو عوام تک پہنچائیں گے۔ مزید تفصیل کے لئے یہاں کلک کریں۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام، پاکستان کی سب سے زیادہ وزٹ کی جانے والی کتابوں کی ویب سائٹ، پاکستان کی ٹاپ 800 ویب سائٹس میں شُمار ہوتی ہے۔

Downloaded from Paksociety.com

اس کی تحریک تحلیل نفسی کی ترویج و ترقی کا سلسلہ آگے بڑھتا رہے جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد لوگوں کو گمراہی سے بچانے کے لیے پیغمبروں کا سلسلہ چلتا رہا۔

مسیحیت قبول کیے بغیر وہ اس غریب یہودی کے مانند تھا جس کے پاس کارلزبیڈ کا ٹکٹ خریدنے کے لیے رقم نہیں تھی۔ اس کے نزدیک یہ دنیا جہنم تھی جو یہودیوں کے لیے مخصوص کردی گئی تھی۔ ایک موقع پر اس نے کہا تھا مجھے یہودیت کے بوجھ سے چھٹکارا حاصل کرنے میں بلاشبہ بڑی مسرت ہوگی۔ اس طرح میں خود کو ہلکا پھلکا اور آزاد محسوس کروں گا مگر میں بھلا اپنے یہودی آباؤ اجداد کی مذمت کر سکوں گا؟ وہ یہودیت کو ترک نہ کرسکا۔

نازیوں کا طوفان وی آنا بڑھتا چلا آرہا تھا اور یہودیوں کو چن چن کر ہلاک کیا جارہا تھا۔ فرائیڈ اپنی اسٹڈی میں بند عہد نامہ قدیم کی تجزیاتی ترجمانی کے کام میں مصروف تھا۔ وہ ایک کتاب ترتیب دے رہا تھا۔ (یہ پروجیکٹ پورا ہونے سے قبل ہی اس کا انتقال ہوگیا)۔

ذہنی پریشانیوں کے بعد اب اسے جسمانی عارضوں کا سامنا ہوا۔ وہ اپنے جبڑے میں سخت تکلیف محسوس کررہا تھا۔ ڈاکٹروں نے سرطان تجویز کیا۔ اس نے اس مرض کو پوشیدہ رکھنے کے لیے دوستوں کو کھانے پر بلانا ترک کردیا۔ معاشرتی تقریبات تو اس کی زندگی ہی سے خارج تھیں مگر اب تو وہ بالکل گوشہ نشین ہوگیا۔

اس کا دل اپنے اس گھر سے بھی اچاٹ ہوگیا جس میں وہ رہ رہا تھا۔ اس نے رہائش گاہ تبدیل کردی۔ اس کے جبڑے پر پھر سرطان کا حملہ ہوا۔ اس کے جبڑے کے کئی آپریشن ہوئے۔ ڈاکٹروں نے ہدایت کی تھی کہ وہ سگار نوشی ترک کردے مگر وہ اسے ترک نہ کرسکا اس کی تکلیف بڑھتی جارہی تھی۔ اسے بار بار آپریشن کی تکلیف سے گزرنا پڑ رہا تھا۔

وہ شخص جس نے تحلیل نفسی کا نظریہ اور اس کا طریقہ کار دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔ اپنی زندگی کے نصف آخر میں اس کی افادیت کے بارے میں مایوس ہو چکا تھا۔ اسے تحلیل نفسی سے بہ حیثیت ذریعہ علاج دلچسپی نہ رہی تھی۔ اب اسے اس کی یہ حیثیت نظریاتی علم ترقی میں زیادہ دلچسپی ہوگئی تھی۔

☆.....☆

اس کے سائنسی نظریات اور مذہب کے بنیادی فلسفے آپس میں ٹکراتے تھے اس لیے اہل کلیسا اس سے ناراض رہتے تھے۔ اس کے اخلاقی نظریات ایسی فضا میں پروان چڑھ رہے تھے جس میں خالص یہودی اخلاقیات کا سبق دیا گیا تھا۔ اہل کلیسا کی ناراضی کا ایک سبب یہ بھی تھا۔

اس کے لیے گھر میں بھی کوئی خوشگوار فضا نہیں تھی۔ اس نے جو اصول وضع کررکھے تھے وہ اس کی بیوی کو کبھی تسکین نہ دے سکتے تھے۔ فرائیڈ نے اسے بے زبان خادمہ کے سوا کسی روپ میں نہ دیکھا تھا۔ وہ لاشعوری طور پر اپنی بیوی میں وہ ہستی تلاش کرتا رہا جو اسے ماں کا پیار دے سکے۔ اس کی ماں اب بھی زندہ تھی مگر بہت بوڑھی ہوچکی تھی اور اسے جوان ماں درکار تھی حالانکہ اب مارتھا (بیوی) بھی جوان نہیں رہی تھی۔

اس نااتفاقی کے باوجود ان کے درمیان بھی شدید لڑائی جھگڑا نہیں ہوا کیونکہ فریقین مہذب تھے جو طبیعتوں کے تضاد کے باوجود نباہ کرنا چاہتے تھے۔

☆.....☆

پہلی جنگ عظیم ختم ہونے کے بعد ایک طریقہ علاج کی حیثیت سے طبی دنیا کی توجہ تحلیل نفسی کی جانب مبذول ہو گئی تھی لیکن ایسے لوگوں کی تعداد بھی کم نہیں تھی جو اس میں شامل جنسی نظریات کی وجہ سے اسے تسلیم کرتے ہوئے ہچکچاتے تھے۔

اس موقع پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تحلیل نفسی کیا ہے۔ اس کا جواب یہی ہوسکتا ہے کہ تلازم افکار کو ایسے طریقے سے بروئے کار لانے کو تحلیل نفسی کہتے ہیں جس میں دبے ہوئے خیالات و جذبات اور ان کی صحت کا اقرار کیا جاتا ہے۔ اس طریقۂ علاج میں مریض اپنے معالج سے مکمل تعاون کرتا ہے لیکن ہپناٹزم کے طریق علاج میں مریض و معالج میں اس قسم کا تعاون نہیں پایا جاتا تھا کیونکہ مریض کو اپنے آپ پر کوئی اختیار ہی نہیں ہوتا تھا۔ وہ نیند کی حالت میں ہوتا تھا اس حالت میں نہیں ہوتا تھا کہ غور و فکر کرسکے، وہ تو معالج کی ہدایات پر عمل کرتا تھا۔

تحلیل نفسی کا بنیادی کام ہی یہ ہے کہ وہ دبائے ہوئے تصورات کو لاشعور کی گہرائیوں سے نکال کر شعور میں لائے تاکہ مریض ان کو عقلی طور پر سمجھ کر ان کا حل دریافت کر سکے۔ اس طرح سے فرد جس ذہنی تناؤ کا شکار ہوتا ہے تناؤ کی وہ قوت کمزور پڑ جاتی ہے۔

تحلیل نفسی کے لیے دو قسم کے طریقہ کار استعمال کیے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

جاتے ہیں۔ایک تلازمی طریقہ دوسرا خوابی طریقہ۔

تلازمی طریقہ یہ ہے کہ مریض کو ایک آرام دہ بستر یا کوچ پر لٹا دیا جاتا ہے اور مریض کو کوئی لفظ یا خیال گفتگو کے نقطہ آغاز کے طور پر دے دیا جاتا ہے۔مریض کو یہ ہدایت کی جاتی ہے کہ اس لفظ یا خیال سے وابستہ جو تصورات اس کے ذہن میں موجود ہیں انہیں وہ بغیر کسی داخلی رکاوٹ کے بیان کرتا جائے۔ ضروری ہے کہ وہی لفظ یا خیال وابستہ تصورات تک رسائی حاصل کی جاتی ہے اور پھر ان تصورات سے وابستہ مزید تصورات تک رسائی حاصل کی جاتی ہے اور پھر ان تصورات سے مزید تصورات تک۔ بالآخر یہ سلسلہ لاشعور تک پہنچ جاتا ہے۔

اس طریقے کی بنیاد شعور و لاشعور کی کشمکش پر استوار ہے۔

دوسرا طریقہ خوابی طریقہ ہے۔تحلیل نفسی کے عمل میں خوابوں کی اہمیت خود فرائیڈ نے اس طرح بیان کی ہے۔

''خوابوں کی تشریح و تحلیل دراصل لاشعور کی تشریح کے مرادف ہے۔یہ تحلیل نفسی کا سب سے کارآمد ذریعہ ہے اور ایک ایسی شے ہے جس کے بارے میں ہر کارکن کو تعلیم و ترتیب حاصل کرنی چاہیے۔اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ تحلیل نفسی کیسے کی جاتی ہے تو میں اسے خوابوں کے مطالعے کا مشورہ دوں گا۔''

فرائیڈ کے خیال میں خواب بہت سی دوسری خصوصیات کے مکمل ہونے کے علاوہ فرد کے دبے ہوئے طفلانہ رجحانات اور دبائی ہوئی خواہشات کی تکمیل کا بہترین اور پوشیدہ راستہ ہے۔مریض کے لاشعور میں چند ایسی خواہشات ہوتی ہیں جن کی آسودگی نہ تو سماجی ضمیر اجازت دیتا ہے اور نہ تہذیب اجازت دیتی ہے اس لیے نیند کے دوران جب ضمیر و تہذیب کی گرفت کمزور پڑ جاتی ہے تو پوشیدہ انداز میں اس کی آسودگی ضروری ہو جاتی ہے۔ خواب دیکھنے والے کی لاشعوری خواہشات اس کے خوابوں میں ظاہر ہوتی ہیں لہٰذا خوابوں کی اہمیت کو تسلیم کرنے کے سلسلے میں یہ لازم سمجھا جاتا ہے کہ مریض کے خواب کی تحلیل کی جائے۔

خوابوں کی تشریح و تحلیل کا عمل آزاد تلازم سے کہیں زیادہ مشکل ہے کیونکہ اگر مریض کو یہ احساس ہو جائے کہ تحلیل کا تمام دارو مدار خوابوں پر ہے تو مزاحمت کی بنا پر خواب نظر آنا بند ہو جاتے ہیں یا گمراہ کن خواب نظر آنے لگتے ہیں لہٰذا اس سلسلے میں ان خوابوں کو بہت اہمیت حاصل ہوتی ہے جو یا تو مریض بچپن سے ہی دیکھتا آرہا ہو یا بچپن کے وہ خواب جن کو وہ کبھی فراموش نہ کر سکا ہو۔

فرائیڈ کو جدید نفسیات میں تحلیل نفسی کا بانی سمجھا جاتا ہے۔تحلیل نفسی کا انسان پر سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے ذہنی بیماریوں کا علاج دریافت کیا۔یہ ایک ایسا طریقہ علاج ہے جس کے ذریعے طبیب بیماریوں اور عصبی بیماریوں کا علاج دریافت کر سکتا ہے۔

اگر فرائیڈ کے نظریہ خواب کو دیکھا جائے تو وہ بڑا جرأت مندانہ ہے۔اس نے اپنے نظریے میں ہزاروں سال پرانے نظریات کو جھٹلایا ہے۔(شاہدہ ارشد)

1920ء سے لے کر 1925ء کا درمیانی عرصہ تحریک تحلیل نفسی کے انتہائی پھلتے پھولتے اور ترقی کا زمانہ تھا۔اس دوران کے منصوبوں پر پوری طرح عمل کیا گیا۔ ترویج و ترقی کا کام آگے بڑھتا رہا۔بے شمار نئے کارکن شامل ہوئے۔

1926ء میں پہلی مرتبہ وی آنا میں اس کی سالگرہ بڑی شان و شوکت سے منائی گئی۔اس کی یہ 75ویں سالگرہ تھی جو وی آنا کے علاوہ لندن اور نیویارک میں بھی منائی گئی۔اس سالگرہ کے ذریعے عمر بھر کی مخالفتوں اور دشمنیوں نے اس کے لیے محبت و عقیدت کا روپ دھارا۔

فرائیڈ نے اپنے اعزاز میں منعقد ہونے والی کسی بھی تقریب میں شرکت نہ کی اور نہ ہی کوئی اعزاز قبول کرنے بذات خود گیا۔اس کی جگہ اس کی بیٹی اینا نے جا کر تمام اعزازات قبول کیے۔اس نے ملاقاتیوں اور رشتے داروں سے ملنے سے بھی انکار کر دیا تھا اور اپنے آپ کو اپنے کمرے میں بند کر لیا تھا۔

اس کی سالگرہ کے دس دن بعد اس کی بوڑھی ماں کا 93 سال میں انتقال ہو گیا۔

دنیا اب اس کے نظریات کو قبول کرنے لگی تھی۔ایڈی پس کمپلیکس اور بچوں کی نفسیات، جنسی نظریات، شعور، لاشعور، نیم شعور، انا، لیبڈو، خوابوں کی تعبیر کے بارے میں اس کے پیش کردہ نظریات وغیرہ قبول عام کی سند پا گئے تھے۔

اس کے جنسی نظریات کی ترویج امریکی معاشرے میں خوب ہوئی اور اس پر کھلے عام بحث کی جانے لگی۔ایک مصنف نے اپنی کتاب ''ڈراک لاٹمر'' میں لکھا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''اگر تم انسانی زندگی کے بارے میں کچھ جاننا چاہتے ہو تو ڈاکٹر فرائیڈ کی کتب کا مطالعہ کرلو۔ امریکی ناول نگاروں کی اکثریت فرائیڈ کی دو کتابوں Totem and taboo اور Three contribution to theory of sex سے زیادہ متاثر ہوئی تھی۔''

فرائیڈ کے کاموں نے مصنفین کی نظروں کا رخ انسان کے اندرون کی طرف پھیر دیا تھا۔ اب جو کہانیاں اور ناول لکھے جانے لگے تھے۔ وہ نفسیات انسانی کی انتہائی گہرائیوں اور باریکیوں کی خبر لانے لگے تھے یعنی ان میں نفسیات انسان کی ہر خصوصیت کا احاطہ ہوتا تھا۔ ان میں تحلیل نفسی کے اصولوں کو خاص طور پر مدنظر رکھا جاتا تھا۔

فرائیڈ کے نظریہ تحلیل نفسی سے گہرا اثر قبول کرنے والے امریکی مصنفین میں روز میکالے کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اسی طرح آلڈس ہکسلے کی Antic Hay اور سوزان گلاسیل کا ڈراما Suppressed desires بھی انہی خطوط پر تحریر کیے گئے۔

1930ء کی دہائی میں اس کی شہرت میں اضافہ ہونا شروع ہوا۔ اس کی دریافتوں کی شہرت پر لگا کر پرواز کرنے لگی۔ اس کے ہم عصر بڑے بڑے لوگ مثلاً آئن اسٹائن تھامس، مین اور رومین رولینڈ اس سے خط کتاب کرنا باعث فخر سمجھنے لگے۔

آرٹ اور لٹریچر کے علم برداران تحریکات اور محرکات کا تجزیہ کرنے لگے، جنہیں فرائیڈ نے دریافت کیا تھا۔ لاشعوری ذہن کے اعمال پر سب سے زیادہ بحث کی جانے لگی۔ مصنفین اور فنکاروں کے لیے تحلیل نفسی کا انکشاف کسی انقلاب سے کم نہ تھا۔ یہ دریافتیں کچھ اس طرح اثر انداز ہوئی تھیں کہ اس زمانے کو فرائیڈ کا دور کہا جانے لگا۔

1930ء کے آتے آتے دنیا میں دو آدمیوں کے نظریات پوری شدومد کے ساتھ شرف قبولیت حاصل کرتے جارہے تھے۔ ایک تو فرائیڈ کا نظریہ تحلیل نفسی اور دوسرے کارل مارکس کے لادینی نظریات۔ ان دونوں میں شدید اختلاف تھا۔ مارکسٹوں کو نظریہ تحلیل نفسی سے نفرت تھی۔ پھر پریس اور کلیسا بھی تھے جو تحریک تحلیل نفسی کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ اس پر مزید ستم اس کے نظریہ جنس پیش کرنے پر ہوا تھا۔ فرانس میں ایک کتاب شائع ہوئی جس میں فرائیڈ کو ہٹلر کہا گیا تھا۔

اس پر حملے جاری رہے مگر ساتھ ہی فرائیڈ اور اس کی تعلیمات کو بہتر طور پر سمجھنے کی راہیں بھی ہموار ہوتی رہیں۔ اس کی تعلیمات تخلیقی تو بڑی پر اثر انداز ہوتی رہیں۔

فرائیڈ کی دریافتوں نے مصوری، رقص، تھیٹر اور موسیقی کو بھی متاثر کیا۔ اب تحلیل نفسی کو کفر، کالا جادو اور بدروحوں کا علم قرار دینے کا وقت گزر چکا تھا۔

☆.....☆

فرائیڈ نے اپنی تحقیقات اور دریافتوں سے نفسیاتی علوم میں اس قدر اضافہ کیا ہے کہ اس کی مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ وہ پہلا انسان ہے جس نے انسان کو سمجھنے کے لیے اس قدر کام کیا۔ پھر جو شخص بھی اس سرچشمے سے سیراب ہوا وہ بھی انسان کو سمجھنے لگا اور بنی نوع انسان کی الجھنوں کو کم کرنے میں مصروف ہوگیا۔ وہ قلم اور زبان سے برابر اپنا پیغام دنیا کو دیتا رہا۔

فرائیڈ لکھنے سے پہلے اپنے موضوع پر بے تحاشا غور کیا کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی تحریر میں کبھی کسی لفظ کو قلم زد نہیں کرتا تھا۔ اس کی محنت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس نے کئی کتابیں برسوں شائع نہیں کرائیں بلکہ انہیں بار بار لکھتا رہا۔

وہ کوئی نظریہ قائم کرنے سے پہلے اس پر خود بہت سے سوالات اٹھاتا تھا اور پھر ان کے حل کرنے کے بعد کسی نتیجے کو مرتب کرتا۔

بحث و تمحیص کے سلسلے میں اگر کوئی نقاد خلوص سے اس پر سوالات کرتا تو وہ بڑے تحمل سے ان کو سنتا اور جواب دیتا۔

فرائیڈ کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ جس موضوع سے اسے دلچسپی ہوتی وہ اس کے متعلق ہر کتاب اور مقالہ جو اسے میسر آتا پڑھ لیتا۔ اسے تاریخ سے بہت دلچسپی تھی اس کے بعد قدیم روم اور یونان کی زندگی اور آرٹ اس کی توجہ کا مرکز بنے۔ مصر، بابل اور شام کی تہذیب سے بھی اسے کافی لگاؤ تھا۔ جب بھی وہ پرانے مدفون شہروں کی کھدائی کی روداد پڑھتا تو اس کے دل میں وہاں کے حالات دریافت کرنے کا ایک جوش پیدا ہوجاتا۔ خود اس کے پاس نادرات قدیمہ کا کافی ذخیرہ تھا۔ اس نے ان نادرات کے ذریعے مختلف زبانوں میں مختلف قوموں کی ذہنی نشوونما کا اندازہ لگایا اور تحلیل نفسی کی روشنی ان ساری دلچسپیوں پر اثر انداز ہوتی تھی۔ جب وہ اپنے اسٹوڈیو میں کسی سے باتیں کررہا ہوتا تو ان نادرات میں سے کوئی چیز اٹھا لیتا اور نگاہیں اس پر گاڑ دیتا۔ ہاتھوں سے اسے چھوتا رہتا۔ اس طرز عمل سے وہ یہ بتا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

رہا ہوتا تھا کہ میں دنیا کو تحلیل نفسی کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔

فرائیڈ کی ساری دلچسپیوں کا مرکز انسانی ذہن تھا اور ان دلچسپیوں کا ایک حصہ کتابوں کا مطالعہ۔ یہ مطالعہ محض فنی کتابوں تک محدود نہیں تھا بلکہ اس نے دنیا بھر کے اعلیٰ وارفع ادب کو کھنگال ڈالا تھا۔ اسے جرمن کے علاوہ انگریزی اور فرانسیسی زبانوں پر پورا عبور تھا۔ اطالوی اور ہسپانوی زبانیں بھی وہ بڑی آسانی سے پڑھ لیتا تھا۔

انیسویں صدی کے جرمن کلچر پر گوئٹے چھایا ہوا تھا۔ وہ اس کی تصانیف کا دلدادہ تھا۔ اس کی لائبریری میں گوئٹے کی کتابوں کے اعلیٰ ایڈیشن موجود تھے۔ جب انقلاب کے بعد اشتراکی روس میں پہلی بار فرائیڈ کی کتابوں کا ترجمہ سرکاری طور پر شائع کیا گیا تو فرائیڈ کے ایک ساتھی نے اس پر خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ تجزیہ نفس نئے روس کی تشکیل پر کافی اثر انداز ہوگا۔ فرائیڈ نے اس کا بہت دلچسپ جواب دیا۔

''روسی لوگ پانی کی طرح ہیں جو ہر قسم کے برتن کو بھر دیتا ہے لیکن کسی شکل کو مستقل طور پر اختیار نہیں کرتا۔''

شیکسپیئر کا وہ بہت مداح تھا۔ ہملیٹ کے ڈرامے میں ایڈی پس الجھن میں موجود ہے جو فرائیڈ کی دلچسپی اور توجہ کا موجب بنی اور اس کا ذکر اس نے اپنی تصانیف میں کیا ہے۔

فرائیڈ کی شہرت سے کون انکار کرسکتا ہے لیکن خود فرائیڈ اس شہرت سے دور رہنا چاہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جوں جوں اس کا نام روشن ہوتا گیا وہ اور زیادہ اپنے کام میں کھو گیا۔ اسے ایسی جگہوں میں جانے سے کبھی مسرت نہ ہوتی جہاں اس کے نام کا ورد شروع ہو جاتا۔ اس کی عظمت سے بھی کوئی انکار نہیں کرسکتا اور اس عظمت کا باعث اس کی ذات کے ساتھ اس کا کام بھی تھا۔ اس کی شخصیت میں ایک پُراسرار طاقت ضرور تھی۔

☆.....☆

اس کے جبڑوں کی تکلیف نے اسے بے حال کر رکھا تھا۔ جب یہ تکلیف ناقابلِ برداشت ہوگئی۔ آپریشن کے بعد بھی کوئی افاقہ نہیں ہوا تو ڈاکٹروں نے یہی طے کیا کہ جبڑے کی ہڈی کا کچھ حصہ نکال دیا جائے۔ اسی پر عمل ہوا۔ جبڑے کا کچھ حصہ نکال دیا گیا۔ مصنوعی جبڑے کے ذریعے کھانا اور بولنا ممکن ہوسکا۔ اس کے باوجود جبڑے کے دبانے سے مسلسل درد ہوتا رہتا تھا۔ اسے اس درد کی پروا نہیں تھی لیکن اپنی اس معذوری سے سخت پریشان ہوگیا کہ گفتگو کرتے وقت الفاظ پوری طرح ادا نہ ہوتے تھے۔ وہ اپنی اس کمی کو برداشت نہ کرسکا اور گوشہ نشیں ہوگیا۔ اپنے خاندان کے افراد اور چند مخصوص لوگوں کے سوا کسی سے ملنا گوارا نہ کرتا۔ اور کھانا تو کسی کے سامنے کھا ہی نہیں سکتا تھا۔

اس کی بیماری کو مدنظر رکھ کر تحلیل نفسی کی مجالس اس کے گھر پر ہونے لگیں۔ ان مجالس میں اعلیٰ پیمانے کے مضامین پیش کیے جاتے اور ان پر خود فرائیڈ تبصرہ کرتا۔

ایک مجلس میں تبصرہ کرتے ہوئے اس نے اپنی زندگی کا نچوڑ پیش کردیا اور یہ اشارہ بھی پیش کردیا کہ اب وہ عمر کی کس منزل پر پہنچ گیا ہے۔

''میں نے پہاڑوں کو کھودا۔ ان میں سے اچھے اچھے کارآمد پتھر نکالے۔ انہیں کندھوں پر لادا اور اب اس سے ایک عمارت کی شکل نمودار ہونے لگی ہے۔ یہ کام بہت سخت تھا بہرحال برا بھلا جو ہوسکا میں نے کیا۔ اب یہ آپ لوگوں کا کام ہے کہ آپ اس عمارت کو خوب صورت بنانے کے لیے جو رنگ روغن پسند کریں اسے مزین کریں۔''

اس میں ایک تبدیلی اور نمایاں ہوئی تھی۔ اس کے تعلقات انسانوں سے کم ہوتے جارہے تھے۔ ان کی جگہ کتوں نے لے لی تھی۔ اسے کبھی کتوں کا شوق نہیں رہا تھا البتہ وہ ایک کتے کا واقعہ بار بار دہراتا تھا۔

''میرے ایک مریض کے پاس چینی نسل کا کتا تھا۔ جونہی میں مریض کو لے کر کمرے میں داخل ہوتا وہ کتا بھی آجاتا اور کمرے میں ایک خاص جگہ جا کر بیٹھ جاتا۔ جب تک تجزیہ نفس کا عمل جاری رہتا، کتا وہاں بیٹھا رہتا۔ کیا مجال ہے کہ اس عرصے میں اس کے منہ سے کوئی آواز بھی نکلے۔ جونہی وقت ختم ہونے کو آتا کتا اپنی جگہ سے اٹھتا اور آقا کے قریب آکر اسے یوں دیکھنے لگتا جیسے کوئی کہہ رہا ہو بس کیجیے اب بہت وقت ہوگیا۔''

فرائیڈ کی بیٹی کتوں سے پیار کرتی تھی۔ اس کے پاس ایک السیشن نسل کا کتا تھا۔ اگرچہ بہت خوب صورت تھا لیکن شور بہت مچاتا تھا۔ اس کے باوجود جب فرائیڈ کو کتوں کا شوق ہوا تو وہ اس کتے سے مانوس ہوگیا۔ اپنی تنہائی دور کرنے کے لیے اس کی شرارتوں سے لطف اندوز ہونے لگا۔ اس دوران یونان کی شہزادی ''میری'' (جو نپولین کے بھائی اوسٹین کی پوتی تھی) اس کی شاگرد ہوگئی۔ وہ تحقیقات کے سلسلے میں بہت اچھا کام کررہی تھی اور فرائیڈ کے گھر اکثر اس کا آنا جانا ہوتا تھا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

فرائیڈ نے اس کے سامنے بھی چینی نسل کے اس کتے کا ذکر کیا اور وہ واقعہ سنایا جو وہ اکثر سنایا کرتا تھا۔ شہزادی کو خود بھی کتوں کا شوق تھا۔ اس نے وعدہ کرلیا کہ وہ اس کے لیے چینی نسل کا کتا لائے گی۔

''آپ کہاں اس زحمت میں پڑیں گی۔ اس نسل کا کتا ڈھونڈیں اور میرے لیے لائیں۔'' فرائیڈ نے اس سے کہا۔

''مجھے ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''

''کیا وہ چین سے خود چل کر آپ کے پاس آئے گا؟''

''اسے بھی یہ زحمت کرنی نہیں پڑے گی۔'' شہزادی نے ہنس کر کہا۔ ''اس لیے کہ اس نسل کا کتا خود میرے پاس ہے۔ اب وہ آپ کے پاس رہے گا۔''

''کیا وہ یہ جدائی گوارا کرلے گا۔''

''اس نسل کے کتے کی یہی تو خوبی ہے۔ عام طور پر یہ کہاوت مشہور ہے کہ بلی گھر کی کتا مالک کا لیکن جب میں اپنے کتے سے کہہ دوں گی کہ اب تمہیں اس نئے گھر میں رہنا ہے تو وہ احتجاج نہیں کرے گا۔''

شہزادی نے وہ کتا بطور تحفہ اسے دے دیا۔ یہ کتا ''شاہی آداب'' سے پوری طرح واقف تھا۔ چند ہی روز میں فرائیڈ کو یہ کتا بہت محبوب ہوگیا۔ ہر وقت اس کے ساتھ رہنے لگا۔ گفتگو کے دوران بھی وہ اس کے پاس ہی بیٹھا رہتا۔ پہلے گفتگو کرتے ہوئے اپنی انگوٹھی سے کھیلتا رہتا تھا اب اس کتے سے کھیلتا رہتا۔

عمر کا کارواں چلا جارہا تھا۔ آخری منزل قریب آرہی تھی۔ اس کے اعزہ اقارب ہر ممکن کوشش کرتے کہ اسے آرام پہنچا سکیں۔ اس کی خدمت گزاری بھی ہورہی تھی لیکن عمر پر کسے اختیار، اسے تو بڑھنا ہے۔

آخری ایام میں اس نے حضرت موسیٰ پر ایک تحقیقاتی کتاب لکھنا شروع کی جس کا نام ''موسیٰ اور وحدت پرستی'' تھا۔ یہ کتاب 1936ء میں لکھی جارہی تھی۔ یہ اس کی عمر کا 80واں سال تھا۔

اسے موت سے شدید نفرت تھی لیکن اپنی تمام تر عقلیت پسندی کے باوجود موت سے مفر بھی ممکن نہیں تھا۔ اس نے موت کو گوارا کرنے کا جواز بھی خوب نکالا تھا۔ وہ کہتا تھا، آسمانی قوتیں خاصی مہربان ہوتی ہیں جو ہماری ڈھلتی عمر کو پہنچنے کے ساتھ ساتھ زندگی ہمارے لیے کٹھن اور دشوار

آپ کیسے پڑھے لکھے؟
عقلمند انسان ہیں؟
آپ کو تو ہمارے خمیرہ مروارید عنبری صندل بادام والا معتدل بارد کے فوائد کا علم ہی نہیں
ہمارا خمیرہ مروارید سچے موتی والا مقوی قلب اور مقوی دماغ ہے۔ دل کی بند شریانیں کھولتا ہے دماغی میموری کی اصلاح کرتا ہے۔ جسمانی نشوونما گروتھ میں اضافہ کرتا ہے۔ فیملی کے تمام افراد کے لئے یکساں مفید ہے۔ دل کی گھبراہٹ دل کی تیز دھڑکن اور ہائی بلڈ پریشر کو کنٹرول کرتا ہے۔ خون کی کمی پوری کرتا ہے۔ گھریلو تمام پریشانیوں تفکرات سے نجات دلاتا ہے۔ تمام غم بھلا کر دل کو راحت، جگر کو ٹھنڈک اور دماغ کو سکون بخشتا ہے۔ انتہائی خوش ذائقہ مسحور کن، مہک والا خمیرہ مروارید عنبری معتدل صندل والا آج ہی فون کر کے بذریعہ ڈاک وی پی VP منگوالیں۔
المُسلم دارالحکمت رجسٹرڈ
ضلع حافظ آباد۔ پاکستان
0300-6526061
0301-6690383
فون اوقات
صبح 10 بجے سے شام 6 بجے تک

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

بناتی چلی جاتی ہیں۔ آخر میں موت ہمیں آن لیتی ہے جو ان حالات میں ہمیں خوش آیند معلوم ہوتی ہے۔

اس نے موت کے موضوع پر کم از کم تین پیپر شائع کیے۔ ان سب کا موضوع ایک تھا یعنی عقلیت اور عقلی استدلال پر زور تھا۔ ان میں روح کے وجود سے بھی انکار کیا گیا تھا۔ تیسرے نمبر کا پیپر اس لحاظ سے دلچسپ تھا کہ اس میں فرائیڈ کو موت میں گہری دلچسپی کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ روح سے انکار کے باوجود یہ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ خود کو موت کے لیے تیار کر رہا ہو۔

''آؤ اگر تم آنا چاہتی ہو۔ تم تو ہر ذی روح کی روح قبض کرنے آؤ گی پھر بھی میں اس امر پر اصرار کرتا رہوں گا کہ تمہارا تعلق جس زمین سے ہے اس کے حقیقی ہونے کا مجھے قطعی یقین نہیں۔ میں اس ذہن کو بھی اسی بلوٹارچ سے اڑا دینے کی اہمیت رکھتا ہوں جس سے میں نے حقیقی دنیا کو پنکچر کر دیا۔ تم زندہ انسانوں سے ٹیلی پیتھی کے ذریعے رابطے قائم نہیں کر سکتیں۔''

اپنے اعتقاد کے مطابق میں اب بھی ایک طاقت ور انسان ہوں۔ میں تمہارا... کسی اُمید کے بغیر اور بغیر کسی اور اعتقاد کے سامنا کروں گا۔''

موت کا سامنا تو ابھی دور تھا۔ ابھی تو اسے نازیوں کا سامنا کرنا تھا۔

نازیت طوفان ناگہانی بلا کی طرح اٹھا اور آسٹریا پر چھا گیا۔ ہٹلر کے لشکر نے چڑھائی کی اور ساری دنیا دیکھتی رہ گئی۔

ہٹلر کے طوفانی دستے بہت بے دردی سے یہودیوں کے گھروں کے اندر گھس آئے اور سفاکانہ حرکتیں کرنے، امیروں کو ہی نہیں لوٹنے بلکہ غریبوں کو بھی طرح طرح سے ستاتے۔ قتل و غارت گری ان کا کھیل بنا ہوا تھا۔

ان حالات کا معتوب خود فرائیڈ بھی بنا۔ اس کی تصانیف برلن کے ایک چوک میں نذر آتش کر دی گئیں اور اس کا نام نازیوں کے معتوبین کی صف اوّل میں شامل کر لیا گیا۔

فرائیڈ کو اس کے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے دوستوں، ہمدردوں اور رشتے داروں نے خبردار کیا تھا کہ اس سے قبل کہ نازی وی آنا میں داخل ہوں وہ جلد سے جلد وہاں سے نکل جائے۔ اس نے یہ مشورے مان بھی لیے تھے اور وی آنا چھوڑنے پر رضامند ہو گیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ وی آنا چھوڑتا، نازی وہاں پہنچ گئے۔ یہ خبر سنتے ہی اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

''میں حالات کا مقابلہ کروں گا۔'' وہ بوڑھے شیر کی طرح دہاڑا اور بے فکر ہو کر اپنے کام میں لگا رہا۔

82 سال کی عمر اس کے دائیں جبڑے کو سرطان نے بالکل کھا لیا تھا۔ وہ اس جبڑے کے پندرہ آپریشن کروا چکا تھا۔ ہر ہفتے اسے اپنا جبڑا چھلوانا پڑتا تھا۔

اس تکلیف اور اس احساس نے کہ اس کی کتابیں نذر آتش کی گئی ہیں اس کی صحت پر بہت برا اثر ڈالا۔ وہ بالکل بدل گیا اس کا جسم مرجھا گیا، آنکھیں اندر کو دھنس گئیں اور وہ محض ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا۔ اسے نازیوں کا ڈر نہیں تھا بلکہ اپنی عمر بھر کی کمائی کے ضائع ہو جانے کا خوف تھا۔ اس کی ساری محنت مٹی میں مل رہی تھی۔ اسے جرمن قوم پر بھی افسوس ہو رہا تھا۔ وہ تو ذہانت اور قوت فیصلہ میں دنیا بھر میں نامور تھے۔ وہ یہودیوں کے خلاف ہر ظلم سہتا چلا آیا تھا لیکن یہ مظالم اس کی روح تک کو کھا گئے۔ وہ شام کتنی اندھیری تھی جب وہ اپنا جبڑا چھلوا کر گھر پہنچا اور اس نے اپنے ڈرائنگ روم میں گسٹاپو والوں کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔

''برائے مہربانی آپ اپنا پاسپورٹ ہمارے حوالے کر دیں۔''

''میں اس کا مطلب سمجھ سکتا ہوں؟''

''آپ کچھ نہیں پوچھ سکتے۔ جو کہا جا رہا ہے اس پر عمل کرو۔ ورنہ ہمیں زبردستی کرنی پڑے گی۔''

''کیا آپ کو میری خدمات کا بھی اعتراف نہیں؟''

''ہمیں تو آپ کا بھی اعتراف نہیں۔''

اس سے اس کا پاسپورٹ اور دیگر کاغذات لے لیے گئے اور اسے مزید تحریروں کا کام کرنے سے روک دیا گیا۔ گھر میں رکھی تمام نقدی لوٹ لی گئی اور اس کی لائبریری اور اشاعت گھر کی تمام کتابیں اکٹھی کر کے انہیں آگ لگا دی گئی۔

بین الاقوامی اشاعت گھر تحلیل نفسی کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ اس کی بیٹی ایننا کے فارم پر بھی قبضہ ہو گیا۔

اس بوڑھے آدمی پر کیا گزری ہو گی۔ اس کا اندازہ کوئی بھی نہ کر سکتا تھا۔

اب حالات ہاتھ سے نکلنے لگے تھے۔ سائنسی دنیا خوف زدہ تھی کہ کہیں فرائیڈ بھی نازیوں کے ہاتھوں گرفتار نہ ہو جائے۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

جب حالات زیادہ خراب ہونے لگے تو فرائیڈ کے خاص دوستوں میں سے ڈاکٹر ارنسٹ جونز لندن سے یونان اور یونان کی شہزادی میری بونا پارٹ جو اس کے شاگردوں کے حلقے میں شامل ہو چکی تھی پیرس سے وی آنا پہنچ گئے۔ مسز ڈراتھی نیویارک سے آکر فرائیڈ کے ہاں رہ رہی تھی۔ وہ بھی جونز اور شہزادی میری کے ساتھ مل کر فرائیڈ کی حفاظت کرنے لگیں۔

ان تینوں نے اپنے اپنے ملکوں کے سفیروں پر زور ڈالا کہ وہ فرائیڈ کی حفاظت کے سلسلے میں ان کی امداد کریں لیکن فرائیڈ آسٹریا کا باشندہ تھا اس لیے وہ اس کو پناہ میں نہیں لے سکتے تھے۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ ایک سفیر کی توجہ سے فرائیڈ ظلم و ستم کا نشانہ بننے سے محفوظ رہا۔

حالات خراب سے خراب تر ہوتے جا رہے تھے۔ اس کی بیوی اس کی حفاظت اور حفاظت سے زیادہ نگرانی میں مصروف رہی۔ فرائیڈ اس صبر آزما دور میں بھی اپنے کام میں مگن رہا۔

ایک دن طوفانی دستے کے چند سپاہی اس کے گھر میں گھس آئے۔ فرائیڈ اس وقت اپنی اسٹڈی میں تھا۔ بیگم فرائیڈ نے نہایت بردباری اور نرم لہجے میں ان کا استقبال کیا اور بڑے احترام سے کرسیاں پیش کیں۔ نازیوں پر خوشگوار گھبراہٹ طاری ہوگئی۔ ایسی آؤ بھگت ان کی کہیں نہیں ہوئی ہوگی۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ بھی ذرا نرم پڑ گئے۔ بس اتنا ہوا کہ انہوں نے فرائیڈ کے باہر جانے کی صورت میں پانچ ہزار آسٹروی شلنگ (بعض جگہوں پر دس لاکھ آسٹروی شلنگ لکھا ہے) کا مطالبہ بطور تاوان طلب کیا۔ وہ فرائیڈ کے کمرے میں گئی اور اسے بتایا۔ وہ اپنے کام میں اتنا مگن تھا کہ سنا ضرور لیکن اپنے کام میں لگا رہا۔ اس نے واپس آکر نازیوں کو بتایا کہ اسے تاوان دینا منظور ہے۔ لیکن یہ رقم بہت بڑی ہے۔ اسے کچھ دن کی مہلت دو۔

اس موقع پر میری بونا پارٹ اس کی مدد کو پہنچی اور اس نے نازیوں کو یہ رقم ادا کر دی اور ساتھ ہی امریکن صدر روزویلٹ سے اس معاملے میں مداخلت کرنے کی بھی درخواست کی۔ صدر روزویلٹ نے جرمن سفیر کو بلوا کر اس سے بات کی۔

اس کی مخلصانہ کوششیں بارآور ثابت ہوئیں اور حکومت انگلستان نے اسے اپنے ہاں آجانے کی دعوت دی۔ ضروری اجازت نامہ بھی مل گیا لیکن پھر بھی نازیوں

جزائر کیمین Cyman Islands

مغربی کیریبین میں تین بڑے اور متعدد چھوٹے جزائر کا مجموعہ۔ اس کے شمال میں کیوبا اور جنوب مشرق میں جمیکا ہے۔ رقبہ 100 مربع میل یا 160 مربع کلومیٹر، زبان، انگریزی، مذہب، عیسائیت دارالحکومت، جارج ٹاؤن، ویسٹ بے دوسرا بڑا شہر ہے۔ برطانیہ کا زیر اثر ایک خودمختار علاقہ ہے۔ اس کا انتظام گورنر اور ایگزیکٹو کونسل چلاتی ہے۔ اس کی اپنی دستور ساز اسمبلی ہے۔ سبزیاں اہم زرعی پیداوار ہیں۔ سمندری کچھوا بھی پالا جاتا ہے۔ سیاحت آمدنی کا بڑا ذریعہ ہے۔ کرسٹی کیمین آئی لینڈز ڈالر، 1503ء میں کولمبس نے سیاحت کی 1670ء میں برطانیہ نے قبضہ کر لیا۔ 1962ء میں برطانیہ کی نوآبادی بنا لیا گیا۔

کینبرا Canberra

آسٹریلیا کا دارالحکومت۔ جنوب مغربی آسٹریلیا میں واقع ہے۔ اس جگہ کا انتخاب 1908ء میں ہوا۔ 1913ء میں اس شہر کی بنیاد رکھی گئی۔ یہ آسٹریلیا کا دوسرا دارالحکومت ہے۔ پہلا دارالحکومت ملبورن تھا۔ 1927ء میں یہاں پہلی بار پارلیمنٹ کا اجلاس ہوا۔ دوسری جنگ عظیم میں عارضی طور پر دارالحکومت کو پھر ملبورن میں تبدیل کر دیا گیا۔ یہاں ایئرپورٹ، ریلوے اسٹیشن، دو یونیورسٹیاں 1946-1989ء اور پارلیمنٹ ہاؤس 1988ء بھی ہیں۔

کیمیائے سعادت

امام غزالی 1058-1111ء نے اسی سے زیادہ کتابیں تحریر کی ہیں۔ ان میں سے احیائے العلوم کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ اسی کتاب کا خلاصہ کیمیائے سعادت ہے، جس میں عبادات، مہلکات، منجیات پر مبسوط اور لطیف تبصرہ ہے۔ علاوہ اس کے اس میں قرون وسطیٰ تک اسلامی فکر و نظر کا کامل لب لباب بھی دیا گیا ہے۔ اس کی زبان بہت سلیس ہے اور یہ دور سلاجقہ کی بہترین نثری کتابوں میں سے ہے۔

مرسلہ: شاہینہ امتیاز ڈی جی خان

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کے ہاتھ جو کچھ آیا انہوں نے ضبط کرلیا۔ جس قدر کتابیں چھپی پڑی تھیں انہیں ضبط کرلیا۔ اس سے نازیوں کی سیری کب ہوتی تھیں۔ فرائیڈ کی بیٹی انا کو پولیس کے مقام پر بلوا کر ایذا دی گئی اور اس سے دریافت کیا گیا کہ ان کی دولت کہاں چھپی ہے۔ جب یہ حرکات کارگر نہ ہوئیں تو اس کے بیٹے کو ظلم کا نشانہ بنایا گیا۔ اس سے کہا گیا کہ جس قدر کتابیں باہر گئیں وہ واپس منگوائی جائیں ورنہ فرائیڈ کے ناقدان کو انگلستان جانے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ بڑی مشکل سے یہ کتابیں اکٹھی کی گئیں۔ انہیں بھی جلا دیا گیا۔ جائیداد ضبط ہوگئی۔

اس بوڑھے آدمی پر کیا گزری ہوگی اس کا اندازہ کوئی بھی نہیں کرسکتا تھا۔

بالآخر 1938ء میں وہ وہیل چیئر پر بیٹھا۔ اس کا خاندان اور ملازم اس کے ساتھ تھے اور نیٹ ایکسپریس میں سوار ہوگئے۔

جب وہ پیرس پہنچا تو امریکا کے سفیر متعینہ پیرس نے اس کا استقبال کیا۔

پرنس میری کے گھر چند روز آرام کرنے کے بعد وہ لندن روانہ ہوگیا۔

اس کے لیے لندن میں رہائش کا انتظام پہلے ہی کرلیا گیا تھا۔ لندن پہنچتے ہی وہ بستر پر دراز ہوگیا۔ اس طویل سفر نے اس کی توانائیاں نچوڑ لی تھیں۔

سیاسی پناہ کی درخواست پہلے ہی دے دی گئی تھی۔ اس کے کچھ دنوں بعد یہ درخواست قبول کرلی گئی۔

اس کے لندن پہنچنے کی خبر عام ہوتے ہی اخباری رپورٹروں نے اس کے گھر پر دھاوا بول دیا۔ اس کو جبڑے کی تکلیف کی وجہ سے بولنے میں تکلیف ہوتی تھی لیکن اس کے باوجود اسے بولنا پڑا۔ انٹرویوز کا یہ سلسلہ دیر تک چلتا رہا۔ انا فرائیڈ ان ملاقاتوں میں اس کی مدد کرتی رہی۔

فرائیڈ آرام کرنے کا عادی تھا ہی نہیں۔ تھکن کا احساس تو جیسے اسے چھو کر ہی نہیں گیا تھا۔ 82 سال کی عمر میں بھی اسے کام کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ اس نے توانائیاں جمع کیں اور کام کا آغاز کردیا مگر اب عمر کا تقاضا تھا کہ ہر کام سست روی سے کرتا تھا۔ صبح آٹھ بجے بیدار ہوتا تھا۔ دس بجے ڈاکٹر اس کا معائنہ کرتا تھا۔ اس کے بعد وہ مریضوں کو دیکھنے کا کام شروع کردیتا تھا۔

وہ جب وی آنا میں تھا تو اس نے حضرت موسیٰ پر ایک تحقیقاتی کتاب لکھنے کا آغاز کیا تھا۔ لندن کے قیام میں فرصت ملتے ہی اس نے کتاب پر کام شروع کردیا۔ اس کی شامیں اسی مصروفیت میں گزرنے لگیں۔ کبھی کبھی وہ سیر کے لیے باہر بھی چلا جاتا تھا۔

وہ اپنے کتے کو بھی ساتھ لے آیا تھا۔ اسے اپنے کتے سے بہت محبت تھی۔ کتوں کے بعد اسے پھولوں سے محبت ہوگئی تھی۔ اس نے لندن آکر بھی اس شوق کو جاری رکھا۔ اپنے گھر کے باغ میں بھی رنگا رنگ مختلف قسم کے پھول لگائے تھے۔ ان پھولوں کو دیکھ کر وہ کہا کرتا تھا۔

''ان کا نہ کوئی کردار ہوتا ہے اور نہ ہی الجھاوے۔''

انگلستان کے آسمان پر جنگ کے بادل چھا رہے تھے۔ سارا ملک آنے والے خطرے سے پریشان اور سراسیمہ تھا۔ خطرے کے الارم، طیارہ شکن توپیں ہر جگہ نصب تھیں۔ ساری دنیا جنگ کی ہولناکیوں کے انجام سے لرزاں تھی لیکن فرائیڈ کے اردگرد کا ماحول پھر بھی پرسکون تھا۔ اس کا یہ گھر بہت آرام دہ اور ہوادار تھا۔ اس کے کمرے وی آنا والے گھر سے زیادہ کشادہ تھے۔ گھر کا باغ کشادہ نہیں تھا لیکن اس کا لان بہت نفیس تھا۔ دیواروں پر بوڑھے درختوں کے سایئے ماحول کو اور بھی پرسکون بنا رہے تھے۔ انا فرائیڈ بچوں کی نفسی تحلیل پر کام کرنے میں مصروف تھی۔

یہ زندگی بظاہر تو بہت آرام دہ تھی لیکن اس کے پیچھے ایک ہیبت ناک حقیقت کھڑی جھانک رہی تھی۔ موت کا فرشتہ منتظر کھڑا تھا۔

اس کی سولہ سالہ سرطان کی پرانی بیماری نے پھر زور باندھا۔ اس کے منہ کا درد ناقابل برداشت ہوتا گیا۔ رات بھر وہ جاگتا رہا۔ دن میں ایک آدھ گھنٹا اونگھ آجائے تو آجائے۔ باغ میں بچھی آرام دہ کرسی پر وہ گھنٹوں بیٹھا رہتا۔

اس بے آرامی نے اسے اور بھی نحیف بنا دیا۔

درد بڑھتا گیا اور آخر مقررہ وقت آگیا۔

1939ء کو اس کے نئے وطن برطانیہ کے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کرنے کے تین ہفتے گزرنے کے بعد اس کا انتقال ہوگیا۔

وصیت کے مطابق اس کی لاش کو نذر آتش کیا گیا اور اس کی راکھ محفوظ کردی گئی۔

تلخیص: سگمنڈ فرائیڈ، توراکینہ قاضی
سگمنڈ فرائیڈ۔ مرتبہ آصف حسن

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

نواب سپاہی

غلام حسین میمن

قیامِ پاکستان کے لیے کتنے لوگوں نے قربانیاں دیں۔ جس کی استطاعت جتنی تھی وہ اتنا ہی مجنون بنا ہوا تھا کیونکہ مطالبہ پاکستان مسلمانوں کے لیے جینے مرنے کا مسئلہ بن گیا تھا، اس لیے کہ متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف سازشیں ہورہی تھیں۔ آریہ سماج کے کارکن مسلمانوں کو شدھی کرن تحریک چلا کر زبردستی ہندو بنا رہے تھے تو آر ایس ایس والے ہتھیار بند ہو کر قتل کے در پے تھے۔ اس تغیر کو جس جس نے محسوس کیا وہ سب مطالبہ پاکستان کے لیے دن رات محنت کرنے لگا تھا۔ قائداعظم کے اس سپاہی نے بھی قربانیوں کی ایک فصیل کھڑی کردی تھی۔

پاکستان کے لیے تن من دھن سے کام کرنے والے ایک نواب کا تذکرہ

''آج تم نے اللہ سے بات نہیں کی اس لیے میں بھی تم سے بات نہیں کروں گی۔'' ننھے بہادر کے لیے نانی کی یہ وارننگ پریشان کن تھی۔ اسے محسوس ہو چکا تھا کہ وہ نماز اور تلاوت سے فرار ہو کر نانی کی نظروں سے چھپ نہیں سکتا۔ اس لیے وہ باقاعدگی سے نماز پڑھتا اور تلاوت کرتا۔ تب نانی اس سے خوش ہوتی۔

حیدرآباد دکن کے جاگیردار نصیب یاور جنگ کے گھر فروری 1905ء کو پیدا ہونے والا بچہ محمد بہادر خان ابھی

Downloaded from Paksociety.com

ایک ہفتے کا ہی تھا کہ والدہ کے انتقال کی وجہ سے وہ اپنی بہترین تربیت گاہ سے محروم ہوگیا۔ باپ نے نومولود کو اپنی ساس کے سپرد کردیا کہ وہ اس کی پرورش کریں۔ اب وہ نانی کے زیرِ کفالت آگیا۔ نانی ایک دیندار اور خدا ترس خاتون تھیں۔ قومی معاملات میں دلچسپی لینا اور اخبارات کا باقاعدگی سے مطالعہ کرنا ان کا معمول تھا۔ انہوں نے اپنے نواسے محمد بہادر خان کو مذہب سے رغبت دلاتے ہوئے نماز، روزہ اور تلاوت کا پابند بنایا۔ نانی سے اس کا یہ تعلق 14 سال رہا۔

محمد بہادر خان نے ابتدائی تعلیم مدرسہ عالیہ اور مفید الانام میں حاصل کی پھر مدرسۃ العلوم بلاہ میں داخلہ لیا۔ دورانِ تعلیم ان کے تمام اساتذہ اس بات سے واقف تھے کہ اس کی حیثیت ایک اوسط درجے کے طالب علم سے زیادہ نہیں ہے۔

یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب ایک رات اس نے عجیب خواب دیکھا۔ خواب میں اس نے دیکھا کہ ایک قبر کھودی گئی ہے اور اسے کفن پہنا کر لٹا دیا گیا ہے اور اس کے اردگرد انسانوں کا جمِ غفیر موجود ہے۔ صبح اٹھ کر اس نے یہ خواب اپنے شفیق استاد علامہ شمسی سے بیان کیا۔ استاد نے مسکراتے ہوئے اس کی تعبیر بتائی کہ ''آئندہ تمہیں مسلمانوں کی قیادت کرنا ہوگی۔'' گویا قدرت بچپن ہی سے اسے آئندہ کے لیے کسی اہم ذمہ داری کے لیے تیار کررہی تھی۔

ابھی اس نے میٹرک کا امتحان بھی نہ دیا تھا کہ والد نصیب یاور جنگ انتقال کرگئے۔ والد کی زمینداری کے تمام تر جھمیلے اب اس کے حصے میں آگئے۔ اس لیے اسے باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا مگر علم کا شوق مسلسل اسے بھڑکاتا رہا۔ وہ اپنے طور پر ہی مولوی سعد اللہ خان اور مولوی سید اشرف شمسی سے عربی، تفسیر، حدیث اور فقہ کا درس لیتا رہا۔

یہ نانی کی مذہبی تربیت کا حصہ ہی تھا کہ وہ نوجوانی میں قدم رکھنے کے بعد تھوڑی سے نکلتے ہوئے بال کے کٹوانے کا خیال تک دل میں نہ لایا۔ آتے جاتے کچھ دوست مذاقاً اسے ''بکرا'' کہہ کر مذاق کا نشانہ بناتے رہے۔

تعلیم کے ساتھ ساتھ اسے فنِ سپہ گری کا بھی شوق تھا۔ ورزش تو وہ بچپن سے ہی کیا کرتا تھا۔ جلد ہی اس نے تلوار بازی، نشانہ بازی اور تیراکی میں بھی کمال حاصل کرلیا۔

والد نصیب یاور جنگ نے مرتے وقت پانچ لاکھ کا قرض چھوڑا تھا۔ اس نے اپنی انتظامی صلاحیت اور قابلیت سے نہ صرف آٹھ سال میں یہ سارا قرض چکا دیا بلکہ جاگیر کے انتظامات بھی پہلے سے بہتر کردیے۔

اب محمد بہادر خان نواب محمد بہادر خان کہلانے لگے جنہیں بعد میں یار جنگ کا خطاب بھی ملا۔ یوں تاریخ انہیں نواب بہادر یار جنگ کے نام سے یاد کرتی ہے۔

قرض کی ادائیگی کے بعد سکون کے لمحات میسر آئے تو انہوں نے حج کا ارادہ کیا۔ کئی رشتے داروں نے ہمراہ چلنے کی خواہش ظاہر کی۔ طبیعت میں انکساری اور محبت کا جو جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا، اس نے کسی کو انکار کرنے کی مہلت ہی نہ دی۔ یوں سفرِ حج کو جاتے وقت خاندان کے 80 افراد ساتھ تھے جس کے سالار نواب بہادر یار جنگ تھے۔

انہوں نے دورانِ سفر اپنی علمی صلاحیتوں کا اظہار کیا اور روزانہ درسِ تفسیر کے علاوہ مسافروں کو سفر کی فضیلت اور مسائلِ حج سمجھاتے رہے۔

حج کے بعد ان کی ملاقات سابق امیر افغانستان امان اللہ خان، ترکی کے جلاوطن سربراہ توحید شاہ، سعودی عرب کے فرمانروا سلطان ابن سعود اور شہزادہ فیصل (جو بعد میں سعودی عرب کے فرمانروا بنے، پاکستان کی شاہ فیصل مسجد ان ہی کے نام سے موسوم ہے) سے ہوئی۔

اس کے بعد ارادہ تو مصر جانے کا تھا مگر پابندی کے باعث بیروت چلے گئے۔ اس بارے میں اپنے ایک خط میں تحریر کرتے ہیں:

''دو روز بیروت کی سیر کی، جو شام کی سب سے بڑی بندرگاہ ہے۔ مغربی تمدن سے پوری طرح بہرہ اندوز، قدرت نے بیروت بلکہ شام کو اپنی فیاضیوں اور مناظر و سرسبزی سے مالا مال کررکھا ہے۔ نہریں بہتی ہیں۔ آبشار گرتے ہیں، صنوبر سے گھری ہوئی پہاڑیوں کو دیکھ کر جسم میں خون بڑھنے لگتا ہے۔ امریکی مشن کی عظیم الشان یونیورسٹی دیکھی جو ترقی کرنے والوں کا بہترین کارنامہ اور خوابِ غفلت کے متوالوں کے لیے تازیانہ عبرت ہے۔''

اس کے بعد بیت المقدس پہنچے جس کا ذکر ان الفاظ میں کیا۔ ''انبیاء کی اس سرزمین پر پہنچے تو بوڑھے ابراہیمؑ کا وعظ، داؤدؑ کے نغمے اور یعقوبؑ کی فرزند گم کردہ کی آہ و زاری کانوں میں گونجنے لگی۔ آسوابوں کا ظلم، مصریوں کا قتلِ عام، رومیوں کا جلال و جبروت، مسلمانوں کی رواداری اور حسنِ سلوک ہر قدم پر نظر آرہا ہے۔ سلیمانؑ کی عظمت داؤدؑ کے شہر کے ہر پتھر سے ظاہر ہورہی ہے۔ غرض آنکھیں دیکھ رہی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ہیں، کان سن رہے ہیں۔ قلب سوچ رہا ہے۔ ہاتھ لکھ رہے ہیں۔''

نواب بہادر یار جنگ فلسطین کے بعد مصر پہنچے، جید علماء سے ملاقاتیں کیں جن سے اتحاد رابطہ اسلامی کے مسائل پر گفتگو رہی۔ وہ مصر کی مشہور جامعہ الازہر بھی گئے۔ بعلبک کے کھنڈر دیکھے۔ میدان یرموک کی زیارت کی۔ حضرت مکرمہؓ کے مزار پر فاتحہ پڑھی، حضرت خالد بن ولیدؓ اور ان کے صاحبزادے حضرت عبدالرحمٰنؓ اور حضرت وحید کلیؓ کے مزارات پر بھی گئے اور فاتحہ پڑھی۔

اس کے بعد وہ دمشق سے ہوتے ہوئے ترکی پہنچے۔ ترکی میں انہوں نے لوگوں کو یورپین لباس میں دیکھا اور وہاں کے لوگوں نے انہیں سرخ رنگ کی ترک ٹوپی پہنے دیکھا۔ یہ ٹوپی جہاں نوجوانوں کے لیے۔ حقارت کی علامت تھی، وہیں بوڑھوں کے لیے قابلِ احترام تھی۔

ایک روز ایک ترک نوجوان تنہائی میں ان کے کمرے میں آیا۔ خود ہی دروازہ بند کر کے ان کی طرف بڑھا۔ ایک لمحے کے لیے خطرے کے سبب ان کا ہاتھ اپنی جیب میں موجود پستول پر سختی سے جم گیا مگر دوسرے ہی لمحے ترک نوجوان کی حرکت نے تمام خوف دور کر دیا۔

اس نے انتہائی منت کر کے ان کی سرخ ٹوپی مانگی اور پھر اسے اپنے سر پر رکھ کر آئینے میں صورت دیکھی اور ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔ ''میرا بادشاہ یورپین ٹوپی پسند کرتا ہے۔ اس لیے میں بھی یہی پہنتا ہوں مگر میرا دل قدیم ترکی ٹوپی پہننے کو چاہتا ہے۔''

اس طرح قسطنطنیہ کے قہوہ خانے کا واقعہ بھی ان کی دلچسپی کا باعث بنا۔ انہوں نے اپنے دوست سے ترکی عورتوں کے یورپین لباس سے متعلق گفتگو کی۔ قریب کی میز پر موجود ایک نوجوان لڑکی نے اپنے بھائی سے کہا کہ یہ شخص لگتا ہے مسافر ہے اور ہمارے لباس کے بارے میں شک میں مبتلا ہے کہ ہم مسلمان نہیں ہیں۔ ان سے کہو الحمدللہ! ہم سب مسلمان ہیں اور ہماری رگوں میں جو خون دوڑ رہا ہے وہ اسلام پر قربان ہونے کے لیے تیار ہے۔ یہ مسافر انگورہ اور قسطنطنیہ کو دیکھ کر ترکوں کی حالت کا اندازہ لگانے کے بعد اناطولیہ جائیں گے۔'' بہادر یار جنگ نے اپنے ایک ساتھی کو اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ واقعی جب میں اناطولیہ گیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہاں اب تک قدیم ترکی تہذیب کے آثار باقی ہیں، جہاں ترکوں کا قدیم لباس، لمبی

نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اے کہ ترے وجود پر خالق دو جہاں کو ناز
اے کہ ترا وجود ہے وجہ وجودِ کائنات

اے کہ ترا سرِ نیاز حد کمالِ بندگی
اے کہ ترا مقامِ عشق قرب تمام عینِ ذات

اے کہ تری زبان سے رب قدیر گل فشاں
وحی خدائے لم یزل تھی تری ایک ایک بات

اے کہ تو فخر آدمی واقف سر عالمی!
لوح و قلم سے بے نیاز، تیرے علوم شش جہات

تیرے عمل سے کھل گئیں تیرے بیان سے حل ہوئیں
منطقیوں کی الجھنیں فلسفیوں کی مشکلات

خوگر بندگی جو تھے تیرے طفیل میں ہوئے
مالک مصر و کاشغر، وارثِ دجلہ و فرات

مجھ سے بیاں ہو کس طرح رفعتِ شانِ احمدیؐ
تنگ مرے تصورات پشت مرے تخیلات

داڑھیاں، عورتوں کا پردہ اور مسجدوں کا مسلمانوں سے بھرا ہوا ہونا مسلم نشاۃ ثانیہ کی یاد دلاتا ہے۔

اس کے بعد بغداد پہنچے، جس کا حال اپنے ایک خط میں یوں تحریر فرماتے ہیں: ''نینوا کے کھنڈروں پر آنسو بہائے، حضرت جرجیسؑ، حضرت شیثؑ، حضرت یونسؑ، حضرت دانیال علیہم السلام کی بارگاہوں پر حاضری دی۔ حضرت اویس قرنیؓ کا مکان دیکھا۔ موصل سے بغداد پہنچا۔ حضرت غوث پاک قطب الاقطاب شیخ عبدالقادرؒ جیلانی کی بارگاہ پر حاضری دی۔ حضرت جنید بغدادیؒ، حضرت ابوبکر شبلیؒ، حضرت امام ابو حنیفہ اعظمؒ، حضرت معروف کرخیؒ، حضرت عمر شہاب الدین سہروردیؒ، حضرت بہلول دانا، حضرت امام موسیٰ کاظمؒ، حضرت سری سقطی و حضرت امام ابو یوسفؒ وغیرہ اولیائے دائمہ عظام کی بارگاہوں پر حاضری دی۔ اشوریوں، بابلیوں، کلانیوں کے کچھ آثار دیکھے۔ سامرا گیا۔ سلطان معتصم باللہ کا ٹوٹا ہوا محل، مسجد جامعہ کا عجیب و غریب مینار دیکھا۔ طاق کسریٰ کے پاس کھڑے ہو کر تھوڑی دیر مدائن کے کھنڈروں کی سیر کی۔ حضرت سلمان فارسیؓ کی بارگاہ پر حاضر ہو کر آنکھیں بند

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کیں اور کسی کو ایران سے تلاش حق سے نکلتے اور مدینہ میں منزل مقصود پاتے دیکھا۔''

چھ ماہ کی سیاحت کے دوران مجلس انجمن تبلیغ اسلام کے تحت شہر شہر اور قریے قریے گھوم کر لگ بھگ پانچ ہزار غیر مسلموں کو مشرف بہ اسلام کیا۔ انجمن تبلیغ اسلام کو وہ اس سفر پر جانے سے چار ماہ قبل قائم کر چکے تھے۔

ان ہی دنوں نواب بہادر یار جنگ نے محسوس کیا کہ ہندو مذہب کی آڑ میں ایک فوج تیار کر رہے ہیں تاکہ مسلمانوں کی اکثریت کو کمزور اقلیت میں تبدیل کر سکیں اور ہندوستان کی مسلمان ریاستوں میں رہا سہا اقتدار بھی ختم کیا جائے۔ نواب بہادر یار جنگ نے شدت سے اس بات کی خواہش کو محسوس کیا.... کہ اگر اس وقت مسلمانوں کو مسلح نہ کیا گیا تو ممکن ہے کہ مسلم اقتدار کے دشمن اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں، اتفاقاً اسی زمانے میں عنایت اللہ مشرقی نے خاکسار تحریک کی بنیاد ان ہی اصولوں پر رکھی جس کے نواب بہادر یار جنگ خواہش مند تھے۔ انہوں نے اُمید بھری نظروں سے اسے دیکھا اور نہ صرف شامل ہوئے بلکہ اس کی اشاعت کے لیے ملک کے گوشے گوشے میں گئے اور مسلمانوں کو اس کا پیغام دیا: ''دوستو! دنیا کے کسی فرد یا قوم نے تکلیف کے بغیر آرام اور راحت کی صورت نہیں دیکھی جس کو تلاشِ راحت ہے اس کو پہلے مبتلائے مصیبت ہونا چاہیے بقول شاعر

میں تم کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

جن قوموں نے اس رازِ حیات کو سرِ زندگی کو پہچانا، ان کی رفعت اور مرتبت کو جاننا دنیا والوں کے لیے مشکل ہو گیا۔ کیا تم کو ان دنوں کی یاد دلانے کی ضرورت ہے جب دو جہانوں کے سردار اور صاحب لولاک خاتم النبیین اور رحمت اللعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی راتیں گھوڑوں کی ننگی پیٹھوں پر سفر کیا کرتے تھے اور راتوں کو جاگتے جاگتے آپؐ کے قدم مبارک متورم ہو جایا کرتے تھے۔ کیا تم نے تاریخ کے ان ایام پر نظر نہیں ڈالی۔ جب فاروقِ اعظمؓ میدان جنگ سے آنے والے نامہ بر کی تلاش میں مدینے سے میلوں دور نکل جایا کرتے تھے۔ کیا تم نے ان دنوں کو بھلا دیا ہے جب دنیا سے چھوٹے بڑے، امیر و غریب اور عرب و عجم کا فرق مٹانے والا، کفر و ایمان کے درمیان ایک خندق کے ذریعے حدِ فاصل کھینچ رہا تھا اور اس کے شکم اطہر پر پتھر پڑے ہوئے تھے۔''

نواب بہادر یار جنگ اس تحریک میں شامل ہو کر ایک عام رضا کار کی حیثیت سے خاکی وردی پہنے، ہاتھ میں بیلچہ سنبھالے، ننگے پیر شاہراہ عام پر پریڈ کی اور کبھی یہ بھی ہوا کہ نماز میں تاخیر کرنے پر پیٹھ پر کوڑے بھی کھائے مگر اف تک نہ کی۔ ان کا علامہ عنایت اللہ مشرقی کے بارے میں خیال تھا کہ انہوں نے امیرانہ زندگی ترک کر کے صرف تین جوڑے معمولی کپڑوں پر زندگی گزارنا منظور کیا۔ اس تحریک کی خاطر وہ ایک عرصے تک خاکسار سے وابستہ رہے مگر پھر اختلافات کی چنگاری جلنے لگی۔ اس کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں: ''چند روز پیشتر مجھ میں اور علامہ مشرقی میں کچھ خفیف سا اختلاف ہو گیا تھا اور وہ محض اس بناء پر تھا کہ علامہ صاحب نے ہمارے ملک کے مقامی حالات سے ناواقف ہو کر انجمن اتحاد المسلمین کے معاملے میں دخل دیا تھا۔ میں انہیں اب بھی غلطی پر سمجھتا ہوں۔

پھر ایک واقعہ ایسا ہوا جس نے نواب بہادر یار جنگ کو ہلا کر رکھ دیا۔ وہ جولائی 1943ء کا ایک گرم دن تھا۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ کے بنگلے پر ایک ملاقاتی آیا اور ان سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ان کے پی اے نے ملاقات کروانے سے انکار کر دیا۔ کیوں کہ ملاقاتی نے پہلے سے وقت نہیں لیا ہوا تھا۔ ابھی گفت و شنید جاری تھی کہ قائداعظمؒ کسی فائل کی تلاش میں اپنے کمرے سے نکل کر پی اے کے پاس آئے اور فائل مانگی۔ جب وہ فائل لے کر کمرے سے جانے لگے تو ملاقاتی نے انہیں روک کر کچھ کہنا چاہا۔ قائداعظم اس کی جانب متوجہ ہوئے تو اس نے فوراً ہی اپنی قمیص میں اڑسا ہوا خنجر نکال کر قائداعظم پر حملہ کر دیا۔ قائداعظم کے تحنتی سے جسم کو دیکھ کر وہ شاید اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ میں ایک ہی وار میں ان کا کام تمام کر دوں گا مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ دفعتاً قائداعظم نے ایک ہاتھ سے اس کا خنجر والا ہاتھ اوپر ہی روک لیا اور پھر چھینا جھپٹی میں قائداعظم کو معمولی سے زخم آئے۔ اسی اثناء میں چوکیدار نے حملہ آور کو اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ حملہ آور قائداعظم کو قتل کے ارادے سے آیا تھا۔ اس کا نام رفیق صابر معلوم ہوا۔ اس کا تعلق خاکسار تحریک سے تھا۔ اس حملہ آور سمیت خاکسار تحریک کے دیگر ارکان کا یہ خیال تھا کہ قائداعظم ہندوستان میں اسلام کی راہ میں کانٹے کی طرح ہیں۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

خاکسار تحریک کے ایک کارکن کی یہ حرکت نواب بہادر یار جنگ کو ٹھیس پہنچائے بغیر نہ رہ سکی اور انہوں نے بطور احتجاج اس تحریک سے علیحدگی اختیار کرلی: نواب بہادر یار جنگ آخر وقت تک مجلس اتحاد المسلمین سے وابستہ رہے۔ وہ 1939ء میں پہلی بار اس کے صدر منتخب ہوئے اور اس کے دستور کا تعارف قائداعظم محمد علی جناح کے نام خط میں تحریر کرتے ہوئے لکھا:

''میں نے مجلس اتحاد المسلمین کا دستور بالکل لیگ کے دستور کی مطابقت میں بنایا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ لیگ کے سیکریٹری اور خازن کا انتخاب جنرل سیشن کرتا ہے اور میرے کانسٹی ٹیوشن کی رو سے صدر ہی کو یہ اختیار ہے کہ وہ مجلس عاملہ کے ممبران کے ساتھ ساتھ جنرل سیکریٹری اور خازن کو بھی نامزد کرے۔''

1906ء میں ڈھاکا سے وجود میں آنے والی آل انڈیا مسلم لیگ کا دائرہ عمل صرف صوبوں تک تھا۔ دیسی ریاستوں کے معاملات حل کرنا اس کے دائرہ اختیار سے باہر تھا مگر آل انڈیا کانگریس نے صوبوں کے ساتھ ساتھ دیسی ریاستوں میں بھی اسٹیٹ کانگریس کے نام سے اپنی سرگرمیاں بڑھادی تھیں۔ کانگریس کی فرقہ وارانہ سرگرمیوں سے صوبوں کے ساتھ ساتھ دیسی ریاستوں کا بھی امن و چین غارت ہورہا تھا۔ خاص کر مسلمانوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے جانے لگے۔ وہ نہ تو آزادی کے ساتھ اذان دے سکتے تھے اور نہ ہی عبادت کرسکتے تھے۔ انہیں آزادی سے قرآن پڑھنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ مساجد کو فالتو کام کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ ان مساجد کو مندروں میں تبدیل کیا جارہا تھا اور یہ سب اسٹیٹ کانگریس کی شہہ پر ہورہا تھا اور کانگریس کو حکمران وقت کی مکمل حمایت حاصل تھی۔ سڑک بنانے کے بعد مسلمانوں کی مساجد کو شہید اور قبرستانوں کو تہس نہس کیا جارہا تھا۔ جنگلات پر مکمل قبضہ ہندوؤں کو حاصل تھا۔ ٹیکس کے معاملات میں ہندوؤں کو سزا کم اور مسلمانوں کو زیادہ دیتا تھا۔ مسلمانوں کا قتل عام ہندوؤں کے لیے مشغلہ بن چکا تھا۔

ایسے نازک دور میں سلطنت آصفیہ کے جاگیردار نواب بہادر یار جنگ نے ایک ترکیب سوچی۔ اس ترکیب کے بعد ایک تنظیم عمل میں آئی جس میں ہر دیسی ریاست کے مسلم نمائندے شامل تھے۔ اس مجلس کا کام صرف اور صرف مسلمانوں کے جائز حقوق کی حفاظت کرنا تھا تاکہ وہ عزت

حلیہ

صحیح تومند جسم، خوب صورت اور دل فریب قد، سرخ وسفید رنگت، کتابی چہرہ اور اس پر ابھری ہوئی داڑھی، دمکتی ہوئی پیشانی، ذہانت سے بھرپور آنکھیں، جسم پر شیروانی اور سر پر سرخ ترکی ٹوپی۔

☆.....☆.....

خلافت کے دور میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالحامد بدایونی اور مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری جیسے آتش فشاں مقرر تھے مگر جس قسم کی بصیرت افروز تاریخی دولت مسلمانوں کو نواب بہادر یار جنگ کی تقاریر سے ملتی تھی وہ کسی کے حصے میں نہیں آئی تھی۔ مسلم لیگ کے اجلاس میں وہ سب سے آخر میں بولتے تھے اور لوگ گھنٹوں خاموش اور پُرسکون ہوکر ان کو سنتے تھے۔

(چوہدری خلیق الزماں)

موجودہ زمانے میں بہت سے مسلمانوں نے ملکوں ملکوں کی سیر کی اور سفرنامے لکھے ہیں جن میں ایک میں بھی ہوں اور مولانا شبلی عثمانی، مولوی محبوب عالم اور بھوپال کے ایک مسلمان بھی ہیں جنہوں نے اسپین کا اچھا سفرنامہ لکھا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے ہیں لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہیں جس نے ایک ہی وقت میں تمام اسلامی دنیا کے ملکوں اور قوموں کو یکجا دیکھا ہو اور مذہبی، سیاسی اور معاشرتی مقاصد کا مطالعہ کیا ہو۔ اس لحاظ سے نواب بہادر یار جنگ مذکورہ سیاحوں سے اعلیٰ ہیں کہ انہوں نے مسلسل سفر کیا اور چھ مہینے میں عراق، حجاز، شام، فلسطین، مصر، ایران، قسطنطنیہ، انگورہ، وسط ایشیا اور افغانستان وغیرہ کو بہت گہری نظروں سے دیکھا، ہر قسم کے رہنماؤں سے ملے، مباحثے کیے اور ان سے نتائج نکالے۔ بس میرے عقیدے میں اسپین کے ابن بطوطہ سے بڑھ گئے ہیں، تاہم میں قدیمی عظمت وعزت کو باقی رکھنے کے لیے نواب بہادر یار جنگ کو ابن بطوطہ سے زیادہ نہیں بلکہ ابن بطوطہ کے برابر سمجھ کر نواب ابن بطوطہ کا خطاب دیتا ہوں۔

(خواجہ حسن نظامی)

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

سے زندگی گزار سکیں۔ بعد میں اس مقصد کے لیے انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ اسٹیٹس قائم کی۔ اس کا مرکزی دفتر ناگ پور میں قائم کیا گیا اور شروع میں اس کا تمام تر خرچ نواب بہادر یار جنگ برداشت کرتے تھے۔

نواب بہادر یار جنگ نہ صرف آل انڈیا مسلم لیگ اسٹیٹس کے بانی تھے بلکہ جب تک زندگی نے وفا کی وہ ہر سال اس کے صدر منتخب ہوتے رہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے آل انڈیا مسلم لیگ اسٹیٹس ایک منظم و مضبوط ریاستی تنظیم بن گئی۔ اس کے سالانہ اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے ساتھ ساتھ عظیم پیمانے پر ہونے لگے۔ وہ خود کہتے تھے: ''مجھے یقین ہے کہ یہ تحریک مستقبل میں نہایت کامیاب اور ریاستی مسلمانوں کے تحفظ و نجات کا ذریعہ بنے گی۔''

نواب بہادر یار جنگ کو قائداعظم سے والہانہ عشق تھا۔ وہ قائداعظم کو دیکھتے ہی گلاب کے پھول کی طرح کھل اٹھتے تھے اور جب بھی ان کے ساتھ ہوتے تو خود کو قائداعظم کا ادنیٰ سپاہی تصور کرتے۔ انہوں نے مسلم لیگ میں شمولیت کا اعلان کیے بغیر ہی مسلم لیگ اور قائداعظم کے ساتھ مل کے مسلمانوں کے حقوق کی بحالی اور حفاظت کے لیے دن رات کام کیا۔ قائداعظم پر جب قاتلانہ حملہ ہوا تو ان کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''اگر میری دعا مقبول ہوتی تو میں التجا کرتا کہ اے اللہ! تو میری عمر گھٹا کر قائداعظم کو طویل عمر عطا فرما۔''

وہ قائداعظم محمد علی جناح کو مسلمانانِ ہند کا بے لوث رہنما کہتے تھے اور اس واقعے کے بعد سے انہوں نے خاکسار تحریک سے ہمیشہ کے لیے علیحدگی اختیار کرلی۔ خاکسار تحریک کا قائداعظم سے دشمنی کا رویہ شروع سے برقرار رہا۔ اس ضمن میں یہ واقعہ اہم ہے کہ مارچ 1940ء کے جلسے کے انتظامات مکمل تھے مگر خاکسار تحریک کی سازش سے حکومت نے امن عامہ کے مفاد میں اس جلسے پر پابندی لگا دی تھی۔ اس پابندی سے جہاں دوسرے رہنما پریشان تھے۔ وہاں قائداعظم بھی سخت تذبذب کا شکار تھے۔ ایسے وقت میں نواب بہادر جنگ نے قائداعظم کو مکمل یقین دلایا کہ جلسہ ضرور ہوگا اور آپ سارے انتظامات اور نظم و ضبط کی ذمہ داری مجھ پر چھوڑ دیجیے۔ قائداعظم کو اپنے اس ساتھی کے قول اور صلاحیتوں پر مکمل بھروسا تھا۔ اس لیے انہوں نے حکومت کو زور دے کر اور اپنی ذمہ داری پر اس جلسے کی خصوصی اجازت لی۔ جلسہ گاہ کے قریب ہی خاکسار تحریک کے کارکن اپنے جوش میں موجود کسی بدنظمی کے لیے تیار تھے۔ اس موقع پر نواب بہادر یار جنگ نے ان کے سامنے پُراثر تقریر کی جس سے ان کا جوش سرد پڑ گیا اور یوں مارچ 1940ء والا جلسہ انتہائی امن کے ساتھ 22 مارچ کو شروع ہوکر 24 مارچ کو ختم ہوا۔

نواب بہادر یار جنگ نے دسمبر 1943ء میں کراچی میں منعقدہ مسلم لیگ کے اجلاس میں پاکستان کی حمایت کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''پاکستان بننے کی اس کوشش کو آج سے شروع کردو اور یاد رکھو کہ نہ صرف پاکستان میں رہنے کے لیے پاکستان بننے کی ضرورت ہے بلکہ پاکستان کے حصول کے لیے بھی پاک بننے کی ضرورت ہے۔''

نواب بہادر یار جنگ ریاستی عوام کو تیار کر کے مسلم لیگ کے تاریخی جلوس میں لاتے اور خود تماشائی بن کر پوری کارروائی دیکھتے اور جب قائداعظم خود تقریر کی دعوت دیتے تب ڈائس پر آکر زور خطابت چمکاتے، وہ بسا اوقات تین تین گھنٹے تک تقریر کرنے اور مسلمانانِ ہند میں اسلام اور پاکستان کے لیے جوش اور جذبہ پیدا کرتے اور عوام کا یہ حال ہوتا کہ ان کی تقریر کے دوران ہلتے تک نہ تھے۔

تحریک پاکستان کے دوران صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کا اثر بہت کم تھا۔ سردار اورنگ زیب خان جو سرحد مسلم لیگ کے صدر تھے۔ انہوں نے بھی یہ بات محسوس کی کہ سرحد میں مسلم لیگ کی سرگرمیاں بڑھنی چاہئیں مگر جہاں دوسری طاقتیں ان کی راہ میں حائل تھیں، وہیں فقیر ایپی کی ہولناک سرگرمیاں پوری دہشت گردی کے ساتھ سرحد میں جاری تھیں ان ہی دنوں کی بات ہے کہ قائداعظم محمد علی جناحؒ پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ قائداعظمؒ کو ملک بھر سے خطوط اور ٹیلی گرام ملنے لگے۔ جب سردار اورنگ زیب خان نے خط بھیجا تو قائداعظم نے جواب میں اپنی اس خواہش کا اظہار کیا: ''میرے زخم اس وقت تک مندمل نہ ہوں گے جب تک سرحد میں مسلم لیگ کو فتح نہ ہوگی۔''

سردار اورنگ زیب اس خط کو پا کر بڑے متفکر ہوئے۔ انہوں نے نواب بہادر یار جنگ سے مشورہ کیا اور ان سے اس سلسلے میں مدد کی درخواست کی۔ بہادر یار جنگ نے قائداعظم کی اجازت سے سرحد کے دورے کرنا شروع کیے، ان کے ہمراہ مسلم لیگ کے دو اور رہنما سردار اورنگ زیب خان اور قاضی محمد عیسیٰ بھی تھے۔ یہ تینوں لیگی رہنما ایک کھلی موٹر میں جا رہے تھے۔ سنسان سڑک تھی اور ساتھ میں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

یہ خطرہ بھی لاحق تھا کہ کسی بھی جگہ سے کوئی گولی آ کر کسی کا بھی خاتمہ کر سکتی ہے۔ ایسے میں آگے جانے پر کسی نے ہاتھ کے اشارے سے گاڑی رکوائی۔

گاڑی روک دی گئی۔ اجنبی قریب آیا اور پوچھا: ''آپ ہیں سے نواب بہادر یار جنگ کون ہیں؟''

نواب بہادر یار جنگ نے اپنے سینے کی طرف ہاتھ کا شارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ''میں.....!''

اجنبی نے تنہائی میں چل کر فقیر اپنی کا پیغام دینے کی خواہش کا اظہار کیا۔ نواب بہادر یار جنگ جانے لگے تو ساتھیوں نے منع کیا کہ کہیں یہ شخص آپ کو نقصان نہ پہنچا دے مگر وہ بے خطر اجنبی کے ساتھ چل پڑے۔ کچھ دور جا کر اس نے نہایت ادب کے ساتھ عرض کیا: ''فقیر صاحب نے آپ کو سلام کہا ہے اور پیغام دیا ہے کہ آپ کی یہاں تشریف آوری کی اطلاع تھی، اس لیے آپ کے سفر کے انتظامات کر دیئے گئے ہیں۔ آپ جہاں جہاں سفر کرنا چاہیں ہمیں اطلاع دے دیجیے تاکہ حفاظتی انتظامات کر دیئے جائیں۔''

یہ نواب بہادر یار جنگ کا کمال تھا کہ دشمن بھی دوستی کا دم بھرنے لگے۔ ان کی شخصیت کے جادو کے ساتھ زورِ خطابت نے وہ کمال دکھایا کہ سرحد مسلم لیگ انتخابات میں کامیاب ہوئی۔

نواب بہادر یار جنگ کبھی بھی مسلم لیگ کے باقاعدہ رکن نہیں رہے کیونکہ اس وقت حکومت برطانیہ کا قانون تھا کہ ریاستی عوام کے نمائندے کسی سیاسی پارٹی کے رکن نہیں بن سکتے۔ نواب بہادر یار جنگ نے خود کو مسلم لیگ اور مسلمانوں کے مفاد کے لیے وقف کر دیا تھا۔ جب حکومت وقت نے دیکھا کہ وہ اس طرح بھی باز نہیں آ رہے ہیں تو قتل اور ریاست بدر کی دھمکی کے ساتھ تقریر کرنے پر پابندی لگا دی مگر پھر بھی آزادی کا یہ متوالا باز نہ آیا تو ایک اور حکومتی فرمان جاری ہوا۔ ''تمام منصب دار اور جاگیردار سرکاری ملازم تصور کیے جائیں گے۔''

چونکہ وہ حیدر آباد دکن کے جاگیردار تھے۔ اس لیے وہ بھی اس فرمان کے تحت سرکاری ملازم میں شمار ہونے لگے۔ اب حکومت کے خلاف کسی بھی سرگرمی میں حصہ لینا صحیح نہ تھا۔ دوسری صورت میں انہیں جاگیر سے ہاتھ دھونا پڑتا۔ ایسے فیصلہ کن مرحلے پر انہوں نے ذاتی مفاد پر قومی مفاد کو عزیز رکھا اور ساری جایداد اور جاگیر حکومت کو واپس کر دی۔

اب وہ بے فکر و مطمئن ہو کر اپنے مشن میں سرگرم ہو گئے۔ انہوں نے اس موقع پر کہا تھا: ''میں یقین رکھتا ہوں کہ یہ امتحان کا وقت ہے۔ مجھ سے بڑھ کر دنیا میں کوئی خود غرض نہ ہوگا۔ اگر میں جاگیر کے خیال سے ملک و ملت کی خدمت چھوڑ دوں۔ اس لیے یہ بہتر ہے کہ اب میں جاگیر کے بھی معاملات سے فارغ ہو کر پہلے سے بھی زیادہ مستعدی سے کام کروں۔''

کچھ عرصے بعد حکومت نے انہیں جاگیر و اعزازات واپس کرنا چاہے مگر انہوں نے لینے سے انکار کر دیا اور باقی زندگی قائداعظم اور پاکستان کی آزادی کے لیے ایک ادنیٰ کارکن بن کر گزاری۔

نواب بہادر یار جنگ میرے عزیز دوست تھے۔ ان کی موت میرے لیے ایک بڑا صدمہ ہے۔ نواب مرحوم مومن صادق تھے اور اسلام کے بہت بڑے داعی۔ انہوں نے اسلام اور مسلمانانِ ہند کی زریں خدمات انجام دیں۔ تاریخ ان کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ وہ ہمارے لیے قدرت کا بیش بہا عطیہ تھے۔

(قائداعظم محمد علی جناح)

خط بنام قائداعظمؒ

11 فروری 1944ء

مائی ڈیئر قائداعظم!

کراچی میں مسلم لیگ کے آخری اجلاس میں، میں نے جو تقریر آپ کے حکم سے کی تھی اس کی نسبت آپ کی ورکنگ کمیٹی کے کئی ارکان کو خفا پایا۔ مجھے نہیں معلوم کہ خود آپ اس کی نسبت کیا رائے رکھتے ہیں لیکن اس کے اثرات جو میں محسوس کر رہا ہوں وہ یہ کہ میرے پاس ہندوستان کے ہر گوشے سے سیکڑوں خطوط موصول ہوئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم لیگ کی بے عمل اور بے جا مصلحت اندیشی کا جو غلط تصور ناواقفیت کی بناء پر عوام اور خصوصاً نوجوانوں میں پیدا ہو گیا تھا۔ اس کا اس تقریر سے بڑی حد تک ازالہ ہو گیا ہے۔

آپ کا مخلص

بہادر یار جنگ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

انہیں مطالعے کے شوق کے ساتھ ساتھ مفید باتیں دوسروں کو بھی پہنچانے کا شغف تھا۔ وہ اسے دین کی خدمت سمجھتے تھے۔ انہوں نے درسِ قرآن اور درسِ اقبالؒ کی محافل میں باقاعدہ درس دیا۔ وہ عربی، اردو اور فارسی روانی سے بولتے تھے۔

ان کی انگریزی تعلیم صرف میٹرک کے درجے تک ہوئی تھی مگر جب سیاست میں آئے تو گوناگوں مصروفیات کے باعث مدرسے میں جا کر باقاعدہ تعلیم حاصل کرنا ممکن نہ رہا مگر انہوں نے کتابیں پڑھ کر خود انگریزی سیکھنے کا ارادہ کیا اور کچھ عرصے کی سخت محنت کے بعد اس زبان پر بھی عبور حاصل کرلیا۔ ایک دفعہ مسز سروجنی نائیڈو کی ایک مختصر اردو تقریر سن کر کہنے لگے تھے۔ ''اگر مسز سروجنی نائیڈو اردو میں تقریر کرسکتی ہیں تو کیا محمد بہادر خان انگریزی جیسی آسان زبان میں تقریر نہیں کرسکتا۔''

نواب بہادر یار جنگ، قائداعظم جیسی بامحاورہ اور معیاری انگریزی بولتے تھے۔ یہ بات بھی ریکارڈ پر ہے کہ کراچی اور الہ آباد میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے دوران قائداعظم نے جو شاندار تقاریر کیں، ان کا فی البدیہہ اردو ترجمہ اچھے اچھے انگریز دانوں کے لیے مشکل تھا مگر نواب بہادر یار جنگ نے قائداعظم کے ایک ہی اشارے پر تقریر کے ختم ہوتے ہی بامحاورہ اور معیاری ترجمہ سنائے کہ سب محوِ حیرت رہ گئے۔

نواب بہادر یار جنگ کو مسلمانوں کے حقوق سے حد درجے محبت تھی۔ سرحد میں مسلم لیگ کو اپنا کام کرنے میں دقت پیش آرہی تھی، کیونکہ وہاں گاندھی اور کانگریس کا زور تھا۔ انہوں نے صرف دو ماہ کے مختصر عرصے میں پشتو زبان پر عبور حاصل کیا اور پھر صوبہ سرحد کے قصبے قصبے میں جا کر ان کی زبان میں مسلم لیگ کا موقف پیش کیا۔ ان کے اس کام سے مسلم لیگ کو سرحد میں کافی استحکام ملا۔

ان کے زورِ خطابت اور شیریں بیانی کا یہ واقعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ حیدرآباد دکن کے ایک محلے میں جس کا نام دھول پیٹھ تھا۔ ہندوؤں کی زیادتی کی وجہ سے وہاں مسلم کش فسادات ہوئے۔ اس میں کئی مسلمان شہید ہوئے جن میں نواب بہادر یار جنگ کے رشتے دار بھی شامل تھے۔ اس موقع پر مشتعل مسلمانوں نے ہتھیار سنبھال لیے۔ اس انتقامی آگ کو ختم کرانا خود حکومت کے بس سے باہر تھا۔ ایسے موقع پر نواب بہادر یار جنگ سامنے آئے اور غیض وغضب سے بے قابو مجمع میں گھس کر مدلل اور پُرتاثیر تقریر کے ذریعے ان کو گھر واپس جانے کا مشورہ دیا۔ ان کی اس پُراثر تقریر کا کمال تھا کہ کوئی بڑا ہنگامہ نہ ہوا۔ یہ سارا منظر فسادی ہندو اور امن پسند غیر مسلم بھی دیکھ رہے تھے۔ حیدرآباد دکن سے بھی تعلق رکھنے والی شعلہ بیان مقررہ مسز سروجنی نائیڈو نے بھی یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا اور حیرت سے کہنے لگیں: ''میں نے امن وسلامتی کی حالت میں اسٹیج کے لیڈر اور مقرر تو بہت دیکھے ہیں مگر انتقام کی آگ سے مشتعل اور جوش سے بپھرے ہوئے مجمع کو قابو میں لانے والا مقرر اور لیڈر آج ہی دیکھا ہے۔''

نواب بہادر یار جنگ جب جاگیر کے مالک تھے تو ان کے لطف وکرم کے حقدار مسلمان ہی نہ تھے بلکہ تمام تر رعایا تھی جن میں ہندو بھی شامل تھے۔ ایک بار ایک ہندو نے کسی سے بارہ سو روپے قرض لیے مگر وقت پر ادا نہ کرسکا۔ عدالت سے ڈگری آگئی۔ قریب تھا کہ عدالتی اہلکار اس کی عزت نیلام کردیتے وہ ہندو کسی موہوم سی اُمید پر نواب بہادر یار جنگ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا مسئلہ بیان کیا۔ انہوں نے فوراً بارہ سو روپے کا چیک لکھ کر اسے دے دیا اور کہا۔ ''جاؤ قرض ادا کرو اور جب رقم آجائے تو مجھے دے دینا۔''

اس واقعے کا ذکر ہندوستان کے مشہور وکیل سری کشن بیرسٹر نے کیا۔ انہوں نے نواب بہادر یار جنگ کے اس عمل سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اس طرح انہوں نے ہندوؤں کے دلوں کو بھی فتح کرلیا تھا۔

ان کی حق گوئی کا ایک اور واقعہ ہے: ''ایک زمین کا جھگڑا ان کے سامنے لایا گیا۔ مندر اور مسجد کے درمیان والی جگہ پر ہندو اور مسلمان دونوں ہی اپنا حق جتاتے تھے۔ نواب بہادر یار جنگ نے جگہ کا معائنہ کیا اور فیصلہ دیا کہ زمین ہندوؤں کی ملکیت ہے، اس لیے انہیں دے دی جائے۔''

مسلمان آپ کے اس فیصلے سے بڑے ناراض ہوئے کہ انہوں نے مسلمان ہو کر فیصلہ ہندوؤں کے حق میں کیوں دے دیا۔ نواب بہادر یار جنگ نے مسلمانوں کے اس عمل کے خلاف اگلے ہی روز اخبار میں یہ بیان شائع کرایا: ''مسلمانوں کا شیوہ یہی ہے کہ وہ ہر وقت اور ہر آن اس آیت مبارکہ کو پیشِ نظر رکھتے: ''اے ایمان والو! اللہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

تعالیٰ کے لیے پوری پابندی کرنے والے اور انصاف کے ساتھ شہادت ادا کرنے والے رہو اور کسی خاص لوگوں کی عداوت تم کو اس پر باعث نہ ہو جائے کہ تم عدل نہ کرو۔ عدل کیا کرو کہ وہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ کو تمہارے سب اعمال کی پوری اطلاع ہے۔''

ہر سال جلسہ عید میلاد النبیؐ میں وہ حیاتِ طیبہ کی جامعیت پر ایمان افروز تقاریر کیا کرتے تھے۔ ایک بار اس جلسے میں دکن کے خسرو نے بھی شرکت فرمائی اور بے مثل خطیب محمد بہادر خان کو ان کی اثر آفریں تقریر اور زورِ خطابت پر ''بہادر یار جنگ'' کا خطاب دیا۔ اس کے بعد سے محمد بہادر خان، بہادر یار جنگ کہلانے لگے۔ میلاد کی اکثر تقاریر سے متاثر ہو کر مسلمانوں نے انہیں لسان الامت کا خطاب بھی دیا تھا۔ مجلس اتحاد المسلمین اور مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے ملت اسلامیہ کی صحیح ترجمانی پر انہیں قائد ملت کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا۔ بعد میں قائد ملت کا یہ لقب لیاقت علی شہید کے لیے مخصوص ہو گیا۔

روزانہ بعد نماز فجر نواب بہادر یار جنگ مسجد میں ایک گھنٹے قرآن مجید کی تفسیر سنایا کرتے تھے۔ موسم خواہ کیسا ہی ہو، بارش ہو یا سخت سردی، وہ ایک چھوٹی سی چٹائی پر بیٹھ کر اس محفل کا باقاعدہ اہتمام کرتے تھے۔ وہ اکثر اس درس کی محفل کی بابت کہا کرتے تھے: ''مجھے اگر کسی عمل کے صلے میں بخشش کی توقع ہے تو وہ یہی قرآن کی خدمت ہے اگر مسلمانوں نے اس قرآن کو چھوڑ دیا تو وہ کہیں کے نہ رہیں گے۔''

جب وہ ریاست حیدرآباد کے جاگیردار تھے تو غریب اور نادار طلباء کے لیے وظائف دیتے تھے اور بعض غریب لوگوں کو اپنے ہاں ہی رکھ لیتے اور ان کی تعلیم و تربیت کا خیال فرماتے۔ وہ تاریخ اسلام کے مضمون میں اوّل آنے والے اور اچھی تقریر کرنے والوں کو انعامات سے نوازتے تھے۔ جو طلباء علم حاصل کرنے علی گڑھ جاتے تو ان کو قرضِ حسنہ بھی دیتے تھے۔

نواب بہادر یار جنگ میں حسِ مزاح بھی خوب تھی۔

ایران میں ایک بار نواب بہادر یار جنگ کو کسی مقام تک جانا تھا۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے کرائے کی گاڑی لینا پڑی۔ ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھا۔ ''کرایہ کیا لو گے؟''

ڈرائیور نے عام انداز میں پوچھا۔ ''آپ کتنے ہیں؟''

انہیں مذاق سوجھا اور کہا۔ ''ہم دو ہیں۔''

ڈرائیور نے کرایہ فی آدمی کا بتایا تو نواب بہادر یار جنگ بولے۔ ''کرایہ تو میں ایک ہی شخص کا دوں گا مگر چلیں گے ہم دونوں۔''

اس پر ڈرائیور نے انکار کیا کہ میں تو لے کر نہیں جاؤں گا۔

نواب بہادر یار جنگ بضد تھے کہ میں ضرور جاؤں گا اور صرف اپنا ہی کرایہ دوں گا۔ ساتھی کا ایک حبہ بھی نہ دوں گا۔ کچھ دیر یہی انکار و اصرار چلتا رہا اور جب انہوں نے دیکھا کہ ڈرائیور غصے میں آچکا ہے تو ہنس کر فرمانے لگے۔ ''میں اور میرا اللہ، ہم دو ہیں۔ کیا دونوں کا کرایہ لو گے۔ میرے ساتھ اور کون شخص ہے جو تم نے پوچھا کہ کتنے ہو؟''

اس پر ڈرائیور بڑا شرمندہ ہوا اور بڑی عزت سے مقام منزل تک پہنچا دیا۔

نواب بہادر یار جنگ نے 26 دسمبر 1943ء کو کراچی میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں منشور پاکستان پیش کرتے ہوئے کہا تھا: ''ہم پاکستان اس لیے چاہتے ہیں کہ وہاں اسلامی نظام حکومت قائم ہو۔ یہ ایک انقلاب ہوگا۔ یہ ایک نشاۃ ثانیہ ہوگی۔''

اس موقع پر قائداعظم محمد علی جناح نے بڑے جوش سے میز پر مکا مارتے ہوئے کہا: ''تم بالکل درست کہتے ہو۔''

نواب بہادر یار جنگ نے کہا: ''لیجیے قائداعظم نے میرے اس قول پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔''

اپنی تقریر کے آخر میں نواب بہادر یار جنگ نے فرمایا:

''ہماری منزل اگرچہ نمایاں ہو کر نگاہوں کے سامنے آچکی ہے اور ہمیں اس بات کا یقین ہو گیا ہے کہ ہم اپنے عظیم قائد کی رہنمائی میں منزل سے ہمکنار ہو کر رہیں گے لیکن راستے کے خطرات سے آگاہ کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وقت کے تیز و تند طوفانوں میں اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ابتلاء و آزمائش کی گھٹن گھڑیوں میں کتنے ہی سپاہی بچھڑ سکتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں آئندہ آپ کے درمیان نہ رہوں۔ میں نے آپ کا بہت سا وقت لیا ہے۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

میری آرزو ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس عظیم مقصد میں کامیابی عطا فرمائے، آمین۔"

نواب بہادر یار جنگ نے اردو زبان کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اردو ادب میں کوئی ایسی صنف نہ تھی جس کا بہترین ادب ان کی نظر سے نہ گزرا ہو۔ وہ بہت معیاری زبان بولتے تھے۔ انہیں اردو پر گرفت صرف گفتگو اور تقریر کے دوران ہی نہ تھی بلکہ وہ ایک اچھے ناقد بھی تھے۔ انہوں نے تحریک پاکستان کے پلیٹ فارم کے علاوہ انجمن ترقی اردو ہند کے جلسوں میں بھی اپنے زورِ خطابت کا لوہا منوایا تھا۔ بابا اردو مولوی عبدالحق کا یہ اعتراف ان کی علمی خدمات کا بین ثبوت ہے: "راس کماری سے لے کر کشمیر تک نواب بہادر یار جنگ کی تقاریر سے زبان اردو کو بڑا فروغ نصیب ہوا ہے۔"

علامہ اقبال کے کلام اور ان کی فکر سے نواب بہادر یار جنگ کو خاص شغف تھا۔ وہ کلام اقبال کا ہفتہ وار درس اپنے گھر پر دیا کرتے تھے۔ خود علامہ اقبال بھی انہیں اس کام پر داد تحسین دیتے تھے۔ ان کے درس میں پروفیسر ڈاکٹر یوسف حسین خان، ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر غلام دستگیر رشید اور مولانا عبدالقدوس ہاشمی جیسے عالم شامل ہوتے تھے۔

جب پاکستان کی منزل قریب آتی دکھائی دی تو خود نواب بہادر یار جنگ نے اپنی زیر نگرانی اسلامی نظام معیشت کی تدوین کے لیے ایک کمیٹی بنائی جس میں ماہرین معاشیات، علماء اور دانشوروں کو شامل رکھا۔ وہ خود اس کے سربراہ تھے مگر افسوس کہ موت نے انہیں مہلت نہ دی۔

نواب بہادر یار جنگ کو قرآن مجید سے بے حد عشق تھا۔ وہ روزانہ بعد نماز فجر تفسیر قرآن بیان کرتے اور جس روز ایک پارہ ختم ہو جاتا۔ اللہ کا شکر ادا کرتے کہ اس نے اپنے حقیر بندے سے اتنی تفسیر سنانے کا کام لیا۔ وہ اس خوشی کے موقع پر اپنی طرف سے سامعین میں شیرینی بھی تقسیم کرتے تھے۔ جب چھ سال بعد قرآن مجید ختم ہوا تو اس دن ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ بار بار آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے اور وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے جاتے۔ اس موقع پر بعض لوگوں نے ہار پہنائے تو کہنے لگے: "پہنایئے صاحب! میں آج ضرور پہنوں گا۔ میری زندگی میں انتہائی مسرت کے دو ہی دن ہیں۔ ایک وہ جب طوافِ بیت اللہ کیا اور ایک آج جب کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے چھ سال تک تفسیر بیان کرتے ہوئے قرآن پاک ختم کر سکا ہوں۔"

ایک صاحب نے اس موقع پر عرض کیا: "نواب صاحب یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔"

تو فرمانے لگے: "آپ کو کیسے گمان ہوا کہ اب میں یہ سلسلہ ختم کر دوں گا۔ قرآن تو بار بار پڑھنے اور سمجھنے کی چیز ہے۔ اب کی دفعہ اس میں اور زیادہ لطف آئے گا۔ انشاء اللہ یہ سلسلہ میری زندگی کے آخری لمحوں تک جاری رہے گا۔"

اور پھر یہی ہوا۔

دوسرے روز سے پھر تفسیر شروع ہوئی اور ان کی زندگی کے آخر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

انہوں نے ایک بار کہا تھا۔ "خانہ خدا میں بیٹھے، کتاب اللہ کو ہاتھ میں لیتے میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میری تقریروں کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں کہ لوگ قرآن کو سمجھنے لگیں اور اس پر عمل پیرا ہوں۔ اگر مسلمانوں نے اس کو چھوڑ دیا تو وہ کہیں کے نہ رہیں گے۔ یہی ان کی پناہ گاہ ہے۔ زمانے نے ممکن ہے راستے میں کچھ تبدیلی کر دی ہو لیکن منزل اگر قرآن نہیں ہے تو وہ ذلت و خواری کے جہنم کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی۔"

25 جون 1944ء کی شام اپنے مکان بیت الامت میں درس اقبال کی محفل تھی۔ اسی رات اپنے ایک دیرینہ دوست جسٹس ہاشم علی خان کے ہاں دعوت تھی۔ وہاں مشہور ریاضی دان ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی و دیگر احباب بھی موجود تھے۔ کھانے میں کچھ دیر تھی کہ آپ کے سامنے حقہ لا کر رکھا گیا۔ ابھی نواب بہادر یار جنگ ایک کش ہی لگا پائے تھے کہ ایک زبردست جھٹکا لگا اور وہ منہ کے بل گر پڑے۔

لوگ سنبھالنے بھی نہ پائے کہ روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

ان کے جنازے میں لوگوں کا جم غفیر تھا اور شہر سے چار میل دور شہر آباد کے قبرستان میں ان کو دفن کیا گیا۔ لوگوں کا ہجوم اتنا تھا کہ لوگ جنازے کو کاندھا دینے کے لیے کئی کئی کوس انتظار میں چل رہے تھے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے ان کے جنازے کا منظر ان الفاظ میں بیان کیا ہے: "جنازے میں زبردست عقیدت و محبت رکھنے والے صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ دیگر مذاہب کے افراد بھی تھے۔"

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

دلچسپ دریافت

دانیہ صدیقی

بعض اوقات ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ سائنس داں بنانے کی کچھ اور کوشش کر رہا ہوتا ہے لیکن بن کچھ اور جاتا ہے۔ وہ تلاش کچھ اور کر رہا ہوتا ہے لیکن اسے مل کچھ اور جاتا ہے۔

چند دلچسپ دریافتوں کا ذکر، خوش ذوق قارئین کے لیے

ماہرین آثار قدیمہ اپنی تمام زندگی دور قدیم کے نوادرات اور پرانے زمانے کے لوگوں کے رہن سہن کے متعلق کھوج لگانے میں بسر کر دیتے ہیں لیکن کبھی کبھار ایسے اتفاقات بھی ہو جاتے ہیں کہ کسی معمولی انسان کے ہاتھوں انجانے میں تاریخ کے کسی اہم راز پر سے پردہ اٹھ جاتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہمارے جیسے معمولی انسانوں کی بے پروائی یا کسی نہ کسی حادثے کے نتیجے میں کئی اہم

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

دریافتیں ہوئی ہیں۔ یہ دریافتیں اتنی اہمیت کی حامل ہیں کہ انہوں نے تاریخ کے بارے میں ہمارا نظریہ یکسر بدل ڈالا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ماہرین آثار قدیمہ اس قسم کی دریافتوں کے لیے خون پسینا ایک کرتے ہوئے ساری عمر دور کی خاک چھانتے ہیں لیکن لاعلمی میں کسی معمولی انسان کے ذریعے کوئی اہم دریافت دنیا کے سامنے آجاتی ہے۔ قارئین کی دلچسپی کے پیشِ نظر ایسی ہی چند عجیب وغریب دریافتیں پیش خدمت ہیں۔

روسیٹا کا پتھر

1799ء میں نپولین کی فوجوں کا گزر جب سرزمین مصر سے ہو رہا تھا تو ایک سپاہی کے ہاتھوں انجانے میں تاریخ کی اہم ترین دریافت ہوئی۔ ہوا کچھ یوں کہ نپولین افواج نے روسیٹا کے مقام پر ڈیرا ڈالا۔۔۔ اور وہاں پر قلعہ تعمیر کرنے کی ٹھانی۔ اس سلسلے میں فوجی جوان زمین کھود کر بڑے بڑے پتھر جمع کرنے لگے اور چٹانوں کو توڑا جانے لگا۔ ایک سپاہی نے زمین کھود کر پتھر کی سل حاصل کی اور اسے قلعے میں لگانے کے لیے آگے بڑھا ہی تھا کہ اس کے کمانڈر کی نظر اس سل پر پڑ گئی جس پر مختلف زبانوں میں کچھ الفاظ کندہ تھے۔

کمانڈر نے وہ پتھر سپاہی سے لے لیا اور غور سے اس کا جائزہ لینے کے بعد اسے نپولین کے قائم کردہ تحقیقی سینٹر بھجوا دیا جہاں اس عجیب وغریب پتھر پر تحقیق ہوئی اور یہ بات سامنے آئی کہ اس پتھر پر لاطینی اور قدیم مصری زبان میں تحریریں درج تھیں جو دراصل تصویروں کی صورت لکھی جاتی تھیں، انہیں انگریزی میں hieroglyphic کہا جاتا ہے جبکہ اردو زبان میں انہیں 'مورتی لکھاوٹ یا تصویری تحریر' کا نام دیا گیا ہے۔

یہ ایک بے حد اہم دریافت تھی جو انجانے میں ایک سپاہی کے ہاتھوں ہوئی تھی۔

لاطینی سائنسدانوں نے اس پتھر پر برسوں عرق ریزی کے بعد بالآخر قدیم مصری لکھاوٹ پڑھنے کا راز جان لیا۔ یہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی جس کے بعد ماہرین اس۔۔۔ قابل ہو گئے کہ مصری آثار قدیمہ سے برآمد ہونے والی قدیم زبان کو پڑھ اور سمجھ سکیں۔

اوٹزل کا قدیم باشندہ

یہ سن 1990ء کی بات ہے۔ آسٹریا کے مشہور برفیلے پہاڑی سلسلے اوٹزل میں ایڈونچر کی غرض سے دو کوہ پیماؤں نے تنگ گھاٹیوں سے گزر کر پہاڑوں پر چڑھنے کا فیصلہ کیا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے اندرونی راستوں پر سفر کرنا شروع کر دیا۔ وہ برف میں راستہ بناتے آگے بڑھ رہے تھے جب انجانے میں ان کے پیروں سے برف میں منہ کے بل پڑی ہوئی لاش ٹکرائی۔ ظاہر ہے کہ لاش دیکھ کر وہ دونوں گھبرا گئے۔ انہوں نے لاش کا جائزہ لیا تو دیکھا کہ سردی کی وجہ سے اس کی کھال کسی چمڑے کی طرح سخت ہو کر اس کی ہڈیوں پر منڈھی ہوئی تھی اور گوشت پر عجیب طرح سے سلوٹیں پڑی تھیں۔

انہوں نے جلدی جلدی اس کی چند تصویریں اتاریں اور پولیس کو اطلاع کرنے کے لیے سر پر پیر رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ انہیں لگا تھا کہ شاید کسی نے اس آدمی کو قتل کر کے یہاں پھینک دیا۔ پولیس آئی مگر لاش کی حالت دیکھ کر چونک گئی کیونکہ یہ کہیں سے بھی قتل کی تازہ واردات نہیں لگ رہی تھی اور لاش پوری طرح سے برف میں پھنسی ہوئی تھی۔ ماہرین کو اس مقام پر طلب کیا گیا اور چار دنوں کی سرتوڑ کوششوں کے بعد یہ لاش پوری احتیاط کے ساتھ برف سے نکال لی گئی۔

جب اس لاش پر تحقیق ہوئی تو ایک حیرت انگیز دریافت سامنے آئی کہ برف میں قدرتی طور پر محفوظ رہ جانے والی اس ممی کا تعلق 3300 قبل مسیح سے ہے اور یہ شخص کوئی شکاری تھا، یعنی غاروں میں رہنے والا انتہائی قدیم باشندہ! اس کا شمار قدرتی طور پر محفوظ رہ جانے والی دنیا کی قدیم ترین ممیوں میں ہوتا ہے اور اس کے ذریعے ماہرین کو دور قدیم کے انسانوں کے رہن سہن اور طرز معاشرت کے بارے میں جاننے میں کافی مدد ملی۔

مصری شہزادی

ڈورو تھی ایڈی جب تین برس کی تھی تو وہ سیڑھیوں سے گرنے کے نتیجے میں موت سے بال بال بچی تھی۔ اس حادثے میں اس کے سر پر شدید چوٹ آئی تھی۔ اس واقعے کے بعد سے اسے عجیب وغریب خواب آنے لگے جس میں وہ خود کو لمبے لمبے ستونوں والی وسیع وعریض عمارت میں کھڑا دیکھتی۔ خوابوں کا یہ سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ ایک دن وہ اپنے والدین کے ہمراہ ایک مصری میوزیم میں گئی اور وہاں جا کر چلا اٹھی۔ ''ہاں، یہی میرا گھر ہے!''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

جوان ہونے پر ڈوروتھی نے مصر میں ہی سکونت اختیار کر لی۔ وہ خود کو 'اوم سیٹی' کہلواتی اور یہ دعویٰ کرتی کہ وہ مصری فرعون سیٹی اول کی محبوبہ ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اوم سیٹی کا دوسرا جنم ہے۔ ماہرین آثار قدیمہ اس کی باتوں پر کان نہیں دھرتے تھے لیکن ایک واقعے نے سب کو حیران کر دیا۔ ڈوروتھی نے دعویٰ کیا کہ وہ سیٹی اول کے قدیم باغات کا مقام جانتی ہے۔ ماہرین کافی عرصے سے ان باغات کی جستجو میں تھے۔ جب ڈوروتھی نے یہ بات کی تو انہوں نے پہلے تو اس کی بات نظر انداز کر دی .... مگر جب اس کا اصرار بڑھا تو اس کے بتائے ہوئے مقام پر کھدائی کی گئی جہاں سے واقعی سیٹی اول کے قدیم باغات کا سراغ مل گیا۔

ڈوروتھی با آسانی پتھر کی سلوں پر قدیم مصری زبانوں میں لکھی گئی تحریروں کا ترجمہ بھی کر دیا کرتی تھی۔ مرتے دم تک اس کا یہی دعویٰ رہا کہ اسے اپنی پچھلی زندگی کی تمام باتیں یاد ہیں اور وہ ابھی تک اسی زندگی میں سانس لے رہی ہے۔

قدیم مہر

یہ سن 1784ء کا واقعہ ہے جب ایک جاپانی کسان اپنے کھیتوں میں کام کر رہا تھا۔ پنیری لگانے کے لیے زمین کھودتے ہوئے اس کی نظر کسی چمکدار چیز پر پڑی۔ اس نے وہ نکال لی اور اسے دھو کر دیکھا تو وہ سونے کی ایک مہر تھی۔

وہ کسان اسے گاؤں کے ایک پڑھے لکھے شخص کے پاس لے گیا۔ اس نے غور سے اس مہر کو دیکھا پھر اسے حکومت کے کارندے کے حوالے کر دیا۔ اس مہر پر تحقیق ہوئی اور یہ بات سامنے آئی کہ یہ مہر 57ء عیسوی میں چین کے شہنشاہ گوانگو کی جانب سے اپنے جاپانی ہم منصب کو پیش کی گئی تھی۔ سفارتی سطح پر چین اور جاپان کے درمیان ہونے والی یہ پہلی ملاقات تھی۔

اس مہر پر موجود لکھاوٹ کے ذریعے جاپانی پہلی بار چینی رسم الخط سے واقف ہوئے تھے۔ بعد میں اسی رسم الخط کی مدد سے جاپان میں 'کانجی رسم الخط' متعارف کروایا گیا جسے جاپان میں آج بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

اٹلی کا قدیم شہر

انٹرنیٹ استعمال کرنے والے قارئین یقیناً جانتے ہوں گے کہ 'گوگل ارتھ' پر آپ کس طرح گھر بیٹھے سیٹلائٹ کی مدد سے دنیا بھر کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ ایک روز اٹلی کا

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

ماہِ آزادی کی

گہما گہمی کا

جگمگاتا شمارہ

اولین صفحات

وقت کے ساتھ زندگی میں بھی تبدیلی ضروری ہے۔ حالات و ماحول میں بس جانے والی وحشتوں کا احوال۔ **کبیر عباسی** کی آزادی کے حوالے سے یادگار تحریر

انگارے

دشمنوں کے شکنجے میں آہنی اعصاب کے مالک چیمپئن کا امتحان۔ محبت اور جنگ کی فضا میں آگے بڑھتا **طاہر جاوید مغل** کے یادگار سلسلے کی ایک اور کڑی

آوارہ گرد

چلچلاتی دھوپ میں ہر دم ایک نئی مصیبت سے برسرِ پیکار نوجوان کی سرگزشت..... **عبدالرب بھٹی** کی سلسلے وار کہانی

سرورق کے رنگ

اسماء قادری اور **امجد جاوید** کی سرورق پر پُرتجسس کہانیاں

ان کے علاوہ

منظر امام، تنویر ریاض، سلیم انور، ارشد بیگ، جمال دستی، تمکین رضا اور عکس فاطمہ کی طبع زاد و ترجمہ کہانیاں

چینی نکتہ چینی

آپ کے تبصرے... مشورے... محبتیں... شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کتھائیں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

باشندہ اپنی بوریت دور کرنے کے لیے گوگل کے نقشوں میں اپنے شہر کو دیکھ رہا تھا جب اسے ایک مقام پر بیضوی شکل کا میدان سا بنا نظر آیا جس کی لمبائی پانچ سو میٹر کے قریب تھی۔ اس کے آس پاس ہی کچھ عجیب سے سائے بھی نظر آ رہے تھے۔

اس شخص نے غور سے ان سایوں کا جائزہ لیا تو اسے یوں لگا جیسے یہ زمین میں دھنسی ہوئی عمارتوں کے سائے ہوں۔ تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے ماہرین آثار قدیمہ کو اس کے بارے میں بتایا اور انہیں اس جگہ کو کھودنے کی اپیل کی۔ چنانچہ اس شخص کے بتائے ہوئے نقشے پر عمل کرتے ہوئے ماہرین نے اس مقام پر کھدائی شروع کر دی اور کچھ ہی عرصہ بعد وہاں سے قدیم رومن عہد کی ایک پُرشکوہ اور طویل و عریض حویلی کے آثار برآمد ہو گئے۔

اس طرح انٹرنیٹ پر بیٹھ کر محض وقت گزاری کرتے ہوئے ایک شخص کی بدولت تاریخ کا ایک اہم باب دنیا کے سامنے آ گیا۔

گوتم بدھ کی طلائی مورتی

تقریباً سات سو سالوں تک تھائی لینڈ کے ایک قدیم بدھ مندر میں گوتم بدھ کی چونے سے بنی ہوئی ایک بھاری بھرکم مگر معمولی سی مورتی رکھی ہوئی تھی۔ اس مورتی میں کوئی خاص بات نہ تھی اس لیے لوگ بھی اسے زیادہ دلچسپی سے نہیں دیکھتے تھے۔ 1935ء میں مندر کے منتظمین نے سوچا کہ یہ خوامخواہ یہاں پڑی پڑی جگہ گھیر رہی ہے تو کیوں نہ اسے اٹھا کر گودام منتقل کر دیا جائے۔ اس کام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے چند صحت مند کارندوں پر مشتمل ایک ٹیم کی ڈیوٹی لگائی گئی کہ وہ اس باری بھرکم مورتی کو اٹھا کر گودام میں لے جائے۔

ان لوگوں نے مورتی اٹھائی اور گودام میں رکھنے کے لیے بڑھے لیکن نجانے کیسے ان میں سے ایک کا پاؤں رپٹا اور وہ مورتی ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی۔ فرش سے ٹکرانے پر اس کا چونا ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گیا تو لوگوں نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا کہ ان کے سامنے گوتم بدھ کی ساڑھے پانچ ٹن خالص سونے سے بنی ایک شاندار مورتی پڑی تھی۔ سونے کی یہ مورتی دراصل چونے کے پلستر میں چھپی ہوئی تھی جو ہزاروں سال پہلے کاریگروں نے لالچی لوگوں سے بچانے کے لیے اس پر پھیر دیا تھا۔

یوں ایک شخص کی نااہلی کی بدولت دنیا کے سامنے تاریخ کا ایک شاہکار آ گیا۔ آپ کی معلومات کے لیے بتاتے چلیں کہ اس مورتی کو دنیا کی سب سے بڑی طلائی مورتی ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔

تو تان خامن کا مقبرہ

اگر ہم آپ کو یہ بتائیں کہ بیسویں صدی کی سب سے اہم تاریخی دریافت دراصل ایک مشکی لڑکے کی بدولت ہوئی تھی تو آپ ضرور حیرت زدہ رہ جائیں گے اور اس اتفاق کی تفصیلات ضرور جاننا چاہیں گے۔ ہوا کچھ یوں کہ مشہور ماہر آثار قدیمہ ہاورڈ کارٹر بہت عرصے سے تاریخی لحاظ سے مشہور مصری بادشاہ تو تان خامن کا مقبرہ تلاش کرنے کی جان توڑ کوششیں کر رہا تھا لیکن کسی طرح اس کا سراغ نہیں مل پا رہا تھا۔ مسلسل ناکامیوں کی وجہ سے نوبت یہاں تک آ چکی تھی کہ اس منصوبے کا فنڈ چند ماہ بعد روک دیا جانے والا تھا۔

کارٹر ان دنوں بہت پریشان رہنے لگا تھا۔ اس کے ساتھ ایک مشکی لڑکا بھی رہتا تھا جس کی ذمہ داری پانی لانے کی تھی۔ ایک روز وہ لڑکا بوریت بھگانے کے لیے صحرا کی مٹی میں کھیل رہا تھا جب اچانک اس کا پیر کسی پتھریلی چیز سے ٹکرایا اور وہ گر پڑا۔ اس نے غور سے دیکھا تو مٹی کے اندر اسے ایک پتھر کی بنی ہوئی سیڑھی نظر آئی۔ وہ لڑکا دوڑتا ہوا کارٹر کے پاس پہنچا اور اسے سیڑھی کی بابت بتایا۔ کارٹر اس کے ہمراہ فوراً اس مقام پر پہنچا اور کھدائی شروع کر دی۔

اس کھدائی میں بائیس دن لگے اور بالآخر کارٹر اور اس کے ساتھی ان سیڑھیوں کے ذریعے کھدائی کرتے ہوئے مقبرے کے دروازے تک پہنچ گئے اور جب وہ مقبرے کے اندر پہنچے تو وہ سونے، چاندی اور جواہرات سے اٹا اٹ بھرا ہوا تھا۔ اس سے پہلے اتنی تعداد میں سونے سے بھرا مقبرہ کہیں دریافت نہ ہوا تھا اور اس کی دریافت کا سہرا ایک معمولی مشکی لڑکے کے سر بندھتا ہے جس نے اپنی بوریت دور کرنے کی تگ و دو میں ایک اہم دریافت کر ڈالی۔

ٹیراکوٹا کی فوج

ہم آپ کو ٹیراکوٹا کی فوج کے بارے میں بتاتے ہیں کیونکہ بہت سے قارئین اس دلچسپ و عجیب فوج کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے ہوں گے۔ قد آدم مجسموں پر مشتمل یہ شاندار فوج جو آٹھ ہزار سپاہیوں، 130 بگھیوں اور 520 گھوڑوں پر مشتمل ہے۔ دراصل یہ چینی شہنشاہ کوئن شی کے زمانے میں بنائی گئی تھی۔ تاریخی لحاظ سے آپ اس کی قدامت کا اندازہ اس طرح لگا سکتے ہیں کہ شہنشاہ کوئن شی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ماہنامہ سرگزشت کراچی

کا ایک اہم خاص نمبر

بے وقت موت نمبر

ان افراد کی روداد جو "بے وقت کی موت" کا شکار ہوئے۔

لیکن اپنی مختصر سی زندگی میں انہوں نے قابلِ تقلید کام کیے۔

اس خاص شمارے کے لیے آپ بھی لکھیں

کیونکہ سرگزشت کا خاص نمبر

اہمیت کا حامل ہوتا ہے، لوگ مجلد کرا کر رکھتے ہیں۔

اگر آپ ایسی کسی شخصیت پر لکھنا چاہتے ہیں تو پہلے آگاہ کر دیں

تاکہ کوئی دوسرا اس شخصیت پر لکھ رہا ہو تو اسے روک دیا جائے۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

دیوار چین کا بانی ہے، یعنی یہ فوج 210 قبل مسیح کے آس پاس تیار کی گئی تھی۔ اس کا مقصد شہنشاہ کے مرنے کے بعد اگلی دنیا میں بھی اسے اس کی شایانِ شان فوج فراہم کرنا تھی۔ اسی لیے کوئن شی کے انتقال پر مجسموں کا یہ لشکر اس کی لاش سمیت ہی دفنا دیا گیا تھا۔

اس کی تاریخ کی طرح اس کی دریافت کی کہانی بھی بہت دلچسپ ہے۔ واقعہ کچھ یوں ہے کہ 1974ء میں ایک چینی کسان اپنے کھیتوں کو سیراب کرنے کے لیے کنواں کھود رہا تھا جب اس کی کدال ایک گول منہ کے مرتبان جیسی چیز سے ٹکرائی۔ اس نے مرتبان کو باہر نکالنے کے لیے کھدائی جاری رکھی اور تھوڑی دیر بعد ہی اسے ایک مجسمے کی جھلک نظر آئی۔ اس نے کسی طرح کوشش کر کے وہ قدآدم مجسمہ باہر نکال لیا اور اسے میوزیم میں دکھانے چل پڑا۔ میوزیم کی انتظامیہ نے جونہی یہ مجسمہ دیکھا تو وہ فوراً بات کی تہ تک پہنچ گئی کہ... حادثاتی طور پر ایک معمولی کسان کے ہاتھوں کس قدر قیمتی تاریخی ورثہ دریافت ہوا ہے۔

اس کے بعد وہاں بڑے پیمانے پر کھدائی کا کام شروع ہوا اور رفتہ رفتہ ماہرین نے وہاں سے ٹیرا کوٹا کی پوری فوج برآمد کر لی۔ اس غریب کسان کو صلے میں پانچ ہزار ین سے نوازا گیا اور حکومت کی طرف سے اسے میوزیم میں اعزازی نوکری بھی دے دی گئی۔ ٹیرا کوٹا کی یہ عظیم الشان فوج آج میوزیم میں دیکھی جا سکتی ہے۔ آپ کو یہ جان کر حیرانی ہوگی کہ آٹھ ہزار سپاہیوں کے یہ مجسمے قد کاٹھ اور شکل وصورت میں ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہیں اور ان کی تیاری میں معمولی باریکیوں کا بھی خیال رکھا گیا ہے اس لیے دیکھنے میں یہ کسی جیتے جاگتے سپاہیوں کے لشکر سے مختلف نہیں لگتے۔ یہ یقیناً اس زمانے کے مجسمہ سازوں کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

ترکی کا زیرِ زمین شہر

1963ء میں ترکی کے ایک شہری نے اپنے چھوٹے سے گھر کی مرمت کرنے کی ٹھانی۔ اس مقصد کے لیے اس نے اپنے گھر کی ایک کمزور پڑتی دیوار گرادی تاکہ وہاں پر دوسری دیوار تعمیر کر سکے۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیوار کی دوسری جانب ایک غار نما کمرا بنا دیکھا۔ اس شخص نے گھبراہٹ کے باوجود کھدائی جاری رکھنے کا فیصلہ کیا اور کچھ عرصہ لگاتار کھدائی کے بعد رفتہ رفتہ اس نے اپنے سامنے سرنگوں کا ایک جال سا بنتا دیکھا جو 280 میٹر تک نیچے گھوم کر کسی قدیم شہر کی باقیات سے جا ملتا تھا۔

یہ صورتِ حال دیکھ کر اس نے مقامی انتظامیہ کو اس کی اطلاع کر دی جنھوں نے آ کر اس جگہ کو سیل کر کے اپنی نگرانی میں کھدائی شروع کروائی۔ آخر کار یہاں سے 'ڈیرنکیو' نامی ایک قدیم شہر برآمد ہوا جو بارہ یا پندرہ صدی عیسوی میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس زیرِ زمین شہر کو انا طولیہ کے 'حتی' نامی قدیم باشندے فوجوں کی یلغار سے بچنے کے لیے استعمال کیا کرتے تھے اور ایک وقت میں یہاں بیس ہزار افراد پناہ لے سکتے تھے۔

آج سیاح اس شہر کی سیر کر سکتے ہیں اور یہاں گھوم پھر کر اس کے معماروں کی مشاقی اور ذہانت کی داد دے سکتے ہیں۔ مزید اربات یہ ہے کہ یہ پورے کا پورا تاریخی شہر اس ترکی کی شہری کی دیوار کی دوسری جانب آباد تھا اور اسے اندازہ تک نہ ہوا۔

بحیرہ مردار کے قدیم نسخے

سن 1947ء میں چند بدو چرواہے اپنی بکری ڈھونڈ رہے تھے جب ان کا گزر ایک متروک غار سے ہوا۔ اس غار میں ان کی نظر اجنبی زبان میں لکھے ہوئے نسخوں پر پڑی جو مرتبانوں کے اندر بند تھے۔ انہیں بالکل بھی اندازہ نہ تھا کہ بے خبری میں انہوں نے عہد نامہ قدیم کے نسخے دریافت کر لیے تھے جو ایک انتہائی اہم تاریخی دریافت تھی۔

انہوں نے یہ مرتبان اٹھائے اور شہر آ کر ایک تاجر کے ہاتھوں ساٹھ ڈالر میں فروخت کر دیئے۔ رفتہ رفتہ چمڑے پر لکھے گئے یہ نسخے دنیا بھر میں پھیل گئے اور لوگوں میں ان کا چرچا ہونے لگا۔ کچھ نسخے امریکا میں بھی فروخت ہوئے، جن کی قیمت ڈھائی لاکھ ڈالرز تک لگائی گئی۔ ان بدو چرواہوں کو جب اندازہ ہوا کہ عہد نامہ قدیم پر مشتمل یہ نسخے اس قدر اہمیت کے حامل ہیں تو انہوں نے اپنا پیشہ تبدیل کر دیا اور ماہرین کے ہمراہ اس علاقے میں گھوم پھر کر ان جیسے مزید نسخوں کی دریافت میں ان کی مدد کرنے لگے۔ ان بدوؤں کی مدد سے ماہرین نے اب تک 981 قدیم نسخے برآمد کر لیے ہیں۔

آج یہ چرواہے اور ان کی اولادیں اپنے اس نئے پیشے کی بدولت تیس لاکھ ڈالرز سالانہ کما رہے ہیں۔ اس طرح انجانے میں ہونے والی ایک دریافت نے انہیں زمین سے اٹھا کر آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

فلم نگری

گولڈن اسٹار

انور فرہاد

انسان کے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے۔ قسمت کے آگے وہ بے بس ہے۔ یہی کچھ اس کے ساتھ ہوا۔ وہ گلوکار بننے چلا تھا لیکن قسمت نے کچھ اور سوچ رکھا تھا۔ پھر جب قسمت نے انگلی تھامی تو وہ خود بھی حیران رہ گیا کہ اس میں یہ خوبی بھی تھی۔

پاکستان کے سپر اسٹار کا زندگی نامہ

خدا کے دین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

اب آپ کو یا کسی دوسرے کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کہاں ملیں گے کہ اس شعر کی صداقت کے بارے میں ان سے خدائے ذوالجلال کی فیاضی کی تصدیق کریں گے۔ ہاں اس کی تصدیق مرزا نذیر بیگ سے بھی کی جاسکتی ہے کہ دل کھول کر دینے والی ذات بابرکات کی فیاضی میں آج بھی کمی نہیں آئی ہے۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''مجھے تو گانے کا شوق تھا اور میں اپنے اس شوق کی تکمیل کے لیے کراچی سے ڈھاکے گیا تھا۔ رب رحیم و کریم سے یہ دعا کرتے ہوئے گیا تھا کہ مولا! کراچی میں میری یہ آرزو پوری نہیں ہوئی۔ ڈھاکے میں پوری کردے۔ وہاں کی فلموں میں گانے کا چانس دلا دے۔ قربان جاؤں۔ اس مولا کی فیاضی پر کہ اس نے میرے مانگنے سے کہیں بڑھ کر مجھے دیا۔ گلوکار کی بجائے ہیرو بنا دیا۔ سپر ہٹ ہیرو۔''

جی ہاں یہ نذیر بیگ کا اعتراف ہے جو وہ بطور اداکار ندیم اپنے ہر انٹرویو میں کرتے ہیں۔ ندیم ہماری فلم انڈسٹری کے ماشاء اللہ سپر ڈپر وراسٹائل فنکار ہیں۔ اپنی اداکارانہ کیریئر کے پچاس سال گزارنے کے باوجود آج بھی ہماری فلمی صنعت کا اثاثہ ہیں۔ کروڑوں پرستاروں کے محبوب فنکار ہیں۔ فلم اور ٹیلی ویژن انڈسٹری کی گراں قدر خدمت انجام دے رہے ہیں۔

یوں تو ان کے بارے میں عوام کی بہت بڑی اکثریت بہت کچھ جانتی ہے۔ پھر بھی بہت سی باتیں نہیں جانتی۔ اس لیے آج کی نشست میں ہم آپ کو ایسی باتیں بھی ان کے بارے میں بتائیں گے جن سے عام لوگ آگاہ نہیں۔

ندیم صاحب کا پیدائشی نام نذیر بیگ ہے۔ ان کی پیدائش ہندوستان میں مدراس کے علاقے وجے واڑا میں ہوئی تھی۔ ان کے والد مرزا محمود بیگ ہندوستان میں کپل ٹیکس شپنگ ڈیپارٹمنٹ میں ملازم تھے۔ ہندوستان سے وہ ہجرت کر کے پاکستان آئے تو کپل ٹیکس کی شاخ سے وابستہ ہو گئے۔ ملازمت کے دوران ان کا تبادلہ سابق مشرقی پاکستان کے شہر کھلنا ہو گیا اور وہ وہیں سے ریٹائر ہو کر کراچی آ گئے۔

مرزا نذیر بیگ کی تعلیم کی ابتداء وجے واڑا ہی میں ہوئی تھی۔ ان کے والد اپنے خاندان میں سب سے پہلے پاکستان آئے تھے۔ پچاس کی دہائی کے اواخر میں انہوں نے اپنی فیملی کو بھی کراچی بلا لیا۔ نئے ملک کے نئے شہر میں آنے کے بعد مرزا نذیر بیگ کو بھی نئے سرے سے تعلیمی سلسلہ شروع کرنا پڑا۔ ان کو کراچی کے ناظم آباد نمبر چار کے گورنمنٹ اسکول میں داخل کروایا گیا جب کہ انہوں نے سندھ مدرسۃ الاسلام سے میٹرک پاس کیا۔

مرزا نذیر بیگ کو ابتداء ہی سے گانے کا شوق تھا۔ کہیں آتے جاتے کوئی اچھی آواز کا گانا سنتے تو رک جاتے اور ان پر ایک کیفیت طاری ہو جاتی اور دل ہی دل میں وہ سوچتے۔ ''کاش کہ میں بھی کبھی ایسی ہی سریلی آواز میں گانے والا بن جاؤں۔''

یہ اور ایسے ہی خیالات میں وہ اکثر کھوئے رہتے۔

''خدایا! وہ دن کب آئے گا جب میں ایک گانے والا بن جاؤں گا؟ میرے گائے ہوئے گیت لوگ شوق سے سنیں گے۔''

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں رکھتی ہے پرواز مگر رکھتی ہے

نذیر بیگ کے دل سے نکلی ہوئی یہ دعا بھی ایک دن قبول ہو گئی۔ نوجوان گانے کے رسیا کو ایک دن خبر ملی کہ بھارت سے آئے ہوئے ایک بڑے موسیقار نثار بزمی کراچی میں تشریف فرما ہیں اور ''یہ کراچی ہے'' نامی بننے والی فلم کی موسیقی دے رہے ہیں۔

نذیر بیگ نے قسمت آزمانے کا عزم کیا۔ نثار بزمی صاحب سے ملنے میں دیر نہیں لگائی۔ ''بزمی صاحب! مجھے گانے کا بہت شوق ہے۔ مجھے بھی اپنی فلم میں گانے کا موقع دیجیے۔''

نثار بزمی صاحب نے اس خوبرو نوجوان کو سر سے پاؤں تک گھور کر دیکھا۔ ''میاں صاحبزادے! پہلے کبھی کسی فلم کے لیے گایا ہے؟''

''جی نہیں۔''

''تمہارا استاد کون ہے؟ کس سے گانا سیکھا ہے؟''

''کوئی استاد نہیں ہے۔ کسی سے گانا نہیں سیکھا۔ گانے کا شوق تھا۔ بس خود ہی گاتا رہا۔''

نثار بزمی سوچ میں پڑ گئے۔ ''لڑکا تو محض شوقیہ گاتا ہے۔ گانے کی تعلیم یعنی سر تال سے بالکل بے بہرہ ہے۔ فلم میں کیسے گائے گا؟''

''سر جی۔'' نذیر بیگ نے نثار بزمی کو سوچتا ہوا دیکھ کر کہا۔ ''آپ میری آواز سن لیجیے۔ دیکھ لیجیے کیسی ہے؟''

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔ تم کچھ گا کر سناؤ۔ آواز سے کچھ اندازہ تو ہو۔''

''نذیر بیگ جو اکثر بڑے گلوکاروں کے گیت گنگنایا کرتے تھے اور دوستوں کی فرمائش پر گایا کرتے تھے۔ انہی گیتوں میں سے ایک گیت گا کر سنایا۔ نثار بزمی غور سے سنتے رہے اور دل ہی دل میں کہتے رہے۔ آواز تو بری نہیں ہے۔ تراش خراش کے بعد اور اچھی ہو جائے گی۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

مرزا نذیر بیگ گا کر خاموش ہوئے اور سوالیہ نگاہوں سے موسیقار کی طرف دیکھا۔ نثار بزمی بولے۔ ''ٹھیک ہے میاں! ہم تمہیں گانے کا ایک موقع دیں گے۔''

نذیر بیگ کو یوں لگا۔ جیسے انہیں دنیا جہان کی دولت مل گئی ہے۔ ''شکریہ سر! بہت بہت شکریہ۔ انشاء اللہ! میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔''

اس طرح انہیں کراچی کی فلم ''یہ کراچی ہے'' میں پہلی بار نثار بزمی صاحب نے چانس دیا۔ نذیر بیگ کی طرح فیصل خان نامی ایک شوقیہ فنکار کو بھی چانس دیا۔

نثار بزمی صاحب کو ایک اور فلم ''سہرا'' میں بھی موسیقی ترتیب دینے کا موقع ملا۔ وہ بھارت کے منجھے ہوئے اور تجربہ کار کمپوزر تھے۔ ''یہ کراچی ہے'' کے گانوں کی ریکارڈنگ سے ان کے کام کی مزید تصدیق ہوگئی تھی۔ اس لیے کراچی کے ایسٹرن اسٹوڈیو کے مالک سعید اے ہارون نے جب اپنی فلم ''سہرا'' شروع کی تو نثار بزمی ہی کو بطور موسیقار سائن کیا۔

نثار بزمی صاحب کو دوسری فلم ملی تو اس کا فائدہ مرزا نذیر بیگ کو بھی ہوا۔ کیونکہ انہوں نے ''یہ کراچی ہے'' میں گا کر بزمی صاحب کا اعتماد حاصل کرلیا تھا لہٰذا ''سہرا'' میں بھی انہیں گانے کا موقع دیا گیا۔

نذیر بیگ بہت خوش تھے کہ انہیں دو فلموں میں گانے کا موقع مل گیا ہے۔ ان فلموں کی ریلیز کے بعد انہیں عوامی مقبولیت حاصل ہوگی اور وہ پاکستانی فلموں کے نامور گلوکار بن جائیں گے۔ دوسرے موسیقار بھی انہیں اپنی فلموں کے لیے گوائیں گے۔

مگر ان کا یہ خواب پورا نہ ہوسکا۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ جو کچھ بندہ سوچتا ہے اس کے برخلاف ہوتا ہے۔ ہوا یہ کہ ان کی دونوں فلمیں ''یہ کراچی ہے'' اور ''سہرا'' مکمل ہی نہیں ہوسکیں۔ نذیر بیگ کو اس کا بڑا صدمہ ہوا۔ ایک نہیں۔ دو فلمیں ملیں مگر دونوں نے ہی مایوس کیا۔ دونوں مختلف وجوہ پر تکمیل کے مراحل سے گزر نہ سکیں۔

وہ دل ہی دل میں اللہ سے شکوے شکایت کرتے۔ پتا نہیں تیری کیا مصلحت ہے مولا! دو فلموں میں گانے کا موقع ملا۔ میں نے یقیناً اچھا گایا ہوگا جبھی نثار بزمی صاحب نے اپنی دوسری فلم میں بھی گانے کا چانس دیا مگر دونوں فلمیں شوٹنگ کے مرحلے ہی میں دم توڑ گئیں۔

ان دنوں نذیر بیگ بہت دل برداشتہ تھے مگر اپنے

زندگی نامہ

خاندانی نام: مرزا نذیر بیگ
فلمی نام: ندیم
پیدائش: وجے واڑا (ہندوستان میں مدراس کا ایک علاقہ)
والد کا نام: مرزا محمود بیگ
تعلیم: ابتدائی تعلیم وجے واڑا میں ہوئی۔ پاکستان آنے کے بعد کراچی کے ناظم آباد نمبر 4 کے گورنمنٹ اسکول میں داخلہ لیا۔ پھر سندھ مدرسۃ الاسلام سے میٹرک پاس کیا اور اسلامیہ کالج کراچی سے گریجویشن کیا۔
پہلی فلم: چکوری
پہلی فلم میں ملنے والا معاوضہ: ڈیڑھ ہزار روپے۔
پہلی فلم میں ملنے والا ایوارڈ: بہترین اداکار کا نگار ایوارڈ۔
فلموں کی تعداد: پچاس سالہ فلمی کیریئر میں کوئی 219 فلموں میں اپنی فنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔
اعزازات: فلم آئینہ میں کراؤن جوبلی کا اعزاز حاصل کیا۔ 9 فلموں نے ڈائمنڈ جوبلی کیا۔ 8 فلموں نے پلاٹینیم جوبلی کا تمغہ حاصل کیا۔ 29 فلموں نے گولڈن جوبلی کے اعزازت حاصل کیے۔ جب کہ 71 فلموں نے سلور جوبلی کے اعزازات حاصل کیے۔
ایوارڈز: 130 کے قریب ایوارڈز مل چکے ہیں۔ ان ایوارڈ میں نگار ایوارڈ، گریجویٹ، کریٹک، دلن، مصور، بولان، ایشین، آل فنکار، سندھ عوامی ایوارڈز، نیشنل فلم ایوارڈ، نیشنل کلچرل ایوارڈ، کا را فلم ایوارڈ، الیاس رشیدی گولڈ میڈل۔ وحید مراد میموریل ایوارڈ قابل ذکر ہیں۔ 1990ء میں حکومتِ پاکستان کی طرف سے فنی خدمات کے اعتراف پر پرائیڈ آف پرفارمنس۔
ذاتی فلمیں: اردو فلم مٹی کے پتلے، پنجابی فلم کھڑاک۔
شادی: کیپٹن احتشام کی بیٹی فرزانہ کے ساتھ ہوئی۔ یہ شادی بڑے رازدارانہ انداز میں اور خفیہ طور پر ہوئی۔ رخصتی کئی سال بعد ہوئی۔ جو دکھاوے کی شادی کے طور پر دھوم دھام سے رچائی گئی۔
اولاد: دو بیٹے، مرزا فرحان بیگ، مرزا فیصل بیگ۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

شوق کے آگے مجبور بھی تھے اور اس شوق کی تکمیل کے لیے جدوجہد بھی کرتے رہے۔

اسی فرسٹیڈ دور میں ان کی ملاقات مشرقی پاکستان کی نامور گلوکارہ فردوسی بیگم سے ہوئی۔ فردوسی بیگم کراچی اور لاہور کی فلموں کے لیے بھی بلائی جاتی تھیں یا کوئی موسیقی کی تقریب ہوتی تو اس میں شرکت کے لیے بھی انہیں بلایا جاتا تھا۔ فردوسی بیگم متحدہ بنگال کے معروف فوک گلوکار عباس الدین احمد کی صاحبزادی ہیں۔ عباس الدین احمد نے نامور بنگالی شاعر نذرالاسلام کے گیت گا کر بے پناہ شہرت حاصل کی تھی۔ ان کے بیٹے اور بیٹی نے بھی گلوکاری شروع کی تو انہیں بھی شہرت ملی۔ ڈھاکے کی فلموں میں گا کر فردوسی بیگم نے ملک گیر شہرت حاصل کرلی تھی۔ نذیر بیگ فردوسی بیگم سے ملے اور بتایا کہ انہیں بھی گانے کا بہت شوق ہے۔ دو فلموں میں نثار بزمی صاحب نے گانے کا چانس بھی دیا مگر اے بسا آرزو کہ خاک شد۔ دونوں فلمیں مکمل ہی نہ ہو سکیں۔

''اس کے بعد کسی اور فلم میں گانے کا موقع نہیں ملا؟'' فردوسی بیگم نے پوچھا۔

''نہیں یہاں فلمیں ہی کبھی کبھار بنتی ہیں اور جو بنتی ہیں وہ بھی.....''

''آپ ڈھاکے آئیں۔'' فردوس بیگم نے کہا۔ ''وہاں کی فلم انڈسٹری بڑی تیزی سے ترقی کررہی ہے۔ میں آپ کی ہیلپ کروں گی۔ اللہ نے چاہا تو آپ کامیاب ہوں گے۔''

کہا جاتا ہے کہ فردوسی بیگم، اس بلوری آنکھ والے خوبرو نوجوان سے بہت متاثر ہوئی تھیں۔ اس لڑکے سے مل کر ان کے دل میں بھی کچھ کچھ ہونے لگا تھا۔ اس لیے بھی وہ اس کی مدد کرنا چاہتی تھیں اور انہوں نے ڈھاکے آنے کی دعوت دے دی تھی۔

نذیر بیگ کراچی کی فلم انڈسٹری سے اپنے لیے کسی بہتری کی توقع نہیں رکھتے تھے۔ اس لیے فردوسی بیگم کی بات پر سوچنے لگے۔ اس بات سے تو انکار نہیں کہ ان دنوں ڈھاکے میں خوب فلمیں بن رہی ہیں۔ وہاں اگرچہ گانے والوں کی کمی نہیں لیکن فردوسی بیگم کا اگر سپورٹ حاصل ہوگا تو ایک دو فلموں میں با آسانی چانس مل جائے گا۔

اور پھر ایک دن وہ کراچی سے بذریعہ پی آئی اے ڈھاکے پہنچ گئے۔ آدمی جہاں بھی جائے روٹی اور روزی کا لاحقہ اس کے ساتھ رہتا ہے۔ نذیر بیگ نے ڈھاکا پہنچ کر گانوں کے سلسلے میں جدوجہد شروع کی۔ ریڈیو اور ٹی وی میں گانے شروع کیے۔ دوسری طرف کسی مستقل آمدنی کے بارے میں بھی کوشش کی۔ کیونکہ ریڈیو یا ٹی وی میں تو کبھی کبھی ہی گانے کا موقع ملتا تھا اور اس کے عوض جو چیک ملتا تھا۔ وہ بھی اس قابل نہیں ہوتا تھا کہ مہینا بھر ساتھ نبھائے۔

اسی دوران ایک دوست نے کہا کہ ہدایت کار ظہیر ریحان ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی کے چیف ہیں۔ تم ان سے ملو۔ شاید وہاں تمہیں کوئی مناسب کام مل جائے۔ نذیر بیگ پہلی ہی فرصت میں ان سے ملا اور اسے مایوسی نہیں ہوئی۔ ظہیر ریحان نے ملازمت دے دی۔

یہ بات قرینِ قیاس ہے کہ ریڈیو اور ٹی وی پر گانے کا چانس دلوانے میں فردوسی بیگم کی کوشش رہی ہو۔ دوسری طرف تقریبات میں لے جانے اور گانے کا چانس دلوانے میں بھی فردوسی بیگم اپنا کردار ادا کرتی رہیں۔ اس سلسلے میں ایک خاص تقریب قابلِ ذکر ہے۔ ہدایت کار احتشام کی رنگین اور سینما اسکوپ فلم ''مالا'' کی سلور جوبلی کی تقریب جب گلستان سینما میں انعقاد پذیر ہوئی تو اس میں بھی نذیر بیگ کو پرفارمنس کا موقع ملا۔ جب کہ اس تقریب کے آرگنائزرز میں فردوسی بیگم بھی شامل تھیں۔

یہ تقریب اس لیے بھی نذیر بیگ کی زندگی میں اہمیت کا درجہ رکھتی ہے کہ اس میں احتشام کی لاڈلی بیٹی فرزانہ نے اس بلوری آنکھ والے کو دیکھا تو اسے اپنا دل سنبھالنا مشکل ہوگیا۔ وہ جو کہتے ہیں عشق اول دردل معشوق پیدا می شود۔ کچھ ایسی ہی بات تھی۔ اس شوخ وشنگ لڑکی کے دل میں وہ ایسا بسا کہ اسے اپنی زندگی سے نکالنا آسان نہ رہا۔ دوسری طرف بے چارے نذیر بیگ کو ایسی کسی بات کا کچھ اندازہ نہیں تھا کہ کون اس کے گانے سے متاثر ہوا اور کون اس سے۔

یہ تقریب بھی بڑی عجیب تھی۔ ''مالا'' رنگین اور سینما اسکوپ فلم ہونے کے بعد بھی عوامی مقبولیت حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ گلستان سینما میں زبردستی اس کی سلور جوبلی کروائی گئی تھی کیونکہ سینما گھر بھی پروڈیوسر دوسانی صاحب کا ذاتی تھا۔ اس لیے کھینچ تان کر اسے 25 ہفتوں تک لے جایا گیا تھا اور سلور جوبلی تقریب منا کر اس فلم کو مزید پبلسٹی دینے کی کوشش کی گئی تھی۔

بات ''مالا'' کی ناکامی کی نکلی ہے تو مناسب ہے کہ لیو

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

فلمز اور ڈوسانی پکچرز والوں کے اشتراک کے بارے میں بھی بتاتا چلوں ''چندا'' اور ''تلاش'' کی سپرہٹ کامیابی کے بعد احتشام اور مستفیض بنگالی فلموں کے بعد اردو فلموں کے بھی کامیاب ہدایت کار تصور کیے جانے لگے۔ فلمی دنیا کی یہ ریت ہے کہ جب کسی ڈائریکٹر کی فلم باکس آفس پر کامیاب ہو جاتی ہے تو پروڈیوسرز کی کوشش ہوتی ہے کہ اسی سے اپنی فلم بنوائے۔ یہی کچھ ان دونوں بھائیوں کے ساتھ بھی ہوا۔ کئی فلم سازوں نے ان کے لیے سرمایہ کاری کی آفر کی۔ جن میں گلستان سنیما کے مالکان ایف ایم ڈوسانی اور ان کے بیٹے انیس ڈوسانی ان ہدایت کار برادران کو زیادہ اچھے لگے۔ کیونکہ ان کے پاس مشرقی پاکستان کا سب سے بڑا اور ماڈرن سنیما گھر بھی تھا۔ یہ دونوں باپ بیٹے سنیما بزنس میں قدم جمانے کے بعد فلموں کی ڈسٹری بیوشن بھی کرنے لگے تھے اور اس میں بھی بہت کامیاب ثابت ہوئے تھے۔ پھر ان کی دلچسپی فلم سازی میں بھی بڑھی اور انہوں نے احتشام اور مستفیض کے ساتھ مل کر فلم سازی کا پروگرام بنایا۔ سرمایہ ڈوسانی پکچرز کا فلم سازی کی ساری ذمہ داری لیو فلمز کی۔ ان دونوں بھائیوں کے فلم ساز ادارے کا نام لیو فلمز تھا۔ دونوں اداروں کے اشتراک سے بننے والی ابتدائی کچھ فلمیں باکس آفس پر کامیاب ہوئیں تو دونوں پارٹیوں کے حوصلے بلند ہوئے۔ مگر ان دونوں بھائیوں کی ایک عادت اچھی نہیں تھی۔ دونوں بڑے حریص تھے دوسرے فلم والوں کی نقل کرنے بلکہ ان سے ایک قدم اور آگے بڑھانے کے معاملے میں۔ سنجیدہ فلم والے انہیں پسند نہیں کرتے تھے۔ ہدایت کار بے بی اسلام نے ڈھاکے میں سب سے پہلے اردو فلم بنانے کی طرح ڈالی تو اس کی کامیابی ان سے ہضم نہ ہو سکی اور دیکھا دیکھی ''چندا'' بنا ڈالی اور بے بی اسلام کی فلم ''تنہا'' کی نمائش میں رخنا ڈال کر اپنی فلم ''چندا'' پہلے ریلیز کر کے ڈھاکے کی پہلی اردو فلم بنانے کا سہرا اپنے سر سجا لیا۔ ظہیر ریحان نے پہلی رنگین فلم ''سنگم'' بنائی تو ان دونوں نے رنگین اردو فلم ''ساگر'' بنا ڈالی۔ ہدایت کار ظہیر ریحان نے پہلی سنیما اسکوپ فلم ''بہانہ'' بنائی تو ان لوگوں نے رنگین سنیما اسکوپ فلم ''مالا'' بنا دی۔ ظہیر ریحان کی سنیما اسکوپ فلم بلیک اینڈ وائٹ تھی اور کراچی کی لوکیشن میں بنائی گئی تھی۔

اس دوڑ میں ان کی فلموں کا معیار کم سے کمتر ہوتا گیا۔ اچھے فلم میکر فلم بنانے سے پہلے اس کی کامیابی کی جو منصوبہ بندی کرتے ہیں اس کا یہ دونوں بھائی خیال نہ رکھ سکے اور

ندیم کے گیت جو انہی پر فلمائے گئے

☆ محبتوں کے قدرداں نہ شہر میں نہ گاؤں میں۔ فلم ''جلے نہ کیوں پروانہ''۔

☆ نجر یا وجر یا ملائے لے۔ فلم ''امنگ''

☆ زمانہ سنگ ناچے گا۔ فلم ''پھول میرے گلشن کا''

☆ اکھیاں ملائے نیندیں چرا کے۔ فلم ''دو بدن''

☆ دیوانہ دیوانہ دل میرا۔ فلم ''پھول''۔

☆ میری اداس غم کی بانہوں میں۔ فلم ''پھول''

☆ لکھے پڑھے اگر۔ فلم ''اناڑی''

☆ نادان تھے جو آپ کی عقل میں آ گئے۔ فلم ''مٹی کے پتلے''

☆ تمہیں کیوں نہ چاہیں۔ فلم ''من کی جیت''

ندیم کے گائے ہوئے دو گانے

☆ کہاں ہو تم کو ڈھونڈ رہی ہیں۔ ندیم، فردوسی فلم چکوری۔

☆ اور حسین بھی دیکھے ہوں گے۔ ندیم، احمد رشدی، نیرہ نور فلم دو بدن۔

☆ ارے طعنہ تیرا طعنہ۔ ندیم، مالا فلم بھول۔

☆ منڈیا دو پٹا (پنجابی)۔ ندیم، نور جہاں فلم مکھڑا۔

☆ اونہوں تکیا پھڑک گئی (پنجابی)۔ ندیم، نور جہاں، مسعود رانا فلم مکھڑا۔

ندیم بطور شاعر

بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ندیم صاحب کو شعر و شاعری سے بھی دلچسپی ہے۔ وہ نہ صرف اچھی شاعری شوق سے پڑھتے ہیں بلکہ کبھی کبھی خود بھی اشعار کہا کرتے ہیں۔ ان کی شاعری کے کچھ نمونے پیش خدمت ہیں۔

اب تو بجھنے لگے سانسوں کے دیئے
زندگی بھی ٹھہرنے والی ہے
ان اندھیروں کے ڈھلتے آنچل سے
اک نئی صبح نکلنے والی ہے

☆

میں ہی صحرا میں تھا میں ہی تھا بہاروں میں
میں چلا جاؤں گا تو ڈھونڈو گے ستاروں میں

☆

کون جاتا ہے چھوڑ کر دنیا
بس ذرا نقش بدل جاتے ہیں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ان کی رنگین فلم ''ساگر'' اور رنگین اور سینما اسکوپ فلم ''مالا'' بڑی سرمایہ کاری کے باوجود باکس آفس پر بری طرح فلاپ ہو گئیں۔ اس بات پر ان کے انویسٹر ڈوسانی پکچرز والے سخت برہم ہوئے اور کہا۔ ''ہم تم لوگوں کے ساتھ ایسے گھاٹے کا سودا نہیں کر سکتے۔ بابا! ہم کاروباری لوگ ہیں۔ اس اُمید پر روکڑ لگاتے ہیں کہ دو خرچ کریں تو چار کمائیں۔ ہم اپنی محنت کی کمائی لگائیں اور تم لوگ بور اور بکواس فلمیں بنا کر ہمارا دھڑن تختہ کرو۔ یہ ہم برداشت نہیں کر سکتے۔''

ڈوسانی پکچرز والوں کے اس بدلے ہوئے رویے پر دونوں بھائیوں کی سٹی گم ہو گئی۔ گھر واپس آ کر سر جوڑ کر بیٹھے۔ اب کیا کیا جائے۔ ان کا ایک دستور تھا کہ کوئی خاص فیصلہ کرنا ہوتا تو گھر میں گول میز کانفرنس کیا کرتے تھے جس میں دونوں بھائیوں کی بیگمات بھی شریک ہوتی تھیں۔ ان کے پاس بھی اپنا کمایا ہوا سرمایہ تھا مگر اب انہیں دوسروں کے پیسوں سے فلم بنانے کا چسکا لگ چکا تھا۔ اس لیے یہی فیصلہ ہوا کہ ڈوسانی پکچرز والوں کو کسی نہ کسی طرح راضی کر کے انہی کے سرمائے سے اگلی فلم بنائی جائے۔ لہٰذا دونوں بھائی ان باپ بیٹوں کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دست بستہ عرض کیا۔ ''ہمیں ایک موقع اور دیجیے۔ ہم آپ کو مایوس نہیں کریں گے۔''

یہ باپ بیٹے بھی منجھے ہوئے کاروباری لوگ تھے۔ انہوں نے ان کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کا سوچا۔

''دیکھو بھئی!'' بڑے ڈوسانی بولے۔ ''ہم تمہاری اگلی فلم کے لیے اسی صورت میں سرمایہ لگا سکتے ہیں کہ تم لوگ.....''

''ہمارا پچھلا گھاٹا بھی پورا کرو۔'' چھوٹے ڈوسانی نے باپ کی بات آگے بڑھائی۔

دونوں بھائیوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ جیسے ان باپ بیٹے کی شرط کا مطلب سمجھنا چاہتے ہوں۔ بڑے ڈوسانی بولے۔ ''ہماری بات کا مطلب یہ ہے کہ اب تم لوگ جو فلم بناؤ گے اس کے منافع سے ہمارے اس گھاٹے کو بھی پورا کرو گے جو ''ساگر'' اور ''مالا'' میں ہمیں برداشت کرنا پڑا ہے۔''

یہ بڑی مشکل شرط تھی۔ دونوں بھائیوں نے ذرا سوچا۔ غور و فکر کیا پھر یہ شرط قبول کر لی۔

''دیکھو اب فلم بہت سوچ سمجھ کر بناؤ۔'' چھوٹے ڈوسانی بولے۔ ''خوب اچھی طرح منصوبہ بندی کرو۔ زبردست پلاننگ کرو۔ اس کے بعد ایسی فلم شروع کرو جس میں ناکامی نہ ہو۔''

''دوسروں کے راستے پر چلنے کی کوشش نہ کرو۔'' بڑے ڈوسانی نے بیٹے کی بات آگے بڑھائی۔ ''دوسرے اپنی سوچ، سمجھ، صلاحیت اور پلاننگ کے تحت کام کرتے ہیں۔ تم لوگ بھی خوب اچھی منصوبہ بندی کرو۔ تم اپنی صلاحیتوں کو نظر میں رکھ کر سوچو کہ کیا کر سکتے ہو۔ کیسے ایک کامیاب فلم پروڈیوس کر سکتے ہو۔ اس طرح ایک فلم شروع کرو۔''

''ٹھیک ہے جی۔ ہم ایسا ہی کریں گے۔''

گھر آ کر مستفیض نے احتشام سے کہا۔ ''بھیا! یہ شرط کچھ بھاری نہیں ہو گئی؟''

احتشام نے انگوٹھے کا ناخن دانت سے کترتے ہوئے کہا۔ ''بھاری تو ہے مگر کیا کیا جائے کہ اسے ماننے کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں۔ فلم بنانا بھی ایک جوا ہے۔ اس میں ایک بازی یہ بھی سہی۔ اب ہمیں ٹھنڈے دل سے سوچنا چاہیے کہ ہمیں کیسی فلم بنانی چاہیے۔''

ان ہی دنوں گلستان سینما میں ہدایت کار پرویز ملک اور فلم ساز و اداکار وحید مراد کی فلم ''ارمان'' کی کامیاب نمائش جاری تھی۔ اسی فلم نے تماشائیوں کو زبردست طریقے سے اپنی پسندیدگی کے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا.... ایسا کوئی شو نہیں ہوتا تھا جو ہاؤس فل نہ ہو۔ ایک بار اسے دیکھنے والا دوسری تیسری بار بھی دیکھنے آتا۔ دوستوں کو بھی دیکھنے کا مشورہ دیتا اور اپنی فیملی کے ساتھ بھی آ کر دیکھتا۔

جب کوئی فلم کامیابی کے جھنڈے گاڑتی ہے تو دوسرے فلم میکرز کا دل مچل جاتا ہے کہ کاش ہم بھی کوئی ایسی ہی فلم بنائیں۔ یہ دونوں حریص بھائی بھی یہی سوچنے لگے۔

''پرویز ملک نے یہ کیسی فلم بنالی ہے کہ شائقین فلم اس پر ٹوٹے پڑ رہے ہیں۔''

''تم لوگ بھی ایسی فلم بناؤ۔'' ان کی بیگموں نے انہیں مشورہ دیا۔

''مگر اس فلم میں ہے کیا جسے لوگ پسند کر رہے ہیں؟'' احتشام نے مستفیض کی طرف دیکھ کر کہا۔

''میرے خیال میں تو بھیا۔'' مستفیض نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''اس فلم کی بنیادی چیز رومانس ہے۔ ڈیپ رومانس۔ وحید مراد اور زیبا نے اپنا محبت بھرا کردار ایسا ادا کیا ہے، اس قدر ڈوب کر پرفارم کیا ہے کہ بار بار دیکھنے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

یہ شمارہ پاک وسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف

ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ

کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ

ایڈ فری لنکس

ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر

ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

ہمیں فیس بُک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

http://paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

کے بعد بھی دیکھنے والوں کا دل نہیں بھرتا۔''

''ہاں!'' احتشام نے اپنے انگوٹھے کا ناخن دانتوں سے کترتے ہوئے کہا۔ ''میں بھی اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ رومانس ہی اس فلم کا بنیادی فیکٹر ہے جس نے عوام کو اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے۔''

ذرا دیر تک دونوں خاموش رہ کر اپنے اپنے طور پر کچھ سوچتے رہے پھر مستفیض بولے۔ ''محبت! فلموں کے لیے ایک ایسا یونیورسل سبجیکٹ ہے جس پر بننے والی فلمیں کبھی ناکام نہیں ہوتیں۔''

''ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اسی لیے ''لوک رومانی داستانوں'' پر بننے والی فلمیں فلم بین شوق سے دیکھتے اور پسند کرتے ہیں۔ لیلیٰ مجنوں، سسی پنوں اور ہیر رانجھا کی داستان عشق پر فلمیں بار بار بنائی جاتی ہیں اور ہر بار انہیں کامیابی حاصل ہوتی ہے۔''

''چونکہ اب نئے دور کے تقاضوں کے تحت فلمیں بنائی جارہی ہیں۔'' مستفیض بولے۔ ''اس لیے اب موجودہ ماحول کے مطابق رومانی کہانیاں فلمائی جانے لگی ہیں۔''

اس گفتگو کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب انہیں بھی کوئی ایسی فلم بنانی چاہیے جس میں ڈیپ رومانس ہو۔ بہت اچھی موسیقی ہو اور دل میں اتر جانے والے گیت ہوں۔

دونوں بھائیوں نے کئی دنوں تک ایسی کوئی کہانی سوچنے کی کوشش کی مگر ایسی کوئی کہانی ان کی سمجھ میں نہیں آئی جو زبردست رومانوی ہو۔ جب تک وہ بنگالی فلمیں بناتے تھے انہیں چھپی ہوئی کوئی کہانی مل جاتی تھی جسے وہ فلمی پیرائے میں منتقل کر کے فلم بنا لیتے تھے۔ اردو فلمیں بنانا شروع کیں تو بنگال کے پس منظر میں کوئی ہلکا پھلکا موضوع سوچ کر کسی اردو فلم نویس سے ڈیویلپ کرواکر اس کے اسکرین پلے اور مکالمے لکھوا لیے اور مصنف کے طور پر اپنی بیگمات میں سے کسی ایک کا نام دے دیا۔ جب کہ ظہیر ریحان اور قاضی ظہیر یا نذرالاسلام ایک مضبوط اور مستحکم کہانی کی بنیاد پر فلم بناتے تھے۔ ظہیر ریحان خود ایک بہت اچھے فکشن رائٹر تھے جب کہ قاضی ظہیر اور نذرالاسلام وغیرہ۔ مستند رائٹرز کی کہانیاں حاصل کرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اچھی کہانی پر ہی اچھی فلم بنتی ہے۔

جب کوشش بسیار کے باوجود یہ دونوں بھائی کوئی کہانی نہ گڑھ سکے تو تھک ہار کر انہوں نے فیصلہ کیا کہ کیوں

ایک یادگار دن

یکم اگست 1975ء کو ایک انہونی ہوگئی۔ اس دن ندیم کی دو فلمیں ''اناڑی'' اور ''پہچان'' ایک ساتھ نمائش پذیر ہوئیں اور دونوں نے ڈائمنڈ جوبلی کی۔ اناڑی ایس سلیمان کی تھی جب کہ پہچان کے ہدایت کار پرویز ملک تھے۔ دونوں فلموں میں شبنم ندیم کی ہیروئن تھیں۔

عظیم فتوحات

کراؤن جوبلی فلم

آئینہ ریلیز 1977ء

ڈائمنڈ جوبلی فلمیں

نادان (ریلیز 1973ء) اناڑی، پہچان (ریلیز 1975ء)، تلاش (ریلیز 1976ء)، ہم دونوں (ریلیز 1980ء)، لاجواب (ریلیز 1981ء) قربانی (ریلیز 1981ء) سنگدل (ریلیز 1982ء)، دھلیز (ریلیز 1983ء)

پلاٹینم جوبلی فلمیں

چکوری (ریلیز 1967ء)، دل لگی (ریلیز 1974ء)، امبر، زندگی (ریلیز 1978ء)، پاکیزہ (ریلیز 1979ء)، بندش (ریلیز 1980ء)، میاں بیوی راضی (ریلیز 1982ء)، حساب (ریلیز 1986ء)

گولڈن جوبلی فلمیں

چھوٹے صاحب (ریلیز 1967ء)، سنگدل ہدایت کار اظفر شباب ریلیز 1968ء) بہن بھائی (ریلیز 1968ء)، دیا اور طوفان (ریلیز 1969ء)، پھول میرے گلشن کا (ریلیز 1974ء)، پھول۔ شمع (ریلیز 1974ء)، زینت، جب جب پھول کھلے (ریلیز 1975ء) پلے بوائے (ریلیز 1978ء)، صائمہ، رشتہ (ریلیز 1980ء)، خوب صورت، مہربانی (ریلیز 1982ء)، دیوانگی (ریلیز 1983ء)۔ کامیابی، بسیرا (ریلیز 1984ء)، ہم سے ہے زمانہ۔ دیوانے دو۔ زمین آسمان (ریلیز 1985ء)، فیصلہ (ریلیز 1986ء)، چوروں کی بارات (ریلیز 1987ء)، بازارِ حسن (ریلیز 1988ء)، انسانیت کے دشمن (ریلیز 1990ء)۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

نہ کسی رائٹر کو یہ ٹاکس دیا جائے۔ کوئی ڈیپ رومانس کی بنیاد پر کہانی لکھنے کو کہا جائے۔ ان دنوں سرور بارہ بنکوی کے علاوہ شاعر صدیقی، نقی مصطفیٰ اور زین العابدین ڈھاکے کی اردو فلموں کے اسکرپٹ رائٹرز کی حیثیت سے نمایاں حیثیت کے حامل تھے۔ سرور صاحب کے بارے میں سوچا مگر وہ بہت زیادہ مصروف تھے۔ ان سے وہ حسب منشا کام نہیں کروا سکتے تھے۔ شاعر صدیقی خاصے سینئر تھے مگر ایک طرح سے وہ ایس ایم پرویز کے گروپ سے ان کا تعلق گہرا تھا اس کام کے لیے وہ بھی انہیں کچھ جچے نہیں۔ نقی مصطفیٰ، قاضی ظہیر اور خان عطاء الرحمن سے زیادہ قریب تھے لہٰذا ان سے اس بات کا خطرہ تھا کہ وہ اگر کوئی منفرد کہانی دیں گے تو شاید فلم کی ریلیز سے پہلے وہ کہیں لیک آؤٹ نہ ہو جائے۔ رہ گئے زین العابدین تو ان کی چھان پھٹک کے بعد پتا چلا کہ وہ بنیادی طور پر فنکشن رائٹر ہیں اور ایک اچھے صحافی بھی ہیں اور کسی فلمی گروپ سے ان کا کوئی تعلق بھی نہیں ہے۔

دونوں بھائیوں نے انہیں بلا کر کہا۔ ''زینو بھائی! ہمیں ایک فلمی کہانی چاہیے۔''

''کیسی کہانی؟''

''ایک رومنٹک کہانی۔''

زینو بھائی بولے۔ ''کیپٹن صاحب! ہر فلم رومنٹک ہوتی ہے۔ ایک رومانی جوڑے کے گرد گھومتی ہے۔''

''ارے بھئی! بھیا کا مطلب ہے۔'' مستفیض نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''اس کہانی میں صرف رومانس ہو۔ ڈیپ رومانس اور کوئی مسئلہ مسائل نہ ہو۔''

زین العابدین ایک کامیاب صحافی بھی تھے۔ ان دونوں بھائیوں کے موڈ مزاج سے بھی واقف تھے۔ انہیں یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ لوگ ''ارمان'' ٹائپ کی کوئی ڈیپ رومنٹک فلم بنانا چاہتے ہیں۔

''ٹھیک ہے۔'' زینو بھائی نے خالص فلمی انداز میں کہا۔ ''میں ایسی کوئی کہانی بنانے کی کوشش کرتا ہوں۔''

''بس اس بات کا خیال رکھنا کہ وہ ہمارے بنگال کے پُرفضا ماحول اور لوکیشنز میں انگوٹھی میں نگینے کی طرح ہو۔''

''انشاء اللہ! ایسا ہی ہوگا کیپٹن صاحب۔ عام روایتی فلموں سے ذرا ہٹ کر۔ بنگال کا حسن۔ بنگال کا جادو اس میں بھرپور طور پر پیش کرنے کی کوشش کروں گا بس چند روز کی مہلت دیجیے۔''

''ٹھیک ہے اطمینان سے سوچیے۔ اطمینان سے لکھ کر لائیے۔ ہمیں کوئی جلدی نہیں بس اس سے ایسا جادو ہو جو سب کے سر چڑھ کر بولے۔''

زین العابدین بنیادی طور پر افسانہ نگار تھے۔ سید پور سے تعلق رکھنے والے جن نوجوانوں کو لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ ان میں زین العابدین بھی تھے اور انہیں بھی محی الدین نواب اور حیدر صفی کی طرح افسانہ نگاری کا شوق تھا۔ احمد سعدی اور ادیب سہیل کی سرپرستی انہیں بھی حاصل تھی۔ ادبی محفلوں میں شریک ہوتے تھے اور اپنے افسانے سناتے تھے۔ پھر جب وہ سید پور سے ڈھاکے آ گئے تو ادبی پرچوں میں ان کے افسانے شائع بھی ہونے لگے۔ فلمی دنیا میں قدم رکھا تو اسکرپٹ رائٹنگ کا شعبہ اپنایا۔ شروع میں ان کے ساتھ بھی یہی ہوا کہ لکھا انہوں نے مگر کریڈٹ کسی اور کو دیا گیا مگر وہ ان باتوں سے دلبرداشتہ نہیں ہوئے کہ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔

کوئی ہفتہ عشرہ کے بعد زین العابدین ایک فلمی کہانی لکھ کر دونوں ہدایت کار بھائیوں کے دربار میں پہنچ گئے۔

''لے آئے کہانی؟''

''جی ہاں۔''

''تو پھر سناؤ۔''

زینو بھائی نے مسودے کو کھول کر پڑھنا چاہا تو مستفیض ایک دم بول پڑے ذرا ٹھہرو یار۔''

زینو بھائی ٹھہر گئے۔ ''بھیا! ان دونوں کو بھی تو بلا لیجیے ناں جو ہماری فلموں کی مصنفہ ہوتی ہیں۔''

''ہاں ہاں ان کی موجودگی بھی ضروری ہے۔''

اتفاق سے اس وقت دربار میں کوئی اور (درباری) نہیں تھا۔ دونوں بیگمات بھی آ کر بیٹھ گئیں۔ ''ہاں اب سنائیے زینو بھائی۔''

زینو بھائی نے کہانی سنانی شروع کی۔ وہ ایک ایک سطر ایک ایک جملہ بہت ٹھہر ٹھہر کر سنانے لگے اور وقفے وقفے سے سننے والوں کے چہروں پر بھی نظر ڈالتے رہے۔ جلد ہی ان کے تاثرات سے زینو بھائی کو اندازہ ہو گیا کہ کہانی میں وہ دلچسپی لے رہے ہیں۔ کہانی میں زینو بھائی نے اپنی فکشن نگاری کا کمال دکھایا تھا۔ بنگال کے پُرفضا مقام میں رہنے والے دو پریمیوں کا ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہنے کے مناظر ایسے جادو اثر تھے کہ ان کے چہروں کی چمک گواہی دے رہی تھی کہ کہانی ان کے حسب منشا لکھی گئی ہے۔ کہانی ختم ہوئی تو دونوں بیگمات نے کچھ کہنے کا ارادہ کیا تھا کہ ان

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کے شوہروں نے نگاہوں کے اشارے سے انہیں روک کر خالص کاروباری انداز میں کہا۔ ''ہاں..... ٹھیک ہے۔''

زینو بھائی بھی کوئی اناڑی کھلاڑی نہیں تھے۔ جھٹ بولے۔ ''اگر پسند نہیں آئی تو کوئی بات نہیں۔ اسے گولی ماریئے۔ میں دوسری لکھ دوں گا۔''

''تمہیں اتنی بری بھی نہیں۔''

''ہاں اسکرین پلے اور بہترین ٹریٹمنٹ کے بعد اس میں جان آجائے گی۔''

''کیوں رسک لیتے ہیں؟'' زینو بھائی نے بھی پینترہ بدلا۔ ''میں اس سے بھی زیادہ مصالحے دار.....''

زینو بھائی کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ان کے ہاتھ سے مسودہ لے لیا گیا۔ ''ارے یار! فلم تو ٹیم ورک کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس میں کچھ ہمارا حصہ بھی پڑے گا تو یہ ایک اچھی فلم بن جائے گی۔''

''چند روز تک ہم اس کہانی پر غور و فکر کریں گے۔ اس کے اسکرین پلے پر کام کریں گے۔ پھر تم ہی اس کے مکالمے لکھو گے۔''

زینو بھائی کے جانے کے بعد انہوں نے کھل کر اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ ''کہانی تو واقعی بہت اچھی ہے۔''

''بہت ڈیپ رومانس ہے۔''

''ایک نوجوان جوڑے کے جذبات و احساسات کو ظالم نے بڑے آرٹسٹک انداز میں پیش کیا ہے۔''

دونوں بھائی بہت خوش تھے کہ انہیں ایک بھرپور رومانی کہانی مل گئی ہے۔ ''اگر اس پر اچھی فلم بن گئی تو ارمان کی طرح نہ سہی۔'' اس سے کم بھی کامیاب ہوئی تو ہمارے وارے نیارے ہو جائیں گے۔

''بھیا! فلم کی کامیابی اور ناکامی کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ ہماری رنگین فلم ''ساگر'' اور رنگین اور سنیما اسکوپ فلم ''مالا'' کا جو حشر ہوا کیا ہمیں اس کی اُمید تھی؟ اس لیے اب بہت محتاط قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اس بار جو پیسا ان باپ بیٹوں سے ملنے والا ہے اسے بہت سوچ سمجھ کر خرچ کرنا ہو گا۔ اس بات کی کوشش کرنی ہو گی کہ پروڈکشن ہیوی نہ ہو۔ کم سے کم سرمائے سے فلم مکمل ہو جائے۔''

''کہانی کی مناسبت سے تو لوکیشن گاؤں دیہات کی ہے۔ چند ایک سیٹ لگوانے پڑیں گے۔ وہ بھی معمولی نوعیت کے۔''

''بھیا! ایک بات اور کہوں؟''

''کہو۔''

''جو رقم ادھر سے ملے اس کا آدھا فلم پر خرچ کیا جائے اور آدھے کو خدانخواستہ اپنے برے وقت کے لیے اپنے بینک میں جمع کروا دینا چاہیے۔''

''بہت اچھا مشورہ ہے۔''

سلور جوبلی فلمیں

چاند اور چاندنی۔ میں کہاں منزل کہاں۔ قلی (ریلیز 1968ء)، نازنین (ریلیز 1969ء)، شمع اور پروانہ، بازی، جلے نہ کیوں پروانہ، سوغات، چاند سورج (ریلیز 1970ء)، چراغ کہاں روشنی کہاں (ریلیز 1971ء)، آؤ پیار کریں، انگارے، من کی جیت، احساس (ریلیز 1972ء)، سہرے کے پھول، بادل اور بجلی، سوسائٹی (ریلیز 1973ء)، دو بدن، سماج، انتظار، مس ہپی، بہشت، شرافت (ریلیز 1974ء)، فرض اور مامتا، ہار گیا انسان، پالکی، روشنی، انجیر (ریلیز 1975ء)، انسان اور فرشتہ، سیاں اناڑی، دو آنسو، جیو اور جینے دو (ریلیز 1976ء)، محبت ایک کہانی، عشق عشق، درد، روٹی کپڑا اور انسان، بڑے میاں دیوانے، شرمیلی، مٹھی بھر چاول، پرنس (ریلیز 1977ء)، مہندی لگی میرے ہاتھ (ریلیز 1980ء)، وطن (ریلیز 1981ء)، آہٹ، آس پاس، آنگن، تھوڑی سی بے وفائی (ریلیز 1982ء)، گمنام، یہ کیسے ہوا (ریلیز 1983ء)، خوش نصیب، لازوال (ریلیز 1984ء)، ہیرو، پروانا، کندن، بدلہ، لو ان لندن (ریلیز 1987ء)، میری عدالت، بکھرا (ریلیز 1988ء)، طاقت کا طوفان، بارود کی چھاؤں (ریلیز 1989ء)، راجا، بلندی (ریلیز 1990ء)، دولت کے پجاری (ریلیز 1991ء)، خونی شعلے، عبداللہ دی گریٹ، چاہت (ریلیز 1992ء)، میں ایک دن لوٹ آؤں گا (ریلیز 2007ء)، میں ہوں شاہد آفریدی (ریلیز 2013ء)

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اور اس مشورے پر انہوں نے عملی طور پر چلنا شروع کردیا۔ فلم کے اخراجات کم کرنے کے لیے نئے لوگوں سے کام لینا شروع کردیا۔ ایسے لوگ جن کو جو دیں وہ قبول کرلیں۔ ایسے میں ان کے ہیرو عظیم نے ڈیمانڈ کردیا کہ اس فلم میں مجھے زیادہ معاوضہ دینا ہوگا۔

''کیوں یہ زیادہ معاوضے کی کیا تک ہے؟''

''کیپٹن صاحب! میں ایک بڑا ہیرو ہوں۔ بڑی بڑی فلمیں کرچکا ہوں۔ رنگین اور سنیما اسکوپ فلموں کا ہیرو رہ چکا ہوں۔''

''اور تمہاری ہی وجہ سے ''ساگر'' اور ''مالا'' کامیاب نہ ہوسکیں۔''

''فلم کی کامیابی یا ناکامی میں صرف ہیرو ہیروئن کا حصہ نہیں ہوتا۔ انہیں بنانے والے زیادہ ذمہ دار ہوتے ہیں۔''

دو بڑی فلموں میں ناکامی کے بعد اس بار ہم ایک لوبجٹ کی فلم بنا رہے ہیں اور آرٹسٹوں کو پیسے بھی کم دے رہے ہیں۔ ہم تو تمہیں بھی تمہارے ریٹ سے کم پیسے دیں گے۔''

''پھر تو آپ کسی دو ٹکے کے ہیرو سے رابطہ کریں۔ میں تو کم پیسے لے کر کام نہیں کرسکتا۔'' یہ کہہ کر عظیم دربار سے اٹھ کر چلا گیا۔

''ہنہہ! کامیاب فلموں کا ہیرو ایسے نخرے کرے تو کوئی بات بھی ہے۔''

''اچھا ہوا وہ خود ہی چلا گیا۔''

یہ ساری باتیں تو وہ ہیں جو اندرون خانہ ہوئیں۔ فلمی اصطلاح میں جنہیں بیک گراؤنڈ یا پس پردہ باس کہا جاتا ہے۔ ان کا علم انہی کو ہوتا ہے جو وہاں موجود ہوتے ہیں یا کچھ کھوجی لوگ اپنے ذرائع سے معلوم کرلیتے ہیں۔

کیپٹن احتشام صاحب کی نئی فلم ''چکوری'' کا گانا ایف ڈی سی اسٹوڈیو میں ریکارڈ کیا جارہا تھا۔ مرزا نذیر بیگ کو چونکہ گانے کا شوق تھا اس لیے گانوں کی ریکارڈنگ کے موقع پر اگر جانے کا موقع ملتا تو وہ ضرور جاتا تھا۔ روبن گھوش سے چونکہ صاحب سلامت تھی۔ وہ ڈھاکے میں موجود اس کے چچا کے جاننے والے تھے۔ انہوں نے ہی اسے روبن گھوش سے ملوایا تھا۔

اس دن بھی وہ روبن گھوش کی وجہ سے ریکارڈنگ کے موقع پر موجود تھا۔ گانا جبار اور فردوس بیگم کی آواز میں ریکارڈ کیا جارہا تھا۔

نذیر بیگ نے دیکھا کہ کیپٹن صاحب، جبار کے گانے سے مطمئن نظر نہیں آرہے ہیں۔ جب بھی وہ گانے کے بول گاتا احتشام صاحب کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات نمایاں ہوجاتے اور وہ روبن گھوش سے کہتے۔

''نہیں یار! کچھ بات نہیں بنی۔''

''اچھا میں دوبارہ گواتا ہوں۔''

جبار اپنے حصے کے بول دوبارہ گاتے۔ کیپٹن صاحب دوبارہ ریجیکٹ کردیتے۔ اچانک ان کی نظر نذیر بیگ پر پڑی تو انہوں نے اشارے سے اسے اپنے قریب بلوایا اور روبن صاحب سے بولے۔ ''جبار کی بجائے اس لڑکے سے گواؤ۔''

روبن گھوش کے کچھ بولنے سے پہلے میں بول پڑا۔

''میں نہیں گاؤں گا۔''

''کیوں؟'' انہوں نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔

''جبار صاحب انڈسٹری کے سینئر گلوکار ہیں۔ یہ تو ان کے منہ سے نوالہ چھیننے کے برابر ہوگا اگر میں نے ان کی جگہ گایا۔''

''سینئر ہوگا تمہارے لیے۔ مجھے تو میری پسند کی پرفارمنس چاہیے۔ چاہے وہ کتنا ہی جونیئر ہو۔''

اس موقع پر روبن گھوش اور فردوسی بیگم نے بھی اسے سمجھایا۔ ''اپنے سینئر کا احترام بہت اچھی بات ہے مگر جب فلم کا ڈائریکٹر اس کی پرفارمنس سے مطمئن نہیں اور اس کی جگہ وہ تم سے گوانا چاہتے ہیں تو انکار نہ کرو۔''

نذیر بیگ نے بڑی بے بسی کے ساتھ جبار صاحب کی طرف دیکھا۔ انہوں نے بھی اپنی طرف سے اجازت دیتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے یار! گاؤ تم نہیں گاؤ گے تو وہ کسی اور سے گوالیں گے۔''

اب مجھے اطمینان ہوا۔ میں نے گایا اور میری آواز بولوں کی ادائیگی اور گیت کے احساسات و جذبات کو کیپٹن صاحب کے علاوہ سب نے پسند کیا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اختر یوسف صاحب کے لکھے ہوئے گیت میں جن تاثرات کا اظہار کیا گیا تھا جبار صاحب بنگالی ہونے کی وجہ سے ان کو سمجھ نہیں پائے اور اپنی آواز سے اسے وہ رنگ نہ دے سکے۔ جس کا یہ گیت متقاضی تھا۔

گانے کی کامیاب ریکارڈنگ کے بعد جب کیپٹن صاحب اور مستفیض صاحب نے اپنے گھر میں یہ دلچسپ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

روداد سنائی تو سننے والوں میں سب سے زیادہ خوشی ان کی بیٹی فرزانہ کو ہوئی۔

''ہاں!'' اس کی والدہ بولیں۔ ''یہ لڑکا جتنا خوب صورت ہے اتنا ہی باادب اور تمیز دار بھی ہے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں بھابی۔'' مستفیض کی بیگم بھی بولیں۔ ''گانے کی اتنی بڑی آفر کو وہ محض اپنے سینئر گلوکار کے احترام میں ٹھکرا رہا تھا۔ یہ اس کی اعلیٰ ظرفی کی دلیل ہے۔''

مما اور آنٹی کی باتیں سن کر فرزانہ کی خوشیوں کا پیمانہ چھلکتا جا رہا تھا۔ جس لڑکے کو اس نے ''مالا'' کی سلور جوبلی تقریب میں پہلی بار دیکھ کر اس کے لیے اپنے دل کے سارے دروازے کھول دیئے تھے وہ اب اس کے علاوہ دوسروں کو بھی پسند آنے لگا ہے۔ ''یہ تو..... یہ تو..... اس کے لیے میری دھڑکنوں کی کامیابی ہے۔'' اس نے خود کلامی کی۔

زین العابدین نے اپنی لکھی ہوئی کہانی کے مکالمے بھی لکھ لیے تھے اس لیے اب شوٹنگ کا مرحلہ قریب سے قریب تر آتا جا رہا تھا۔ دیگر کرداروں کے لیے آرٹسٹوں کا چناؤ بھی ہو چکا تھا۔ بس ابھی تک ہیرو کا مسئلہ حل نہیں ہوا تھا۔ فلم کی کہانی کی مناسبت سے جیسے ہیرو کی ضرورت تھی ابھی تک پروڈیوسر اور ڈائریکٹر کو کوئی جچا نہیں تھا۔ اندرونی طور پر وہ اس بات کے متمنی تھے کہ ''ارمان'' کے وحید مراد کی طرح آنکھوں کے راستے دل میں اتر جانے والا کوئی چکور۔ ''چکوری'' کا ہیرو ہونا چاہیے۔

یوں تو ڈھاکے کی فلموں میں بہت سے ہیرو پرفارم کر رہے تھے مگر کسی نہ کسی عنوان سے وہ ''چکوری'' کے چکور کے لیے مناسب نظر نہیں آتے تھے۔

گھر کے سارے ہی لوگ اس مسئلے کا حل تلاش کرنے میں اپنی اپنی سوچ اور فکر کے مطابق اظہار خیال کر رہے تھے مگر دونوں بھائیوں کو جچتے نہیں تھے۔ مگر تلاش بسیار کے بعد ایک لڑکا عابد انہیں پسند آ گیا اور انہوں نے اسے ہیرو کے رول کے لیے منتخب کر لیا۔ اس کے بعد ایک دن فرزانہ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''پپا! ایک بات کہوں؟''

''ہاں ہاں کہو۔''

''یہ میرے چھوٹے منہ کی بڑی بات تو نہیں سمجھی جائے گی؟''

''ارے نہیں بیٹا! چھوٹی اور بڑی بات کیا۔ اچھی ہو گی تو قبول کر لی جائے گی۔ بری ہوئی تو ریجیکٹ کر دی

ندیم کے ہدایت کار

ہر آرٹسٹ کی فنی زندگی میں اس کے ہدایت کاروں کا بڑا اہم کردار ہوتا ہے۔ ندیم صاحب نے اپنے کیریئر میں جن ہدایت کاروں کی ہدایات پر فلموں میں کام کیا اس کا ایک جائزہ: احتشام پانچ فلمیں، مستفیض تین فلمیں، ظفر شباب تین فلمیں، محمد جاوید فاضل تیرہ فلمیں، پرویز ملک بارہ فلمیں، نذر الاسلام گیارہ فلمیں، الیس سلیمان گیارہ فلمیں، شباب کیرانوی آٹھ فلمیں، کے خورشید سات فلمیں، اقبال اختر سات فلمیں، سنگیتا سات فلمیں، حسن طارق پانچ فلمیں، اقبال کشمیری پانچ فلمیں، حسنین پانچ فلمیں، اسلم ڈار سات فلمیں، مسعود بٹ دو فلمیں، رفیق علی راکھن تین فلمیں، نذر شباب تین فلمیں، رضا میر دو فلمیں، رنگیلا دو فلمیں، ایس اے بخاری دو فلمیں، اقبال رضوی دو فلمیں، فرید احمد دو فلمیں، جعفر شاہ بخاری دو فلمیں، شمیم آراء دو فلمیں، عزیز الحسن دو فلمیں، ایم اے رشید چار فلمیں، حسن عسکری دو فلمیں، سید نور گیارہ فلمیں، ریما خان دو فلمیں، جاوید شیخ دو فلمیں، پرویز رانا دو فلمیں

قومی ایوارڈ۔ صدارتی اعزاز

ندیم نے پاکستان میں فلمی اداکاری کے پیشے کو وقار اور اعتبار بخشا ہے۔ ساٹھ کی دہائی کے وسط سے اسی کی دہائی کے آخر تک اپنی فلمی زندگی کے دوران انہوں نے اپنے فن کی شان اور امتیاز کو برقرار رکھا۔ لاتعداد نجی انعامات کے علاوہ انہوں نے 1985ء میں لازوال اور 1987ء میں قاتل کی تلاش نامی فلموں میں بہترین اداکاری کا قومی فلمی ایوارڈ حاصل کیے۔

فلمی اداکاری کے شعبے میں ان کی اداکاری کے اعتراف میں صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان نے مرزا نذیر بیگ (ندیم) کو صدارتی اعزاز برائے حسن کارکردگی عطا فرمایا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

جائے گی چلو اب فٹافٹ بتا دو۔''

فرزانہ نے فوراً ہی زبان نہیں کھولی۔ اپنے دل کو سنبھالا اور دل ہی دل میں دعا کی کہ اس کے مشورے کو ریجیکٹ نہ کیا جائے۔

''ہاں ہاں بولو۔''

''وہ.....وہ جو گلو کار لڑکا ہے۔''

''کون لڑکا؟''

''کون لڑکا بھئی؟''

''وہ جس نے جبار کی جگہ گانے سے انکار کر دیا تھا۔''

''تمہارا مطلب نذیر بیگ سے ہے؟''

''جی.....جی ہاں وہی، میں کہنا یہ چاہتی ہوں کہ اب جب آپ نئے لڑکوں کو لے کر فلم بنا رہے ہیں تو نذیر بیگ کو بھی کسی اچھے سے کردار کے لیے چانس دیں۔''

''گڈ۔'' کیپٹن صاحب نے سب سے پہلے اس مشورے پر اپنا خیال ظاہر کیا۔ ''اس کی طرف تو ہمارا دھیان گیا ہی نہیں تھا۔ ہیرو تو تم نے عابد کو لے لیا ہے نذیر بیگ کو ولن بنا دیں گے۔''

''ہاں بھیا!'' مستفیض بول پڑے۔ ''یہ لڑکا تو ہیرو کے خانے میں بھی فٹ ہو سکتا تھا۔''

''مگر اس نے تو.....'' کوئی بولا۔ ''کسی فلم میں کام نہیں کیا ہے۔''

''تو اب کرے گا۔ ہم کرائیں گے اس سے اداکاری۔ کوئی بھی تو ماں کے پیٹ سے اداکار بن کر پیدا نہیں ہوتا ہے۔''

اس گلوکار کو اداکار بنانے کا مشورہ اکثریتی طور پر پسند کیا گیا۔

''مرزا نذیر بیگ ڈن۔'' کیپٹن صاحب نے اپنا حتمی فیصلہ سنا دیا۔ ''اب ''چکوری'' کا ولن وہی بنے گا۔''

دوسری طرف فرزانہ کا حال یہ تھا کہ ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلی میں۔ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے وہ بڑوں کی محفل سے اٹھی اور اپنے کمرے میں آ کر رونے لگی۔ یہ آنسو بے اختیار نکلے تھے جو خوشی کے تھے اظہار تشکر کے تھے۔

اسی رات احتشام صاحب کا ڈرائیور نذیر بیگ کے پاس آیا اور بولا۔ ''آپ کو کیپٹن صاحب نے بلایا ہے۔''

''کیوں بلایا ہے؟''

''میں کیا جانوں۔ آپ خود جا کر ان سے پوچھ لیجیے۔''

نذیر بیگ ڈر گیا کہ خدا جانے کیا بات ہے۔ دو بار پہلے بھی اس کے ساتھ یہ ہو چکا تھا کہ گانے ریکارڈ ہونے کے بعد بھی فلم ریلیز نہ ہو سکی۔ یہ اور ایسے خیالات نے اسے بہت پریشان کر دیا تھا۔ بہر حال اسے ڈرائیور کے ساتھ جانا پڑا۔

وہ پہنچا تو وہاں گھر کے شاید سارے ہی لوگ موجود تھے۔ میں نے سب کو مخاطب کر کے السلام علیکم کہا اور پھر خوف زدہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔

''نذیر بیگ!'' کیپٹن صاحب بولے۔ ''تم نے فردوسی بیگم کے ساتھ جس فلم کا گانا گایا ہے نا۔''

نذیر بیگ کی باہر کی سانس باہر اور اندر کی اندر ہی رہ گئی۔

''اب یہ بولیں گے ہم یہ فلم نہیں بنائیں گے۔'' نذیر بیگ نے دل ہی دل میں سوچا۔ ''یہ خبر مجھے یہاں بلا کر بتانے کی کیا ضرورت تھی؟ مجھے اپنی تقدیر کا لکھا تو بعد میں بھی معلوم ہو جاتا۔''

''ہم اس فلم میں۔'' کیپٹن صاحب نے اپنا جملہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں ایک اداکار کے طور پر پیش کرنا چاہتے ہیں۔''

''جی!'' نذیر بیگ نے گھبرا کر انہیں یوں دیکھا جیسے وہ کہہ رہے ہوں۔ ''ہم تمہارا جینا دوبھر کر دیں گے۔''

''نہیں.....'' نذیر بیگ نے دہشت زدہ آواز میں کہا۔ ''میں اداکار نہیں بنوں گا۔ اداکاری نہیں کروں گا۔''

سب لوگ اسے حیران پریشان نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ ''کیوں؟ اداکار کیوں نہیں بنو گے؟ اداکاری کیوں نہیں کرو گے؟'' اس بار مستفیض کی بیگم بولیں۔ ''میں اگر تمہاری جگہ ہوتی تو اس زبردست آفر پر خوشی سے ناچنے لگتی۔''

''وہ.....وہ.....جی، میری جاب چھوٹ جائے گی۔''

''ارے بیٹا!'' مسز احتشام بولیں۔ ''تم اداکار بن جاؤ گے تو تمہیں پھر جاب کرنے کی کیا ضرورت ہو گی۔ تم عظیم کی طرح، خلیل کی طرح، انور حسین کی طرح اور دوسرے اداکاروں کی طرح فلموں میں کام کرنے لگو گے اور ڈھیر سارے روپے کمانے لگو گے۔''

''تم کہاں جاب کرتے ہو۔ کیا جاب کرتے ہو؟''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کیپٹن صاحب نے پوچھا۔

''ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی ہے۔'' نذیر بیگ نے آہستہ سے کہا۔ ''نئی نئی یہ نوکری ہے فلم کے چکر میں ناغہ کیا تو میری چھٹی کردیں گے۔''

''کون سی ایڈورٹائزنگ کمپنی ہے؟''

نذیر نے نام بتایا تو بولے۔ ''وہی تو نہیں جس میں ظہیر ریحان بھی کام کرتے ہیں؟''

''جی ہاں.....جی ہاں وہی۔ وہ اس کے چیف ہیں۔''

''ارے بھئی! وہ ہمارے ہی قبیلے کا آدمی ہے۔ وہ بھی ہماری طرح فلم ڈائریکٹر ہے۔ شریف آدمی ہے۔ تم اس سے جاکر بتاؤ گے کہ تمہیں ایک فلم میں اداکار کے طور پر کام کرنے کا موقع ملا ہے ایک مہینے کی مجھے چھٹی دے دیجیے۔ ظہیر ریحان تمہیں ضرور چھٹی دے دیں گے۔''

''اور اگر انہوں نے میری مستقل چھٹی کردی تو؟''

''یار! تم سارا فیصلہ خود ہی کرلیتے ہو۔'' مستفیض صاحب بولے۔ ''جاؤ ان سے بات تو کرو۔''

اگلے روز نذیر جاب پر گیا تو موقع مناسب دیکھ کر ظہیر ریحان صاحب سے ملا اور کہا۔ ''سر! مجھے ایک مہینے کی چھٹی چاہیے۔''

انہوں نے نذیر کو سر سے پاؤں تک گھور کر دیکھا۔ پھر مسکراتے ہوئے بولے۔ ''کیا شادی کررہے ہو؟''

''جی نہیں۔''

''پھر کس لیے چھٹی چاہیے؟''

''وہ سر!'' نذیر بیگ کہتے ہوئے شرمانے لگا۔

''بھئی! جب تک مجھے سچی بات نہیں بتاؤ گے ایک مہینے کیا ایک دن کی بھی چھٹی نہیں دوں گا۔''

اب نذیر بیگ نے جی کڑا کرکے کہہ ہی دیا۔ ''سر جی! مجھے ایک فلم میں اداکاری کا چانس مل رہا ہے۔''

وہ ایک دم خوش ہوگئے۔ ''ارے بھئی! یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے مگر یہ تو بتاؤ تمہیں کون یہ چانس دے رہا ہے؟ کس کی فلم ہے؟''

نذیر بیگ نے بتادیا۔ ''کیپٹن احتشام کی فلم ہے۔ فلم کا نام ''چکوری'' ہے۔ اس فلم کے لیے میں نے فردوسی بیگم کے ساتھ ایک گانا بھی گایا ہے۔''

''کیپٹن صاحب نے تمہارا انتخاب بہت درست کیا ہے۔ تم واقعی اداکار بننے کے قابل ہو۔''

''تو میری ایک مہینے کی چھٹی قبول؟''

''ارے یار! تم جس جاب میں جارہے ہو اس کے آگے اس جاب کی کیا حقیقت ہے۔ فلم کامیاب ہوگئی تو..... فلم کامیاب نہ ہوئی تو بھی تم ہارون کی طرح کامیاب ہوجاؤ گے۔''

ظہیر ریحان صاحب کی باتوں سے نذیر بیگ کو بڑا حوصلہ ملا۔ اس نے کیپٹن صاحب کو جاکر بتایا۔ ''ظہیر ریحان صاحب نے میری چھٹی قبول کرلی ہے۔ ایک مہینے کے لیے مجھے چھٹی دے دی ہے۔''

ایک ہدایت کار کی ایک فلم

مندرجہ ذیل ہدایت کاروں کی ایک ایک فلم میں ندیم صاحب نے اداکاری کی۔ فاروق مینگل (ہجرت)، شہزاد غفور (دی سسٹم)، علی رضا اسامہ، (میں ہوں شاہد آفریدی)، سید فیصل بخاری (بھائی لوگ)، مبشر لقمان (پہلا پہلا پیار)، عمران ملک (تیرے بن جیا نہ جائے)، عجب گل (کیوں تم سے اتنا پیار ہے)، اقبال ٹمی (کندن)، امتیاز قیصر (دل میں چھپا کے رکھنا)، ثمینہ پیرزادہ (تنہا)، الطاف قمر (چاند گرہن)، سہیل خان (انداز)، زاہد شاہ (پابندی)، نسیم حیدر شاہ (خونی شعلے)، ادریس شاہ (دولت کے پجاری)، عثمان پیرزادہ (گوری دیاں جھانجرا)، جہانگیر قیصر (پروانہ)، اقبال یوسف (ہیرو)، اے ایچ صدیقی (خوش نصیب)، شریف (بسیرا)، امریش مینگل (درویش) سرور بارہ بنکوی (تم میرے ہو)، اقبال شہزاد (بازی)، شور لکھنوی (چاند سورج)، نورالحق (جلتے سورج کے نیچے)، حسن شیرازی (بادل اور بجلی)، شوکت ہاشمی (جلے نہ کیوں پروانہ)، رزاق خان (دو بدن)، اختر یوسف (ساون آیا تم نہیں آئے)، ثناء اللہ خان (ساجن رنگ رنگیلا)، ایس ایم یوسف (ہار گیا انسان)، علی سفیان آفاقی (جاگیر)، قمر زیدی (پالکی)، اطہر شاہ خان (آس پاس)، کیفی (روٹی، کپڑا اور انسان)، قوی خان (روشنی)

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''گڈ!'' احتشام صاحب خوش ہو کر بولے۔ ''میں نے کہا تھا نا ظہیر ریحان اچھا آدمی ہے۔ تمہارے ساتھ ضرور تعاون کرے گا۔''

''ارے بھئی! اس موقع پر تو تمہیں ہم سب کو مٹھائی کھلانی چاہیے تھی۔'' مستفیض صاحب خوشگوار انداز میں بولے۔ نذیر بیگ خاموش رہا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہی بولے۔ ''چلو ہم ہی تمہارا منہ میٹھا کرواتے ہیں۔''

یہ کہہ کر انہوں نے کسی سے کہا۔ ''ہماری نئی فلم کے نئے اداکار کی طرف سے سب کا منہ میٹھا کراؤ۔''

یہ سب کچھ تو ٹھیک تھا مگر نذیر کو اس بات کی وہ خوشی نہیں تھی جو ہونی چاہیے تھی۔ وہ اندر سے خوفزدہ تھا۔ اس نے کبھی اداکاری نہیں کی تھی نہ اس کا خواب دیکھا تھا۔ اس نے گلوکار بننے کا خواب دیکھا تھا۔ گلوکار بننا چاہتا تھا۔ یہ جو اسے اچانک فلم کا ولن بنا دیا گیا تو وہ ایک دم اپ سیٹ ہو گیا۔ اس کے دن کا چین اور راتوں کی نیند اڑ گئی۔ یہ سب کچھ کیسے ہوگا؟ اداکاری اور وہ بھی برے آدمی کی اداکاری۔ اللہ میرے حال پر رحم کرے۔ پھر اس نے اپنے آپ کو خود ہی سمجھانا شروع کیا۔ ''یار نذیر بیگ اب تو تم نے ان لوگوں کی بات مان لی ہے، اداکاری کرنے کی ہامی بھر لی ہے، تم سے اداکاری ہوئی تو ٹھیک، نہیں ہوئی تو بھی ٹھیک تم نے جو اداکاری کی اسے انہوں نے پسند کیا تو وہی ہوگا جو گانے کی ریکارڈنگ کے موقع پر ہوا تھا۔ جس طرح جبار کو ریجیکٹ کر کے تم سے گیت گوالیا گیا اسی طرح..... ہاں بالکل اسی طرح تم کو کیمرے کے پاس سے ہٹا کر بلکہ بھگا کر کسی اور سے اپنی پسند کی اداکاری کروالیں گے۔ یہی ہوگا نا، تمہارا کیا بگڑ جائے گا؟ تم کون سا کراچی سے ڈھاکے ہیرو بننے آئے ہو؟ تم گلوکار کی حیثیت سے ہی کامیاب ہو جاؤ۔ یہی تمہارے لیے بہت ہے۔

اپنے آپ کو سمجھانے کا یہ طریقہ کارگر ثابت ہوا۔ اس کی پریشانیاں دھیرے دھیرے ختم ہوگئیں۔ شوٹنگ کی تاریخ قریب سے قریب آتی گئی اور پھر ایک دن یونٹ کے تمام لوگوں کو یہ فیصلہ مضحکہ خیز لگا انہوں نے کہا کہ نہ ولن کا کردار کرسکتا ہے نہ ہیرو کا۔ جو دوسروں سے بات کرتے ہوئے شرماتا ہے۔ اداکاری کیا کرے گا۔ پتا نہیں کیپٹن صاحب نے ایسا غیر دانشمندانہ فیصلہ کیوں کیا ہے۔ اچانک خبر ملی کہ عابد کو کاسٹ سے خارج کر دیا گیا ہے کیونکہ وہ ریہرسل کے دوران احتشام کو مطمئن نہ کرسکا۔ کئی دنوں کی محنت شائقہ کے بعد بھی جب وہ ان کے معیار پر پورا نہ اترا تو اس کی جگہ انہوں نے مجھے ہیرو کے طور پر کام کرنے کو کہا۔

نذیر سے کہا گیا کہ تم گاؤں کے ایک سادہ لوح نوجوان ہو۔ اس مناسبت سے اسے بڑا سیدھا سادہ لباس پہنایا گیا تھا۔ کیمرے کے سامنے کھڑا کر کے اس کو مکالمے بتائے گئے کہ تم اس طرح یہ ڈائیلاگ بولو گے۔ کیمرا اور اس کے درمیان کچھ فاصلہ تھا۔

اس سے پہلے کہ اس شوٹنگ کی بات آگے بڑھائی جائے مناسب ہے کہ چکوری کی کہانی اختصار کے ساتھ بیان کردی جائے۔

انور جسے گاؤں والے پیار سے انو کہتے ہیں۔ مشرقی پاکستان کے ایک دیہات میں رہتا ہے۔ اس کا کل اثاثہ ایک ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی اور ایک گھوڑی ہے یا پھر چکوری کی محبت۔ اسی گاؤں میں انور کا ایک دوست شمسو ہے جو ماہی گیر ہے۔ گاؤں میں ایک ڈاک بنگلا بھی ہے۔ جہاں لوگ تفریح کے لیے آتے ہیں۔ انو ان لوگوں کو اپنی گھوڑی پر بیٹھا کر سیر کراتا ہے۔ اس طرح جو پیسے کماتا ہے اس سے اپنا پیٹ پالتا ہے۔ گاؤں میں رہنے والا ایک ڈاکیہ جمن بھی چکوری پر مرتا ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے اسے چکوری اور انو کا میل ملاپ پسند نہیں ہے۔ اس کا ایک دوست اصغر بھی ہے جو اسے الٹی سیدھی پٹی پڑھایا کرتا ہے۔ چکوری اور انو کی بڑھتی ہوئی محبت سے تنگ آکر وہ اصغر سے مدد طلب کرتا ہے۔ اصغر پہلے تو چکوری کے بھائی سے شکایت کرتا ہے پھر مہاجن کو اکساتا ہے کہ وہ اپنا قرضہ وصول کرے۔ مگر جب سب ترکیبیں ناکام ہو جاتی ہیں تو انو کی گھوڑی چوری کرا دیتا ہے۔ اس کڑے وقت میں اس کا دوست شمسو اسے دلاسا دیتا ہے اس کی مدد کرتا ہے۔

جن دنوں انور کی گھوڑی اس کے پاس تھی ایک سیٹھ فاروق ڈاک بنگلے میں اپنی بہن (ریشماں) اور اپنی بیٹی کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے۔ انور ان کی لڑکی کو گھوڑی پر بٹھا کر سیر کرایا کرتا تھا۔ سیٹھ فاروق کی بیوی مر چکی تھی۔ وہ اس کے غم میں گیت لکھا کرتے تھے۔ انور کو ایک بار انہوں نے گاتے ہوئے سنا تو اس سے بولے۔ ''تم بہت اچھا گاتے ہو۔ میرے ساتھ شہر چلو میں تمہیں ایک بڑا گانے والا بنا دوں گا۔'' لیکن انور چکوری کو چھوڑ کر شہر جانے پر تیار نہیں ہوا۔

اب جب کہ اس کی گھوڑی چوری ہو چکی تھی وہ اپنے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

دوست شمسو کے مشورے پر چکوری کو بتائے بغیر شہر چلا گیا۔ کیونکہ مہاجن نے بھی اس کی جھونپڑی پر قبضہ کرلیا تھا۔ لہٰذا اس خیال سے وہ شہر چلا گیا کہ وہاں سے کما کر آئے گا تو چکوری کو اپنی دلہن بنالے گا۔ شہر پہنچ کر بڑی مشکلوں کے بعد اسے سیٹھ فاروق کا پتا ملا۔ سیٹھ فاروق اور ان کی بہن ریشماں نے اسے تربیت دے کر ایک مشہور گلوکار بنادیا۔

انور کے چلے جانے پر چکوری اداس اداس رہنے لگی۔ شمسو نے اسے بتایا کہ وہ تجھے اپنی دلہن بنانے کے لیے پیسا کمانے شہر گیا ہے۔ چکوری اس کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔ دوسری طرف انور کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جمن ڈاکیے اور اس کے دوست نے چکر چلایا کہ اس کا بھائی اس کے ساتھ چکوری کی شادی کردے۔ اس دوران شہر سے انور نے چکوری کے نام خط بھجوایا تھا کہ وہ جلد ہی آکر اس سے شادی کرلے گا مگر یہ خط جب ڈاکیے جمن کے ہاتھ آیا تو اس نے یہ خط چکوری تک نہیں پہنچایا اور شمسو کے نام سے انور کو خط بھجوادیا کہ چکوری کی شادی جمن سے ہوگئی ہے۔

چکوری کا بھائی کسی حال میں جمن سے اس کی شادی نہیں کروانا چاہتا تھا مگر چکوری انور سے اب بالکل مایوس ہو چکی تھی کیوں کہ انور کا دوست شمسو جب شہر گیا تھا تو اس نے انور کے ساتھ سیٹھ فاروق کی بہن کو دیکھا تھا۔ یہ بات اس نے آکر چکوری سے کہہ دی تھی کہ انور تو اب بڑی اونچی اڑان اڑنے لگا ہے۔ لگتا ہے وہ سیٹھ کی بہن سے ہی شادی کرلے گا۔

چکوری نے بھائی کی رضامندی کے باوجود جمن سے شادی کی ہامی بھرلی کہ وہ انور سے مایوس ہوگئی تھی مگر اس شادی سے پہلے انور کا دوست شمسو اسے گاؤں واپس لے آیا اور جمن کی ساری سازشوں کا پول کھل گیا اور دو بچھڑے ہوئے پریمی آپس میں مل گئے۔

اب دوبارہ شوٹنگ کے آغاز کی کہانی سنیے۔

''نذیر بیگ کا ڈر خوف یہ سوچ کر رفو چکر ہوگیا تھا کہ جب اوکھلی میں سر دے دیا تو مزید کیا ڈرنا۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ فلم کے ہدایت کار نے اسے جو کچھ سمجھایا۔ اس نے ذہن نشین کرلیا۔ دیکھو یہ تمہارا مکالمہ ہے۔ تم اسے بولتے ہوئے اس طرح کا ایکشن دوگے۔''

جب احتشام صاحب نے ایکشن کہا تو نذیر نے بڑے اعتماد کے ساتھ اپنا مکالمہ بولا۔ مگر کیپٹن نے کٹ کہہ کر کہا۔ ''اوہ..... نو۔''

نذیر نے ہمت کر کہا۔ ''سر جی! میں نے بالکل ویسا ہی کہا اور ویسا ہی ایکشن دیا جیسا آپ نے کہا تھا۔''

''تم نے ایکشن اور ڈائیلاگ ڈیلیوری میں تو غلطی نہیں کی مگر یہ تو دیکھو تم کھڑے کہاں ہو؟ تم نے کیمرے کے فریم سے باہر جا کر اداکاری کی ہے۔''

نذیر نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ اسے اس وقت کیا معلوم تھا کہ کیمرا کا فریم کیا ہوتا ہے۔ احتشام نے اسے بتایا تو آہستہ آہستہ اس کی سمجھ میں آنے لگا۔

نگار ایوارڈز

نگار اور نگار ایوارڈ کے بانی الیاس رشیدی مرحوم کی یاد میں 28 اکتوبر 2016ء کو منعقدہ ایک شام میں ندیم صاحب نے بھی شرکت کی اور اس موقع پر کہا۔ ''میں جب بھی کبھی کسی فلم میں کام کرتا تھا تو میری یہ خواہش ہوتی تھی کہ مجھے اس فلم میں نگار ایوارڈ ملے۔ اللہ تعالیٰ کے کرم سے مجھے نگار ایوارڈ ملتا رہا اور پھر میں سب سے زیادہ نگار ایوارڈ لینے والا اداکار بن گیا۔''

ندیم صاحب کی نگار ایوارڈ یافتہ فلموں کی تفصیل کچھ یوں ہے:۔

''چکوری'' بہترین ہیرو 1967ء۔ ''احساس'' بہترین ہیرو 1972ء۔ ''اناڑی'' بہترین ہیرو 1975ء۔ ''آئینہ'' بہترین ہیرو 1977ء۔ ''پاکیزہ'' بہترین ہیرو 1979ء۔ ''صائمہ'' بہترین ہیرو 1980ء۔ ''قربانی'' بہترین ہیرو 1981ء۔ ''سنگدل'' بہترین ہیرو 1982ء۔ ''دہلیز'' بہترین ہیرو 1983ء۔ ''لازوال'' بہترین ہیرو 1984ء۔ ''ناراض'' بہترین ہیرو 1985ء۔ ''فیصلہ'' بہترین ہیرو 1986ء۔ ''چوروں کی بارات'' بہترین ہیرو 1987ء۔ ''مکھڑا'' بہترین ہیرو 1988ء۔ ''پارود کی چھاؤں'' بہترین ہیرو 1989ء۔ ''گوری دیاں جھانجراں'' بہترین ہیرو 1990ء۔ ''وطن کے رکھوالے'' بہترین ہیرو 1991ء۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

وہ جیسا کہتے رہے جیسا سمجھاتے رہے۔ نذیر اسی طرح کرتا رہا۔ ہر شاٹ پر وہ خوش ہوکر گڈ ویری گڈ کہتے اس کی پیٹھ تھپتھپاتے۔ شاباشی دیتے۔

چکوری کے ڈائریکٹر کیپٹن احتشام نے اپنے گھر اپنے بھائی مستفیض الرحمٰن کو فون کیا۔

''مستفیض تم کل کی فلائٹ سے رانگامائی پہنچو۔''

''کیوں! کیا بات ہے۔ میری ضرورت کیوں آ گئی آپ کو؟''

''میں فون پر تمہارے سوالوں کا جواب نہیں دے سکتا۔ بس تم کل یہاں پہنچ جاؤ۔''

''مگر بھیا!'' مستفیض نے بیزاری سے کہا۔ ''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔ کل ہر حال میں تمہیں یہاں پہنچنا پڑے گا۔''

کیپٹن صاحب آخر ان کے بڑے بھائی تھے اور وہ ان کا احترام بھی کرتے تھے۔ بس وہ اس بات پر ان سے خوش نہیں تھے کہ وہ ایک ایسے لڑکے کو لے کر فلم بنا رہے تھے جو ہیرو تو کیا کسی معمولی کردار کے لیے بھی موزوں نہیں۔ کبھی کبھی وہ ضد میں ایسی بے تکی باتیں کر جاتے ہیں جو سراسر نقصان کا سبب بنتی ہے۔ نئے ہیرو ہیروئن کی فلم پہلے ہی رسکی ہوتی ہے۔ اس پر ایسے ''بوتل'' کو لے کر فلم بنا رہے ہیں۔

بہرحال اگلے دن انہیں بادل نخواستہ رانگامائی جانا پڑا اور جب وہ لوکیشن پہنچے تو دیکھا۔ نذیر بیگ کیمرے کے سامنے کھڑا اداکاری کر رہا ہے۔ کیپٹن صاحب نے خاموشی سے انہیں نذیر بیگ کی طرف دیکھنے کو کہا۔

نذیر بیگ جسے وہ ایک بے حد شرملا لڑکا سمجھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ وہ اداکاری کی الف بھی نہیں ادا کر سکے گا۔ اس اعتماد کے ساتھ اس وقت ایسے اداکاری کر رہا تھا جیسے کوئی منجھا ہوا اور تجربہ کار اداکار ہو۔ انہوں نے اپنے جسم میں چٹکی کاٹی کہ کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ رہے ہیں مگر یہ خواب نہیں تھا۔ حقیقت تھی۔ شاٹ مکمل ہوا تو مستفیض صاحب آگے بڑھے اور نذیر بیگ کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس کی پیشانی چومی۔ اس کی پیٹھ تھپتھپائی اور پھر اپنے سے علیحدہ کرتے ہوئے اسے گھور کر دیکھا اور بولے۔ ''تم تو چھپے رستم نکلے۔''

''جی! میں نے تو کچھ نہیں کیا۔''

''اور یہ جو تم کر رہے تھے؟''

''وہ تو جی...... جو کچھ کیپٹن صاحب نے کہا میں نے ویسا ہی کر دیا۔''

اب وہ بھائی کے پاس آئے۔ ''بھیا! یہ پل بھر میں کیا ماجرا ہو گیا؟''

''میں خود حیران ہوں۔'' کیپٹن صاحب نے اپنے انگوٹھے کا ناخن دانت سے کترتے ہوئے کہا۔ پھر ذرا رازدارانہ انداز میں دھیمے لہجے میں بولے۔ ''سچی بات تو یہ ہے کہ تمام لوگوں کی مخالفت اور ناپسندیدگی کی وجہ سے میں بھی اندر ہی اندر خوفزدہ ہو گیا تھا اور تم سب سے دور آ کر اس کی فلمبندی کا آغاز کرنے کا اسی لیے پروگرام بنایا تھا کہ اگر وہ بھی عابد کی طرح میرے معیار پر پورا نہ اترا، بوتل ثابت ہوا تو اس شرمندگی کے وقت میرے مخالفین میرے سامنے موجود نہ ہوں مگر...... مگر اس نے تو کمال ہی کر دیا۔ اس نے اداکاری کی تو بس اور یہاں یونٹ کے دیگر لوگ بھی حیران رہ گئے۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے کہ یہ وہی شرمیلا اور ڈرا ڈرا رہنے والا نذیر بیگ ہے یا کوئی اور......''

''بھیا! آپ کا بھی جواب نہیں۔ بڑے باکمال آدمی ہیں۔'' مستفیض نے کہا۔ ''اگر آپ اپنے نادر شاہی حکم کے تحت مجھے نہیں بلاتے اور فون پر نذیر بیگ کی جادوگری کی روداد سناتے تو مجھے ہرگز یقین نہ آتا۔''

''میں جانتا ہوں۔ دیکھنے اور سننے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔''

مستفیض جب گھر واپس گئے تو گھر کے لوگوں نے انہیں گھیر لیا کہ کیا بات تھی؟ کیوں بلایا تھا کیپٹن صاحب نے اس طرح؟''

''کیا بتاؤں!'' مستفیض صاحب نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ حاضرین میں فرزانہ بھی تھی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور دل ہی دل میں وہ دعا مانگنے لگی۔ ''یا اللہ! انکل کوئی بری خبر نہ سنائیں۔''

''وہی بتاؤ جس کے لیے انہوں نے تمہیں بلایا تھا۔''

''بھابی! انہوں نے اس لیے بلایا تھا کہ......''

مستفیض نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا تو وہ بھی پریشان ہو گئیں۔

''بول دیجیے نا۔'' ان کی بیگم بھی بولیں۔ ''جب آپ دیکھ کر بھی صحیح سلامت ہیں تو ہم سن کر بھی......''

''وہ جو گلوکار نذیر بیگ ہے نا۔''

''اس نے تمہارے بھیا کی اُمیدوں پر پانی پھیر دیا ہو گا؟''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''اسے وہ رانگا مائی اس لیے لے کر گئے تھے کہ اگر اس نے بھی عابد کی طرح انہیں مایوس کیا تو اس شرمندگی کے وقت ہم لوگ موجود نہ ہوں۔''

''تو پھر آپ کو کیوں بلایا تھا؟'' اس بار فرزانہ نے سوال کر دیا۔ ''کیا اپنی غلطی کی معافی مانگنے کے لیے؟ یہ کہنے کے لیے کاش میں تم لوگوں کی بات مان لیتا۔''

''ارے نہیں بیٹا! تم جانتی ہو۔ اپنے پاپا کو، انہوں نے کبھی اپنی غلطی تسلیم کی ہے؟ وہ تو دراصل غلطی کرتے ہی نہیں۔ انہوں نے مجھے یہ بتانے اور دکھانے کے لیے بلایا تھا کہ دیکھو میرا فیصلہ کتنا درست تھا۔''

''کیا مطلب!'' بیک وقت کئی آوازیں ابھریں۔

''مطلب یہ کہ انہوں نے مجھے نذیر بیگ کی جادوگری دکھانے کے لیے بلایا تھا۔''

''جادوگری!''

''نذیر بیگ کی جادوگری!''

''ہاں بھئی! نذیر بیگ کیمرے کے سامنے اپنی اداکاری کے جو جادو جگا رہے تھے اسے دیکھ کر تو میں بھی حیران پریشان ہو گیا۔ مجھے پہلے تو یقین نہیں آیا۔ کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں لیکن وہ خواب نہیں حقیقت تھی۔ پتا نہیں یہ کیا ماجرا تھا۔ کس کی دعاؤں کے اثر سے یہ شرمیلا اور ہر وقت خوف زدہ نظر آنے والا لڑکا، اتنے اعتماد کے ساتھ اداکاری کر رہا تھا جیسے کوئی منجھا ہوا تجربہ کار اداکار پرفارم کر رہا ہو۔'' وہ ذرا رکے پھر بولے۔ ''بھیا نے یہی جادو ئی تماشا دکھانے کے لیے مجھے بلایا تھا۔''

ذرا دیر کے لیے سب کے چہرے پر طمانیت کے آثار دکھائی دیئے۔ پھر نجمہ رحمٰن بولیں۔ ''تم بھی کچھ کم اداکار نہیں ہو۔ ہم تمہاری اداکاری سے لطف اندوز ہوئے۔ اب اصل بات بتا دو کیوں بلایا تھا کیپٹن صاحب نے تمہیں؟''

''ارے بھابی! اصل بات یہی ہے۔ آپ کی قسم بھیا نے اسی لیے مجھے بلایا تھا کہ میں اپنی آنکھوں سے نذیر بیگ کی جادوگری دیکھ لوں۔''

''کیا تم واقعی سچ کہہ رہے ہو؟''

''جب وہاں شوٹ کیے ہوئے رش پرنٹ نکلیں گے تو آپ لوگ بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجیے گا۔ اس جادوگر کی جادوگری۔''

سب نے اطمینان بھرا سانس لیا تھا۔ سب کو خوشی ہوئی تھی مگر جو خوشی فرزانہ کو ہوئی تھی وہ ناقابلِ بیان تھی۔ ''یہ سب کچھ میری دعاؤں کے اثر سے ہوا ہے۔'' وہ دل ہی دل میں سوچتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ''یا اللہ! میں آپ کا شکریہ کس زبان سے ادا کروں۔ میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر جو کچھ آپ سے مانگتی رہی آپ دیتے رہے۔ نذیر بیگ کی گلوکاری سے اداکاری تک میں نے اس کی کامیابی کے لیے جو دعا مانگی آپ نے قبول کی۔ سب لوگ مخالف تھے۔ انکل تک اسے اداکار بنانے کے خلاف تھے۔ بس ایک پاپا تھے جو میرے کہنے پر میرے مشورے پر عمل کر رہے تھے۔ آج انہوں نے یہ خوش خبری سنائی ہے کہ اس نے اپنی اداکاری سے سب کو حیران کر دیا ہے۔ میرا مولا اسے آنے والے وقت میں ہر قدم پر ایسی ہی عظیم کامیابی عطا کرنا۔''

وہ اسی دن سے پاپا کا یونٹ کے ساتھ رانگا مائی سے واپس آنے کا انتظار کرنے لگی۔ وہ واپس آئیں گے تو شوٹ کیے ہوئے پرنٹ کے رشیز نکلوا کر سب کو دکھائیں گے۔

کامیڈی اداکاری

ندیم وراسٹائل اداکار ہیں۔ جس طرح کا بھی انہیں کردار دیا گیا اس میں وہ مکمل طور پر پورے اترے۔ ان کی پہلی فلم ''چکوری'' بے حد سنجیدہ تھی مگر اگلی ہی فلم ''چھوٹے صاحب'' غیر سنجیدہ یعنی کامیڈی فلم تھی۔ ایک اداکار جو حادثاتی طور پر اداکاری کے میدان میں نمودار ہوا تھا اس کو دوسری ہی فلم میں مزاحیہ اداکاری کا ٹاسک دیا گیا۔ اس میں بھی وہ پورے اترے جب کہ مزاحیہ اداکاری سنجیدہ اداکاری سے زیادہ مشکل سمجھی جاتی ہے لیکن ندیم نے کامیڈی فلموں میں بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔

چھوٹے صاحب، اناڑی (ہدایت کار مستفیض)، احساس، نادان، دل لگی، پہچان، اناڑی (ہدایت کار ایس سلیمان)، سیاں اناڑی، بڑے میاں دیوانے، امیر، ہم دونوں، صائمہ، لاجواب، میاں بیوی راضی، استادوں کے استاد، مکھڑا اور تیس مار خان ندیم صاحب کی ایسی فلمیں ہیں جن میں انہوں نے مزاح کی پھلجڑیاں بکھیری ہیں۔ وہ کامیڈی رنگ اور ڈھنگ میں خوب جچے ہیں۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

مجھے بھی اس جادوگر کی جادوگری دیکھنے کا موقع ملے گا جس نے مجھے پہلی ہی نظر میں ہوش وحواس سے بے گانہ کردیا تھا۔ فلم ریلیز ہوگی تو ہر دیکھنے والا اس کے جادو کا اسیر ہوجائے گا۔

اس جادوگر لڑکے کے بارے میں ڈھاکے میں اگر کچھ لوگ کچھ جانتے تھے تو وہ یہی کہ یہ ایک گلوکار ہے شوقیہ گلوکار جو فلمی گانے گا کر اپنا مستقبل سنوارنا چاہتا ہے۔ اس مقصد سے وہ کراچی سے ڈھاکے آیا ہے۔

لہٰذا اس کے اداکار بننے کی مزید کہانی سنانے سے پہلے مجھے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ڈھاکے آنے سے پہلے کراچی میں گزارے ہوئے اس کے شب وروز کی روداد بھی سنا دی جائے۔ اس کے لیے میں نے اس کے ایک انتہائی قریبی دوست یونس ہمدم کی تحریر سے مدد لی۔

''یہ اس کا تعلیمی دور تھا۔ میٹرک پاس کر کے اس نے اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا تھا۔ اسلامیہ کالج کراچی کا ایک ایسا کالج تھا جہاں طالب علموں کی فوج ظفر موج ہوا کرتی تھی۔ یہ کالج اپنے وقت کا مقبول ترین کالج تھا۔ اس نے ادب، اسپورٹس اور فنون لطیفہ کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ اتوار کو یہاں ہفتہ واری چھٹی ہوا کرتی تھی۔ ہفتے کے دن جب کلاسز آف ہوجاتی تھیں تو چند لڑکے اپنی کلاس کی اندر سے چٹخنی لگا لیا کرتے تھے اور پھر کلاس کے دو تین فنکار طالب علم نذیر بیگ، امیر احمد خان اور قاسم صدیقی موسیقی کی محفل سجا لیتے تھے۔ چھپا کر لائے ہوئے ہارمونیم اور طبلہ نکالے جاتے احمد خان ہارمونیم اور قاسم صدیقی طبلہ سنبھال کر اپنے فن کے جوہر دکھاتے اور نذیر بیگ اپنے گیتوں سے محفل موسیقی میں رنگ بھرتے اس طرح یہ آرکس گروپ اپنی کارکردگی میں اتنا مشہور ہوگیا کہ جب بھی انٹر کالجیٹ میوزک کمپیٹیشن ہوتا تو اسلامیہ کالج کے امیر احمد خان کو پہلا، قاسم صدیقی کو دوسرا اور نذیر بیگ کو تیسرا انعام ضرور ملتا تھا اور یوں میوزک ٹرافی اسلامیہ کالج آجاتی تھی۔ ان دنوں نذیر بیگ کو مکیش کے تین چار گیت یاد تھے۔ خاص طور پر وہ یہ دو گیت ہر محفل میں سنایا کرتا تھا۔''

☆ چاند آہیں بھرے گا پھول دل تھام لیں گے

☆ چھوٹی سی یہ زندگانی تیری دو دن کی یہ جوانی تیری

یہ دونوں گیت ان دنوں نذیر بیگ کی پہچان بن گئے تھے۔ جس محفل میں وہ جاتا اس سے انہی گیتوں کی فرمائش کی جاتی تھی۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ اسلامیہ کالج میں آج کے دور کی کئی نامور شخصیتیں یکجا تھیں بلکہ تقریباً ایک ہی کلاس میں پڑھتی تھیں جن میں ریڈیو پاکستان کراچی کا سینئر پروڈیوسر امیر احمد خان، ریڈیو کا نامور صداکار طلعت حسین، ٹی وی پروڈیوسر ایم ظہیر خان، ٹی وی پروڈیوسر اقبال حیدر و آفتاب عظیم اور دبئی ٹی وی کا کمپیئر سلیم جعفری۔ اسلامیہ کالج میں ہم سب ایک ہی کلاس میں تھے اور فنکارانہ سرگرمیوں میں بھی پیش پیش تھے۔ کیپٹن سے لے کر گرلز کامن روم تک ہماری بڑی آؤ بھگت تھی۔

ان دنوں اسلامیہ کلب کی بھی بڑی شہرت تھی۔ وہاں بڑے بڑے نامور فنکار اپنے فن کا جادو جگانے آتے تھے۔ اسلامیہ کالج کے فنکار دوست بھی وہاں اکثر پروگراموں میں مدعو کیے جاتے تھے۔ امیر احمد خان، قاسم صدیقی اور نذیر بیگ زمانہ طالب علمی ہی میں اسلامیہ کلب کے پروگراموں کی وجہ سے کافی شہرت حاصل کر چکے تھے جب کہ بہت سارے فنکار ابھی سیکنڈ ایئر کے طالب علم تھے۔

ایک دن پتا چلا کہ اسلامیہ کلب میں ڈھاکا سے آئے ہوئے فنکاروں کا ایک بڑا زبردست میوزیکل پروگرام ہے۔ پروگرام والے دن ہم بھی وہاں پہنچے۔ بنگالی فنکاروں نے اپنے فن سے لوگوں پر جادو کردیا تھا۔ فردوسی بیگم جو بڑی اچھی گلوکارہ تھی جس کی آواز میں اپنا جادو تھا جو سر چڑھ کر بولتا تھا۔ اس پروگرام میں نذیر بیگ نے بھی اپنی پرفارمنس دی تھی۔ یہیں فردوسی بیگم سے اس کی ملاقات ہوئی تو اس نے نذیر بیگ کی بڑی حوصلہ افزائی کی اور اسے ڈھاکا جا کر قسمت آزمائی کا مشورہ دیا۔ فردوسی کا یہ مشورہ نذیر بیگ کو اچھا لگا تھا مگر رات گئی بات گئی کے مصداق غالباً وہ اسے بھول گیا۔

امتحانات سر پر آئے تو سب یکسوئی سے امتحان کی تیاریوں میں مصروف ہوگئے اور پھر جب امتحان کا مرحلہ ختم ہوا اور پھر سے نئی کلاس میں موسیقی کی محفلوں کا آغاز ہوا تو اس میں نذیر بیگ کی غیر حاضری محسوس کی گئی۔ جب اس غیر حاضری نے طول پکڑا تو دوستوں کو تشویش ہوئی کہ یہ خوبرو فنکار کہاں غائب ہوگیا ہے؟ لہٰذا دوستوں نے اس کی کھوج شروع کردی۔ ایک دن سلیم جعفری نے کہا۔

''یارو! یہ پرندہ تو لگتا ہے کہیں اڑ گیا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ اس شہر میں وہ کہیں بھی موجود نہیں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ہے۔''

''مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔'' امیر احمد خان نے کہا۔

''کہاں اڑ گیا؟ کس شاخ پر جا بیٹھا؟''

''ہاں یہ بات معلوم کرنے کی ہے۔''

اور پھر چند دنوں کے بعد سلیم جعفری جو دور کی کوڑی لانے کا ماہر تھا۔ یہ بتایا۔ ''بھائیو! نذیر بیگ کی گمشدگی کا پتا چل گیا ہے۔''

سب اس کی طرف ہمہ تن گوش ہو گئے۔ ''مصدقہ خبر ہے کہ نذیر بیگ اسلامیہ کلب کے سیکریٹری مجید صاحب کے ساتھ ایک کلچرل ٹرپ میں شامل ہو کر ڈھاکے گیا ہوا ہے۔''

''اوہ!'' سب کے منہ سے فوری طور پر یہی لفظ نکلا تھا۔

''اس بارے میں کچھ پتا چلا کہ وہ کب آئے گا؟''

''اس سلسلے میں کچھ معلوم نہیں ہوا۔ البتہ امکان اس بات کا ہے کہ جب تک وہ کچھ بن نہیں جائے گا۔ اس کی واپسی کا امکان نہیں۔''

سب نے سمجھ لیا قدرت اسے آگے بڑھانے کے لیے مختلف مراحل سے گزار رہی ہے۔ اس کا حادثاتی طور پر ڈھاکے پہنچنا اور پھر گلوکاری کے پائیدان پر پیر رکھ کر اداکاری کے میدان میں قدم جمانے کا مرحلہ یہ سب کچھ قدرت کا کارنامہ تھا۔ قدرت اس پر مہربان ہوئی تو اس کے خلاف تمام تر مخالفتیں بے اثر ہو گئیں۔ رانگا ماٹی سے اپنی ابتدائی شوٹنگ مکمل کروا کر وہ واپس ڈھاکے آیا تو اس کی قدر و قیمت بدل چکی تھی۔ جاتے وقت اس کی جو حیثیت تھی اس میں نمایاں تبدیلی آ گئی تھی۔ اب وہ ایک اداکار، ایک بھرپور اور بے پناہ صلاحیتوں کا اداکار سمجھا جانے لگا تھا۔ اس کی شوٹنگ کے رشٹسز دیکھ کر لوگ حیران رہ گئے۔ اتنی نیچرل اداکاری جیسے وہ کوئی پیدائشی اداکار ہو۔ ایف ڈی سی کے نگار خانے میں رشٹسز دیکھنے والوں میں گھر کے افراد کے علاوہ فلم انڈسٹری کے چیدہ چیدہ افراد بھی تھے۔ سب نے کیپٹن احتشام کو زبردست مبارک باد دی کہ یہ کارنامہ آپ ہی کا ہے کہ ایسا انمول ہیرا آپ نے فلم انڈسٹری سے متعارف کرایا۔

ندیم کو فلم والوں نے مبارک باد دی اور کہا۔ ''یار! تم نے تو کمال کر دیا۔''

''نہیں میرا کوئی کمال نہیں۔''

''پھر یہ کس کا کمال ہے؟''

ندیم کی ہیروئنیں

ندیم کی ہیروئنوں کی تعداد 26 ہے۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ہیروئنوں کی بھی سلور جوبلی کی ہے۔ انہوں نے معروف اور صفِ اوّل کی ہیروئنوں کے ساتھ بھی کام کیا اور غیر معروف اداکاراؤں کے ساتھ بھی۔ انہوں نے اپنی فلمی زندگی کا آغاز بنگالی اداکارہ شبانہ کے ساتھ کیا مگر سب سے زیادہ فلمیں شبنم کے ساتھ کیں۔ شبنم اور ندیم کی مشترکہ فلموں کی تعداد 48 ہے جب کہ دوسرا نمبر بابرہ شریف کا ہے۔ ان دونوں کی مشترکہ فلموں کی تعداد 27 ہے۔ شبانہ کے ساتھ ندیم کی 9 مشترکہ فلمیں ہیں۔ دیبا کے ساتھ 10 فلموں میں اداکاری کی ہے۔ رانی اور ندیم کی تین مشترکہ فلمیں ہیں۔ نشو نے ندیم کے ساتھ 9 فلموں میں کام کیا۔ شمیم آراء اور ندیم کی مشترکہ فلمیں 3 ہیں۔ بنگلہ دیشی اداکارہ سبیتا نے دو فلموں میں ندیم کی ہیروئن کا کردار ادا کیا ہے۔ کویتا اور ندیم کی مشترکہ فلموں کی تعداد 12 ہے۔ سلمیٰ آغا نے دو فلموں میں ندیم کی ہیروئن کا رول ادا کیا۔ ترکی کی اداکارہ نازاں نے بھی ندیم کے ساتھ دو فلموں میں بطور ہیروئن کام کیا۔ نادرہ نے چار فلموں میں ندیم کے ساتھ کام کیا۔ کنول کے ساتھ تین فلموں میں کام کیا۔ ثمینہ پیرزادہ کے ساتھ دو فلموں میں مرکزی کردار ادا کیا۔ 9 ہیروئنیں ایسی ہیں جنہوں نے صرف ایک ایک فلم میں کام کیا ہے۔ اداکارہ... (فلم میں کہاں منزل کہاں)، روزینہ (فلم سوغات)، عالیہ (فلم دامن اور چنگاری)، زیبا (فلم پالکی)، انجمن (فلم دوراستے)، سری لنکا کی اداکارہ سبیتا (فلم زمین آسمان)، نیپالی اداکارہ ششما شاہی (فلم چوروں کی بارات)، بنگلہ دیشی اداکارہ پچوریتا (میری عدالت)، نیلی (فلم عبداللہ دی گریٹ)۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''مجھے تو کیپٹن صاحب نے جو کہا جو سمجھایا میں نے بس ویسا ہی کر دیا۔''

رانگا ماٹی سے واپس آنے کے بعد ایک اور انقلابی اعلان کیا گیا۔ نذیر بیگ! ایک فلم آرٹسٹ کی حیثیت سے تمہارا یہ نام پسند نہیں۔ میرے خیال میں تمہارا فلمی نام ندیم ہونا چاہیے۔

نذیر بیگ بے چارہ کیا کہتا۔ اسے تو اداکاروں کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم بھی نہ تھا۔ اسے نہ اداکاری سے دلچسپی تھی نہ اداکاروں سے۔ اسے تو گانے کا چسکا تھا۔ گانے والے ہی اسے پسند تھے۔ محمد رفیع، مکیش، ہمنت کمار، کشور کمار وغیرہ۔

اس نے دھیرے سے کہا۔ ''ٹھیک ہے کیپٹن صاحب! آج سے بطور اداکار میں مرزا نذیر بیگ نہیں ندیم ہوں۔''

''کیا تمہیں میرا دیا ہوا یہ نام پسند نہیں؟''

''ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ بہت اچھا نام ہے۔ مجھے بھی پسند آیا ہے۔''

ہدایت کار احتشام نے اخباروں اور جریدوں کے نمائندوں سے کہا۔ ''ہماری نئی فلم ''چکوری'' کے ہیرو کا نیا فلمی نام ندیم ہے۔ آپ لوگ اب نذیر بیگ کی بجائے اسے ندیم ہی کے نام سے یاد رکھیے گا۔''

اخباروں میں یہ خبر چھپ گئی کہ گلوکار نذیر بیگ جو کیپٹن احتشام کی فلم ''چکوری'' میں ہیرو کا کردار ادا کر رہا ہے۔ اس کا فلمی نام ندیم رکھا گیا ہے۔ اب وہ اسی نام سے یاد کیا جائے گا۔

فرزانہ جس کی دعاؤں سے نذیر بیگ، ندیم بن گیا تھا۔ اسے بھی پاپا کا دیا ہوا یہ نام اچھا لگا تھا۔ اب ہر وقت اس کا دل یہی چاہتا تھا کہ اس کے ندیم کی فلم جتنی جلدی ممکن ہو سکے ریلیز ہو جائے مگر اس کی اس تمنا اس خواہش کے آگے حالات اور واقعات دیوار بن گئے تھے۔ پاپا اور انکل کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی تھی کہ ان کی زیر تکمیل فلم کم سے کم وقت میں ریلیز ہو جائے مگر اس بار نئی فلم چکوری کی تکمیل کے سلسلے میں یہ فارمولا کارگر ثابت نہیں ہو رہا تھا۔ کوئی نہ کوئی ایسی بات، ایسا رخنہ ہو جاتا کہ چکوری کی شوٹنگ میں تاخیر ہوتی چلی گئی۔ سابقہ فلموں کی طرح کم مدت میں مکمل ہونے کی بجائے، رک رک کر اس کی فلم بندی ہونے لگی۔ اس صورت حال سے شاید ندیم سے زیادہ فرزانہ پریشان تھی۔ وہ جتنی جلدی اپنے ہیرو کو سلور اسکرین پر جلوہ گر دیکھنا چاہتی تھی اسی قدر تاخیر ہوتی جا رہی تھی۔ اس ناچیز کی دیگر وجوہ کے علاوہ ایک وجہ کیپٹن صاحب کے شوگر کا عارضہ تھا جو ان دنوں انہیں زیادہ تنگ کر رہا تھا۔ بہر حال کئی مہینوں کی ایکسٹرا مدت گزرنے کے بعد شوٹنگ کا مرحلہ مکمل ہو گیا۔ اب اس کا ان ڈور کام باقی رہ گیا تھا مگر کیپٹن صاحب کی بیماری انہیں اس بات کی بھی اجازت نہیں دے رہی تھی۔ فرزانہ ایسے حالات میں اپنے باپ سے کیا کہتی۔ ایک دن مستفیض انکل سے بول پڑی۔ ''آخر یہ فلم کب تک التوا کا شکار رہے گی؟''

''تم کس فلم کی بات کر رہی ہو بیٹا؟''

''یہ جو پاپا بنا رہے ہیں چکوری کے نام سے۔''

''تم تو دیکھ رہی ہو کہ ان کے شوگر نے انہیں کس قدر پریشان کر رکھا ہے۔''

''اس پریشانی کی وجہ بھی تو وہ خود ہیں۔ میٹھا کھانے سے باز نہیں آئیں گے، پرہیز نہیں کریں گے تو پریشان تو ہوں گے۔''

''ہاں یہ بات تو ہے۔ اس بیماری میں دوا سے زیادہ پرہیز ضروری ہوتا ہے۔''

''انکل! آپ ہی چکوری کے لیے کچھ کیجیے۔''

''میں کیا کروں بیٹا! وہ تمہارے پاپا کی فلم ہے۔'' مستفیض بولے۔ ''میں کچھ کہوں گا تو وہ ناراض بھی ہو سکتے ہیں۔''

''اچھا! ٹھیک ہے۔ میں ہی ان سے کہتی ہوں۔''

اور ایک دن پاپا کا موڈ مزاج اچھا دیکھ کر فرزانہ نے کہہ ہی دیا۔ ''آپ کا زبردست کارنامہ کب منظر عام پر آئے گا۔''

''کون سا کارنامہ بیٹا! میرے تو بہت سے کارنامے ہیں۔''

''آپ کی لو بجٹ کی بہت بڑی فلم چکوری کب ریلیز ہو گی؟ کب آپ کے نام کا ڈنکا بجے گا؟''

کیپٹن صاحب مسکرائے۔ پھر اداس ہو گئے۔ ''اس بیماری نے تو مجھے کسی کام کا نہیں رکھا ہے۔ دعا کرو۔ میری طبیعت سنبھل جائے۔''

''پاپا! میں ایک بات کہوں؟''

''ہاں ہاں کہو۔''

''آپ اپنے بھائی سے کہیں نا۔ وہ اس فلم کا باقی کام مکمل کر دیں۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''ہاں تمہارا یہ آئیڈیا اچھا ہے مگر وہ تو شاید اپنی آنے والی فلم کی تیاری کررہا ہے۔''

''ان کا کام بھی ہوتا رہے گا۔ آپ اپنی فلم کی تکمیل کے بارے میں ان سے کہہ کر تو دیکھئے۔''

''ٹھیک ہے میں مستفیض سے بات کروں گا۔''

کیپٹن صاحب کے کہنے پر مستفیض نے چکوری کے شوٹ کیے ہوئے حصوں کو دیکھا تو سر پیٹ لیا۔ یہ بھیا نے ندیم کی غیر معمولی اداکاری کی وجہ سے اتنے طویل طویل شاٹ لیے ہیں۔ کہانی کو اس قدر کھینچا ہے کہ اچھی خاصی فلم دردسر بن جائے گی۔ انہوں نے فلم کے ٹمپو کو تیز رکھنے کے لیے غیر ضروری حصوں کو کاٹنا شروع کیا اور چند دنوں کی جان توڑ مشقت کے بعد باقی حصوں کو اس طرح لنک اپ کیا کہ کہانی کے تمام تر تاثرات کے ساتھ فلم ابتدا سے انتہا تک پہنچی۔ انہوں نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر اس کا ایک خصوصی شو ایف ڈی سی اسٹوڈیو میں ہی کیا جس میں گھر کے تمام لوگوں کے علاوہ یونٹ کے افراد اور اہم فلم والے شریک ہوئے۔ سب نے اس کی تعریف کی کہ کہانی، موسیقی، اداکاری اور ہدایت کاری کو جس چابکدستی کے ساتھ اس فلم میں پیش کیا گیا ہے۔ وہ اس فلم کی کامیابی میں اہم کردار ادا کرے گی۔

سب لوگ بہت خوش ہوئے۔ فرزانہ کی خوشی کی انتہا نہیں تھی۔ اس نے اپنے پاپا اور انکل سے کہا ''اب اس فلم کی نمائش کا بندوبست کیجیے۔ پہلے ہی بہت دیر ہوچکی ہے۔''

''ہاں بیٹا! ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ اب یہ فلم ریلیز ہوجائے۔''

''بھیا! میرا تو خیال ہے کہ اس فلم کی نمائش سے پہلے اس کے پروڈیوسروں کو یہ فلم دکھا دی جائے کہ وہ اس سے مطمئن ہیں یا نہیں۔''

''ہاں اس بار یہ ضروری ہے۔''

اور دونوں بھائی ڈوسانی پکچرز کے دفتر پہنچ گئے۔

''نئی فلم مکمل ہوگئی ہے۔''

''اچھا! ہم تو یہ سمجھ رہے تھے کبھی مکمل نہیں ہوگی۔''

''وہ میری بیماری کی وجہ سے اتنی دیر ہوگئی۔ بہرحال ہم چاہتے ہیں کہ پہلے آپ لوگ یہ فلم دیکھ لیں۔ پھر اس کی نمائش کا پروگرام ترتیب دیا جائے۔''

''یہ تو بڑی اچھی بات ہوگی۔ ذرا ہم بھی دیکھ لیں۔ کیا کارنامہ انجام دیا ہے آپ لوگوں نے۔''

نیلی اور انجمن ایسی اداکارائیں ہیں جنہوں نے اور بھی کئی فلموں میں ندیم کے ساتھ کام کیا ہے لیکن وہ ان فلموں میں ندیم کی ہیروئن نہیں تھیں۔

اداکارہ شبانہ نے جن 9 فلموں میں ندیم کی ہیروئن کا کردار ادا کیا ان میں ایک فلم پلاٹینیم جوبلی اور دو فلموں نے گولڈ جوبلی کی۔ ان میں کچھ فلمیں سابق مشرقی پاکستان کی اور تین پاکستان کی تھیں۔

شبنم اور ندیم کی مشترکہ 48 فلموں میں 15 فلموں نے گولڈ جوبلی تین فلموں نے پلاٹینیم جوبلی اور 7 فلموں نے ڈائمنڈ جوبلی کی جن میں چار سال تک مسلسل چلنے والی فلم آئینہ بھی ہے جس نے کراؤن جوبلی کی جب کہ ان دونوں کی ناکام فلموں کی تعداد 10 ہے۔

☆☆☆

بابرہ شریف اور ندیم کی مشترکہ 27 فلموں میں شمع، انتظار، بھول، پرنس، پلے بوائے، آس پاس، مہربانی، قاتل کی تلاش نے گولڈ جوبلی کی۔ تلاش، لاجواب اور سنگدل نے ڈائمنڈ جوبلی اور زندگی نے پلاٹینیم جوبلی کی جب کہ درد، آنگن، گوری دیاں جھانجراں، خونی شعلے اور شہزادہ اس جوڑی کی ناکام فلمیں ہیں۔

کویتا اور ندیم کی مشترکہ 12 فلموں میں میاں بیوی راضی نے پلاٹینیم جوبلی کی جب کہ محبت اور مہنگائی، عشق عشق، محبت ایک کہانی، مہندی لگی میرے ہاتھ، گولڈن جوبلی فلمیں تھیں۔ مٹھی بھر چاول، محل میرے سپنوں کا، بارود کی چھاؤں اور آندھی نے بھی کامیابی حاصل کی۔ کیسے کہوں اور خوش نصیب اس جوڑی کی ناکام ترین فلمیں تھیں۔

نشو اور ندیم کی مشترکہ 9 فلموں میں نادان ڈائمنڈ جوبلی فلم، بازی، سماج، پھول میرے گلشن کا گولڈن جوبلی جب کہ ان کی ناکام فلمیں انگارے، تیرا غم رہے سلامت، گمراہ اور مٹی کے پتلے تھیں۔

دیبا اور ندیم نے دس فلموں میں ہیرو ہیروئن کے کردار کیے جن میں 5 فلمیں کامیاب اور 5 فلمیں ناکام ثابت ہوئیں۔ دو فلموں نے گولڈن جوبلی کی۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اور پھر ایک خصوصی شو کا اہتمام گلستان سنیما میں ہوا جس میں دونوں باپ بیٹوں نے ''چکوری'' دیکھی۔

''کیسی ہے؟'' فلم کے اختتام پر کیپٹن صاحب نے پوچھا۔

''ٹھیک ہے۔'' خالص کاروباری انداز میں جواب ملا۔

''دیکھئے۔'' ڈوسانی بولے۔ ''نئے آرٹسٹوں کی فلم ہے۔ اس لیے اس کی نمائش سے پہلے اس کی پبلسٹی پر خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔''

''جی ہاں یہ بات تو ہمارے پیش نظر بھی ہے۔'' مستفیض بولے۔ ''بتایئے اخبارات وغیرہ میں آپ لوگ کب سے اشتہار دینا شروع کریں گے۔''

''شیڈول کی پبلسٹی کے علاوہ بھی کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔'' بڑے ڈوسانی نے کہا۔

''بتایئے۔ اس سلسلے میں آپ کے ذہن میں کیا آئیڈیا ہے؟''

''میرا تو خیال ہے۔ اس فلم کی نمائش سے ہفتہ دس دن پہلے اس کا پریس شو کیا جائے تاکہ اخبارات و جرائد میں اس کی نمائش سے پہلے اس کے بارے میں تنقید و تبصرے چھپ جائیں۔''

بیٹے نے باپ کی بات آگے بڑھائی۔ ''یہ پبلسٹی اشتہارات سے کہیں بڑھ کر مؤثر ہوگی۔ اخبارات کسی بات کی تعریف کریں نہ کریں نئے ہیرو کی پرفارمنس کا ضرور تذکرہ کریں گے۔''

اور ایسا ہی ہوا۔ فلم کی نمائش سے بہت پہلے گلستان سنیما میں اس کا پریس شو کا انعقاد ہوا۔ میں نے بھی بطور اخباری نمائندہ کے اس پریس شو میں شرکت کی۔

ان دنوں ڈھاکے کا سب سے بڑا فلمی اخبار ''چترالی'' تھا جو دو زبانوں میں چھپتا تھا۔ بنگالی اور اردو۔ اردو چترالی کے ایڈیٹر انچیف زین العابدین تھے۔ اگرچہ میں چترالی کا اسٹاف نہیں تھا مگر اس دفتر میں کام کرنے والے سارے لوگ میرے دوست تھے۔ اس لیے وہاں آنا جانا رہتا تھا۔

زین العابدین نے مجھ سے کہا۔ ''یار انور فرہاد! تم ''چکوری'' کا تبصرہ لکھ دو۔''

''زینو بھائی! یہ کام تو آپ خود بھی کر سکتے ہیں۔ آپ خود لکھ دیجیے نا۔''

''یار! تم سمجھتے کیوں نہیں۔ لوگ جانتے ہیں کہ میں نے اس فلم کا اسکرپٹ لکھا ہے۔ لوگ یہی کہیں گے کہ اپنی فلم کی تعریف کی ہے۔''

ان کی بات معقول تھی۔ اگرچہ فلم کے کریڈٹ میں نہ کہانی کے شعبہ میں ان کا نام دیا گیا تھا نہ مکالمے میں۔ مصنف کے طور پر نجمہ رحمان کا نام تھا۔ مکالموں کا ذکر ہی نہیں کیا گیا تھا کہ کس کے زور قلم کا نتیجہ ہے؟ یہ ان دونوں بھائیوں کا وتیرہ تھا کہ مصنف کے طور پر اپنے ہی خاندان کے لوگوں کا نام دیتے تھے۔ مثلاً ''چھوٹے صاحب'' کے کہانی نویس مستفیض۔ ''چاند اور چاندنی'' کی مصنفہ نجمہ رحمان۔ ''قلی'' کے کہانی کار مستفیض۔ ''داغ'' کے کہانی نویس آئی اے رحمان اور ''اناڑی'' کے مستفیض۔ اگرچہ یہ لوگ اردو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ بس صاف ستھری اردو بول لیتے تھے۔

یونائیٹڈ فلمز کا ادارہ بھی شباب پروڈکشن کی طرح تھا کہ اس ادارے کی فلم بڑی پابندی سے بنتی تھی۔ یکے بعد دیگرے دونوں بھائی فلم ڈائریکٹ کرتے رہتے تھے۔ اس لیے ان کی فلمیں لکھنے والے رائٹران کی یہ زیادتی برداشت کر جاتے تھے کہ چلو باہر کے لوگ نہ سہی فلم والے تو جانتے ہیں کہ فلاں فلم کس نے لکھی ہے۔

ہاں بات ''چکوری'' کے تبصرے کی ہو رہی تھی۔ میں زینو بھائی کے حکم پر ''چکوری'' کا تبصرہ لکھنے بیٹھا تو اس کے ہیرو نئے اداکار ندیم کی اداکاری کے بارے میں ایک مکمل مضمون لکھ بیٹھا۔ یہ سوچ کر کہ اس فلم کا تبصرہ تو سارے اخباروں میں شائع ہوگا۔ زینو بھائی کو یہ تحریر دی تو اسے پڑھ کر انہوں نے کہا۔

''میں نے تو تمہیں تبصرہ لکھنے کو کہا تھا۔''

''ہاں! آپ نے کہا تھا۔ مگر وہ تو سارے اخبارات و جرائد میں شائع ہوگا۔ نئے ہیرو کے بارے میں پہلی تحریر کے طور پر یہ تحریر آپ کو چھاپنے کا اعزاز ہوگا۔''

''ہاں! یہ بات بھی درست ہے۔ تم نے اس فلم کے ہیرو کی اداکاری کے بارے میں بہت اچھی تحریر لکھی ہے۔''

فلم کی نمائش سے پہلے ''چترالی'' میں نئے اداکار ندیم کے بارے میں یہ تحریر شائع ہوئی تو ڈھاکے کی فلم انڈسٹری کے لوگوں کے علاوہ شائقین فلم نے بھی اس پر اپنے ایکشن اور ری ایکشن کا اظہار کیا۔ اداکار عظیم جس سے میرا بڑا یارانہ تھا، نگار خانے میں اس سے ملاقات ہوئی تو مجھ سے الجھ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

گیا۔ ''میری اتنی بڑی بڑی فلمیں ریلیز ہوئیں۔ تم نے کبھی میرے لیے تعریف کے دو کلمے نہیں لکھے۔ اس نئے لونڈے پر تم نے تعریفوں کے پُل باندھ دیئے۔ وہ تمہاری بولی بولنے والا ہے نا۔ اس لیے تم نے اس کے ساتھ یہ جانبداری برتی ہے۔''

وہ غصے میں بھرا ہوا تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے لائٹ موڈ میں کہا۔ ''تم نے بے شک بڑی بڑی فلموں میں کام کیا مگر کاش کہ تمہاری اداکاری میں بھی کچھ بڑا پن ہوتا۔ کوئی بڑی بات ہوتی۔ کوئی انوکھا انداز ہوتا۔ جس کی وجہ سے تمہاری ان فلموں کو فائدہ پہنچتا۔ وہ فلمیں کامیاب ہوتیں۔ میں نے ندیم کے ساتھ کوئی جانبداری نہیں برتی ہے۔ اس نے جو اداکاری کی ہے اس کی تعریف کی ہے۔ اس کی یہ فلم واقعی تمہاری فلموں کے مقابلے میں بہت چھوٹی ہے۔ بلیک اینڈ وائٹ ہے۔ لو بجٹ کی ہے۔ مگر دیکھنا تمہاری رنگین اور سینما اسکوپ فلموں سے کہیں زیادہ کامیاب ہوگی اور اس کی کامیابی میں اس کے نئے ہیرو کا بھی نمایاں کردار ہوگا۔ اس کی اداکاری اسے بہت آگے لے جائے گی۔''

عظیم یوں بھی پہلے سے تپا ہوا تھا کہ کیپٹن نے اسے کاسٹ کرنے کی بجائے پیسا بچانے کے لیے نئے ہیرو ہیروئن کو لے کر فلم بنائی۔ شاید اسے اسی بات کی توقع ہوگی کہ میرے بغیر بننے والی فلم دو کوڑی کی ثابت ہوگی۔

اس سلسلے میں سب سے دلچسپ تبصرہ خود ندیم کا تھا۔ اس سے ملاقات ہوئی تو اس نے بھی شکایت کی۔ ''انور صاحب! آپ نے میرے بارے میں کچھ زیادہ ہی لکھ دیا ہے۔''

''نہیں زیادہ نہیں جو لکھنا چاہیے تھا وہی لکھا ہے۔''

''یہ جو آپ نے مجھے وحید مراد اور محمد علی کی صف میں لے جا کر کھڑا کر دیا ہے یہ زیادہ نہیں ہے؟''

''نہیں ہرگز نہیں۔ تمہارے اندر جو فنی صلاحیتیں ہیں میں نے اسی کے تناظر میں لکھا ہے۔''

میں نے لکھا تھا کہ وہ دن دور نہیں جب ''چکوری'' کا ہیرو وحید مراد اور محمد علی کی ٹکر کا ہیرو بن جائے گا اور ایسا ہی ہوا۔ آنے والے دنوں میں میری بات میرا وژن صد فیصد درست ثابت ہوا۔ میں چونکہ ایک صحافی ہوں اور اچھے اور تجربہ کار صحافی سامنے کی باتوں کو دیکھ کر دور کی باتوں کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔ ندیم چونکہ ان دنوں کچی کلی کی طرح تھے اور کلی کو اپنے پھول بننے اور گلشن کی رونق میں اضافہ کرنے کی کوئی خبر نہیں ہوتی۔ اس لیے اس نوزائیدہ اداکار کو بھی اپنی قدر و قیمت کا احساس نہیں تھا۔ وہ اداکاری کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ اچھی اداکاری کیا ہوتی ہے؟ بری اداکاری کیا ہوتی ہے؟ ان اداکاری کے ابتدائی دور میں اس غریب کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ اس بات کا اظہار انہوں نے خود کیا ہے۔ اپنے ایک حالیہ انٹرویو کے درمیان انہوں نے کہا۔

''اس فلم کے مکمل ہونے کے بعد جب یہ فلم سب سے پہلے ایف ڈی سی اسٹوڈیو میں چلائی گئی تو میں اپنی اداکاری دیکھ کر بہت شرمندہ ہوا اور چپکے سے وہاں سے اٹھ کر باہر چلا گیا۔ میں اپنے آپ کو کوسنے لگا کہ میں نے کیوں فلم میں کام کیا۔ کراچی میں میرے دوست احباب اور گھر والے اگر میری یہ فلم دیکھیں گے تو وہ کیا سوچیں گے؟ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ فلم ہٹ ہو جائے گی اور لوگوں کو بہت پسند آئے گی۔''

ندیم صاحب نے اپنی پہلی فلم کی نمائش کے بعد کا احوال سناتے ہوئے کہا۔ ''جب لوگ مجھے اس فلم کی پسندیدگی کی خبریں دیتے تو میں سوچتا۔ یہ لوگ میرا دل رکھنے کے لیے ایسی باتیں کر رہے ہیں۔''

اسی انٹرویو میں وہ کہتے ہیں۔ ''بات دراصل یہ ہے کہ مجھے اداکاری کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ احتشام صاحب جو

عجیب اتفاق

موسیقار نثار بزمی صاحب نے ابھرتے ہوئے گلوکار کی حیثیت سے نذیر بیگ کو اپنی دو فلموں ''یہ کراچی ہے'' اور ''شیرا'' میں پہلی بار پلے بیک سنگر کی حیثیت سے گانے کا چانس دیا تھا مگر دونوں ہی فلمیں مکمل نہ ہو سکیں۔ ان میں سے کسی ایک فلم میں نذیر بیگ نے خورشید شیری کے ساتھ ایک دوگانا ریکارڈ کرایا تھا۔ کرنا خدا کا یوں ہوا کہ جب نذیر بیگ ہیرو بن گئے اور ندیم کے نام سے فلموں میں کام کرنے لگے تو وہی دوگانا۔

بہت یاد آئیں گے وہ دن صنم تیری قسم

فلم ''انیلا'' میں مہدی حسن کی آواز میں ندیم صاحب پر فلمایا گیا کبھی کبھی ایسا بھی اتفاق ہوتا ہے۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کہتے۔ میں وہی کردیا کرتا تھا۔ کیونکہ اس وقت مجھے اداکاری بالکل نہیں آتی تھی۔ اس لیے اس فلم میں بناوٹ اور تصنع بالکل نہیں ہے۔ بلکہ سچائی اور معصومیت ہے جو میرا اصل ہے۔''

اس نئے نویلے اداکار کو اپنے کام کا اندازہ ہو نہ ہو اس فیلڈ کے تجربے کار اور گہری نگاہ رکھنے والے لوگوں نے اندازہ لگالیا تھا کہ اس کے اندر خداداد صلاحیتیں موجود ہیں اور اداکاری کے آسمان پر یہ چاند سورج بن کر چمکے گا۔ ان لوگوں میں کیپٹن احتشام اور ان کے گھر والے سرفہرست تھے۔ ان لوگوں نے پہلی فرصت میں ایک خفیہ میٹنگ کی جس میں یہ بات سامنے لائی گئی کہ یہ گوہر نایاب جو سو فیصد ہماری دریافت ہے کہیں اسے دوسرے نہ لے اڑیں۔ فلم انڈسٹری میں یہ کوئی نئی بات نہیں ہوگی۔ اگر ایسا ہوا تو ہم ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔ چڑیاں کھیت چگ جائیں گی۔ ہمیں اس کے تدارک کے لیے کیا کرنا چاہیے؟ کس طرح ہم اپنے حق میں اس کے حقوق کے مالک بن سکتے ہیں؟ اس بات کا بھی امکان ہے کہ اس کے پر پرزے نکل جائیں اور وہ خود پھر سے اڑ جائے۔ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

''اس کے پر کتر کر اسے پنجرے میں بند کردینا چاہیے۔''

''ہاں ایسا ہی کرنا چاہیے۔''

اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں۔ پھر دونوں بھائیوں اور ان کی بیگموں نے ایک بہت اہم فیصلہ کیا۔ جس کے بعد انہوں نے نذیر بیگ کو بلا کر اس سے کہا۔ ''تم کہاں رہتے ہو؟''

''اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ۔''

''دیکھو بیٹے! اب تم پہلے والے نذیر بیگ نہیں ہو۔ ایک فلم کے ہیرو بن گئے ہو، اب تم ندیم ہو۔ ایک سپرہٹ فلم کے ہیرو۔ اگر تم نے اس وقت اپنے آپ کو مین ٹین نہیں کیا تو تمہیں اس کا نقصان پہنچے گا۔ تمہاری ساکھ متاثر ہو گی۔''

''جی پھر میں کیا کروں؟''

''پہلے یہ بتاؤ تم ہم لوگوں کو اپنا دوست سمجھتے ہو یا دشمن؟''

''یہ کیسی بات کہہ رہے ہیں آپ لوگ؟ آپ لوگ میرے دشمن کیسے ہو سکتے ہیں؟ یہ آپ ہی لوگ ہیں جنہوں نے مجھے اس مقام تک پہنچایا ہے۔''

''جیتے رہو۔ تم بہت اچھے بہت نیک اور فرمانبردار لڑکے ہو۔ اسی لیے ہم چاہتے ہیں کہ اللہ نے تمہیں جو عزت اور شہرت دی ہے تم اس کی قدر کرو۔ تاکہ دوسرے بھی تمہاری قدر کریں۔ عزت کریں۔''

''مجھے تو کچھ پتا نہیں۔ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ آپ لوگ ہی بتائیں۔''

''دیکھو سب سے پہلے تو تم اپنا بوریا بستر اٹھا کر یہاں ہمارے پاس آجاؤ کہ اب تم سڑک چھاپ نوجوان نہیں ہو۔''

''ہم تمہیں یہاں آنے کو اس لیے کہہ رہے ہیں کہ ابھی تم اپنا کوئی علیحدہ مکان لے کر نہیں رہ سکتے۔''

''مگر..... آپ لوگوں کا مجھ پر پہلے ہی اتنا احسان ہے۔''

''احسان وحسان کچھ نہیں اگر ہم ایک دوسرے کے وقت میں کام نہیں آئے تو انسان کہلانے کے بھی حقدار نہ ہوں گے۔''

''دیکھو بیٹے شوبز کی دنیا کا کچھ اپنا ہی طور طریقہ ہوتا ہے۔ بڑا اداکار بننے کے لیے بڑی ترقی کرنے کے لیے بڑی احتیاط اور بڑی سوجھ بوجھ سے کام لینے والے ہی کامیاب ہوتے ہیں۔''

''یہاں ہمارے پاس کچھ دن رہو گے تو ہم تمہیں گائیڈ کریں گے۔ اونچ نیچ سمجھائیں گے۔ پھر جب تم خود بھلے برے کی تمیز کرنے لگو گے تو اپنی پسند سے اپنی دنیا آباد کرلینا۔''

قصہ مختصر یہ کہ نذیر بیگ کو جو ''چکوری'' کا کامیاب ہیرو بن کر ندیم بن گیا تھا ان کے گھر نیو اسکاٹن روڈ منتقل ہونا پڑا۔ وہ بڑا خوددار تھا۔ اسے ان کے گھر جا کر بڑا عجیب سا لگا۔ ایک ویل فرنشڈ کمرا اس کے لیے مختص کردیا گیا تھا۔ اس کی خدمت کے لیے نوکر چاکر تو لگے ہی رہتے تھے مگر اس کی اصل نگرانی فرزانہ کی ذمہ تھی۔

''آپ میرے لیے کیوں پریشان ہوتی ہیں؟ مجھے یہاں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں، یوں بھی میں اپنا کام خود کرنے کا عادی ہوں۔ جب کہ اتنے نوکر چاکر میرے آگے پیچھے لگے رہتے ہیں۔''

وہ بے چاری کیا کہتی اور کیسے کہتی کہ ہم لوگ تمہارے ساتھ یہ برتاؤ کیوں کررہے ہیں؟ بس وہ مسکرا کر کہتی۔ ''ندیم صاحب! اب آپ نذیر بیگ نہیں ہیں۔ ''چکوری''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کے سپر اسٹار ہیرو ہیں۔ آپ کی خدمت کر کے ہمیں خوشی ہوتی ہے۔''

وہ بے چارہ شرما کر کہتا۔ ''مجھے شرمندہ نہ کریں۔ دوسروں کے لیے نہ سہی، آپ لوگوں کے لیے تو وہی نذیر بیگ ہوں جو پہلے تھا۔''

''آپ نہیں جانتے آپ کیا تھے اور کیا ہو گئے ہیں۔''

یہ حقیقت بھی تھی۔ ان کے تو فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ وہ چکوری کے ہیرو بننے سے بہت پہلے سے کسی کے ہیرو بن چکے ہیں اور چکوری کا ہیرو بھی وہ اسی ہیروئن کی کوششوں کاوشوں اور مشوروں سے بنے ہیں۔ اس بے چارے کو تو اس بات کا بھی علم نہیں تھا کہ اسے یہاں کس منصوبے کے تحت لایا گیا ہے۔ اس کے ہیرو شپ کے تحفظ اور پروان چڑھانے کے بہانے اسے اس عشیش محل کے پنجرے میں قید کر دیا گیا ہے۔

دوسری فلم ''چھوٹے صاحب'' شروع ہو گئی تھی۔ گھر سے شاہانہ انداز میں موٹر کار پر شوٹنگ کے لیے جانا اور شوٹنگ مکمل کروا کر اسی شان سے واپس آنا بظاہر بڑا دل خوش کن تھا۔ واپس آتے ہی بے بی اس کے فریش اپ ہونے سے لے کر کچھ کھانے پینے اور پھر آرام کرنے تک پیش پیش رہتی۔ وہ ہزار منع کرتے رہ گئے کہ آپ کیوں اپنے آپ کو ہلکان کرتی ہیں مگر انہیں مزید کچھ کہنے سے روک دیا جاتا۔

''مجھے ہلکان ہونے سے پریشان ہونے سے نہ روکیں۔ روکیں گے تو مجھے تکلیف ہوگی۔ میں یہی سمجھوں گی کہ آپ مجھے اس قابل نہیں سمجھتے کہ.....''

''وہ بھولا بادشاہ مخمصے کا شکار ہو جاتا۔ آخر بے بی ایسی باتیں کیوں کرتی ہیں؟ بے بی آخر کیا چاہتی ہیں؟ بے بی کو کیا پسند ہے؟''

فرزانہ گھر بھر کی لاڈلی تھیں۔ اس لیے انہیں سب لوگ بے بی ہی کہتے تھے۔ وہ خود تو انہیں بے بی نہیں کہتے تھے مگر ان کی یہ باتیں یہ حرکتیں یہ خواہشیں بے بیوں ہی جیسی لگتی تھیں۔ لیکن ایک دن انہیں اصل حقیقت کا پتا چلا تو وہ سناٹے میں آ گئے۔ کب اور کیسے انہیں اس بات کا پتا چلا اس کی تو کوئی مصدقہ اطلاع نہیں مگر اتنا ضرور معلوم ہے کہ جب ان سے کہا گیا۔

''ہم تمہیں اپنے خاندان کا فرد بنانا چاہتے ہیں۔''

''جی.....! میں کچھ سمجھا نہیں۔''

''اگر واقعی تم نہیں سمجھے ہو تو تمہیں سمجھانے کی یہ بات ہے کہ ہم تمہیں اپنا داماد بنانا چاہتے ہیں۔''

''جی.....!!'' حیرت و استعجاب کی شدت سے وہ اور کچھ نہ کہہ سکے۔

''تم بے بی کی پہلی اور آخری پسند ہو۔ اس کی اسی پسندیدگی کی وجہ سے تم اس مقام تک پہنچے ہو۔ تمہیں ہیرو بنانے میں سب سے بڑا کردار اسی کا ہے۔ اگر تم اس کے حقیقی ہیرو بننے سے انکار کر دو گے تو اس کے ساتھ ہم سب کو بھی بہت صدمہ پہنچے گا۔''

کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد جب ان کے اعصاب ان کے قابو میں آئے تو انہوں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے میں آپ لوگوں کی فیملی کا ممبر بن جاؤں گا بس مجھے اتنی مہلت دیجیے کہ میں کچھ بن جاؤں۔ فلم انڈسٹری میں اپنا کوئی مقام بنا لوں۔''

''بیٹے! شاید تم نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی ہے۔ اس لیے تمہیں اس بات کا کچھ پتا نہیں کہ چاہنے والوں کے لیے صبر و ضبط کا مرحلہ کتنا مشکل، کتنا کٹھن ہوتا ہے۔ بے بی اس انتظار میں تو تڑپ تڑپ کر مر جائے گی۔''

وہ کچھ کہنا چاہتے تھے کہ انہیں روک کر کہا گیا۔ ''تمہیں جس بات کا خطرہ ہے ہم ہرگز ایسی کوئی بات ہونے نہیں دیں گے۔ نہایت خاموشی کے ساتھ بے حد رازداری کے ساتھ ہم تم دونوں کو نکاح کے بندھن میں باندھ دیتے ہیں۔ جب تم چاہو گے دھوم دھام سے رخصتی کر دیں گے۔''

''مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے اگر میری شادی کی خبر لیک آؤٹ ہو گئی تو میرا کیریئر تباہ ہو جائے گا۔''

''کیسے لیک آؤٹ ہو گی؟ کیسے کسی کو پتا چلے گا۔ جب گھر کے لوگوں کے علاوہ اس موقع پر کوئی شریک نہیں ہو گا تو باہر کے کسی آدمی کو اس بات کا کیسے پتا چلے گا؟ تم بالکل اطمینان رکھو۔ تمہاری ساکھ اور کیریئر کا تم سے زیادہ ہمیں خیال ہے۔''

وہ ایک طرف اکیلے تھے۔ دوسری طرف گھر کے تمام اہم لوگ۔ انہوں نے اپنی بات اپنا فیصلہ ان سے منوا ہی لیا۔

اور ایک دن بے بی کی پسند کو بے بی کا حقیقی ہیرو بنا دیا گیا مگر اس احتیاط اور اس رازداری کے ساتھ کہ نکاح خوانی اپنے گھر پر بھی نہیں کی گئی۔ انہیں ڈوسانی کے گھر میں یہ انتہائی خفیہ تقریب انعقاد پذیر ہوئی جس میں گھر کے بھی انتہائی اہم افراد نے شرکت کی اور اس میں ڈوسانی کے گھر کے بھی بے حد محدود اعتماد افراد شریک ہوئے۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

بے قرار لوگوں کی بے قراری کو قرار آ گیا۔ پنچھی کے پر کتر کر اسے سنہرے پنجرے میں بند کر دیا گیا تھا۔ سب کچھ اتنی ہوشیاری سے ہوا تھا کہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس احتیاط اور رازداری کے باوجود یہ خبر پریس تک پہنچ کر طشت از بام ہو جائے گی۔ یہ پریس والے..... یہ اخباری نمائندے بھی کسی جن بھوت سے کم نہیں ہوتے کہ جہاں پرندہ پر نہیں مار سکتا وہاں کی خبریں بھی لے اڑتے ہیں۔

ایک دن ایف ڈی سی کے نگار خانے میں ''تم میرے ہو'' کی شوٹنگ ہو رہی تھی کہ ایک اخباری نمائندہ عقیل پرویز وہاں جا پہنچا۔ شاٹ اوکے ہو جانے کے بعد جب دوسرے شاٹ کی تیاری کی جانے لگی۔ عقیل پرویز آگے بڑھے اور ندیم صاحب سے شکایت کی۔ ''ندیم صاحب! آپ نے اتنی اہم خبر مجھے نہیں بتائی، انور فرہاد کو بتا دی۔''

عقیل پرویز کو شاید اس بات کا گمان تھا کہ وہ ندیم کے بہت قریب ہیں۔

''کون سی خبر عقیل صاحب؟'' ندیم نے بڑے خلوص سے پوچھا۔

''ارے بھئی! اپنی شادی کی خبر۔'' عقیل پرویز برجستہ بولے۔ ''آپ نے شادی کر لی اور مجھے بتایا بھی نہیں۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ کیسی شادی؟''

عقیل پرویز صاحب نے جھٹ اپنے بغل سے نگار کراچی کا تازہ شمارہ نکال کر ان کے روبرو کر دیا جس کی شہ سرخی تھی۔

''ندیم نے کیپٹن احتشام کی بیٹی فرزانہ سے شادی کر لی۔''

ندیم صاحب کے لیے یہ خبر کسی دھماکے سے کم نہیں تھی۔ ان پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اخبار سمیت وہ سیٹ سے آندھی اور طوفان کی طرح باہر نکلے اور کار ڈرائیو کر کے گھر پہنچے اور اپنے کمرے میں خود کو بند کر لیا۔ گھر کے لوگوں نے انہیں اس طرح اچانک آتے اور کمرے میں خود کو بند کرتے دیکھا تو گھبرا گئے اور دروازے پر جا کر دستک دینے لگے اور پوچھنے لگے۔ ''کیا بات ہے؟''

اندر سے کوئی جواب دیا گیا..... نہ دروازہ کھولا گیا۔

گھر کے لوگ حیران پریشان کہ اچانک اس لڑکے کو کیا ہو گیا؟ کس نے اسے کیا کہہ دیا؟

یہ لوگ ابھی اسی تذبذب میں تھے کہ نگار خانے سے اسسٹنٹ ڈائریکٹر تقی مصطفیٰ اور یونٹ کے ایک دو لڑکے آ گئے۔ ''ندیم صاحب کہاں ہیں؟''

''اپنے کمرے میں۔'' گھر والوں نے ان کے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

''آخر کیا ہوا کہ وہ آندھی اور طوفان کی طرح آ کر اپنے کمرے میں بند ہو گیا؟ ہم اسے آواز دے رہے ہیں کمرا کھولنے کو کہہ رہے ہیں مگر نہ کوئی جواب دیتا ہے نہ کمرا کھولتا ہے۔''

اب آنے والوں نے اصل وجہ بتائی۔ ''کراچی کے نگار اخبار میں ان کی شادی کی خبر چھپی ہے۔ جسے دیکھ کر.....''

چند لمحوں کے لیے گھر والے بھی سناٹے میں آ گئے۔ پھر اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بولے۔ ''یہ سراسر جھوٹی خبر ہے۔ ندیم کے دشمنوں نے اس کی ساکھ کو نقصان پہنچانے کے لیے چھپوائی ہے۔''

آنے والوں نے بھی دروازے پر دستک دے کر اسے کھولنے کو کہا اور یہ بھی سمجھانے لگے۔ ''ایسی جھوٹی خبر پر آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں۔ اپنے آپ کو قابو میں رکھیے اور ہمارے ساتھ چل کر شوٹنگ میں حصہ لیجیے۔ آپ تو بڑے ہمت اور حوصلے والے آدمی ہیں۔ ایسی خبر پھیلا کر آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔''

''ایسا ہے کہ.....'' گھر والوں نے ان سے کہا۔ ''خبر سچی ہو یا جھوٹی اس کے دل و دماغ پر منفی اثر ہوا ہے۔ اس لیے اس وقت تو وہ اداکاری نہیں کر سکے گا۔ اس کی شوٹنگ کسی اور دن کروا لیجیے گا۔''

یہ بات معقول تھی۔ ایسی ذہنی پریشانی کے عالم میں کوئی کیا پرفارم کر سکتا ہے؟ یہ سوچ کر ''تم میرے ہو'' کے یونٹ کے لڑکے واپس چلے گئے۔

اس کے بعد کی اطلاع یہ ہے کہ بڑی مشکلوں سے دروازہ کھلوایا گیا تو ندیم صاحب غم و الم کی تصویر بنے نظر آئے۔

''اب تو آپ لوگ خوش ہیں نا۔ میری ترقی کے راستے پر دیوار کھڑی کر کے آپ لوگوں کے دل کو ٹھنڈک مل گئی نا؟''

''ارے بیٹا! ایسی کوئی بات نہیں۔ ہم اس خبر کی پُرزور تردید کریں گے۔ الیاس رشیدی کو بتائیں گے کہ یہ سراسر غلط خبر ہے۔ جھوٹی خبر ہے۔ ہمارے دشمنوں نے ہمیں بدنام اور ناکام کرنے کی نیت سے شائع کروائی ہے۔''

''مگر ہم تو جانتے ہیں کہ یہ خبر سچی ہے اور میں یہی کہتا تھا کہ یہ خبر باہر چلی گئی تو.....''

''کچھ نہیں ہو گا۔ ہم اس کی پُرزور تردید شائع کروا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

دیں گے۔''

اور اس سلسلے میں دونوں بھائیوں احتشام اور مستفیض صاحبان نے نگار کے ایڈیٹر الیاس رشیدی صاحب کو ہر طرح سے یقین دلانے کی کوشش کی کہ یہ غلط خبر ہے۔ اگلے شمارے میں یہ خبر بھی نمایاں انداز میں چھپ گئی کہ متعلقین نے اس خبر کی پُرزور تردید کی ہے۔ ندیم کی جانب سے یہ کہا گیا ہے کہ ابھی میں شادی کیسے کرسکتا ہوں۔ یہ وقت اپنے مستقبل کے لیے جدوجہد کرنے کا ہے۔ شادی تو بہت بعد کی بات ہے۔

ایسی تردیدی خبروں کی اشاعت کے بعد ندیم صاحب کی کچھ تسلی ہوئی اور وہ اپنی نئی مصروفیات میں حصہ لینے لگے۔

دوسری طرف اس بات کی جستجو نے گھر والوں کو پریشان کر رکھا تھا کہ آخر یہ خبر لیک کیسے ہوئی؟ کیسے انور فرہاد تک پہنچی؟

''یہ تو انور فرہاد ہی بتا سکتا ہے۔''

لہٰذا ان کے لیے انور فرہاد سے ملنا ضروری ہوگیا۔ انہوں نے اپنے کچھ کارندوں کو اس کام پر مامور کیا اور کہا کہ انور فرہاد کو کسی طرح بھی یہاں لاؤ۔

اس سے پہلے کہ ان لوگوں کا کوئی فرد مجھ تک پہنچتا میرے جاسوس نے مجھے آکر سارے حالات سے باخبر کیا اور تاکید کی کہ خبردار کسی کے کہنے سننے پر آپ ان کے ''دربار'' میں نہ پہنچیے گا۔

''آخر کار وہ لوگ کیوں مجھ سے ملنا چاہتے ہیں؟''

''اس کے علاوہ اور کیا بات معلوم ہوسکتی ہے کہ وہ لوگ پوچھیں گے۔ شادی کی خبر آپ تک کیسے پہنچی؟''

میں ہنس دیا۔ جس پر میرے جاسوس نے کہا۔ ''آپ ہنس کیوں رہے ہیں؟''

''یہ تو ایسی بات ہے جو میں اپنے اخبار کے ایڈیٹر کو بھی نہیں بتا سکتا۔''

میں نے کہا۔ ''یہ صحافتی قانون کے خلاف ہے۔ کسی صحافی سے اس کا سورس معلوم نہیں کیا جاسکتا۔''

''پھر تو وہ آپ کے لیے اور بھی خطرناک بن جائیں گے۔ زور زبردستی کریں گے۔ آپ کی زبان کھلوانے کے لیے وہ کچھ بھی کرسکتے ہیں۔''

''ایک طرف تو وہ تردید چھپوا کر اسے جھوٹی خبر ثابت کررہے ہیں۔ دوسری طرف یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ یہ خبر مجھے کیسے حاصل ہوئی؟ کیا اس بات سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ سچی خبر ہے؟''

''ہاں انور صاحب! دال میں یقیناً کچھ کالا ہے۔ بس آپ احتیاط برتیے۔''

وہ اپنے دربار میں مجھے بلانے میں کامیاب نہیں ہوئے تو انہوں نے یہ پیش کش کی کہ میں پریس کلب میں ان سے مل لوں۔

میرے بہی خواہوں نے اس ملاقات سے بھی مجھے منع کیا اور کہا۔ ''فی الحال کچھ دنوں تک آپ اسٹوڈیو بھی نہ جائیں یا کسی فلمی تقریب میں بھی شرکت نہ کریں۔ ان کو خوش کرنے کے لیے ان کے خوشامدی آپ کو اغوا بھی کرسکتے ہیں۔ اس لیے آپ کچھ دنوں تک گھر پر ہی رہیں۔''

وہ جو شاعر نے کہا ہے

ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے
یہی قدرت کا کارخانہ ہے

وقت کے ساتھ ساتھ حالات بدلتے رہتے ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد حالات معمول پر آنے لگے۔ ندیم صاحب کی اداکاری جاری رہی۔ ان کی شادی کی خبر ان کی ساکھ پر بھاری ثابت نہیں ہوئی۔ ان کی شہرت بڑھتی رہی۔ ان کی فلموں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ ان کی پہلی فلم ''چکوری'' ڈھاکے میں نمائش کے کچھ دنوں بعد کراچی میں نمائش پذیر ہوئی تو یہاں بھی اس نے دھوم مچا دی۔ پلاٹینم جوبلی کا اعزاز حاصل کر کے ایک تاریخ رقم کی۔

ان تمام باتوں کے بعد ایک نمایاں تبدیلی یہ بھی ہوئی ''چکوری'' کے ہیرو بہترین اداکار کو نگار ایوارڈ بھی مل گیا۔ احتشام اور مستفیض صاحب کی نگار سے جو ناراضگی تھی ختم ہو گئی۔ ان حالات میں وہ لوگ مجھے بھی بھول گئے۔ واضح رہے یہ زیادہ دنوں چھپا نہیں رہا۔ ندیم صاحب کے نارمل ہوتے ہی ان کے مربی بھی اپنی مصروفیات میں گم ہوگئے۔ تو میں بھی اپنی صحافتی ذمہ داریاں کھل کر ادا کرنے لگا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک موقع ایسا آیا کہ محترم الیاس رشیدی صاحب بھی تذبذب کا شکار ہوگئے اور مجھ سے کہنے لگے۔ ''تم نے اچھی طرح تحقیق کر کے شادی کی خبر بھجوائی تھی یا بس سنی سنائی پر ہی بھروسا کرلیا تھا؟''

''الیاس بھائی! اس قدر مصدقہ خبر ہے کہ اسے جھٹلایا ہی نہیں جاسکتا۔''

''مگر اتنی خفیہ شادی کی خبر تمہیں معلوم کیسے ہوئی؟''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''میں انتہائی معذرت کے ساتھ عرض کروں گا کہ اپنے سورس کے بارے میں آپ کو کچھ بتا نہیں سکوں گا۔''

میں نے اس خبر کی سچائی کا یقین دلاتے ہوئے کہا۔ ''اگر یہ خبر جھوٹی ہوتی تو نگار میں اس کی اشاعت کے بعد ندیم صاحب کا اتنا شدید ری ایکشن کیوں ہوتا؟''

اور پھر وہ وقت بھی آ گیا جب ندیم صاحب نے فلم انڈسٹری میں اپنا قدم مضبوطی کے ساتھ جما لیا۔ تو اس شادی کو مزید چھپانے کی ضرورت نہیں رہی۔ وہ دراصل رخصتی تھی جسے باضابطہ شادی کے طور پر رچایا گیا۔ ڈھاکے میں انعقاد پذیر ہونے والی یہ ایک بہت بڑی تقریب تھی۔ شبنم اور روبن گھوش کی شادی کی تقریب کے بعد یہ دوسری بڑی اور اہم شادی تھی مگر افسوس کہ اتنی بڑی تقریب ناقص انتظام کی وجہ سے بدمزگی کا شکار ہوگئی۔ ندیم کے بے شمار پرستار بن بلائے مہمانوں کی حیثیت سے ٹوٹ پڑے۔ اس ہلڑ بازی میں تقریب کا سارا حسن نہس نہس ہوگیا۔

شادی کی اس اعلانیہ تقریب کے بعد ندیم صاحب اپنی شریک حیات کے ساتھ لاہور منتقل ہوگئے۔ فرزانہ جس نے پہلی نظر میں ہی اسے اپنا حقیقی ہیرو بنا لیا تھا۔ اس وقت کس قدر خوش تھی شاد اور آباد تھی اس کا اظہار بہت مشکل ہے۔ اب وہ فرزانہ نہیں ایک سپر اسٹار کی بیوی ہیں تھیں۔

لاہور میں ان کی پہلی فلم ''سنگدل'' تھی جس کے فلم ساز شباب کیرانوی اور ہدایت کار ظفر شباب تھے۔ ان دنوں چاکلیٹی ہیرو وحید مراد اپنے عروج پر تھے۔ ان کا اس وقت معاوضہ دس ہزار تھا لیکن ندیم نے ''سنگدل'' سائن کی تو اس کا معاوضہ پندرہ ہزار لے کر سب کو حیرت زدہ کر دیا۔''

نئے نویلے ہیرو کے زیادہ معاوضہ لینے اور فلم ساز کے دینے پر اس دور کے دوسرے اداکاروں نے بھی اپنے معاوضوں میں اضافہ کر دیا جن میں سرفہرست وحید مراد اور محمد علی تھے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے ندیم صاحب کی فلمیں فتوحات کے ایک سے بڑھ کر ایک میدان مارنے لگیں۔ ان کی ڈیمانڈ اور مانگ میں اضافہ ہوتا گیا اور انہوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنا معاوضہ بھی بڑھانا شروع کر دیا۔

ہمارے ہاں فلم بزنس کا ایک سسٹم یہ بھی رہا ہے کہ مقبول فنکاروں کے نام پر فلم بکتی ہے۔ جس فلم میں جتنا بڑا ہیرو یا جتنی مقبول ہیروئن ہوتی ہے فلم تقسیم کار اس میں اتنی ہی دلچسپی لیتے ہیں اور منہ مانگے دام دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ ندیم صاحب کی زیادہ تر فلمیں زیادہ کامیاب ہوئیں اس لیے ان کی فلمیں تقسیم کاروں کی اولین پسند رہیں۔ اس موقع کا انہوں نے بھی فائدہ اٹھایا اور فلم سازوں سے منہ مانگے معاوضے لیے۔

احتشام صاحب ان دنوں بیٹی داماد کے ساتھ لاہور میں تھے۔ وہ جو کہتے ہیں بیکار مباش کچھ کیا کر تو کیپٹن صاحب نے بھی سوچا بیکار بیٹھنے سے بہتر ہے کوئی فلم ہی بنالی جائے۔

ان کی فلم ''ماٹیر پوتول'' ڈھاکے میں بہت کامیاب ہوئی تھی۔ انہوں نے بیٹی داماد سے مشورہ کیا تو انہوں نے کہا۔ ''ضرور بنائیے۔''

''مگر اس سلسلے میں تم لوگوں کو بھی میرا ساتھ دینا پڑے گا۔''

ندیم صاحب تو سمجھ گئے کہ ساتھ دینے سے ان کی کیا مراد ہے مگر فرزانہ پوچھ بیٹھیں۔ ''ہمیں کس طرح آپ کا ساتھ دینا پڑے گا؟''

''ارے بھئی! میرا مطلب ہے میں ڈائریکٹر۔ تم لوگ پروڈیوسر۔''

''اچھا!'' کہہ کر ان کی بیٹی نے سوالیہ نگاہوں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ جن لوگوں نے ندیم صاحب کو قریب سے دیکھا ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ وہ بڑے بامروت آدمی ہیں جس نے کبھی بھی ان پر کوئی احسان کیا ہے اسے ہمیشہ یاد رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں احتشام صاحب کے احسان کو وہ کیسے فراموش کر سکتے تھے۔ انہوں نے بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں بھئی ہم ان کی فلم پروڈیوس کریں گے۔''

''جیتے رہو۔'' بیٹی کی بجائے باپ نے جواب دیا۔ ''مجھے تم سے یہی اُمید تھی۔''

''ٹھیک ہے آپ پلاننگ کیجیے۔''

احتشام صاحب نے سوچا تو اسی نتیجے پر پہنچے کہ انہیں اپنی حالیہ کامیاب بنگالی فلم ''ماٹیر پوتول'' کو اردو زبان میں بنانے کا خیال آیا۔ انہیں اس لحاظ سے بھی ''ماٹیر پوتول'' کا سبجیکٹ پسند آیا کہ ان دنوں پاکستان میں مزدوروں کے مسائل عروج پر تھے۔ کارخانوں میں آئے دن ہڑتالیں ہوتیں اور جلاؤ گھیراؤ ہوا کرتا تھا۔

''ماٹیر پوتول'' کی کہانی کا موضوع عام اور محنت کش

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

لوگوں سے متعلق تھا۔ انہوں نے بیٹی داماد سے بھی اس سلسلے میں مشورہ کیا۔

''پاپا! آپ کا آئیڈیا زبردست ہے۔'' فرزانہ بولیں۔ ''یہ بہت اچھا موقع ہے۔ اسے فٹافٹ بنا کر ریلیز کردیجیے۔''

اور کیپٹن صاحب نے ماٹیر پوتول کو ''مٹی کے پتلے'' کے نام سے بنانا شروع کردیا لیکن اسی دوران احتشام صاحب کو دل کا دورہ پڑا اور فلم رک گئی۔ انہیں صحت یاب ہونے میں کافی عرصہ لگا۔ اب انہوں نے ''مٹی کے پتلے'' کا بقیہ کام شروع کیا۔ فلم جب مکمل ہوئی تو کافی عرصہ گزر چکا تھا۔ اس وقت تک مزدوروں کے مسائل تقریباً ختم ہو چکے تھے۔ اتنی تاخیر سے یہ فلم ریلیز ہوئی تو اس کا وہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا جسے پیش نظر رکھ کر یہ فلم شروع کی گئی تھی۔ 22 فروری 1974ء کو ''مٹی کے پتلے'' نمائش پذیر ہوئی تو محض 20 ہفتے چل سکی۔ باکس آفس پر بری طرح ناکام ہوگئی۔ لیکن اپنے موضوع اور تھیم کے لحاظ سے یہ ایک قابل قدر فلم تھی۔ پڑھے لکھے اور بائیں بازو کی تحریک سے وابستہ لوگوں نے اس کی بڑی تعریف کی۔ محنت کشوں کے مسائل پر مبنی ہونے کی وجہ سے اسے ''لینن پرائز'' سے بھی نوازا گیا۔ اس فلم میں ندیم کے مقابل نشو نے مرکزی رومانوی کردار ادا کیا تھا۔ دیگر آرٹسٹوں میں فرح جلال، قوی اور منور سعید قابل ذکر تھے۔

''مٹی کے پتلے'' کے بعد ندیم کی ذاتی پروڈکشن ''مکھڑا'' تھی۔ یہ پنجابی فلم تھی اور 1988ء میں بنائی گئی تھی۔ ندیم نے اب تک کسی پنجابی فلم میں کام نہیں کیا تھا۔ پھر انہوں نے خود پنجابی فلم کیسے بنائی؟ یہ بات عام لوگوں کو معلوم نہیں تھی مگر لوگ یہ جاننا چاہتے تھے کہ ندیم صاحب کو تو اردو فلموں ہی کا فنکار سمجھا جاتا تھا پھر انہوں نے نہ صرف پنجابی فلم میں کام کیا بلکہ اسے پروڈیوس بھی کیا۔

اس اہم سوال کا جواب خود ندیم صاحب کی زبانی سنیے۔ انہوں نے اپنے ایک انٹرویو کے درمیان بتایا۔

''مکھڑا'' میں نے اس وقت بنائی جب اردو فلمیں بنتی بالکل بند ہوگئی تھیں اور پنجابی فلموں کا دور تھا۔ میرے پاس پنجابی فلموں میں کام کرنے کی پیش کش آرہی تھیں۔ میں نے سوچا کہ میں پنجابی فلموں میں گنڈاسا نہیں پکڑ سکوں گا۔ چنانچہ کیوں نہ اپنی ذاتی پنجابی فلم بنائی جائے۔ اس لیے میں نے ''مکھڑا'' بنائی جو رومانوی اور مزاحیہ پنجابی فلم تھی۔ اس کے گانے بہت مشہور ہوئے اور مجموعی طور پر لوگوں نے اسے بہت پسند کیا۔''

''مکھڑا'' 2 ستمبر 1988ء میں ریلیز ہوئی۔ اس کے شریک فلم ساز ایم صادق اور ہدایت کار اقبال کشمیری تھے۔ کہانی بشیر نیاز کی اور موسیقی وجاہت عطرے کی تھی۔ ندیم کے ساتھ بابرہ شریف نے ہیروئن کا کردار ادا کیا تھا۔ دیگر آرٹسٹوں میں ثمینہ پیرزادہ، اسماعیل شاہ، ادیب اور طالش شامل تھے۔

''مکھڑا'' کے بعد ندیم نے مزید کوئی پنجابی فلم نہیں بنائی کیونکہ ان دنوں فلم انڈسٹری تیزی سے روبہ زوال تھی۔ البتہ کئی فلم سازوں کے اصرار پر دو پنجابی فلموں میں اداکاری ضرور کی یہ فلمیں تیس مار خان اور گوری دیاں جھانجراں تھیں۔ تیس مار خان ہدایت کار اقبال کشمیری کی فلم تھی جس میں ندیم کے ساتھی فنکار نادرہ، شیم آراء، ساون اور ہمایوں قریشی تھے۔ یہ فلم 10 نومبر 1989ء کو ریلیز ہوئی تھی۔

''گوری دیاں جھانجراں'' ہدایت کار عثمان پیرزادہ کی فلم تھی۔ بابرہ، ستارا، سہیل احمد، عثمان پیرزادہ اور مصطفیٰ قریشی اس فلم کے دیگر آرٹسٹ تھے۔ یہ فلم 19 جنوری 1990ء میں ریلیز ہوئی تھی۔

یہ دونوں فلمیں بھی کاروباری لحاظ سے بہت نرم رہیں۔ ان دنوں حالات ایسے تھے کہ پنجابی فلمیں بھی نہیں چل رہی تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عام لوگوں کے معاشی حالات اچھے نہیں تھے۔ پھر اچھے فلم ساز بھی نہیں تھے۔ جو زندہ تھے وہ فلم انڈسٹری کے حالات دیکھ کر کنارہ کش ہوگئے تھے۔ ان کی جگہ نااہل لوگ فلم انڈسٹری میں آگئے تھے جنہیں فلم سازی کی سوجھ بوجھ بالکل نہیں تھی۔

ان حالات کو دیکھتے ہوئے ندیم صاحب نے سوچا کہ اب لاہور میں رہنا بے سود ہے۔ کیا فائدہ ایسے حالات میں رہ کر اور وہ لاہور سے کراچی آگئے۔ یہ سن 2000ء کی بات ہے کہ ندیم صاحب اپنا بوریا بستر سمیٹ کر لاہور سے کراچی منتقل ہوگئے۔

''جب میں نے دیکھا۔'' یہ روداد خود ندیم صاحب کی زبانی سنیے۔ ''یہاں فلمیں نہیں بن رہی ہیں۔ جو بن رہی ہیں وہ کچھ اس طرح کی ہیں کہ میں ان میں کام نہیں کرسکتا تو میں نے ٹی وی پر آنے کا سوچا۔ کیونکہ ٹی وی فلموں سے بہتر کام ہو رہا تھا۔ ٹی وی کا کام کراچی میں زیادہ ہو رہا تھا اس لیے میں لاہور سے کراچی منتقل ہوگیا۔''

ٹی وی ڈراموں کے بارے میں ندیم صاحب کا کہنا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ہے۔ ''مجھے شروع میں اپنے آپ کو ٹی وی کے ماحول میں ڈھالنے میں مشکلات پیش آئیں لیکن رفتہ رفتہ میں نے اپنے آپ کو اس کا عادی بنالیا۔''

ندیم صاحب جب نذیر بیگ کی حیثیت سے اپنی طالب علمی اور نوجوانی کی زندگی گزار رہے تھے تو بڑے چپ چپ اور خاموش طبیعت کے تھے۔ اس لیے اپنا دکھ درد کسی سے شیئر نہیں کرتے تھے۔ اس زمانے میں وہ جو خواب دیکھ رہے تھے اس کے لیے انہیں بڑے دھکے کھانے پڑ رہے تھے۔ مگر وہ اس کا اظہار کسی سے نہیں کرتے تھے۔ اپنی جدوجہد جاری رکھتے تھے اور بہت سوچ سمجھ کر اپنا لائحہ عمل اختیار کرتے تھے۔ ان کی یہ عادت اس وقت اور پختہ ہوگئی جب اللہ تعالیٰ نے انہیں کسی قابل کیا۔ وہ بہت سوچ سمجھ کر کوئی قدم اٹھاتے تھے۔ بہت محتاط ہو کر کوئی فیصلہ کرتے تھے۔ ان کی اس عادت کا ہی نتیجہ ہے کہ انہوں نے فلم انڈسٹری میں ایک ممتاز مقام حاصل کیا اور وہ جس نے کبھی مجھ سے کہا تھا کہ آپ نے میرے بارے میں کچھ زیادہ ہی لکھ دیا ہے۔ آپ نے میری اس پہلی فلم کے بعد ہی لکھ دیا کہ وہ دن دور نہیں جب یہ نیا ہیرو وحید مراد اور محمد علی کی ٹکر کا ہیرو ہوگا۔ اس نے میری پیش گوئی سے بڑھ کر ترقی کی۔ وحید مراد اور محمد علی کی مقبولیت اور شہرت سے بڑھ کر فلم انڈسٹری میں اپنا مقام بنایا۔

وقت گزرنے کے ساتھ جب حالات میں تبدیلی آئی اور کراچی میں فلمیں بننے لگیں تو ندیم صاحب نے دوبارہ فلموں میں کام کرنا شروع کر دیا مگر اب بھی انہوں نے محتاط رویہ اپنائے رکھا۔ اچھی کہانیوں کے اچھے کردار دیکھ کر ہی فلمیں سائن کیں۔

ندیم صاحب نے اپنے اچھے دنوں میں ایک بھارتی فلم ''دور دیش'' میں بھی کام کیا تھا۔ مگر اس فلم میں جس کردار میں انہیں پیش کیا گیا تھا وہ بہت مختصر تھا۔ اس بات پر یہاں پاکستان میں کچھ لوگوں کو حیرت ہوئی تھی کہ ایک بڑے پاکستانی فنکار ہونے کے باوجود انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ اتنے مختصر کردار کی فلم میں کیوں کام کیا؟ اس کا جواب انہوں نے ایک صحافی کو کچھ اس طرح دیا۔

''اگرچہ یہ ایک مختصر کردار تھا لیکن میرے لیے ایک چیلنجنگ کردار تھا۔ میں نے اس فلم کو سائن کرنے سے پہلے اس کے اسکرپٹ کو بہت غور سے پڑھا تھا اور وہ کردار مجھے اچھا لگا تھا۔ اس میں اداکاری کی گنجائش بہت زیادہ تھی۔ اس فلم کی نمائش کے بعد بھارت میں میرے کردار کو پسند کیا گیا۔ البتہ پاکستانی دوستوں اور پرستاروں نے چونکہ مجھے شروع سے مرکزی کردار میں دیکھا ہے۔ اس لیے انہوں نے اس کردار کی اہمیت کو نہیں سمجھا۔ صرف اس کے مختصر دورانیے کو دیکھا اور اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اپنے فلمی کیریئر میں جو چند اچھے کردار میں نے کیے ہیں ان میں فلم ''دور دیش'' کا یہ مختصر کردار بھی شامل ہے۔''

اس بھارتی فلم کے بعد ندیم صاحب کو مزید انڈین فلموں میں کام کرنے کی دعوت دی گئی مگر یہ وہ وقت تھا جب وہ اپنی پاکستانی فلموں میں بہت زیادہ مصروف تھے اس لیے آفرز انہوں نے قبول نہیں کیں۔ پھر ایک بہت بڑی بھارتی فلم کی دعوت ملی مگر انہوں نے قبول نہیں کی۔ فلم کا اسکرپٹ پڑھنے کے بعد انہیں پتا چلا تھا کہ اس کا موضوع متنازعہ ہے۔ ہندو مسلم کے مسئلے پر اس فلم میں بحث کی گئی تھی۔ اس لیے انہوں نے یہ سوچ کر آفر ٹھکرا دی کہ ان کے پرستار اور چاہنے والے ان کو کسی متنازع فلم میں دیکھ کر خوش نہیں ہوں گے۔ ندیم صاحب کی بے پناہ مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ محض اپنے فائدے اور مفادات کا خیال نہیں رکھتے اپنے چاہنے والوں اور پرستاروں کے جذبات اور احساسات کو بھی اہمیت دیتے ہیں۔ آج اگر انہوں نے اپنے کامیاب کیریئر کے پچاس سال مکمل کر لیے ہیں اور اب بھی ان کی مقبولیت اور شہرت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے تو اس میں ان کی بہت سی قربانیوں کا بھی حصہ ہے۔

ندیم صاحب کے اکثر بیانات اخبارات میں شائع ہوتے ہیں کہ پاکستان میں بھارتی فلموں کی نمائش نہیں ہونی چاہیے مگر پاکستان میں فلم انڈسٹری کی زبوں حالی کا بھی انہیں بخوبی ادراک ہے اور وہ یہ جانتے ہیں کہ سنیما انڈسٹری کی بقا کے لیے فی الحال بھارتی فلموں کی نمائش ضروری بھی ہے۔ وہ دل سے یہ چاہتے ہیں کہ ہماری فلم انڈسٹری اس قابل ہو جائے کہ ہمارے سارے سنیما گھروں کی سال بھر تک ضرورت پوری کرے مگر اس کے لیے جن باتوں کی فی الحال ضرورت ہے ان کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔ وہ کہتے ہیں۔ ''مجھے پاکستانی سنیما پر انڈین فلمیں دکھائے جانے پر کوئی اعتراض نہیں لیکن کیا یہ بہتر نہیں کہ ہم اپنے سنیما پر مشترکہ طور پر بنائی جانے والی فلمیں دکھائیں تاکہ اپنی فلم انڈسٹری کو بھی فائدہ پہنچے۔''

وہ اس سلسلے میں کہتے ہیں۔ ''جب ہم دنیا کے تمام قسم

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کے کاروبار مشترکہ طور پر کر سکتے ہیں تو بھارت سے مشترکہ فلم سازی کیوں نہیں کر سکتے؟ اس سلسلے میں ہمیں کسی قسم کے احساس کمتری کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ ہمارے مقابلے میں بھارت ایک بہت بڑی مارکیٹ ہے لیکن پاکستان میں بھی بہت باصلاحیت لوگ موجود ہیں جو اچھا کام کر سکتے ہیں۔''

ندیم صاحب اپنی موجودہ پاکستانی فلموں کے بارے میں بھی فکرمند رہتے ہیں۔ وہ موجودہ فلموں کے بارے میں کہتے ہیں۔ ''ہمارے ہاں فلمیں بن تو رہی ہیں مگر ان میں وہ بات نہیں جو فلموں میں ہونی چاہیے۔ ماضی میں ہماری فلمیں ''فلم'' ہوتی تھیں مگر اب جب میں سنیما پر فلم دیکھتا ہوں تو لگتا ہے کوئی ایڈیاٹی وی ڈراما دیکھ رہا ہوں۔ فلم کا الگ مزاج ہوتا ہے اور وہ اسی مزاج پر بننا چاہیے مگر یہ خوش آیند بات ہے کہ فلمیں ختم ہو رہی تھیں تو نئے لوگوں نے انہیں نئے سرے سے نئی زندگی دی۔ مجھے یقین ہے کہ آنے والے دنوں میں یہ اور بہتر فلمیں بنانے لگیں گے۔ سیکھتے سیکھتے ہی فلم سازی سیکھ جائیں گے۔ مجھے پچاس سال ہو گئے ہیں۔ اس فیلڈ میں آج بھی میں سیکھ رہا ہوں۔ یہ بڑی بات ہے کہ اس دور میں بھی کچھ لوگ فلم بنانے کی ہمت کر رہے ہیں اور اچھی فلمیں بھی بن رہی ہیں لیکن فلم کو سوچ سمجھ کر بنانا ضروری ہے۔''

ندیم صاحب کی ایک انسانی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ شہرت اور مقبولیت کے اتنے اعلیٰ مقام پر پہنچنے کے باوجود اپنے پرانے دوستوں کو نہیں بھولے ہیں۔ جن کے ساتھ انہوں نے اپنی طالب علمی کا دور گزارا۔ اپنی نوجوانی کا زمانہ بتایا۔ وہ ان دنوں اور ان دوستوں کو یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ''فلم میں آنے سے پہلے میں سندھ مدرسۃ الاسلام میں پڑھتا تھا اس کے بعد اسلامیہ کالج سولجر بازار میں آ گیا۔ اس وقت کے جو دوست تھے ہم فلمیں ان کے ساتھ دیکھتے تھے اور بندو کباب والے کے ریسٹورانٹ میں جا کر کباب کھاتے تھے۔ جب ہم سب ..... کے پاس اتنے پیسے نہیں ہوتے تھے کہ اکیلے وہ سارا بل ادا کرے۔ ہم سب لوگ تھوڑا تھوڑا ملا کر لمیٹڈ انداز میں بل ادا کرتے تھے۔ اس دور کا مزہ ہی الگ تھا۔''

بات اس دور کی چل نکلی ہے تو کچھ مزید باتیں بھی اس دور یا اس کے فوری بعد کی باتیں بھی ہو جائیں۔ ندیم صاحب کی پہلی فلم ''چکوری'' بنی، ڈھاکے اور مشرقی پاکستان کے دوسرے شہروں میں ریلیز ہوئی۔ ان دنوں کی بات ہے کہ جب ''چکوری'' کا فوٹو سیٹ لاہور پہنچا تو انہوں نے مشورے کے لیے یاسین گوریجہ کو طلب کیا۔ انہوں نے فوٹو سیٹ دیکھا تو فیصلہ دیا کہ اوّل تو ندیم ایسا نام ہے جو کسی فلمی ہیرو کے لیے جچتا ہی نہیں۔ دوسرے کوئی بھی ایسی خوبی ہمیں فوٹو سیٹ میں نظر نہ آئی۔ ان دنوں ڈوسانی فلم کارپوریشن کی ہر فلم ڈبہ ہو رہی تھی۔ ''چکوری'' کے لیے انہوں نے کوشش کی کہ کراچی، لاہور میں کوئی فلم تقسیم کار مل جائے تو وہ اس کو فروخت کر دیں لیکن کسی نے ہامی نہ بھری۔ چنانچہ یاسین گوریجہ نے مشورہ دیا کہ اس فلم کے دو پرنٹ بنوا کر پہلے کراچی میں ریلیز کر دیجیے۔ اگر چل گئی تو مزید پرنٹ بن جائیں گے۔ ورنہ یہی پرنٹ لاہور آ جائیں گے۔

19 مئی 1967ء کو یہ فلم کراچی کے پیراڈائز اور بندر روڈ کے لائٹ ہاؤس سنیما میں ریلیز ہوئی۔ یاسین گوریجہ کی رہائش ان دنوں قیصر سنیما کے پاس رحمان کورٹ میں تھی۔ جمعہ کی شب گوریجہ نے یہ بھی گوارا نہ کیا کہ اس فلم کو دیکھ لیا جائے۔ ہفتے کی صبح ابھی وہ بستر پر ہی تھے کہ ایک فلم ساز تقسیم کار آ گئے۔

انہوں نے بتایا۔ ''رات انہوں نے چکوری دیکھی ہے۔'' اور پھر جو انہوں نے اس کی تعریفیں شروع کیں تو وہ حیران رہ گئے۔ وہ دلیپ کمار کے عاشق تھے۔ انہوں نے کہا۔ ''دلیپ کمار کے بعد اگر کوئی ہیرو آیا ہے تو وہ ندیم ہے۔ آج آپ بھی یہ فلم دیکھیں اور جیسے بھی ممکن ہو سکے ندیم کو میری فلم میں سائن کرا دیں۔ میں گارنٹی کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ ندیم پاکستان میں صفِ اول کا ہیرو بنے گا۔''

ہفتے کے روز پیراڈائز سنیما میں اس کا پریس شو تھا۔ گوریجہ نے بھی اس شو میں ''چکوری'' دیکھی۔ ندیم نے ان کی تمام پیشہ وارانہ پیش گوئیاں جھٹلا دی تھیں۔ اس نے واقعی بے حد اچھا کام کیا تھا۔''

''چکوری'' جس دن ریلیز ہوئی تو عام فلم بینوں نے اس کو اتنی اہمیت نہیں دی نئی کاسٹ ہونے کی وجہ سے ریگولر فلم بینوں نے اس فلم کو پسند نہیں کیا مگر اسلامیہ کالج کے ہزاروں ساتھیوں نے ایک ہفتے بعد ہی اس سنیما گھر پر لگی اس فلم کو کامیابی سے ہمکنار کر دیا۔ ''چکوری'' دیکھتے ہی دیکھتے نوجوان دلوں کی دھڑکن بن گئی اور نذیر بیگ ندیم کے روپ میں رومان پرست نوجوانوں کا دوسرا دلیپ کمار بن کر آسمان فلم پر چمکتا چلا گیا اور اس کی پہلی فلم کو عظیم کامیابی نصیب ہوئی۔ ایسی کامیابی جو کبھی اس کے تصور تک میں نہ تھی۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''چکوری'' کی نمائش کے بعد جہاں اس فلم اور اس کے ہیرو ندیم کی تعریف و توصیف کی گئی وہاں کچھ ناقدین اور مبصرین نے اس نئے ہیرو پر یہ الزام بھی لگایا کہ اس نے دلیپ کمار کی نقالی کی ہے۔ میں نے اس سلسلے میں بھی کچھ چھان بین کی کہ یہ بات کہاں تک درست ہے؟ اگر درست ہے تو اس کا ذمہ دار کون ہے؟ اس سلسلے میں اس وقت ایک تحریر کا اقتباس پیش کروں گا جو اس دور کے ایک ہدایت کار شریف امینی نے تحریر کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں۔ ''ایک ٹی وی پروگرام میں انور مقصود نے ندیم سے ازراہ مذاق کہا۔ ''دلیپ کمار اگر نہ ہوتے تو آپ کیا کرتے؟''

انور مقصود نے اس سوال سے یہ بات باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ ندیم کی اداکاری میں دلیپ کمار کی اداکاری کا رنگ ہے۔

جواب میں ندیم نے بڑے خوب صورت پیرائے میں کہا۔ ''دلیپ کمار فن کا سمندر ہے اور میں اس سمندر سے چند قطرے ہی حاصل کر پایا ہوں۔''

یہ ندیم کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ اس نے حقیقت کو تسلیم کیا اور یہ سچ ہے کہ شروع شروع میں ندیم کی اداکاری میں دلیپ کمار کا رنگ نمایاں تھا۔ مگر اس کی ایک خاص وجہ بھی تھی۔ فلم ''چکوری'' ندیم کی پہلی فلم تھی۔ اس فلم کی کامیابی میں ندیم کی اداکاری کے ساتھ ساتھ فلم کی ہدایت کاری اور عکاسی کا بھی بہت دخل تھا۔ اس فلم کے ہدایت کار احتشام اور کیمرا مین اے آر ناصر ان دونوں حضرات کو میں بخوبی جانتا ہوں۔ ان دونوں حضرات کے ذہنوں پر دلیپ کمار بہت زیادہ چھایا ہوا تھا۔ احتشام صاحب کے ساتھ میرا ایک فلم میں ساتھ رہا ہے اور کیمرا مین اے آر ناصر کے ساتھ میں نے کئی فلمیں کی ہیں۔ احتشام صاحب جب بھی کسی اداکار کو کسی فلم کا کوئی سین سمجھاتے ہیں تو بالکل دلیپ کمار کے انداز میں بتاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ندیم چکوری میں کام کر رہے تھے تو دلیپ کمار کی جگہ ندیم کی شکل میں احتشام صاحب کو ایک نیا اداکار مل گیا اور پھر جس نے فوٹو گرافی کرنی تھی وہ بھی دلیپ کمار کا دلدادہ مارا ہوا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ''چکوری'' ریلیز ہونے کے بعد سب لوگوں نے کہا۔ پاکستان کو ایک دلیپ کمار مل گیا ہے۔

''چکوری'' میں ندیم کے وہ Angles جن میں وہ دلیپ کمار سے مشابہ نظر آتا ہے خاص طور پر فلم بند کیے گئے تھے لیکن اس ساری کارروائی میں ندیم کا کوئی قصور نہیں، اسے اس روپ میں پیش کرنے والوں کا ہے۔ جہاں تک ندیم کا تعلق ہے اس نے اپنی ذاتی صلاحیتوں اور اپنی ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے آہستہ آہستہ اپنا خاص انداز اختیار کر لیا اور اپنے آپ پر دلیپ کمار کی چھاپ کے الزام سے اپنے آپ کو بچا لیا۔''

اللہ رب العزت نے ندیم کو حسن کی دولت جس فیاضی سے عطا کی ہے اسی دریا دلی کے ساتھ اسے فنی صلاحیتوں سے بھی مالا مال کیا ہے، ایک شرمیلا شرمیلا سا لڑکا جب اداکار بنا تو اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اداکاری کیسے کی جاتی ہے مگر جب وہ مکمل اداکار بن گیا تو اس نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے فلمی دنیا میں دھوم مچا دی۔ وراسٹائل اداکار کی حیثیت سے ہر طرح کی اداکاری کی۔ بھرپور رومانوی اداکاری بھی کی، کامیڈی میں بھی اپنا لوہا منوایا۔ مشکل ترین اور چیلنجنگ کرداروں میں بھی اپنے آپ کو بہترین فنکار ثابت کیا۔ ان کی فلمیں اگر کراؤن جوبلی (آئینہ)، ڈائمنڈ جوبلی، پلاٹینیم جوبلی، گولڈن جوبلی اور سلور جوبلی کرتی رہیں تو اس میں ان کی اداکاری کا بھی بڑا حصہ شامل رہا۔ بے شک فلم ٹیم ورک سے بنتی ہے مگر وہ ٹیم کا انتخاب بھی بہت چھان پھٹک کر کرتے تھے۔ اچھے فلم میکرز اور اچھے اسکرپٹ پر انہوں نے ہمیشہ خصوصی توجہ دے کر فلم سائن کی۔

اداکار یا اداکارہ اگر اپنی ساکھ کو مستحکم رکھنے کے سلسلے میں خود محتاط ہو تو وقت اور حالات کے تند اور تیز جھونکوں میں بھی اپنے آپ کو محفوظ و معاون رکھنے میں کامیاب رہتا ہے۔ ان کے اس ضمن میں خیالات کا اندازہ ان کے اس اظہاریے سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ ایک بار ایک صحافی نے ان سے کہا۔ ''ماضی کے معروف اور مصروف اداکاران دنوں کسمپرسی کی زندگی گزار رہے ہیں ان کی موجودہ حالت کا قصوروار آپ کسے ٹھہرائیں گے؟''

اس پر ندیم صاحب کا جواب ملاحظہ فرمایئے۔ ''کل اگر اللہ نہ کرے میرے حالات خراب ہو جائیں تو اس کا سب سے پہلا ذمہ دار میں خود ہوں گا۔ اس کا الزام میں حکومت اور فلم انڈسٹری پر عائد نہیں کروں گا۔ فلم انڈسٹری نے مجھے بہت کچھ دیا ہے۔ دوسری طرف ہم حکومت کو ہر کام کا ذمہ دار نہیں ٹھہرا سکتے۔ ہمارے اوپر بھی کچھ ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں۔ حکومت ایک حد تک مدد کرتی ہے۔ ہم پر اگر برا وقت آتا ہے تو وہ ہماری اپنی کوتاہیوں اور کمزوریوں کی وجہ سے آتا ہے۔ نامور اداکاروں کی موجودہ بدحالی کے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اصل ذمہ دار وہ خود ہیں۔ اس میں کسی اور کو قصور وار ٹھہرانا درست نہیں۔"

صحافی نے اس موقع پر ان سے یہ سوال کر دیا۔ "بولی ووڈ کے گوندا پر زوال آیا تو سلمان خان نے انہیں اپنی فلم میں چانس دے کر انہیں سہارا دیا مگر ہمارے یہاں جب وحید مراد پر زوال آیا تو کسی نے بھی ان کا ساتھ نہیں دیا۔ ہمارے یہاں ایسا کیوں ہوتا ہے؟"

ندیم صاحب اس سوال کو سن کر بڑی سنجیدگی سے بولے۔ "زوال سے آپ کی کیا مراد ہے۔ آپ زوال کسے کہتے ہیں؟ وحید مراد اچھا خاصا پڑھا لکھا اور کھاتے پیتے گھرانے کا فرد تھا۔ اس کا اپنا پروڈکشن ہاؤس تھا اگر اس کی فلمیں کم ہو گئی تھیں تو اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ آج اگر میری فلمیں ہٹ نہیں ہو رہی ہیں اور دوسرے ہیروز کی ہو رہی ہیں تو فلم پروڈیوسرز اپنی فلموں میں انہیں زیادہ سائن کریں گے۔ اس میں زوال کی کوئی بات نہیں۔ ماشاء اللہ جو وقت وحید مراد نے گزارا ہے ایسا وقت کسی کے حصے میں نہیں آیا۔ صحیح معنوں میں اگر پاکستان کا کوئی سپر اسٹار تھا تو وہ وحید مراد تھا۔ جس کا ہر اسٹائل نقل کیا جاتا تھا۔ ہاں آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ فلم انڈسٹری کی بے حسی تھی کہ اتنے بڑے اداکار کی اگر چند فلمیں نہیں چل سکیں تو انڈسٹری نے اسے نظرانداز کرنا شروع کر دیا جس کی وجہ سے وہ مایوس اور ڈپریشن کا شکار ہوا۔ فلم انڈسٹری کے وحید کے ساتھ برتاؤ کا مجھے غم تھا، اس لیے میں جب ان سے ملتا تو اس موضوع پر ان سے کوئی بات نہیں کرتا تھا تاکہ انہیں کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ جب وہ مایوسی کی باتیں کرتے تو میں ان سے کہتا۔ "تم فلم انڈسٹری کی پروا کیوں کرتے ہو۔ تم اپنی فلمیں خود بناؤ۔ خود ڈائریکٹ کرو۔ ہم سب مل کر تمہاری فلم میں کام کریں گے۔"

جب وحید مراد کا کار ایکسیڈنٹ ہوا تو وہ اپنے فلمی مستقبل سے مایوس ہو چکے تھے۔ میں ان سے ملاقات کرنے ان کے گھر گیا۔ یہ میری ان سے آخری ملاقات تھی۔ اس ملاقات میں ہم نے ساتھ کھانا کھایا اور ڈھیر ساری باتیں کیں۔ ان کے چہرے اور جسم پر کافی چوٹیں آئی تھیں۔ وحید نے مایوسی سے کہا۔

"دیکھو میرا کیا حال ہوا۔"

میں نے کہا۔ "تمہیں کچھ نہیں ہوا معمولی زخم ہیں۔ چند دنوں میں ٹھیک ہو جاؤ گے اور پھر پلاسٹک سرجری سے سارے نشانات ختم ہو جائیں گے۔"

خواب سراب

عشق کی جنوں خیزیوں میں اٹھنے والے انتہائی قدم کا لرزہ خیز انجام..... آخری صفحات پر ناہید سلطانہ اختر کی سوغات

سیوا سے سنبھا تک

مختلف تاریخی ادوار کے بکھرتے رنگوں کا احاطہ کرتی ایک اور خوبصورت تحریر..... ڈاکٹر ساجد امجد کے قلم کی روانی

باغی

مثبت اور منفی رویوں کے درمیان دلچسپ معرکہ آرائی..... خوبصورت پیار کے رشتوں کے درمیان علم بغاوت بلند کرنے والے رویوں کی انوکھی داستان..... ایک یادگار تحفہ

وقت

وقت کی بھول بھلیوں اور چال چلن کا قصہ..... وہ جو اپنے مرکز سے ہٹ کر ایک نئی دنیا کی تلاش میں چل نکلا ہے..... دیکھیے قسمت اسے کہاں لے جاتی ہے۔ حسام بٹ کے قلم سے خوبصورت داستان

اس کے علاوہ

منظر امام۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید۔ زویا اعجاز۔ تنویر ریاض۔ سلیم انور اور علی اختر کی دلچسپ تحریریں آپ کی منتظر

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

"ان سے اس ملاقات کے بعد میں پاکستان سے باہر چلا گیا۔ کچھ دنوں بعد کسی نے فون پر مجھے ان کی وفات کی خبر دی تو کانوں کو یقین نہ آیا۔ پچھلے سال جب میں ان کی برسی کے اجتماع میں گیا تو مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ ان کو ہم سے بچھڑے پچیس سال ہو گئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے کل کی بات ہے جب ہم سب مل کر فلموں میں کام کیا کرتے تھے۔"

ندیم صاحب کے ان خیالات، جذبات اور احساسات سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ حقیقت پسندانہ سوچ کے حامل ہیں۔ اپنے کیے کا ذمہ دار اور قصور وار دوسروں کو نہیں ٹھہراتے۔ حالات اور حادثات کا جوانمردی کے ساتھ مقابلہ کرنے کے روادار ہیں۔ جو شخص ایسے خیالات کا حامل ہو ظاہر ہے وہ خود بھی ان پر عمل پیرا ہوتا ہے۔ ندیم صاحب نے اپنی فنی زندگی کے پچاس سال مکمل کر لیے ہیں، اس کے باوجود وہ تندرست ہیں اور تندہی کے ساتھ آج بھی ٹی وی ڈراموں اور فلموں میں کام کر رہے ہیں۔ اس کی وجہ صرف اور صرف ان کا بے حد محتاط رویہ ہے۔ وہ ہر طرح کے حالات میں اپنے آپ کو ڈھال لیتے ہیں۔ اپنے فن اور تخلیقی صلاحیتوں پر کسی بھی طرح آنچ آنے نہیں دیتے۔ ان کا فن آج بھی بھرپور طمانیت کے ساتھ زندہ ہے اور ان کی زندگی فنی زندگی اپنانے والوں کے لیے مشعلِ راہ ہے۔

اس موقع پر میں ایک خاص شخصیت کو ٹریبوٹ پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں، جنہوں نے اللہ کے بعد ندیم صاحب کو گولڈن اسٹار بنانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے یہ کوئی اور نہیں فرزانہ بیگم ہیں۔ ندیم صاحب کی شریکِ حیات۔

انہیں میں نے گلستان سنیما (ڈھاکا) میں رنگین اور سنیما اسکوپ فلم "مالا" کی سلور جوبلی تقریب میں ایک شوخ وشنگ لڑکی کے روپ میں دیکھا تھا تو میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ لڑکی آنے والے دنوں میں کوئی اہم، بہت زیادہ اہم کام سرانجام دینے والی ہے۔ اس نے اسٹیج پر ایک خوبرو لڑکے کو گاتے ہوئے دیکھ کر اس کے بارے میں کیا سوچا؟ کیا محسوس کیا؟ یہ تو وہی جانتی ہے یا خدا جانتا ہے۔ میں یا میرے اردگرد بیٹھے ہوئے لوگ تو محض اس کی شوخی اور شرارت سے محظوظ ہو رہے تھے۔ ہمارے تو وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ اس موقع پر اس ہنستی مسکراتی چلبلی سی لڑکی نے اپنی آنکھوں کے راستے اس گلوکار کو اپنے دل میں اتار لیا ہے۔ اس کمسنی کے دور میں یہ اس کی پہلی محبت تھی جو آخری محبت بھی ثابت ہوئی۔

محبت بھی بڑی عجیب شے ہے۔ کبھی بربادی کا سبب بنتی ہے اور کبھی آبادی کا۔ اسٹیج پر پرفارم کرنے والے گلوکار کے فرشتوں کو بھی اس بات کی خبر نہیں ہوئی کہ اسے کسی نے اپنے من مندر میں ایک دیوتا بنا کر بسا لیا ہے۔

"مالا" کی اس سلور جوبلی تقریب کا اس کے بزنس پر کچھ اثر پڑا یا نہیں پڑا۔ اس سے قطع نظر اس کا ایک فائدہ ضرور ہوا کہ ایک لڑکی اس تقریب سے خالی ہاتھ واپس نہیں آئی۔ اپنے دل میں کسی کو بسا کر اپنے ساتھ گھر لے آئی۔

اس محبت نے اسے جتنا تڑپایا، جتنا رلایا، اس کے دل میں یہ چاہت اتنی ہی مستحکم ہوتی گئی اور اس محبوب کو اپنانے اور اسے کچھ بنانے کا عزم وارادہ اور مضبوط ہوتا گیا۔ ارادہ جب مضبوط و مستحکم ہو تو مولا کریم بھی مددگار ہوتا ہے وہ بھی ایک دن اپنے ارادے میں کامیاب وکامران ثابت ہوئی۔ اس لیے اسے گلوکار سے اداکار بنانے میں ہی کلیدی کردار ادا نہیں کیا اپنے جیون کا اوتار بنانے میں کامیاب ہوئی۔ محبت ہو تو ایسی ہو۔

گلوکار نذیر بیگ کو اداکار ندیم بنانے والی فرزانہ بیگم نے ندیم کی بیوی بن کر بھی اس کی بہتری بہبود اور ترقی کے لیے اپنی کوششوں اور کاوشوں کا سلسلہ جاری رکھا۔

اچھی، نیک اور چاہنے والی بیوی اللہ تبارک وتعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہوتی ہے۔ بلاشبہ ندیم صاحب کے لیے ان کی بیگم فرزانہ قدرت کا ایک انمول تحفہ ایک بہت بڑی نعمت ہیں۔ آج ندیم صاحب جو کچھ ہیں، انہوں نے اپنی پچاس سالہ فنی زندگی میں جو فتوحات حاصل کی ہیں اس میں بھی ان کی چاہنے والی بیوی کا بہت اہم کردار ہے۔ انہوں نے ندیم صاحب کو پُرسکون ہو کر اپنی فنی سرگرمیاں جاری رکھنے میں ان کا بھرپور ساتھ دیا ہے۔ کسی طرح سے بھی انہیں ڈسٹرب نہیں کیا، پریشان نہیں کیا۔ ندیم صاحب کے موڈ اور مزاج کے عین مطابق ان کے گھر اور ان کے بچوں کی نگہداشت اور پرورش وبرداخت کی۔

میں اس عظیم خاتون کو سلوٹ پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے ہماری فلم انڈسٹری کو نہ صرف ایک اچھا ٹیلنٹڈ اداکار دیا بلکہ اسے ایک انمول فنی ہیرا بنانے میں بھی کوئی کمی کوئی کسر نہ چھوڑی۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

روزنامہ پیسہ

شکیل صدیقی

جب مسلمانانِ برصغیر غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے اس وقت قلمی جہاد میں مصروف جتنے روشن نام نظر آتے ہیں ان میں سے ایک نام پیسہ اخبار کا بھی ہے۔ لاہور سے شائع ہونے والے اس اخبار پر ایک مختصر سا مگر جامع جائزہ۔

اپنے وقت کے ایک مشہور اخبار پر مختصر سی تحریر

منشی محبوب عالم 1863ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد گوجرانوالہ میں رہتے تھے۔ جنوبی ایشیا کی صحافت میں انہیں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ انہوں نے 1887ء میں روزنامہ "پیسہ اخبار" کی بنیاد رکھی۔ یہ گوجرانوالہ سے شائع ہوتا تھا۔ جسے بعد میں انہوں نے لاہور سے شائع کیا۔ اس اخبار کا نام پیسہ اس لیے رکھا گیا کہ اس کی قیمت ایک پیسہ تھی۔ یہ اخبار سیاست اور سماجیات کا احاطہ کرتا تھا۔ اس میں لوگوں کی دلچسپی کے لیے کہانیاں بھی ہوتی تھیں اور قومی صورتِ حال سے متعلق

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

مضامین بھی۔ یہ قومی معاملات پر کھل کر تبصرہ بھی کرتا تھا۔ لوگوں کی دلچسپی میں اضافہ کرنے کے لیے اس میں ادبی مضامین اور شاعروں کا کلام بھی شائع ہوتا تھا۔

یہ لوگوں میں جلد مقبول ہوگیا اور اس کی اشاعت پانچ ہزار تک پہنچ گئی۔ جب کہ ''اخبار عام'' اس وقت 2700 شائع ہوتا تھا جس کے مدیر پنڈت گوپی ناتھ تھے۔ مولوی محبوب عالم نے صحافت کی تربیت لینے کے لیے 1900ء میں یورپ کا سفر کیا۔ وہ اٹلی، آسٹریلیا، جرمنی، انگلینڈ، فرانس، روم، انگلستان، شام اور مصر کی سیاحت کی۔ واپس آکر انہوں نے سفر کے حالات پہلے پیسہ اخبار میں قسط وار شائع کیے اس کے بعد ''سفرنامہ یورپ'' کتابی صورت میں شائع کیا۔ گورنمنٹ پنجاب نے انہیں اس سفرنامہ پر چار سو روپے کا انعام دیا۔ وہ ایک اچھے مصنف اور مبلغ تھے۔ تقریر کرنے پر آتے تھے تو لفظوں کے دریا بہا دیتے تھے۔

پیسہ اخبار کے بعد انہوں نے خواتین کے لیے ایک ماہنامہ ''شریف بی بی'' شائع کرنا شروع کیا، جو لاہور کے علاوہ دوسرے شہروں میں بھی فروخت ہونے لگا۔ اس وقت خواتین کے لیے کوئی اخبار شائع نہیں ہوتا تھا، اس لیے یہ لوگوں میں بہت مقبول ہوا۔ اس کے بعد انہوں نے 1902ء میں ''بچوں کا اخبار'' شائع کرنا شروع کر دیا، جو ہفت روزہ تھا۔ یہ ہفت روزہ دس برس تک شائع ہوتا رہا۔ اس کی اشاعت ایک ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ منشی محبوب عالم نے 1913ء میں حج کیا اور مکہ شریف سے واپس آنے کے بعد اسلامی انسائیکلوپیڈیا پر کام شروع کر دیا۔ ان کے وسائل محدود تھے، لیکن عزم و حوصلہ پختہ جس کی بنا پر انہوں نے یہ کام بھی پایہ تکمیل تک پہنچا دیا۔

خواتین کے لیے منشی ممتاز علی نے ''تہذیب النساء'' کا اجرا کیا جس کی مدیر ان کی بیوی محمدی بیگم تھیں۔ یہ ماہنامہ اشاعت کے لحاظ سے سب سے آگے نکل گیا اور اس کی اشاعت روز بہ روز مستحکم ہوتی چلی گئی۔

تاریخ کا مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلا اردو اخبار دہلی سے شائع ہوا تھا جس کا نام ''دہلی اردو اخبار'' تھا جو 1836ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ اس کے مدیر مولوی محمد باقر تھے۔ ان اخبارات اور اس کے بعد شائع ہونے والے اخبارات کو اس لیے اہمیت دی گئی کہ حکومت نے اردو کو سرکاری زبان قرار دے دیا تھا۔ یہ سب لیتھو پر چھپتے تھے۔ (پیلا سا کاغذ ہوا کرتا تھا جس پر کاتب سیاہی میں قلم ڈبو کر لکھا کرتے تھے) اردو اخبارات لوگوں میں بے حد مقبول ہوئے حالانکہ فارسی اس وقت زبان زد عام تھی۔ یہ اخبارات اپنے ملک کی ہی نہیں بلکہ افغانستان، ترکی اور فلسطین کے مسلمانوں کی خبریں بھی لگایا کرتے تھے۔ اس زمانے میں خبر رساں ایجنسیوں کا رواج نہیں تھا، چنانچہ اخبارات نے اپنے نمائندے دوسرے ممالک میں مقرر کر رکھے تھے۔ یہ نمائندے خبریں ارسال کیا کرتے تھے جو ڈاک و تار کے ذریعے ہندوستان دو تین دن بعد پہنچا کرتی تھیں۔ مگر اخبارات انہیں شائع کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھتے تھے۔ اس لیے کہ تازہ اور باسی خبروں سے انہیں کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ تو اپنے اخبار کے ذریعے لوگوں کو باخبر رکھنا چاہتے تھے۔ حکومت ان اخبارات کو خریدتی تھی اور اشتہارات بھی دیا کرتی تھی۔

اردو اخبارت دہلی، لاہور، ملتان، گجرات، پشاور، راولپنڈی، لکھنؤ، بمبئی، علی گڈھ اور مدراس سے شائع ہوتے تھے، لیکن دہلی اور لاہور صحافت کی جنم بھومی سمجھے جاتے تھے۔ ان اخبارت کی اشاعت لمبی چوڑی نہیں تھی۔ کوہِ نور جو منشی ہرسکھ رائے شائع کرتے تھے 350 کی تعداد میں روزانہ شائع ہوتا تھا، مگر یہ 54 برس تک شائع ہوتا رہا۔ ایک ہفت روزہ جس کا نام ''سید الاخبار'' تھا، اس کی صرف 27 کاپیاں شائع ہوتی تھیں۔ زیادہ تر اخبارات کی 50 کاپیاں روزانہ شائع ہوتی تھیں۔ جن اخبارات کو انگریز خرید لیا کرتے تھے ان کی اشاعت 200 تک پہنچ جایا کرتی تھی۔

مولوی محمد باقر جنہوں نے دہلی اردو اخبار شائع کیا تھا انہیں انگریزوں نے پھانسی کی سزا دے دی۔ چنانچہ انہیں ہندوستان اردو صحافت کا پہلا شہید کہنا مناسب ہے۔ ہفت روزہ ''سید الاخبار'' کے مدیر جمال الدین کو تین برس کی سزا سنائی گئی۔

1848ء میں ہندوستان کی مختلف زبانوں میں 26 اخبارات شائع ہونے لگے جن میں سے 19 اردو تھے۔ ان میں سے بیشتر انگریزوں کے خلاف تھے، اس لیے ان کے مدیروں ... کو انگریزوں کی پالیسیوں کے خلاف لکھنے پر سزا سنا دی جاتی تھی۔ 1877ء میں ''اودھ پنچ'' سجاد حسین کی ادارت میں شائع ہونا شروع ہوا جو پہلا مزاحیہ اخبار تھا۔ جب کہ خواتین کے لیے پہلا رسالہ ''اخبار النسا'' کے نام سے آیا۔ جس میں کارٹون اور لطیفے بھی شائع ہوتے تھے۔

1903ء میں مولانا ظفر علی خان نے جب ''زمیندار'' اخبار کی ادارت سنبھالی تو اسے انقلابی بنا دیا۔ یہ اخبار لاہور

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

سے شائع ہوتا تھا۔ اس وقت تک نیوز ایجنسیاں قائم ہوچکی تھیں، اس لیے وہ ان سے خبریں لے لیا کرتے تھے۔ اپنے اداریوں اور مضامین کی بنا پر اخبار لوگوں میں مقبول ہوگیا اور اس کی اشاعت 30,000 تک پہنچ گئی۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ انگریزوں کی مخالفت کی بلکہ تحریک پاکستان کی بھی حمایت کی۔ یوں پنجاب کے نوجوانوں کا حلقہ ان کے قریب ہوتا چلا گیا۔

1912ء میں مولانا محمد علی جوہر نے "نقیب ہمدرد" شائع کیا۔ اس کے بعد مولانا ابوالکلام آزادؒ نے ہفت روزہ "الہلال" شائع کیا جس کی دھوم مچ گئی، کیونکہ اس میں سیاست اور مذہب کے موضوع پر مضامین شائع ہوتے تھے جس سے لوگوں کے دلوں میں حریت کی شمع روشن ہوگئی۔ اس ہفت روزہ اخبار کا گیٹ اپ اور ڈیزائن دوسرے اخبارات کے مقابلے میں جدید تھا۔ 1945 میں جواہر لال نہرو نے بھی ایک اخبار شائع کرنا شروع کردیا جس کا نام "قومی آواز" تھا۔ اس اخبار کے اداریے لوگوں کے جذبات میں شعلے بھڑکا دیا کرتے تھے۔

تقسیم کے وقت اردو اخبارات 513 کی تعداد میں شائع ہوتے تھے اور ان کی مجموعی اشاعت ساڑھے سات لاکھ تھی۔ جب کہ تقسیم کے بعد اردو روزناموں کی تعداد 3168 ہوگئی اور ان کی مجموعی اشاعت 1.7 کروڑ تک پہنچ گئی۔ حیدرآباد (دکن) سے شائع ہونے والے اخبار "سیاست" نے 1996ء سے انٹرنیٹ پر اپنی خبریں دینے لگا۔

مولوی محبوب عالم ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ موضع [illegible]، وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد غربت کی وجہ سے انہیں زیادہ تعلیم نہیں دلا سکے۔ بچپن میں ان کے چچا مولوی احمد دین مدرس تھے۔ وہاں انہوں نے پرائمری کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد اپنے دوسرے چچا منشی محمد دین کے پاس چلے گئے جو اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے اور ایک ماہنامہ "کلید امتحان" کے مالک بھی تھے۔ وہاں منشی صاحب نے مڈل کا امتحان دیا۔ اوائل عمری میں منشی صاحب کی طبیعت کھیتی باڑی اور زرعی صنعت وحرفت کی طرف مائل تھی۔ وہ ایک انجمن ترقی زراعت کے سیکرٹری تھے۔ کچھ عرصے بعد اپنے چچا کے ساتھ لاہور چلے گئے۔ وہاں انہوں نے میڈیکل کالج میں داخلہ لیا۔ لیکن اسی اثنا میں ان کے والد مولوی [illegible] کی وفات ہوگئی۔ ان کی اور ان کے بھائی منشی عبدالعزیز کی شادی چھوٹی عمر میں ہوگئی تھی، اس لیے والد صاحب کی وفات کے بعد گھر کا سارا بوجھ اٹھانا پڑا۔ چند ہی ماہ بعد انہیں کالج چھوڑنا پڑا۔ غالباً قدرت انہیں کسی اور طرف لے جانا چاہتی تھی۔

وہ لاہور آگئے اور پرائیویٹ طور پر منشی اور منشی فاضل کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا اور صوبے بھر میں اوّل آئے۔ جس کے اعتراف کے طور پر پنجاب یونیورسٹی نے انہیں ایک سو روپے کے انعام سے نوازا اور اس کے علاوہ پچاس روپے کی کتابیں بھی دیں۔ اس کے علاوہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ انہوں نے عربی اور انگریزی علوم کا اکتساب کیا۔ فارسی علم وادب میں انہیں ایک طرح سے مستند سمجھا جاتا تھا۔ تمام قابل ذکر شعرا کا انتخاب انہیں ازبر تھا۔ منشی محبوب عالم کی تعلیم کے زمانے میں انہوں نے اپنے بھائی منشی عبدالعزیز کو جو بعد میں پیسہ اخبار کے مدیر مقرر ہوئے تحصیل قصور سے اپنے پاس بلا لیا جہاں وہ چھ روپے ماہانہ پر اسکول میں ملازم ہوئے۔

ان کے چچا چونکہ فارغ البال تھے اس لیے انہوں نے رسالہ "کلید امتحان" ان دونوں کے سپرد کر دیا۔ رسالے کا انتظام سنبھالنے کے بعد منشی محبوب عالم نے ایک پریس کھول لیا جس کا نام تعلیم کی مناسبت سے "خادم تعلیم" تھا۔

اس کے بعد انہوں نے اسّی روپے سے کاروبار شروع کیا۔ اس مصروفیت کے باوجود تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ والد کے انتقال کے بعد والدہ اور اپنے چھوٹے بھائی کی دیکھ بھال ان کے لیے ضروری تھی۔ اس لیے مجبوراً وہ ایک سال کے بعد لاہور سے گوجرانوالہ چلے گئے۔

اپنے گاؤں فیروز والہ سے انہوں نے ایک ماہنامہ "زمیندار" جاری کیا۔ پھر ایک ہفت روزہ اخبار "ہمت" شائع کرنا شروع کیا۔ اس کے چند ماہ بعد ایک اور ہفت روزہ "اسکول ماسٹر" جاری کیا۔ مگر چند ماہ بعد انہیں محسوس ہوا کہ عام لوگوں کو سستا اخبار چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے ہمت کو پیسہ اخبار سے بدل دیا۔

پیسہ اخبار ہر ہفتے جمعہ کے روز آٹھ چھوٹے چھوٹے صفحات پر شائع ہوتا تھا۔ اس کا سالانہ چندہ صرف بارہ آنے تھا۔ البتہ ڈاک خرچ کے لیے تیرہ آنے علیحدہ تھے۔ پڑھنے والے کو ایک روپیا نو آنے ادا کرنا پڑتے تھے۔ چونکہ انہوں نے ابتدائی زندگی افلاس میں گزاری، اس لیے اس اخبار کے مدیر، منیجر، کاتب، سنگساز، پروف ریڈر اور کلرک وہ خود تھے۔ چار برس تک انہوں نے بے حد محنت سے کام کیا اور اس کے بعد اخبار اور رسائل کی ایک زنجیر سی بنا ڈالی۔ لاہور کی یاد انہیں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

پھر آنے لگی تو وہ وہاں چلے گئے اور اخبار کو وہاں سے جاری کیا۔ اس کا پہلا ایڈیشن ایک سو کی تعداد میں چھاپا۔ جس کو ان کے بھائی منشی عبدالعزیز اسکولوں میں جا کر خود ایک ایک پیسے میں فروخت کرتے تھے۔

1895ء میں انہوں نے ایک انگریزی اخبار ''وی سن'' جاری کیا، جو لوگوں کی ناقدری کی بنا پر دو سال کے بعد بند کرنا پڑا۔

16 مارچ 1897ء کو ہفتہ وار ایڈیشن کے علاوہ پیسہ اخبار کا روزانہ ایڈیشن بھی جاری کیا۔ مگر چونکہ اس وقت لوگ روزانہ اخبار کی قدر و قیمت سے واقف نہ تھے، اس لیے 2 مئی 1899 کو اس کا روزانہ ایڈیشن بند کرنا پڑا۔

گوجرانوالہ میں کچھ سرمایہ جمع ہو گیا تھا اور پریس کا تجربہ بھی تھا، اس لیے انہوں نے لاہور میں ایک پریس لگا لیا۔ جس میں رفتہ رفتہ کر کے سترہ مشینیں لگا لیں۔ یہ پریس اور دفتر انارکلی سے ملحقہ گلی میں تھا۔ اس کا نام پیسہ اخبار اسٹریٹ سرکاری طور پر رکھا گیا۔ اس گلی میں ایک پوسٹ آفس بھی قائم کیا گیا۔ دونوں چیزیں آج بھی قائم ہیں۔

1900ء میں وہ اخبار نویسی کا مطالعہ کرنے کے لیے یورپ چلے گئے۔ سرسیّد کے بعد یہ دوسرے صحافی تھے جنہوں نے یورپ کے اخباری تجربات سے استفادہ کر کے اخبار نویسی کی بنیاد رکھی۔ ان کی روانگی پر ان کے دوستوں نے ایک شاندار جلسہ کیا تھا جس میں شیخ محمد اقبال علامہ اقبال نے ایک نظم پڑھی تھی۔ یورپ سے جو مضامین وہ پیسہ کے لیے بھیجا کرتے تھے اس سے اخبار میں ایک دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔

وہ جب دسمبر 1900ء میں لاہور آئے تو ریلوے اسٹیشن پر ان کا استقبال انجمن اسلامیہ پنجاب اور انجمن حمایت اسلام لاہور کے اراکین کے علاوہ ہزاروں دوستوں نے کیا۔ انہوں نے یورپ میں نہ صرف صحافت کی تعلیم حاصل کی بلکہ زبانیں بھی سیکھیں۔ انہیں اردو، فارسی، عربی کے علاوہ انگریزی، فرانسیسی، ترکی اور روسی آتی تھی۔ انہیں مطالعے کا بہت شوق تھا، اس لیے ان کے ذاتی کتب خانے میں تقریباً بیس ہزار کتابیں موجود تھیں۔ اس وقت ہندوستان کا کوئی اخبار نویس اتنی زبانیں نہیں جانتا تھا۔

''پیسہ'' لوگوں میں روشناس ہو گیا تو انہوں نے اسے 1904ء میں ایک بار پھر روزنامہ بنا دیا۔ پہلے جب انہوں نے اسے روزنامہ کیا تھا تو اس کا سائز چھوٹا تھا، مگر اب انہوں نے اسے غیر ملکی اخبارات کی طرح بڑے سائز پر شائع کرنا شروع کر دیا۔ یہ انداز لوگوں کو پسند آیا اور وہ لوگوں میں معروف و مقبول ہوتا چلا گیا۔ دیکھا دیکھی اردو کے دوسرے اخبارات بھی اسی سائز پر آنے لگے۔

کتاب ''اخبار نویسوں کے حالات'' نے منشی محبوب عالم کو ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا:

جہاں تک علم ہے یہ بات بلا خوف و تردید کہی جا سکتی ہے کہ اردو اخبارات میں لطیفے، عجائبات، اعداد و شمار، باتصویر حکمت کے موتی، معلومات، نامور لوگوں کے باتصویر حالات اور سیکڑوں قسم کی دلچسپیاں پیدا کرنے والے آپ ہی پہلے شخص ہیں۔

قدرت نے ان کی محنت کا پھل اس طرح سے دیا کہ وہ اپنے ہم عصر ''اخبار عام'' سے بازی لے گیا۔ صحافت کی دنیا میں اس کا چرچا ہو گیا۔ اس میں لطائف، معلومات اور اقتباسات سب ہی کچھ شائع ہوتا تھا۔ چنانچہ اس کا ہفت روزہ ایڈیشن بھی کامیاب ہو گیا۔ بچوں کے لیے TIT BITS کی طرز پر ایک ماہنامہ اور جاری کیا، جو خالصتاً تفریحی تھا۔ اس کا نام ''انتخاب لاجواب'' تھا۔ طلبہ کے لیے ماہنامہ ''کلید امتحان'' دوبارہ شائع کرنا شروع کر دیا۔ زراعت پر ایک ماہنامہ ''باغبان'' بھی جاری کیا۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا رسالہ تھا، اس لیے اس کی بہت سی کاپیاں ڈسٹرکٹ بورڈ خریدتا تھا۔ انہوں نے اپنے اشاعتی ادارے سے تقریباً ایک ہزار کتابیں شائع کیں، جن میں سے پچاس تصانیف خود ان کی تھیں۔

جب ان کا اخبار اپنے عروج پر تھا تو ان کے پریس میں آگ لگ گئی۔ ساری مشینیں برباد ہو گئیں اور کاغذ جل گیا۔ انہیں تقریباً دو لاکھ روپے کا نقصان برداشت کرنا پڑا۔ اس کے بعد حیدر آباد دکن سے ڈھائی ہزار روپے سالانہ کا وظیفہ جاری ہوا جو ان کی موت تک جاری رہا۔

منشی محبوب عالم عالمی ادب سے بھی بخوبی واقف تھے۔ غیر ملکی ادیبوں کی خود نوشت اور سفرناموں میں بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ انہوں نے پیسہ اخبار کے حوالے سے لاکھوں روپے کمائے اور اچھی خاصی جایداد بنالی۔

اردو صحافت کی ترقی میں ''پیسہ اخبار'' سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ''کوہِ نور'' کے بعد یہ پہلا اخبار تھا جہاں مستقبل کے کئی صحافیوں نے تربیت حاصل کی یا اس میں نمایاں کام کیا۔ مثلاً لالہ دینا ناتھ جنہوں نے بعد میں ''ہندوستان'' جاری کیا۔ حکیم غلام نبی جو بعد میں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''الحکما'' کے مدیر ہوئے۔ منشی احمد دین جنہوں نے ''نخوار عالم'' شائع کیا۔ منشی محمد دین فوق جنہوں نے ''فقیری میگزین'' نکالا اور بے شمار اچھی کتابیں لکھیں۔ اور مولوی شجاع اللہ جنہوں نے کچھ عرصہ بعد ''ملت'' جاری کیا۔

ان سب سے جاندار شخصیت میر جالب دہلوی کی تھی، جنہیں بعد میں منشی محبوب عالم نے ''پیسہ'' کا مدیر مقرر کر دیا تھا۔ بقول والد عبدالمجید سالک اس زمانے میں پیسہ اخبار کے اداریے نہایت پُر مغز ہوتے تھے، اس لیے کہ میر صاحب کی معلومات اور ان کا بے نظیر حافظہ سطر سطر میں نظر آتا تھا۔ پیسہ اخبار سے نکل کر میر جالب دہلوی ''ہمدرد'' اور پھر ''ہمدم'' میں کام کرنے لگے۔

پیسہ اخبار کی دوسری خصوصیت اس کی متانت اور سنجیدگی تھی۔ اس پر سرسیّد کی صحافت کا پرتو تھا۔ اس لیے تبصروں میں اسے نمایاں مقام حاصل تھا۔ ''اخبار عام'' یوں تو غیر فرقہ وارانہ اخبار تھا، لیکن کبھی کبھی ہندوؤں کے حق میں لکھ جاتا تھا۔ اس کے مقابلے میں پیسہ اخبار اسلامی طرز فکر رکھتا تھا۔ وہ اسلامی حقوق کا علم بردار تھا۔ اردو کی پرانی روایت کے برعکس اس پر ''اخباریت'' غالب تھی۔ مضامین اور اداریے ان موضوعات پر لکھے جاتے تھے جن کا لوگوں کی زندگی کے مسائل سے تعلق تھا۔ چونکہ تجارتی طور پر اخبار کی قیمت کم تھی، اس لیے لوگوں سے درخواست کی جاتی تھی کہ وہ اس میں اشتہارات دیں۔ بہت سے اخبارات اشتہارات نہ ملنے کی وجہ سے سسک سسک کر دم توڑ گئے، مگر پیسہ اخبار نصف صدی سے زیادہ زندہ رہا۔

اس کی آخری خصوصیت اس کی اشاعت تھی۔ 1890ء میں جب تک یہ ہفت روزہ تھا اس کی اشاعت پانچ ہزار کے قریب تھی جب کہ روزنامہ کی حیثیت سے یہ دو ہزار ہو گیا۔ اس کے باوجود اس کا کوئی ہمعصر اخبار اس تک نہ پہنچ سکا۔ آج صرف پیسہ اخبار محبوب عالم کے عظیم صحافتی کارنامے کی یاد دلاتی ہے۔ طرابلس کی جنگ کے دوران انہوں نے برطانوی حکومت کی حمایت کا دم بھرا۔ اس لیے ہندوستان کے آزادی پسند عوام میں نامقبول ہوتے چلے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے سارے پریس اور اخبار رفتہ رفتہ بند ہو گئے۔ پیسہ 1888ء میں جاری ہوا تھا اور 38 برس بعد 1924ء میں بند ہو گیا۔ اس کے باوجود بھی منشی صاحب نے کتابوں کی نشر و اشاعت کا سلسلہ جاری رکھا اور اردو زبان میں دنیا کے ہر موضوع پر کتابیں پیش کیں۔

وہ ذاتی طور پر با اخلاق تھے اور ان کی طبیعت میں انکسار تھا۔ کسی کو نقصان پہنچانا ان کی فطرت میں شامل نہیں تھا۔ برطانیہ کی حکومت نے قدر و منزلت کی اور 1904 اور 1912ء میں شاہی مہمان کی حیثیت سے مدعو کیا۔

ابتدائی عمر میں ان کی طبیعت موزوں تھی اور وہ شاعری سے بھی شغف رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنا تخلص مسافر رکھا تھا۔ جب اخبار کی مصروفیت میں اضافہ ہو گیا تو شاعری ترک کر دی۔ بہرحال ضرورت کے وقت کچھ کہہ لیا کرتے تھے۔ مثلاً ان کے ایک شکاری دوست نے تلیر شکار کر کے انہیں بھیج دیے۔ انہوں نے شکریے کے طور پر تین اشعار لکھ بھیجے۔

تین تلیر جو آپ نے بھیجا ان سے بندہ ہوا بہت محظوظ
اے شکاری تجھے خدا رکھے جملہ آفات سے سدا محفوظ
چونکہ تلیر تین تھے گنتی میں اس لیے تین شعر ہیں ملفوظ
ان کا انتقال 23 مئی 1933ء میں ہوا۔

اخبار کا ایک اداریہ ملاحظہ فرمایئے جس میں ''البرٹ بل'' کے پاس ہونے کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہ بات انگریزوں کو اس لیے ناپسند تھی کہ اس کی رو سے انگریزوں کو عدالتوں میں پیش ہونا پڑتا تھا۔

لارڈ لٹن صاحب ہندوستان کے انگریزوں کے ساتھ اس امر میں متفق الرائے ہیں کہ البرٹ بل پاس ہونے سے ان انگریزوں کو سخت بے عزتی، بشرم، مصیبت اور بربادی برداشت کرنی پڑے گی، لیکن ہم لوگ ان سے ہاتھ جوڑ کر اور ٹوپی اتار کر اپنے گالوں پر تھپڑ مار کر، اپنا سر پیٹ کر، اپنا گلا پھاڑ کر عرض کرتے ہیں کہ یہ آپ کا سراسر خیال خام ہے، کیونکہ انگریز لوگ کئی مقامات اور علاقہ جات میں ہندوستانیوں کے ماتحت ہیں۔ انگریز لوگوں کے کل دیوانی مقدمات ہندوستانی فیصل کرتے ہیں۔ انگریز لوگ برابر ہندوستانی حاکموں کے اجلاس میں کام پڑنے پر ٹوپی اتار کر جاتے ہیں۔ انگریز لوگ کتنے ہی راجا مہاراجوں کے ہاں نوکر ہیں انگریز کتنے ہی بڑے آدمیوں کے پہرہ دار کوچبان ہیں۔ انگریز لوگ لاکھوں روپے کے ہندوستانیوں کے قرضدار ہیں۔ انگریز لوگ دو آنے میں ہندوستانی لوگوں کو تماشے دکھاتے ہیں۔ ان باتوں میں انگریز لوگ بے عزت نہیں ہوتے۔ وہ بے عزتی فقط عدالت میں ہندوستانی حاکموں کے جسم میں جا چپٹی ہے۔ ہندوستانی کالے جنگلی، دھوکا باز، حاسد سب ہیں اور انگریز گورے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

4 Downloaded from Paksociety.com

سولائزڈ بھیتر باہر سے ایک سے، انصاف کے، ایمان کے، خود خدا کے اوتار سب ہی، لیکن عدالت تو دونوں کے ماننے لائق ہے۔ ہاں اگر انگریز لوگ عدالتوں میں جانے کو ہی بے عزتی سمجھتے ہیں تو ہم انہیں صلاح دیتے ہیں کہ آج سے کبھی ایسا کام مت کرو جو عدالت میں جانا پڑے۔ ہندوستان میں بھی ایسے بھلے آدمی بہت سے ہیں جو مرجانے پر بھی عدالت میں جانا پسند نہیں کریں گے۔ کیا ایسی صاف باطنی اور پاکیزہ مزاجی انگریز لوگوں میں نہیں ہوسکتی؟

(12 مئی 1889ء) انگریزوں نے ہندوستان کو سونے کا انڈا دینے والی مرغی سمجھ رکھا تھا۔ اس نے جو سفارت خانے دوسرے ملکوں میں قائم کر رکھے تھے ان کے اخراجات وہ ہندوستان کے خزانے سے پورے کرتا تھا۔ اس کی مخالفت پہلی فروری 1896ء کے پیسہ کے اداریے میں کی گئی۔ اس نے اپنے ذرائع سے ان اخراجات کی تفصیل معلوم کر کے بھی درج کی۔ اس اداریے کا عنوان تھا۔ ''انگلستان کا خرچ ہندوستان کے سر'' انگلستان کے اکثر اخراجات مکمل طور پر خزانہ انگلستان سے دیے جانا چاہییں۔ یا کم از کم اس کا واجبی ساحصہ ہندوستان سے لے لینا چاہیے۔

لیکن مکمل اخراجات غیر واجبی ہندوستان کے سر بندھے ہوئے ہیں۔

گزشتہ دس برس سے 30 فیصد کے اوسط سے ان میں اضافہ بھی ہوگیا ہے۔ 1882ء میں یہ خرچ مکمل طور پر دو کروڑ انتیس لاکھ گیارہ ہزار روپے تھا۔ لندن میں انڈیا آفس بنا اس کا خرچ تعمیر ہندوستان سے پانچ لاکھ پاؤنڈ لیا گیا۔ جو کلونیل آفس لندن میں بتایا گیا۔ اس کے لیے خزانہ ہند سے ایک لاکھ روپیا اٹھایا گیا۔ (مال مفت دل بے رحم) 2 لاکھ 20 ہزار پاؤنڈ سالانہ مصارف انڈیا آفس لندن ہندوستان سے لے جاتا۔ ہوم گورنمنٹ قیام سفارت خانہ چین کے لیے ساڑھے 12 ہزار پاؤنڈ اور سفارت خانہ ایران کے لیے 7 ہزار پاؤنڈ سالانہ ہندوستان سے لیا جاتا ہے۔ رزیڈنسی عرب، ترکی اور کونسل بغداد کا خرچ ایک لاکھ بہتر ہزار تین سو ساٹھ انگلستان ہندوستان سے دلواتا ہے گویا اسے ان مقامات سے کوئی غرض نہیں۔

انگریز ہندوستان کی فوج کو غیر ممالک بھیجتا تھا، لیکن اس کے اخراجات ہندوستانی خزانے سے ادا کیے جاتے تھے۔ پیسہ اخبار کے 6 جون 1896 کے شمارے میں اس کی مخالفت میں اداریہ لکھا گیا۔ سخت الفاظ میں مذمت کی گئی۔ اس اداریے کا عنوان ایک شعر تھا۔

وہ کون ہے جو مجھ سے تاسف نہیں کرتا
پر میرا جگر دیکھ کہ میں اف نہیں کرتا

قاعدے کی بات ہے کہ مظلوم بے زبان پر بڑے بڑے سنگدل ظالموں کو بھی رحم آجاتا ہے۔ مہمات خارجہ پر ہندوستانی فوج بھیجنا اور مصارف کا بار بھی غریب ہندوستان ہی کے گلے میں باندھنا اتنا بھاری ظلم ہے کہ اخبار ٹائمز لندن جیسا متعصب وطرف دار گورنمنٹ بھی اسے بے اختیار ناانصافی کہہ اٹھا ہے اور ان سختیوں پر ہندوستان کی خاموشی، اور تحمل دیکھ کر اس کا دل بھر آیا۔ 19 مئی کے لندن کے تار برقی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اخبار مذکورہ نے بڑے شدومد سے اس معاملے پر کئی مضامین لکھے ہیں۔

اور جو ہندوستانی افواج افریقا وغیرہ میں مصروف کارزار ہے یا ہونے والی ہے، اس کی تنخواہ وغیرہ کے مصارف کو بھی خزانہ ہندوستان اس کی صریح ناانصافی اور ہندوستان پر ظلم کہا ہے۔ بمبئی پریسیڈنسی ایسوسی ایشن نے سیکرٹری آف اسٹیٹ اور وائسرائے ہند کو تار دیے ہیں کہ مہم سوڈان میں ہندوستانی فوج کے خرچ کا کوئی حصہ ہندوستان پر نہ ڈالا جائے۔ یہ سچ ہے اگر یہ فوج ہندوستان میں رہتی تو اس کی تنخواہیں وغیرہ ہندوستان سے دی جاتیں۔ لیکن جب کہ ہندوستان اس کے وجود سے خالی ہے اور ان کی خدمات سے محروم کیا گیا اور جب کہ ان کی خدمات سے ممالک غیر میں منتقل کر دی گئیں تو ایسی حالت میں ہندوستان سے ان کی تنخواہیں دلانی کیا ناانصافی نہیں ہے؟ اس بحث میں سیکرٹری آف اسٹیٹ نے سابق کی نظیروں پر زیادہ زور دیا ہے۔ لیکن یہ ایک بیہودہ حجت اور عذر بدتر از گناہ ہے۔

انگریزوں نے ذرا سی زمین انعام میں ملنے کے بعد تمام ہندوستان پر قبضہ جمالیا۔ ایسی خطرناک قوم کے بارے میں بعض ریاستوں میں وہاں کے قانون یا رسم ورواج کے مطابق ان کو وہاں زمین خریدنے کا اختیار نہیں تھا، جس کو انگریز حکومت تسلیم بھی کر چکی تھی۔ لیکن طاقت وحکومت کا غرور کام میں آتا ہے۔ وہاں اس کے سامنے سب قانون ومعاہدوں کی اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی۔ چنانچہ وائسرائے ہندوستان نے اس معاہدے کی مٹی پلید کر دی اور حیدرآباد میں انگریزوں کو زمین خریدنے کا اختیار دے دیا۔ جس پر پیسہ اخبار نے 6 جون 1896ء کے اداریے میں اس جبر وستم پر تبصرہ کیا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ہے۔جس کا عنوان ہے:

ہندوستانی ریاستوں کے حقوق میں گورنمنٹ کی مداخلت اب تک ریاست حیدر آباد دکن میں دیگر ریاستوں کے کسی یورپین کو زمین خریدنے یا اس پر کوئی عمارت مثلاً گرجا وغیرہ بنانے کی اجازت نہیں تھی اور یہ قاعدہ قدیم ایام سے چلا آتا تھا۔حال میں مدارس کے کسی پادری نے علاقہ نظام میں زمین خریدنی چاہی اور گورنمنٹ نظام کی ممانعت پر اس نے مدارس کے بشپ سے فریاد کی۔بشپ نے ریذیڈنٹ حیدر آباد کو لکھا اور ریذیڈنٹ مدار المہام ریاست سے کہ پادری کو زمین خریدنے کی اجازت دے دی جائے۔مدار المہام نے وہی عذر خلاف دستور قاعدہ ریاست پیش کر کے اس درخواست کو نامنظور کر دیا۔مسٹر پلاؤڈل ریذیڈنٹ نے گورنمنٹ ہندوستان کو لکھا اور زور دیا کہ یہ قاعدہ منسوخ کیا جائے۔وائسرائے نے کونسل کا اجلاس بلانے کے بعد حکم دیا کہ برٹش گورنمنٹ کو حق حاصل ہے کہ جو حقوق خریدِ زمین تجارت و دیگر جائز کاروبار کے رعایا حیدر آباد کو علاقہ سرکار انگریزی میں حاصل ہیں وہی برٹش رعایا کو علاقہ نظام میں سرکار موصوف سے باصرار دلائے۔عیسائی لوگ خصوصاً پادری جس طرح ریاستوں میں قدم جماتے ہیں اور رفتہ رفتہ اپنی جا و بیجا مداخلتوں کو ہر معاملے میں بڑھاتے ہیں اور چونکہ ریاست کو ان کے مقدمات سننے کا اختیار نہیں ہوتا،لہٰذا یہ لوگ مار آستین بن کر وقتاً فوقتاً کس طرح حیران اور ان کے اختیارات کی توہین کرتے رہتے ہیں۔مسٹر پلاؤڈل جب تک ریذیڈنٹ حیدر آباد دکن ہیں ریاست کی جس قدر حق تلفیاں ہوں اور جتنا اسے ضعف پہنچے تھوڑی ہے۔

انگریزوں نے ہندوستان کے ہر شعبے پر قبضہ جما رکھا تھا اور ہندوستان کی ہر صنعت کو ختم کرنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔اگر ہندوستان کا کپڑا بلا ٹیکس ہندوستان میں فروخت ہوتا تو سستا بکتا۔اس صورت میں غیر ملکی کپڑا یہاں فروخت ہو نہیں سکتا تھا۔انگریز حکومت کو یہ برداشت نہیں تھا۔اس لیے کہ مانچسٹر اور لنکا شائر میں جو کپڑے کی صنعتیں لگ چکی تھیں ان کا مال ہندوستان کی منڈی میں کیسے فروخت ہوتا؟ چنانچہ ہندوستانی کپڑے پر ٹیکس لگا دیا گیا۔جس پر مدیر پیسہ اخبار نے 8 فروری 1896 کی اشاعت میں انگریزوں کی اس شرمناک پالیسی پر نکتہ چینی کی۔جب انگریزی حکومت نے ہندوستانی کپڑے پر ٹیکس لگا دیا تو ہندوستانیوں نے فیصلہ کیا کہ بدیسی کپڑے کا بائیکاٹ کیا جائے اور دیسی کپڑا خریدنے کی درخواست کی جائے۔اس مشورے پر عمل درآمد کرانے کے لیے ملک کے مختلف حصوں میں جلسے ہوئے اپنے دیس کی چیزوں کو خریدنے کے لیے نئے نئے اسٹور کھولے گئے۔اس پر پیسہ اخبار نے ایک مضمون شائع کیا جس میں اس جدوجہد کی تعریف و تائید کی گئی۔عنوان تھا:

دیسی اشیا کے استعمال کی ضرورت باوجود ہندوستان کے کارخانہ داروں کی عام مخالفت اور واجبی شکایت کے محض اہل مانچسٹر کے فائدے کے لیے گورنمنٹ نے پارچہ جات پر ٹیکس کے جدید قانون کو نافذ کر کے ہندوستان میں بددلی اور ناخوشی پھیلا دی۔بمبئی میں جا بجا مجلس منعقد ہو کر گورنمنٹ کی اس ناانصافی پر اظہارِ نفرت کیا جا رہا ہے۔اس وجہ سے لوگ اب زیادہ سرگرم معلوم ہوتے ہیں کہ ولایتی کپڑے کا استعمال ایک دم چھوڑ کر صرف اپنے ہی ملک کا بنا ہوا کپڑا جو مضبوطی اور عمدگی کے لحاظ سے ولایتی کپڑے کی نسبت کہیں سستا ہے، پہنا کریں۔چنانچہ 15 فروری کو اکولہ صوبے برار میں بھی اس غرض کے لیے ایک بڑا اور پُرجوش جلسہ ہوا اور بمبئی کے لوگ بھی اس معاملے میں جوش دکھا رہے ہیں۔اس جلسے میں لوگوں کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ تھی۔ایک پُرجوش قرار داد منظور ہوئی اور جمع حاضرین نے عہد کیا کہ جب تک حکومت پارچہ جات کے ٹیکس کے بارے میں انصاف سے کام نہیں لے گی۔وہ لوگ صرف دیسی کپڑے پہنیں گے۔اور ولایتی کپڑے کو بالکل ہاتھ نہیں لگائیں گے۔بمبئی پریسیڈنسی کے مختلف مقامات میں اس غرض سے انجمنیں کثرت سے بن رہی ہیں کہ سوائے اس پارچہ جات کے جو بمبئی کے کارخانوں میں تیار ہوتا ہے انگریزی کپڑے کو استعمال میں نہ لائیں نہ اس کی تجارت کریں۔لاہور میں بھی ''سودیشی وستو پرچارک'' کے نام سے ایک انجمن قائم ہوئی ہے۔اس نے ایک ماہوار پرچا بھی نکالا ہے۔کچھ شک نہیں کہ اگر لوگ اس عہد پر پورے طور قائم رہ سکیں تو مانچسٹر کے حملے کا دندان شکن جواب ایسی حالت مایوس میں جب کہ گورنمنٹ نہیں سنتی اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے۔حقیقت میں یہ پالیسی گورنمنٹ کی ہے کہ وہ اپنی انگلستان کے نفع کے لیے ہندوستانیوں کے عوام کی ناراضی کی پروا نہیں کرتی۔دور اندیشی سے بعید ہے لیکن ایسے خلاف قانون تدبیر قوانین کے اجرا اور ہندوستانیوں کے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

حقوق کے فروگزاشت ہر نیا معاملہ اپنی ہندوستان کو اتنا فائدہ دیتا ہے کہ ان میں ایک نیا ولولہ پیدا کر دیتا ہے جس سے انہیں یہ یقین ہو جاتا ہے کہ بغیر ایجی ٹیشن کے انہیں کچھ نہیں ملے گا۔

ہندوستان کی ساری چیزوں پر قابض ہونے کے بعد انگریزوں کی خواہش تھی کہ ہندوستان کی ساری آبادی عیسائی ہو جائے۔ اس ضمن میں وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس ملک میں کسی اور مذہب کی تبلیغ کی جائے۔ اگر کوئی ہندوستانی عیسائی ہو جاتا تو مشنری طبقہ جشن مناتا، لیکن اگر کوئی عیسائی مسلمان ہو جاتا یا کوئی دوسرا مذہب اختیار کر لیتا تو اس کے خلاف انتقامی کارروائیاں ہونے لگتیں۔ اس تنگ نظری کے خلاف منشی محبوب عالم نے 15 فروری 1896 کے شمارے میں حسب ذیل مقالہ لکھا۔ جس کا عنوان تھا:

اپنی آنکھوں کا شہتیر نظر نہیں آتا۔

قوم انگریز کو بہت بڑا دعوا اپنے آزاد اور بے تعصب ہونے کا ہے۔ انگریز اپنی سلطنت کو آزادی کا گھر اور اپنی قوم کو انصاف پرور کہنے کے عادی ہیں۔ مسلمانوں پر "ٹالریشن" نہ کرنے کا الزام لگایا جاتا ہے۔ مگر واقعات ثابت کرتے ہیں کہ یہ لوگ خود سب سے بڑے ان ٹالریٹ ہیں۔ کچھ عرصہ گزرا ہندوستان کے محکمہ تار برقی میں ایک یورپین افسر نے اسلام قبول کر کے سراج الدین نام اختیار کر لیا تھا۔ اس قصور پر اس غریب کو اپنی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑے۔ حال ہی میں ایک انگریز پادری نے عیسائی مذہب چھوڑ کر خود اسلام قبول کر لیا اور عبدالمجید نام رکھ لیا۔ اسلام کی شرع کے مطابق دوسری شادی کر لی۔ جو انگلستان کے ایک اعلا خاندان کی لڑکی تھی۔ مسٹر عبدالمجید کی گزشتہ بیس برس سے گورنر سیلون کے اسسٹنٹ کمشنر تھے۔ ان کے مذہب تبدیل کرنے پر گورنر سیلون نے سیکرٹری آف اسٹیٹ سے اجازت حاصل کر کے انہیں ملازمت سے علیحدہ کر دیا۔

ان کی بیس سالہ خدمات کا کوئی لحاظ نہ کیا۔ اس بیچارے کا قصور صرف اتنا تھا کہ اس نے اپنا مذہب تبدیل کر لیا اور دوسری شادی کر لی۔ آج کل برہما میں اکثر انگریز افسران نے ناجائز طور پر برہمی عورتوں کو گھر میں ڈال رکھا ہے، جس کے لیے سال گزشتہ میں صاحب چیف کمشنر نے ایسے افسران کو تنبیہہ بھی کی تھی مگر ان کی ملازمت کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ واقعی گورنمنٹ انگریزی کی تنگ نظری ہزار نفریں کے قابل ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ پیسہ اخبار کے مدیر منشی محبوب عالم کو شعر و شاعری شائع کرنے سے دلچسپی نہیں تھی۔ اس لیے اس میں غزلیں اور نظمیں دکھائی نہیں دیتیں۔ 7 مارچ 1896ء کے شمارے میں مولوی فضل الرحمن گنج مراد آبادی کی وفات پر سات قطعات درج ہیں۔ زیادہ تر فارسی کے ہیں۔

اس زمانے میں اخبارات چھوٹے سائز پر شائع ہوتے تھے۔ اور عام اخبار کے علاوہ ان کی سالانہ قیمتیں سو پچاس روپے سے کم ہوتی تھیں۔ اس وقت کے اخبارات میں عجیب و غریب قسم کے مضامین ہوتے تھے تاکہ لوگ چونک جائیں اور ہمیشہ اخبار خریدتے رہیں۔ گاڑی پر مضمون ہے۔ تلوار اور قلم کا مناظرہ ہے۔ کبھی سردی اور گرمی کا مقابلہ ہو رہا ہے۔ کبھی ریاستوں کی مدح سرائی ہے۔ گویا اخبارات کے کالم پُر کرنے سے غرض تھی۔ گدھے کی دو میں اور بچے کی پانچ آنکھیں۔ آگ کی بارش قسم کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ مگر پیسہ اخبار میں ایسے مضامین شائع ہوتے تھے جو عام افراد کے لیے معلوماتی اور دلچسپ ہوا کرتے تھے۔ ان میں سنسنی خیزی نہیں ہوتی تھی۔ اس کی قیمت بھی کم تھی، اس لیے بچے بوڑھے یکساں پڑھنا پسند کرتے تھے۔

دوسرے اخبارات میں اشتہارات نہیں ہوتے تھے۔ اس لیے نہیں کہ ان کی پالیسی نہیں تھی، بلکہ انہیں اشتہارات نہیں ملتے تھے۔ تجارت پیشہ پیسہ اخبار میں اشتہار دینا پسند کرتے تھے۔

پیسہ اخبار میں اشتہار دینے سے سیکڑوں افراد جنہیں کوئی جانتا تک نہ تھا اپنی اشتہار بازی سے نام پیدا کر لیا اور لاکھوں روپے کما لیے۔ ایڈیٹروں کی ایک بڑی تعداد نے اسی اخبار میں تربیت حاصل کی اور بعد میں کسی اور اخبار کے ایڈیٹر بن گئے۔

پیسہ اخبار اور اس جیسے دوسرے اردو اخبارات کا مکمل ریکارڈ کہیں میسر نہیں ہے البتہ اس کا بیشتر ریکارڈ گوجرانوالہ کی لائبریری میں رکھا ہوا ہے۔

جن کتابوں سے مدد لی گئی

نقوش۔ لاہور نمبر ..... جامع اردو انسائیکلو پیڈیا ..... اسلامی انسائیکلو پیڈیا۔ سیّد قاسم محمود ..... پاکستانیکا۔ سیّد قاسم محمود ..... انسائیکلو پیڈیا فیروز سنز ..... مسلم شخصیات کا انسائیکلو پیڈیا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ازم

منظر امام

جب اس کرۂ ارض پر تہذیب نے انسانوں کی صحیح راہ متعین کی تو وہ لوگ جو خود کو عقل مند بنا کر پیش کرنے والے تھے انہوں نے مزید قوانین متعارف کرنے شروع کردیے ان قوانین کو ''ازم'' کہا گیا۔ یوں تو بے شمار ازم سامنے آئے لیکن ان میں جو زیادہ مشہور ہوئے ان کا ذکرِ خاص۔

ایک مختصر سی دلچسپ تحریر، قصۂ دل پذیر

ازم کیا ہیں۔

جب پڑھے لکھوں یا دانشوروں کی محفل میں بیٹھ جاتے ہیں تو ہمیں مختلف ازم کے ناموں سے واسطہ پڑتا ہے۔ دانش وارانہ اور فلسفیانہ اصطلاحات پر گفتگو ہوا کرتی ہے۔

کوئی موومنٹ، کوئی تحریک کوئی نظریہ، کوئی مکتبہ فکر، یہ سب ازم ہیں۔ مختلف قسم کی تحاریک۔ پوری دنیا میں اس وقت اس قسم کی تحاریک موجود ہیں۔

دانش وروں نے ان پر کتابیں لکھی ہیں۔ گفتگو کی ہے۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

تقریریں کی ہیں۔ان کا پرچار کیا ہے۔پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ اصطلاحیں پوری دنیا میں پھیل گئی ہیں۔

(سیاست سے قطع نظر ہمارے ملک میں بھی ایک ازم کا بہت چرچا رہا ہے اور وہ ہے بھٹوازم۔وہ کیا ہے کیوں ہے؟ اس کی تشریح و تعریف ایک الگ موضوع ہے۔بتانا یہ تھا کہ پاکستان میں بھی ایک سیاسی تحریک بھٹوازم موجود ہے)

میرا خیال ہے کہ ہر قسم کی عام سی تحریک کو جب ماننے والے مل جائیں تو وہ ازم میں تبدیل ہو جاتی ہے۔پھر اس کی تقلید کرنے والے،اس کی راہ پر چلنے والے ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں سامنے آجاتے ہیں۔

ویسے تو ان ازموں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔لیکن ہم اس مضمون میں صرف ان تحاریک کا ذکر کر رہے ہیں جن سے کسی نہ کسی حد تک ہم بھی واقف ہیں اور جو کسی نہ کسی طور پر ہماری سماجی اور ثقافتی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

ہم ان اہم تحاریک کے ناموں سے آگاہی کے ساتھ یہ کوشش کریں گے کہ ان کے حوالے سے کسی نہ کسی حد تک ان کا تعارف بھی کروا سکیں۔اور ان کا پس منظر بھی سامنے لا سکیں۔

Absoluteism کاملیت

آٹوکریسی۔اس سے ملتا جلتا ڈکٹیٹرشپ بھی ہے۔یعنی ایک حکمراں کا تصور۔اور یہ سوچ کہ اگر فیصلوں میں یا حکمرانی کے معاملات میں کسی اور کو شامل کیا گیا تو اس میں خرابیاں پیدا ہو جائیں گی۔

دنیا میں اس طرز حکومت کی تاریخ بہت پرانی ہے۔بادشاہت کو بھی آپ اسی ضمن میں شامل کر سکتے ہیں۔

اس کے بعد وہ لوگ آتے ہیں جن کی حکمرانی موروثی تو نہیں ہوتی لیکن حادثاتی طور پر کسی ملک کے حکمران بن جاتے ہیں۔اس کی تاریخ بھی بہت قدیم ہے۔اور یہ ازم ..... عام طور پر لشکر کے ذریعے آیا کرتی ہے۔

academicism اکیڈمی سی ازم

اس کا یہ تصور ہے کہ کچھ نہیں جانا جا سکتا۔اور کچھ جان لینے کا جو تصور ہے وہ کھوکھلا ہے۔نسب سے پہلے یہ تصور پلوٹو نے پیش کیا تھا۔

اس کا کہنا تھا کہ ہماری بصیرت کمزور ہے۔اور ہماری عقل محدود ہے۔اسی لیے ہم کاملیت کی طرف نہیں جا سکتے۔ بس جو کچھ سامنے ہے وہی سب کچھ ہے۔بعد میں یہ اصطلاح ایک تحریک کی صورت اختیار کر گئی۔آرٹ کے مختلف شعبوں میں اس کا عمل دخل ہو گیا۔

Adamitism بے لباسی

مذہبی وجوہات کی بنا پر بے لباسی۔

بے لباسی کی تاریخ بہت پرانی ہے۔جب انسان کے پاس کپڑے نہیں ہوا کرتے تھے۔جنگلوں میں رہنے والوں اور پتھروں کے عہد کے انسانوں کا تصور کریں۔

پھر انسان نے صدیوں بعد اپنے آپ کو ڈھانپنا شروع کر دیا تھا۔پتوں سے۔درختوں کی چھالوں سے اور جانوروں کی کھالوں سے۔

پھر مذہبی پیشواؤں نے دیوی دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے بے لباسی کا حکم دیا۔مندروں میں داسیوں کو بے لباس کر کے رقص کروایا جاتا۔

ہندوستان میں آج بھی ننگے سادھو ہر جگہ گھومتے پھرتے ہیں اور ان کا بہت احترام بھی کیا جاتا ہے۔ہندوؤں میں اس قسم کے رسومات کی بھرمار ہے۔

پھر اس قسم کے رسومات آرٹ اور فیشن میں بھی داخل ہو گئے۔خاص طور پر مصوری اور مجسمہ سازی میں۔نیوڈ ازم آرٹ کے اظہار کا ایک ذریعہ بن گیا۔دنیا کے بڑے بڑے مصوروں نے اس قسم کے آرٹ میں کمال حاصل کیا ہے۔ امریکا اور یورپ وغیرہ میں تو اس آرٹ کو بہت قیمتی تصور کیا جاتا ہے۔

Adoption ism (گود لینے کی تحریک)

ویسے تو عام معنوں میں اس کا مفہوم کچھ اور ہے۔لیکن خالص تحریک کی صورت میں یہ وہ نظریہ ہے جس کے نزدیک مسیح کو گود لیا گیا تھا وہ خدا کے بیٹے نہیں ہیں (عیسائیوں کی تحریک)

عیسائیت کے نظریہ تثلیث کو سمجھنے کے بعد ہم اس نظریے پر آتے ہیں۔یروشلم کی فتح کے بعد یہ تحریک اپنے پورے عروج پر تھی۔

یہ تحریک عیسائیوں ہی کے ایک چھوٹے سے فرقے نے شروع کی تھی۔اور اس لحاظ سے بڑا حقیقت پسندانہ نظریہ تھا ان کا۔عیسائیوں کا وہ گروہ جو حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا مانتا تھا وہ یقیناً ان کے خلاف ہو گیا ہوگا۔لیکن یہ تحریک آج بھی جاری ہے۔(مخالفتوں کے باوجود)۔

Aesthetic ism (تصورِ جمالیات)

اس تحریک کا مرکزی تصور یہ ہے کہ خوبصورتی ہی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کائنات کا مرکز ہے۔

آرٹ کی یہ تحریک انیسویں صدی میں یورپ سے شروع ہوئی۔ بعد میں یہ تحریک symbol ism وغیرہ کی تحاریک میں شامل ہوگئی۔

اس تصور کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ آرٹ کو سکون دینا چاہیے۔ خوشی دینی چاہیے۔ چاہے وہ کسی بھی شکل میں ہو۔

ایک تصویر بھی خوبصورت ہوسکتی ہے۔ اور کوئی فرنیچر بھی۔ جس چیز کو بھی سلیقے اور خوبصورتی کے ساتھ پیش کردیں وہ آرٹ ہے۔

1882 میں آسکر وائیلڈ نے ایک جگہ گھر کی خوبصورتی پر ایک لیکچر دیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہی لیکچر اس آرٹ کی تحریک کی ابتدا تھی۔

Agonstic ism اگناسٹک ازم

یہ تصور کہ ہم مادے سے باہر کچھ نہیں جان سکتے۔ یعنی جو کچھ بھی ہے وہ اسی مادے میں ہے۔ مادے سے باہر کچھ بھی نہیں ہے۔ لہٰذا اس کے لیے ہمیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

یہ بے دینی اور دینی کے درمیان کی کیفیت ہے۔ نہ تو اقرار ہے اور نہ ہی انکار۔ فلاسفر ولیم رونے اس پر بات کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ دو انتہاؤں کے درمیان کی کیفیت ہے۔

یعنی کسی مذہب کو ماننے والے مجسم اقرار ہوتے ہیں اور ان کا یہ رویہ اتنا شدید ہوتا ہے کہ وہ کسی اور کی دلیل بھی سننے کو تیار نہیں ہوتے۔

جبکہ اس کے برعکس لامذہب ہوتے ہیں۔ اور یہ اپنی جگہ سراسر انکار ہوتے ہیں۔ یہ بھی دلیل سننے کو تیار نہیں ہوتے اور اپنی جگہ یہ بھی انتہا پسند ہوتے ہیں۔

جبکہ اس نظریے اگناسٹک ازم کے ماننے والے درمیانی حالت سے دوچار رہتے ہیں۔

جن فلاسفر نے اس موضوع پر کام کیا ان میں سنجے بیلا کا نام قابلِ ذکر ہے۔ یہ ہندوستانی فلاسفر پانچویں صدی بی سی میں تھا۔

اسی طرح یونان کا مشہور فلاسفر فیثا غورث جو اپنے دور کا بہت بڑا اگناسٹک تھا۔ اس زمانے میں معاشرہ بے شمار دیوی دیوتاؤں کے درمیان ہوا کرتا تھا۔ فیثا غورث نے دیوی دیوتا کے وجود پر شک کیا تھا۔

واضح ہو کہ اس نے مکمل انکار نہیں کیا تھا۔ بلکہ شک کا اظہار کیا تھا۔

اس تحریک کو ملحدانہ تحریک کا نام بھی دیا گیا ہے (مذہبی حلقوں میں)

ہندوؤں کی مقدس کتاب رگ وید میں بھی اس قسم کی تشکیک موجود ہے۔ اس اصطلاح سے ملتی جلتی اور بھی کئی تحاریک ہیں جیسے۔

Monothe ism---Daism __Athe ism __opothe ism . وغیرہ۔

اس قسم کے ازم کے برعکس مذاہب میں خدا کے وجود کا بھرپور اقرار ہے۔ مثال کے طور پر اسلام۔

اللہ۔ خدائے واحد کا مکمل تصور۔ اپنی تمام تر صفات کے ساتھ۔ سورہ اخلاص سے اللہ کے تصور کو سمجھا جاسکتا ہے۔ یعنی وہ ذات جو اپنی تمام تر صفات میں مطلق ہے نہ وہ کسی سے جنی گئی اور نہ ہی اس نے کسی کو جنم دیا۔

یہودیت۔

ان کے یہاں بھی خدائے واحد کا تصور موجود ہے۔ اور وہ بھی اپنی پوری شدت کے ساتھ۔

وہ ایک کامل ذات ہے۔

عیسائیت۔

ان کے یہاں خدا کا تصور تو موجود ہے لیکن اس تصور کو تثلیث کے فلسفے نے آلودہ کردیا ہے۔ The books of facts اور گوسپل میں بھی اس قسم کا تصور موجود ہے۔

ہندوازم۔

ہندو کے یہاں خدا کا تصور بہت پے چیدہ ہے۔ ہزاروں اقسام کے دیوی دیوتا اور ان کا پورا خاندان موجود ہے۔

یہ خدا ایک دوسرے سے الجھتے رہتے ہیں۔ مار پیٹ کرتے ہیں۔ آپس میں شادیاں کرتے ہیں اور بچے پیدا کرتے ہیں۔ ہندوؤں کے خداؤں کو مکمل طور پر سمجھنے کے لیے ایک طویل عمر چاہیے۔ تب بھی شاید یہ گتھی حل نہ ہوسکے۔

بدھ ازم۔

مہاتما بدھ نے ایک بالکل الگ راہ نکالی۔ انہوں نے نہ تو وجود خدا سے انکار کیا اور نہ ہی اقرار۔ بلکہ انہوں نے مراقبہ اور گیان دھیان پر زور دیا ہے۔

Anarch ism (انارک ازم)

انارکی۔ یہ ایک سیاسی نظریہ ہے۔ اس کا مطلب ہے معاشرے میں سیاست اور ریاست کے وجود سے انکار۔

بسا اوقات انارک ازم سے افراتفری اور شورش زدگی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

مراد لی جاتی ہے۔ جو درست نہیں ہے۔

اس نظریے کی رو سے مملکت بذاتِ خود ایک حقیقی، آزاد اور فلاحی معاشرے کے قیام میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اور اس کے ادارے جیسے فوجی حکومتیں اور پارلیمنٹ وغیرہ سامراج کا کردار ادا کرتے ہیں۔

فلسفیانہ مباحث میں یہ تصور نیا نہیں ہے مگر صنعتی انقلاب کے بعد ہابکنس، ٹالسٹائی اور بال گونن وغیرہ نے اس تحریک کو نئی جہت دی ہے۔

آج کے دور میں امریکی مفکر چوم نوسکی اور لاطینی امریکا کی کئی تحریکیں انارکسٹ ہیں۔

Athe ism (لامذہبیت)

ہمارے یہاں اتھی ازم دہریت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

لفظ دہریت اپنے مخصوص معنوں میں اور اسلامی اصطلاحوں میں بھی ایسے معنوں میں استعمال ہوتا ہے جب کوئی خالق کی تخلیق سے انکاری ہو۔

لفظ دہریسکولر ازم کے زیادہ قریب ہے۔ حضرت امام غزالی اور البداوی نے دہریت پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

موجودہ دور میں اب سے پہلے کے بہت سے دانش ور اور مفکر اس ازم کے پیروکار رہے ہیں۔ اس دور میں ایک بڑا نام ژاں پال سارتر کا ہے۔

Dual izm

فلسفے کی اصطلاح جو پہلی بار تھامس ہائیڈ نے اپنی کتاب ''تاریخ مذہب'' میں استعمال کی تھی۔ یہ مابعد الطبیعات کا نظریہ ہے جو بیک وقت دو خود مختار اور ایک دوسرے سے غیر متعلق چیزوں کے وجود کو تسلیم کرتا ہے۔

مثلاً حواس کی دنیا اور ادراک کی دنیا۔ ثنویت (فلاطونیت) سوچ کا مادہ اور خارجی دنیا کا مادہ (ڈیکارٹ) امکانی دنیا اور اصلی دنیا۔ مظہری دنیا اور عنصری دنیا۔ (کانٹ)

ایران کا قدیم ترین مذہب زرتشت بھی (پارسی) بھی دو طاقتوں پر یقین رکھتا ہے۔ خیر کا خدا ''اہورا مزدا'' اور شر کا خدا ''اہرمن''۔

capital ism (سرمایہ داریت یا سرمایہ دارانہ نظام)

یہ ایک معاشی اور معاشرتی نظام ہے جس میں سرمایہ اور عاملِ پیدائشی نجی شعبے کے پاس ہوا کرتا ہے۔

اشتراکی نظام کے برعکس سرمایہ دارانہ کی ترقی معکوس نہیں ہوتی۔ اس نظام کی کئی ایسی خرابیاں ہیں جن پر ہمیشہ گفتگو ہوتی رہی ہے۔

جملہ حقوق، منافع خوری اور نجی ملکیت اس نظام کی وہ خصوصیات ہیں جن کی مدد سے غریبوں کا خون چوسا جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کے مخالفین یہ خیال پیش کرتے ہیں۔ جدید دانش وروں کے مطابق آج یہ نظام اپنے اختتام کی طرف جا رہا ہے۔ اس کی دو واضح وجوہات ہیں۔

نجی ملکیت بغیر حدود و قیود اور مکمل طور پر آزاد منڈی۔ شاید اسی لیے غریب غریب تر اور امیر امیر تر ہوتا جا رہا ہے۔

commonusim (اشتمالیت یا کمیونزم)

یہ ایک انقلابی سماجی تحریک ہے۔ جس کے ذریعے درجہ بندی اور ملک سے بالاتر سماجی نظام کی تشکیل مقصود ہے۔

پیداوار مشترکہ ملکیت ہوتے ہیں۔ (جو یقیناً ایک غیر فطری صورتِ حال ہے)

اشتمالیت، اشتراکیت کی ایک شاخ ہے۔ اس نظام کو ترویج دینے میں جرمن فلاسفر کارل مارکس کا بہت بڑا کردار ہے۔

اس سے پہلے افلاطون نے اپنی کتاب ''ری پبلک'' میں اس نظام کی نشان دہی کی ہے۔ وہ تو یہاں تک کہتا ہے کہ بیوی اور بچے بھی ریاست کی ملکیت ہیں۔ جو حد درجہ غیر فطری ہے۔

De ism (خدا کا اقرار۔ لیکن مذہب سے انکار)

اس تحریک کو ماننے والوں کا یہ کہنا ہے کہ خدا کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے کسی رہنما یا مذہب وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بہتے آبشار یہ چاند، یہ ستارے، یہ سورج کا جلال، یہ پہاڑوں کی بلندیاں، یہ طرح طرح کے پھل اور نعمتیں۔ یہ سب خدا کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔

ہمارے جوش صاحب کا یہ شعر شاید اسی حوالے سے ہے۔ ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوتِ حق کے لیے۔ اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی۔

خدا کی عبادت کے لیے ضروری نہیں کہ مذہب کو بیچ میں لایا جائے۔ ہم اس کے بغیر ہی ٹھیک ہیں۔

یہ فلسفہ سترہویں اور اٹھارویں صدی میں بہت زور پکڑ گیا تھا۔ اس کی تقلید کرنے والے معجزوں وغیرہ پر یقین نہیں رکھتے۔ لیکن ایسا اگر ہو ہی جائے تو وہ اس کو اتفاق قرار دیتے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ہیں۔

برطانیہ میں یہ اصطلاح پہلی بار 1624 میں لارڈ ہربرٹ کی کتاب کے ذریعے سامنے آئی۔

Edol ism

بھوتوں اور روحوں پر یقین رکھنے والے۔

جی ہاں۔ یہ پورا ایک مکتبہ فکر ہے۔ جبکہ ہمارے یہاں اس قسم کی باتوں پر یقین رکھنے کے لیے کسی ازم وغیرہ کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہاں ہر دوسرا شخص اس یقین میں مبتلا ہے۔

(اسی لیے عامل باباؤں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے۔)

اس ازم کے باقاعدہ فلاسفرز ہیں جو اپنے مباحث میں بھوتوں روحوں کے وجود پر دلائل دیا کرتے ہیں۔ یورپ میں ایسی کئی سوسائیٹیز ہیں جو بھوتوں اور روحوں کو بلایا کرتی ہیں۔

Fatal ism

یہ تصور کہ انسان بے بس ہے۔ وہ اپنی تقدیر یا مستقبل پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہوسکتا۔ ہمارے یہاں بھی یہی تصور کیا جاتا ہے کہ انسان مجبور محض ہے۔ قدیم ہندو فلسفے کے مطابق بھی انسان کے ساتھ کرم کا چکر ہے۔

484 بی سی میں ایک فلاسفر گوسالامان نے یہ اصطلاح دی تھی۔ صدیوں بعد فریڈرک نطشے نے اس تصور کو fatal ism کا نام دیا۔

جبکہ ہمارا تصور یہ ہے کہ انسان کو خدا نے اچھائیوں اور برائیوں میں انتخاب کی قوت دے کر دنیا میں بھیجا ہے۔

وہ اپنے کردار اور اعمال سے یا تو اپنی دنیا یا عاقبت خراب کرسکتا ہے یا بہتر کرسکتا ہے۔

Heden ism

یہ تصور کہ خوشی میں سب کچھ ہے۔ اور انسان کو ایسی خوشی حاصل کرتے رہنا چاہیے جس میں دکھ کا کوئی عنصر نہ ہو۔

ہر شخص کو اپنی مرضی کی خوشی حاصل کرنے کا حق حاصل ہے۔ وہ ناچ سکتا ہے۔ گا سکتا ہے۔ محبت کرسکتا ہے۔ کچھ بھی کرسکتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ دوسروں کے حقوق متاثر نہ ہوں۔

یہ نظریہ سب سے پہلے سقراط کے ایک شاگرد Aristippus نے پیش کیا تھا۔

سمیریوں کی تہذیب میں اس نظریے کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ تحریر کے وجود میں آنے کے بعد بابلی تہذیب کے siduri نے اپنی کتاب میں اس نظریے کو عام کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ پیٹ بھر کر کھاؤ۔ رات دن خوبصورت عورتوں کی محبت میں رہو۔ زندگی کو خوشیوں سے بھردو۔ رقص کرو گیت گاؤ کیوں کہ یہی زندگی ہے۔ بابر نے بھی شاید اسی طرف اشارہ کیا تھا ”بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست“

Agnorant ism (لامعرفت)

لغوی طور پر لامعرفت کے معنی لاعلم کے قریب تر ہیں۔ یہ اصطلاح دو الفاظ کا مرکب ہے۔ لا یعنی نہیں اور عارف یعنی جاننا۔

انگریزی میں اس کو اگنورنٹ ازم کہا جاتا ہے۔ پہلی بار 1869ء میں ٹی ہکسلے نے استعمال کیا تھا۔

یہ تحریک کلیسا کی تاریخ عرفانی یا معرفت کی ضد میں شروع ہوئی تھی۔ اس نظریے کے تحت حقیقی یا مطلق علم کا حصول ناممکن ہے۔ اسی لیے تمام علوم و آگہی اضافی ہیں۔ دوسرے

شام

10 جون 2000ء کو شام کے صدر حافظ الاسد انتقال کرگئے، تو ان کے بیٹے بشارالاسد کو صدر کے عہدے پر جب کہ محمود مصطفیٰ امیر کو وزیر اعظم کے عہدے پر نامزد کیا گیا۔ 2000ء میں شام نے 200 میٹر کلو تک مار کرنے والے میزائل کا کامیاب تجربہ کیا، جس پر اسرائیل نے سخت تشویش کا اظہار کیا جس کے جواب میں شام نے امریکا اور اسرائیل کو زیادہ سخت جواب دیا۔ 2001ء میں شام نے سلامتی کونسل کی صدارت سنبھال لی۔

2003ء میں صدر نے محمد نجی الاوتاری کو وزیر اعظم کے عہدے پر فائز کیا جو اسرائیلی دشمنی میں مشہور تھے۔ چنانچہ امریکی ایوان نمائندگان نے 2003ء میں شام کے خلاف پابندیاں عائد کرنے کی منظوری دے دی۔ شام پر دہشت گرد گروپوں سے مبینہ تعلقات کے علاوہ کیمیائی، ایٹمی اور حیاتیاتی ہتھیار حاصل کرنے کی کوشش کے الزامات بھی عائد کیے گئے۔ 2003ء میں شام کے خلاف اقتصادی پابندیوں کے بل پر امریکی صدر نے بھی دستخط کردیے۔ 2004ء میں اسرائیل کے صدر نے شام کے ساتھ غیر مشروط طور پر بات چیت کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا۔ 2004ء میں امریکا نے شام پر اقتصادی پابندیاں عائد کردیں اور اس کے اثاثے منجمد کردیے۔ لیکن شام نے جھکنے سے انکار کردیا۔ بالآخر ملک میں خانہ جنگی کرادی گئی۔

مرسلہ: ندرت اسلم، لاہور

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

معنوں میں خدا کے وجود یا عدم وجود کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ''اس کا انکار بھی جہل ہے اور اقرار بھی جہل۔''

اس مکتبہ فکر کے ماننے والوں میں ہملٹن، ہکسلے، اسپنر اور رسل وغیرہ ہیں۔

Material ism (مادیت پرستی)

اس کے معنی ایسے نظریے کے ہیں جن کی رو سے سوائے مادے کے دنیا میں اور کوئی جوہر موجود نہیں ہے۔ یعنی مادہ پرستی۔

ان کا یہ ماننا ہے کہ ذہنی اور روحانی رجحانات بھی مادے کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ یہ تحریک قدیم چین میں بھی رہی ہے۔

یہ 800 سے 200 بی سی کے دوران کی تحریک رہی ہے۔ ہندوستان میں یہ نظریہ 600 عیسوی میں رائج ہوا تھا۔

(اس سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ علمی اور فکری تحریکیں ایک دو برسوں کی کہانیاں نہیں ہوتیں بلکہ ان کے بیج سینکڑوں سال پہلے پڑ چکے ہوتے ہیں)

موجودہ دور میں رینے اور ڈیکارٹ جیسے فلاسفر اس نظریے کے حامی تھے۔

Monothe ism (توحیدیت)

یہ وہ عقیدہ ہے جس میں ایک خدا کے وجود پر یقین ہوتا ہے۔ اور یہی یقین اسے توحیدی بناتا ہے۔ دنیا کے سارے الہامی مذاہب اسی عقیدے پر قائم ہیں۔ اسلام کا تو یہ بنیادی عنصر ہے۔ مشترکیت اس عقیدے کے برعکس ہے۔

توحیدیت کا نظریہ پہلی بار قدیم مصر میں مودار ہوا۔

چودہ سو سال پہلے مصر کے ایک فرعون اخیتان نے ایک ہی دیوتا آتین کو ماننے پر مجبور کیا تھا۔ کیوں کہ اس زمانے میں مصر میں دیوی دیوتاؤں کی بھرمار ہوا کرتی تھی۔

positive ism

یہ ایک ایسا فلسفہ ہے۔ جس کے تحت صرف واقعی علم کو علم سمجھا جاتا ہے۔ یعنی positive science

ان کے نزدیک صرف وہی علم قابلِ بھروسا ہے جو سائنس کی کسوٹی پر پورا اترے۔ وہی درست ہے۔

یہ اصطلاح کامیو نے 1850 میں وضع کی۔ بعد میں اور بہت سے فلاسفر اس کی حمایت میں آگئے۔

Raci ism (نسلیت یا عصبیت پرستی)

اس تحریک یا جذبے کا ذکر بہت ضروری ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ جذبہ انسان کے اندر ہمیشہ سے موجود ہے۔ اپنے آپ کو دوسروں سے الگ یا برتر سمجھنے کا جنون۔

اور یہی جنون نسلیت میں تبدیل ہو جاتا ہے اور نسلی فسادات کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ اس کی ابتدا اپنے خاندان برادری یا مسلک والوں کی بے جا حمایت سے ہوتی ہے۔ اس طرزِ فکر میں ممکن ہے کچھ اچھائیاں بھی ہوں۔ لیکن بنیادی طور پر یہ ایک منفی طرزِ فکر ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ادب اور آرٹ زندگی کا ترجمان ہوا کرتا ہے۔ اسی لیے فلسفہ وغیرہ سے ہٹ کر ادب اور آرٹ نے بھی کئی قسم کی تحریکوں کو جنم دیا ہے۔ اس قسم کی تحریک کی گنتی بہت طویل ہے۔ یہاں میں دو تین مکتبہ فکر کی بات کروں گا۔

Expression ism

اسے باطن نگاری یا اظہاریت سمجھ لیں۔

مصوری، سنگ تراشی وغیرہ کی وہ صنف جس میں ظاہری رنگ وروپ اور دیگر قدرتی صفات کو معنی خیز طور پر مسخ کردیا جاتا ہے۔ تاکہ ایک خاص منظر کی خارجی حقیقت کو تباہ کیا جاسکے اور اس طرح اس کی صداقت یا جذباتی ماہیت تک رسائی ہوسکے۔

یہ تحریک وسطی یورپ کی ایک مضبوط تحریک رہی ہے۔ اس نے جرمنی اور آسٹریا میں جنم لیا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ اور تحریک ماڈرن ازم اور ہائپر ماڈرن ازم وغیرہ بھی ہیں۔ اس مضمون میں اس قسم کی چند تحاریک کا تعارف کروانے کی کوشش کی ہے۔ ان کا واسطہ عام انسانوں سے نہیں ہوتا۔ بلکہ دانشورانہ مباحث میں ان اصطلاحات سے واسطہ پڑتا ہے۔

چند مکتبہ فکر کا یہ ایک اجمالی سا جائزہ تھا۔ ویسے دنیا بھر میں اس قسم کے بے شمار مکتبہ ہائے فکر ہیں۔ اور اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ انسان نے ابھی سوچنا ترک نہیں کیا۔

وہ زندگی کائنات، ہونے نہ ہونے اور خدا کے وجود اور عدم وجود کے بارے میں سوچتا رہتا ہے اور طرح طرح کے سوالات اٹھاتا ہے۔ یہی سوالات اس کے زندہ ہونے کی نشان دہی کرتے ہیں۔

''میں سوچتا ہوں اس لیے میں ہوں۔'' یہ ہے انسان۔ اگر وہ سوچنا بند کردے تو اس میں اور دیگر جانداروں میں کیا فرق رہ جائے کچھ بھی نہیں۔

اُمید ہے کہ اس قسم کے مضامین ذہن کے دریچے کو کسی حد تک کھولنے میں کامیاب رہیں گے۔

لہٰذا سوچیں اور سوچتے رہیں۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

90 کی دہائی میں میرے ایک دوست، جن کا تعلق پاکستان کسٹمز سے ہے، جنہیں تاریخی چیزیں اور کھنڈر دیکھنے کا بہت شوق تھا، کہنے لگے کہ ''لہانی بندر'' چلنے کا پروگرام بنالو۔ پوچھا کہ یہاں کیا ہے؟ تو جواب دیا کہ یہاں کچھ قریب ایک بستی کے آثار بہت اچھی حالت میں ہیں اور سنا ہے کہ کچھ مکان اوندھے بھی ہیں؛ جن کا ذکر ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں کیا ہے۔ پروگرام تو بنا نہیں لیکن تاریخ کا طالب علم ہونے کے ناتے میرے اندر شوق اور تجسس نے سر اٹھایا، ابن بطوطہ کی کتاب کی تلاش شروع ہوئی اور بالآخر کراچی کے اردو بازار میں رئیس احمد جعفری صاحب کا اردو ترجمہ مل گیا۔

تقریباً 683 سال پہلے ابن بطوطہ برصغیر پاک و ہند سیاحت کے لیے آیا تھا۔ اس کی آمد 12 ستمبر 1333 عیسوی بنتی ہے۔ سفر کے دوران وہ یادداشتیں مرتب کرتا رہا۔ جب 25 سال بعد وطن واپس پہنچا تو گوشہء عافیت میں بیٹھ کر ان کی مدد سے اپنا سفرنامہ لکھا۔ اس دلچسپ سیاحت کے عربی زبان سے فارسی اور پھر اردو میں کئی تراجم ہوئے۔ جناب رئیس احمد

اوندھی بستی

شاھد لطیف

کئی سو سال قبل ابن بطوطہ نے اس ارضِ پاک کی سیاحت کی تھی۔ اس نے اپنے سفر نامے میں ایک اوندھی بستی کا ذکر کیا تھا۔ وہ بستی اب پاکستان کا حصہ ہے۔ لیکن ہم میں سے لاتعداد لوگ اس قہرزدہ بستی سے واقف نہیں۔

اس بستی کا احوال جو آج بھی اوندھی پڑی ہے!

Downloaded from Paksociety.com

جعفری صاحب کے سفرنامہ ابن بطوطہ کے ترجمے میں ایک الٹی (اوندھی) بستی کا ذکر ہے جس میں ابن بطوطہ نے بعض مکانات اوندھے دیکھے تھے گویا کسی طاقتور ہاتھ نے انہیں اٹھا کر الٹا کر دیا ہو۔

ابن بطوطہ لکھتا ہے ''پانچویں دن ہم 'لاہری' پہنچے۔ یہ خوبصورت شہر سمندر کے کنارے واقع ہے۔ قریب ہی دریائے سندھ، سمندر میں گرتا ہے۔ شہر سے سات کوس کے فاصلے پر ایک میدان ہے جس کو 'تارنا' کہتے ہیں۔ وہاں جا بجائے شمار آدمیوں اور حیوانات کی پتھر کی بنی مورتیاں، ثابت اور ٹوٹی پھوٹی نظر آتی ہیں۔ غلّہ، گیہوں، چنا اور مسری وغیرہ پتھرائے ہوئے پڑے ہیں۔ کھنڈر میں پتھر کا بنا ہوا ایک گھر ہے، جس کے وسط میں ایک ہی طویل پتھر کا بنا ہوا چبوترہ ہے۔ ایک جگہ نہایت بدبودار پانی کھڑا ہوا تھا۔ دیواروں پر سنسکرت زبان کے کتبے نظر آئے۔ مقامی لوگ اور یہاں کے مؤرخ خیال کرتے ہیں کہ یہ شہر مسخ ہو گیا تھا۔ چبوترے پر بادشاہ کا بت ہے۔ چنانچہ اب بھی اس کو راجا کا محل کہتے ہیں۔ یہاں کی دیوار کے کتبے سے پتا لگتا ہے کہ یہ بربادی، میرے یہاں آنے سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے ہوئی تھی۔''

آج کا 'لہاری بندر' جس کا طول بلد اور عرض بلد 29°11'N, 68°13'E ہے، غالباً کل کا لاہری بندر تھا جس کے قریب دریائے سندھ، طاس (ڈیلٹا) کی صورت سمندر میں گرتا ہے۔ یہاں پر آج بھی یہ کھنڈر اچھی حالت میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ سفرنامہ پڑھنے کے بعد دل میں آیا کہ کیوں نہ ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا جائے۔ اس سلسلے میں سوچا کہ سرکاری سروے کرنے والے اداروں سے رابطہ کیا جائے۔ سب سے پہلے راقم 'کے ڈی اے' کے ایک افسر کے پاس گیا۔ وہ بولے کہ بالکل ایسی بستی موجود ہے اور انہوں نے خود اس مقام کا سروے بھی کیا ہے۔

اس بات نے مجھے تقویت دی اور اپنے چند ہم خیال دوستوں کے ساتھ شہید ملّت روڈ اور شاہراہ فیصل کے سنگم سے کچھ پہلے واقع، محکمہ آثار قدیمہ کے مرکزی دفتر گیا۔ ہمارے ملک کی سڑکوں یعنی شاہراہوں کو کہیں فارسی میں شاہراہ اور کہیں عربی میں شارع لکھا جاتا ہے جو ایک الجھن کا باعث ہے۔ بہر حال، راقم نے جناب رئیس احمد جعفری صاحب کے 'سفرنامہ ابن بطوطہ' کے اردو ترجمہ کے متعلقہ صفحات کی فوٹو کاپی، شعبہ کے ذمہ دار افراد کو دکھلائی جن میں 'لہری بندر' کا ذکر تھا۔ وہ اس جگہ کو جانتے تھے۔ راقم نے تجویز پیش کی کہ اگر ان کے محکمہ کا کوئی ذمہ دار فرد ساتھ چلے اور اس تاریخی مقام کے پس منظر میں چند جملے قلم بند کروا دے تو اس کام کو سرکاری سند حاصل ہو جائے گی۔ تو جواب ملا۔ ''یہاں تو موہنجوداڑو کے لیے فنڈ مشکلوں سے حاصل ہوتے ہیں۔ یہ لہری بندر' ہماری ترجیحات میں ہے ہی نہیں۔ آپ ہماری جیپ کو قابل استعمال کروا کر اس میں تیل پانی ڈلوا دیں تو پھر ہمیں وہاں جانے میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔'' اس جواب نے ہمیں لاجواب کر دیا۔

انہی دنوں اتفاق سے کراچی ائرپورٹ کے کلثوم بائی ولیکا اسکول کے ہم جماعت اور پرانے محلہ دار سے ملاقات ہوئی جو اس وقت پاک فوج میں لیفٹیننٹ کرنل تھے۔ باتوں باتوں میں سفرنامہ ابن بطوطہ اور لاہری بندر کا ذکر ہوا۔ وہ بھی یہ کھنڈر اور اوندھی بستی دیکھنے کے لیے بہت پُرجوش ہو گئے۔ راقم نے ان کو رئیس صاحب کے ترجمے کی فوٹو کاپی دی جس سے اس مقام تک رسائی میں مدد مل سکتی تھی۔ اس خاکسار کی قسمت اچھی تھی کہ وہ اس وقت آرمی ایویشن سے بھی تعلق رکھتے تھے۔ یہ حضرت میری طرح، اس قسم کی جگہوں پر جانے کے شوقین تھے۔ فرمانے لگے کہ جلد وہاں جانے کی کوشش کریں گے۔

کرنل صاحب نے اگلی ہی شام یہ خوش کن خبر سنائی کہ وہ ہیلی کاپٹر سے مطلوبہ مقام دیکھ آئے ہیں۔ نیز یہ کہ جیسا رئیس صاحب نے ترجمہ میں بیان کیا تھا، انہوں نے اس بستی اور کھنڈرات کو ویسا ہی پایا۔

اس اوندھی بستی اور کھنڈر کے مقام اور وجود کی تحقیق صحیح سمت میں اور صحیح رفتار سے ہو رہی تھی۔ اس تاریخی مقام کا وجود ثابت ہو گیا، اب خود دیکھنا باقی رہ گیا تھا۔

☆☆☆

شوق کو مہمیز ملی اور راقم نے اپنے ذہن کو چاروں جانب دوڑانا شروع کیا۔ سوچ بچار کے بعد ایک صاحب کا خیال آیا جو اس وقت پاکستان کسٹمز کے شعبہ اینٹی اسمگلنگ آرگنائزیشن میں تھے۔ یہ صاحب بھی دور دراز تاریخی کھنڈر دریافت کرنے کے شوقین تھے۔ راقم نے ان سے لاہری بندر/لہاری بندر کا ذکر کیا۔ انہوں نے مختلف افراد سے اس مقام پر جانے کی صورت دریافت کی۔ معلوم ہوا کہ مختصر راستہ تو زمینی ہے مگر اس میں خطرات کچھ زیادہ ہیں۔ سب سے بڑا مسئلہ تو دلدلیں ہیں۔ اگر کسی مقامی جانور، جیسے گدھا یا گائے کی دم پکڑ کر اس کو زبردستی دلدل میں لے جائیں تو وہ آپ کو بحفاظت دلدل

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

میں سے نکال کر ان کھنڈرات تک لے جائے گا۔ شاید قدرت نے اس علاقے کے چوپایوں میں ان کی حفاظت کے لیے یہ جبلّت رکھی ہو۔

دوسرا اور زیادہ بہتر ذریعہ سمندری سفر تھا، جو کسی قریبی بستی سے بادبانی کشتی کے ذریعے بہ آسانی طے کیا جا سکتا تھا۔ ان کھنڈر کے تین طرف دلدل اور سامنے کی جانب سمندر تھا۔ پانی کی گہرائی اکثر جگہوں پر کافی کم تھی لہٰذا بڑی یا چھوٹی لانچ کا وہاں لے جانا مناسب نہیں تھا۔ اسی لیے بادبانی کشتی کا مشورہ دیا گیا۔

لہائی یا لہری بندر کبھی ایک بڑا تجارتی مرکز ہوا کرتا تھا مگر زمانے کے سرد و گرم نے آج کل اسے گمنام کر دیا۔ اب ان کھنڈرات تک، سمندری کھاڑی کے راستے جایا جاتا ہے۔ سمندر کے خشکی میں اندر تک جانے کے آبی راستے کو کھاڑی کہتے ہیں۔ کئی تنگ اور چھوٹی بڑی کھاڑیوں سے گزر کر اچانک نظروں کے سامنے یہ کھنڈرات آ گئے۔ پہلی نظر میں ایسا لگا جیسے کہ کسی تاریخی فلم کا سیٹ لگایا گیا ہو کیوں کہ ان کھنڈرات میں مٹی اور دھول کا نام و نشان نہیں تھا۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہو گی کہ تین اطراف میں دلدل اور کیچڑ ہے اور سامنے سمندر اور اس کی کھاڑیاں۔ لہٰذا لاکھ ہوا چلے، مٹی تو دور دور تک ہے ہی نہیں۔ بالکل صاف ستھرے کھنڈرات، جب ہی تو فلمی سیٹ کا گمان ہوا تھا۔ دوسرا سبب قریبی بستیوں میں نسل در نسل چلی آنے والی پُراسرار داستانیں اور لوگوں کی توہم پرستی بھی ہو سکتی ہے۔ دور نزدیک کی بستیوں والے ادھر کا رخ کرتے ہی نہیں تھے۔ اسی لیے اتنے قیمتی تاریخی خزائن اب تک قریباً اسی حالت میں ہیں جیسے ابن بطوطہ نے دیکھے۔

دیکھنے والوں کو یوں لگتا ہے گویا ایک چھوٹے سے مخصوص علاقے میں کوئی قدرتی آفت آئی اور ویرانیاں پھیر گئی۔ ممکن ہے بستی کا ایک خاصا بڑا حصہ اب بھی دلدلی زمین کے نیچے ہو۔ یا سمندر برد ہو گیا ہو۔ ممکن ہے وہ کوئی ہلکا پھلکا زلزلہ ہو..... حقیقت کچھ بھی ہو لیکن ایک بات طے ہے کہ یہاں ایک مجموعی ہیبت طاری تھی۔

کرنل صاحب کا کہنا تھا کہ جب انہوں نے اور ان کے ساتھی نے ہیلی کاپٹر سے یہ کھنڈر دیکھے تو وہ ششدر رہ گئے۔ اتنی اچھی حالت اور صاف ستھرے!! آپ پاکستان کے کسی بھی آثار قدیمہ میں چلے جائیے، وہ آثار سے زیادہ اشتہار گاہ لگتے ہیں، ہر طرف پینٹروں کے لکھے ہوئے اشتہارات، وال چاکنگ، جیتنے اور ہارنے والے دونوں امیدواروں کے نہ

کیمائس (Chamois)

ہرن کی طرح کا ایک جانور۔ مشرقی یورپ اور مغربی ایشیا میں پایا جاتا ہے۔ قد میں بکری کے برابر لیکن پھرتیلا اس قدر کہ مشکل سے قابو میں آتا ہے۔ بیشتر پہاڑوں میں رہتا ہے اور چھوٹی چھوٹی گھاٹیوں کو آسانی سے پھلانگ جاتا ہے۔ اس کا گوشت لذیذ ہوتا ہے اور اس کی کھال سے کیمائس چمڑا بنتا ہے۔ جس سے دھاتی چیزوں کو پالش کر کے چمکایا جاتا ہے۔ نر اور مادہ اکتوبر اور نومبر میں اختلاط کرتے ہیں اور مئی اور جون میں بچے پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک دن کے بعد ہی بچے اپنی ماں کے پیچھے دوڑنے لگتے ہیں۔ اس عجیب جانور کی عمر طبعی 20، 25 برس ہوتی ہے چونکہ اس کے گوشت اور چمڑے کی مانگ زیادہ ہے۔ اس لیے اس کے شکار پر پابندیاں لگائی گئی ہیں تاکہ کہیں معدوم نہ ہو جائے۔ شمالی ایران اور روس کا کیمائس عمدہ قسم کا ہوتا ہے۔

مرسلہ: حسین فرجاد، لاہور

جانے کن کن انتخابات کے فلیکس، جا بجا ان کا اور اپنا نوحہ پڑھتے نظر آئیں گے۔

لہری بندر کے کھنڈر ایک تو عوام کی دسترس سے دور ہیں، دوسرے تو ہم پرستی کہ 'وہاں کوئی نہ جائے، جو وہاں جاتا ہے مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے' نے بہت حد تک اس مقام کو محفوظ رکھا ہوا ہے۔ تیسرے وہاں پہنچنا قطعاً کوئی آسان کام نہیں۔

ان آثار میں سب سے عمدہ اور دلچسپ چیز پتھر پایا ہوا (فوسل) غلّہ ہے؛ جیسے گیہوں، چنا اور شاید کسی قسم کی کوئی دال وغیرہ۔ یہ ایک چبوترے پر بکھرا ہوا ہے۔ چبوترے کے ساتھ ہی ایک پتھر کا بنا ہوا اوندھا مکان ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کسی زبردست قوت نے پکڑ کر اوندھا کر دیا ہو۔ یہ اوندھا پن بالکل صاف محسوس ہوتا ہے۔ قرب و جوار میں کچھ مورتیاں بھی سر کے بل ہیں۔ تھوڑی سی محنت سے ایک سنگی کتبے پر قدیم

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

سنسکرت کی تحریر بھی مل گئی۔ شاید اسی کو دیکھ کر ابن بطوطہ نے بستی کی قدامت کا اندازہ لگایا تھا۔ کم از کم اس خاکسار کو ایسا لگا جیسے میں قبل ابن بطوطہ کی آنکھ سے ہی یہ سب دیکھ رہا ہوں۔

☆☆☆

ایک تو ویسے ہی کھاڑیوں میں سمندر کا پانی آتا جاتا رہتا ہے جس کی وجہ سے کبھی کبھی وہاں صرف کیچڑ ہی رہ جاتا ہے، دوسرے موسم کی اونچ نیچ سے دلدلی پانی اور خود دلدل بھی خشک ہونے لگتی ہے ایسے میں تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں اور محققوں کو ایسی جگہوں سے گئی تہذیبوں کے روزمرہ استعمال کی اشیاء مل جایا کرتی ہیں جو آج کے نوادر ہوتے ہیں۔

راقم کے دوست، جن کا تعلق پاکستان کسٹمز سے تھا، ان کو پتا نہیں کیوں اس بات کا یقین تھا کہ ہم لوگ اگر کچھ محنت کریں اور کچھ روز ادھر ہی رہیں تو ہمیں بھی پرانے زمانے کی اشیاء مل سکتی ہیں۔ ان کے پاس اپنی بات کو پُر اثر بنانے کو صرف ایک ہی دلیل تھی کہ کھاڑی میں پانی اترا ہوا ہے لہٰذا کسی نہ کسی تاریخی چیز کے ملنے کا روشن امکان ہے۔ ہمارے ایک اور ساتھی نے مشورہ دیا کہ تاریخی چیزیں دلدلی کیچڑ میں ضرور ہوں گی کیوں کہ یہاں کسی کا کچھ تلاش کرنے کی نیت سے آنا محال ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ نہ تو ہم میں سے کوئی مہم جو ہونے کا دعویٰ دار تھا نہ ہی کبھی ایسا تجربہ پہلے کر چکا تھا۔ ہم لوگ تو یہاں تفریحاً آئے تھے کہ گھنٹے دو گھنٹے بعد واپسی کی راہ لیں گے۔ یہ جنگل تو تھا نہیں کہ شام ہوئی نہیں اور درندے آئے نہیں۔ لیکن یہ سطور لکھنے میں کوئی شرم نہیں کہ اس جگہ ٹھہرنے سے خوف محسوس ہوتا تھا، ابھی تو رات بھی آنا تھی۔ شاید ماحول کے اثر کے ساتھ ساتھ اس بستی سے متعلق گردش میں رہنے والی داستانوں نے دہشت طاری کر دی تھی۔ یہ بھی لکھنے میں کوئی قباحت نہیں کہ ہم سب کو وہاں سے پرانے زمانے کی کسی شے کے ملنے کی زبردست آرزو تھی اور شاید یہی وجہ تھی کہ معمولی بحث و تکرار کے بعد ہم چاروں وہاں رات بسر کرنے پر تیار ہو گئے۔

☆☆☆

کھاڑی کے کناروں کناروں اچھی طرح دیکھ بھال کی لیکن کوئی چونکا دینے والی چیز نظر نہیں آئی۔ پھر سوچا کہ ابھی سورج کی خاصی روشنی ہے، کیوں نا دلدلی زمین کو بھی دیکھ لیا جائے۔ یہ کہنا آسان تھا مگر کیچڑ میں اترنا کوئی اتنا آسان کام نہیں تھا۔

کیچڑ اور دلدلی زمین کے آس پاس کافی باریک بینی سے چھان بین کی مگر نتیجہ صفر رہا۔ پھر خیال آیا کہ ابن بطوطہ نے انہی کھنڈر کے پاس کہیں بدبودار پانی کھڑا ہونے کی بات لکھی تھی کیوں نا اسے تلاش کیا جائے۔ ہم نے اب تک جو باتیں اس کے سفرنامہ میں پڑھی تھیں من وعن ویسی ہی پائی تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان آثار کی بالکل ویسی ہی حالت میں رہنے کی کچھ تو وجوہات ہوں گی ہمیں زیادہ اس بات سے دلچسپی تھی کہ چونکہ اب تک نہ تو کسی چیز کو چھیڑا گیا نہ ہی عوام یا محکمہ آثار قدیمہ والے کوئی شے یہاں سے اٹھا لے گئے چنانچہ اس بدقسمت بستی والوں کی کوئی نہ کوئی چیز ہم بہ آسانی دریافت کر سکتے ہیں۔

اب تک تو ہم کھنڈر کے آس پاس ہی تھے، کھاڑی کے کنارے اور کیچڑ زدہ زمین پر بھی نظر ڈالی تھی اور اب بدبودار پانی کی تلاش میں بہت پرجوش ہو گئے۔ ایک ساتھی نے مشورہ دیا کہ کھڑا پانی کھاڑی کے علاوہ نہیں اور تلاش کیا جائے۔ دلدلی زمین پر بھی 'بدبودار' پانی نہیں ملا۔

باہم مشورے سے ہم کھنڈر کے اندر داخل ہو گئے۔ کچھ ہی آگے گئے ہوں گے کہ وہی مخصوص بو آنے لگی جو کھڑے پانی کی نشاندہی کرتی ہے۔ ہم نے بو کی سمت چلنا شروع کیا۔ کچھ آگے ایک جوہڑ نظر آیا۔ جوں جوں آگے بڑھے توں توں تعفن کی بو بڑھتی گئی۔ ہمیں اندازہ ہو گیا کہ یہ مقام وہی ہو سکتا ہے جس کو ابن بطوطہ نے بیان کیا۔ قریب جانے پر واضح ہوا کہ اس مقام پر زمانے پہلے بھی پانی کھڑا رہا ہو گا۔ اب جوہڑ بالکل خشک تھا اور بدبو ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا، ہمارے چاروں طرف کھنڈرات اور بت بکھرے پڑے تھے۔ مکانوں کے سائے لمبے ہوتے جا رہے تھے۔ اچانک ہم سب کی نظر ایک ساتھ مغرب کی جانب جھکتے ہوئے سورج کی طرف اٹھی۔ وہ اسی مکان کے پیچھے غروب ہو رہا تھا جو اوندھا تھا۔ اس کی ہیبت نے ہم سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور ہم سب ایک ساتھ پلٹے اور تیزی کے ساتھ اپنی کشتی کی طرف بڑھے۔ دس منٹ میں ہم اپنی کشتی کے اندر تھے۔ اس دوران ہم میں سے کوئی بھی ایک لفظ نہ بول سکا۔ کشتی والوں نے واپسی کا سفر شروع کیا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے اوسان بحال کیے تو ہم بات کرنے کے قابل ہوئے۔

پڑھنے والوں کو دعوت ہے کہ وہ سفرنامہ ابن بطوطہ کا مطالعہ کریں اور اگر ہو سکے تو خود بھی وہاں تک جائیں۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

DOWNLOADED FROM
PAKSOCIETY.COM

شمشال سے ٹورنٹو

ندیم اقبال

DOWNLOADED FROM
PAKSOCIETY.COM

شاعر نے غلط نہیں کہا ہے کہ چاند میری زمیں پھول میرا وطن۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ میرا وطن چاند سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔ اس کی وادی، اس کے دریا، شہر و کوہسار سب کے سب بے نظیر و بے مثال ہیں۔ لیکن ان فضاؤں سے جو نکل کر کسی اور شاخ پر آشیانہ سجانے کی خواہش کرتا ہے۔ اسے کیسی کیسی پریشانیاں گھیرتی ہیں اس کا ذکر جو یورپ و امریکا میں بسنا چاہتے ہیں وہ اس تحریر کو ضرور پڑھیں۔

ایک جداگانہ انداز کی دلچسپ سفر کہانی کا سولھواں حصہ

جمیل صاحب کے ساتھ ایک عجیب واقعہ ہوا۔ وہ ٹورنٹو میں رہتے ہیں۔ انہوں نے گروسری اسٹور کھول رکھا ہے۔ ان کے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔

اس دن ہم ان کے ساتھ ایک ریسٹورنٹ میں آبیٹھے تھے۔ ان کے علاوہ طارق کے پانچ چھ دوست اور بھی تھے۔ کڑاہی گوشت بنانے کا آرڈر دیا گیا تھا۔ کڑھائی گوشت سب پاکستانیوں کی طرح میری بھی پسندیدہ ڈش ہے۔ آرڈر دے کر ہم آپس میں باتیں کرنے لگے۔ ویک ڈے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded from Paksociety.com

کی وجہ سے زیادہ رش نہ تھا۔ ہمارے علاوہ ایک اور میز پر دو بندے سر جوڑے بیٹھے تھے۔ میں طارق اور ان کے دوستوں کی وہ باتیں سن رہا تھا جو چیکن ہائیٹ میں ہر وقت ہوتی رہتی تھیں۔ ایک لڑکا ان کے ہمراہ بیٹھا تھا۔ وہ وزٹ ویزے پر آیا ہوا تھا اور اب یہاں مستقل طور پر رہنے کا پلان بنا رہا تھا۔

ان دنوں جو بھی ایک بار وزٹ ویزے پر آیا تو وہ واپس اس وقت جاتا تھا جب اسے گرین کارڈ مل جاتا۔ اس میں بھلے اسے دس سال ہی کیوں نہ رہنا پڑ جائے۔ جو اسپانسر ہو کر آتے تھے وہ کبھی اس طرح سے چیکن ہائیٹ کے ریسٹورنٹ میں بیٹھے نظر نہ آتے تھے۔ ایک صاحب اس لڑکے کو کسی گروسری اسٹور میں جاب دلانے کی امید دلا رہے تھے اور بتا رہے تھے کہ تمہیں ہفتے کے سات دن صبح سے شام تک کام کرنا ہوگا، تنخواہ ہفتے میں ڈھائی یا تین سو ڈالر ملے گی۔ رہائش کے لیے مل کر رہنا ہوگا۔ دو بیڈ کے اپارٹمنٹ میں آٹھ آٹھ لڑکے رہتے ہیں۔

''جی میں رہ لوں گا۔'' لڑکے نے جواب دیا۔

''مہینے کا چار سو ڈالر کھانے سمیت پڑے گا۔ کھانا بنانے اور برتن دھونے کی باری ہوتی ہے۔''

''جی میں کرلوں گا۔'' لڑکے کے لہجے میں لجاجت تھی کہ میں ہر طرح کا کام کروں گا بس مجھے کوئی جاب دلوا دیں۔'' وہ اسے تسلیاں بھی دے رہے تھے اور ساتھ ہی یہاں کی مشکلات بھی بتا رہے تھے۔

سب مشکلات سن کر بھی وہ یہی کہہ رہا تھا۔ ''مجھ سے کسی کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ بس مجھے کوئی بھی جاب دلوا دیں۔''

وہ لڑکا شکل سے پڑھا لکھا لگتا تھا۔ نام لکھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ نام میں کیا رکھا ہے۔ نام کوئی بھی ہو یہاں آنے والے بیشتر اسی طرح سے رہا کرتے۔ میں ایک گروسری شاپ میں کچھ دیر پہلے گیا تھا۔ وہاں اسی قسم کے کردار کام کر رہے تھے۔ کوئی فرش پر ماپ کر رہا تھا اور کوئی سامان شیلفوں میں لگا رہا تھا۔ برابر میں ایک کمرا تھا، اس میں چار چار لڑکے فرش پر گدے بچھائے آڑے ترچھے لیٹے ہوئے تھے۔ کچن میں ایک بڑا دیگچا سالن سے بھرا رکھا تھا۔ وہ کھانا شاید کل بنایا گیا تھا۔ کسی کو بھوک لگی تو فریج سے روٹیاں نکال کر گرم کیں۔ پلیٹ میں کچھ سالن ڈالا اور خاموشی سے کھا لیا۔ اور لیٹ گئے تاکہ صبح تیار ہو کر جاب پر پہنچ سکیں۔ واپس آئے تو رات کی تاریکی پھیل چکی ہوتی ہے جسم درد اور تھکاوٹ سے نڈھال ہوتا ہے۔ بقول طارق، واقعی امریکا، امریکا ہے۔

ہم جس ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے وہاں بھی یہی کردار کام کرتے نظر آ رہے تھے۔ کوئی میز صاف کر رہا تھا تو کوئی کسٹمر کے سامنے پانی رکھ رہا ہے۔ ریسٹورنٹ میں سب سے زیادہ عزت کک کی ہوتی ہے اور وہی کنگ بنا ہوا ہوتا ہے۔ ریسٹورنٹ کا مالک بھی اس کے سامنے زیادہ بول نہیں سکتا کیونکہ اگر کک چھوڑ جائے تو ریسٹورنٹ بند ہونے کو آجاتا ہے۔

آپ امریکا کے کسی ریسٹورنٹ میں کچھ دیر کو بیٹھ جائیں تو کئی کہانیاں آپ کے سامنے کھلی کتاب کی طرح آ کھڑی ہوتی ہیں۔ وہ جو کام کر رہے ہوتے ہیں اور وہ بھی جو میزوں کے گرد بیٹھے چائے پی رہے ہوتے ہیں، ہر ایک اپنی ذات میں ایک مکمل داستان ہوتا ہے۔ سب نڈھال اور تھکے ہارے۔ اپنوں کی محبت اور خیال سے بہت دور اور اپنی ذات میں تنہا۔ سال میں ایک چھٹی عید پر بھی مل جائے تو غنیمت جانی جاتی ہے۔

پاکستان میں بیٹھے لوگوں کو امریکا یا کینیڈا ایک خواب سا لگتا ہے۔ حقیقت دیکھنی ہو تو شکاگو کی دیوان اسٹریٹ چلے جائیں یا لندن کے ٹوٹنگ یا ساؤتھ ہال یا پھر ٹورنٹو کی جیرالڈ اسٹریٹ یا پھر نیویارک کے کونی آئی لینڈ اور چیکن ہائیٹ۔ سب جگہ کسی بھی کام کرنے والے سے بات کرلیں تو ایک پوری کتاب لکھ جائے گی۔ دکھوں کی چادر پر خوش نما رنگ سجائے یہ لوگ اسے اوڑھے جی رہے ہوتے ہیں۔ یہاں زندگی اس کی بہتر ہوتی ہے جو قانونی طریقے سے آیا ہو اور پھر پروفیشنل ڈگری رکھتا ہو۔

آٹھ ایمپلائی ہیں اور ایک ایمپلائر ہے۔ ایمپلائر سیٹھ بن کر رہتا ہے اور باقی کارندے۔ قدرت کا نظام بھی ایک خاص ترتیب سے چلتا ہے۔ جو بیلنس شروع میں تھا وہ ابھی تک قائم ہے۔ اس کرۂ عرض پر ہر جگہ، ہر ملک میں 83 فیصد کارندے ہیں اور 17 فیصد سیٹھ۔ بل گیٹس کہتا ہے کہ اگر سترہ فیصد سیٹھوں سے دولت لے کر سب کارندوں میں بانٹ دی جائے تو دس سال بعد پھر سے وہی سترہ اور تریاسی فیصد کا تناسب قائم ہو جائے گا۔ شاید دنیا میں یہی ہوتا آرہا ہے اور یہی ہوتا رہے گا۔

چیکن ہائیٹ کے ماحول نے میری آنکھیں کھول دی تھیں۔ میں کرب میں بیٹھا تھا۔ ہم کڑھائی گوشت کھا رہے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

تھے اور ہماری تعلیم کے برابر لوگ ہماری میزیں صاف کررہے تھے۔

یہاں ایک واقعہ ضمنی طور پر آگیا ہے کہ کیسے نئے آنے والوں کے لیے مشکلات ہوتی ہیں اور پاکستان میں ان کے جانے کی خوشی میں گلی میں دیگیں چڑھی ہوتی ہیں۔ ان کو معلوم نہیں ہوتا کہ جس کو بھیج کر وہ اپنی اُمیدیں لگائے بیٹھے ہیں وہ کس عذاب میں مبتلا ہیں۔

سلیمان بھی اسی طرح اپنی یونیورسٹی کی جاب چھوڑ کر ٹورنٹو آگیا۔ اس کی بیوی ایک اسکول ٹیچر تھی۔ وہ مجھے بتا رہا تھا کہ ائرپورٹ پر اس بندے نے پک کیا جس کے اپارٹمنٹ میں اس نے رہنا تھا۔ اپارٹمنٹ پہنچا تو دیکھا کہ دو کمرے ہیں اور آٹھ بندے رہائش پذیر ہیں۔ سب دیواروں سے ٹیک لگائے چھت کو گھورے جارہے ہیں۔ اسے بھی ایک لائن میں بٹھا کر اسی کام پر لگا دیا گیا۔ کسی ایک کے پوچھنے پر جب اس نے بتایا کہ وہ یونیورسٹی میں اس جاب پر کام کرتا تھا تو سب نے مل کر اس کو کوسنا شروع کردیا اور سب کم وبیش یہی کہتے تھے کہ اپنی جاب کیوں چھوڑ آئے ہو؟ یہاں تو صبح سے شام تک مزدوری کرنی ہوتی ہے۔ تم نے ایک اندھے کنویں میں چھلانگ لگائی ہے۔ وہ تب تک چپ نہ ہوئے جب تک باقاعدہ وہ رونے نہ لگا۔ پھر دوسرے دن ایک بندہ اس کو پکڑ کر لے گیا اور اس کا اکاؤنٹ کھلوایا۔ سوشل کارڈ بنوانے کی درخواست ڈال دی۔ واپس آکر پھر اسے اسی لائن میں بٹھایا اور سب مل کر چھت کو گھورنے لگے۔

دوسرے دن اپارٹمنٹ کی دیوار پر ایک اشتہار چسپاں تھا۔ جس کے مندرجات یہ تھے کہ اس ہفتے کس دن کھانا کس نے بنانا ہے۔ برتن کون دھوئے گا اور صفائی کس دن کون کرے گا۔ سلیمان کا نام سب سے اوپر کھانا بنانے والوں میں لکھا تھا۔ اس کا بنایا لوبیا سب نے پسند کیا اور پھر وہ اگلے کئی ماہ تک ان کے لیے لوبیا بنانے لگا۔ پھر کسی طرح سے اسے کے ایف سی میں جاب ملی جہاں وہ چکن فرائی کرتا تھا اور ساتھ میں خود بھی فرائی ہوتا رہتا تھا۔ اپارٹمنٹ واپس آکر لوبیا بناتا۔ اس نے پکا پروگرام بنایا کہ وہ واپس پاکستان چلا جائے گا۔ اس کے ایک رشتے دار کو اندازہ تھا کہ اس کا پاسپورٹ ضبط کر رکھا تھا۔ سلیمان پاسپورٹ مانگتا اور وہ اسے پولیس کے حوالے کرنے کی دھمکی دیتا۔ سلیمان پاؤں پڑنے پر آگیا تھا مگر اس کا پاسپورٹ اس کو نہیں دیتے تھے۔

یہ سب باتیں اس وقت سلیمان میرے سامنے بیٹھ کر مجھے بتا رہا تھا۔

ہم ابھی جنکسن ہائیٹ کے ریسٹورنٹ میں بیٹھے کڑھائی گوشت کھا رہے تھے۔ یہاں کے گوشت میں وہ ذائقہ نہیں ہوتا جو اپنے ملک میں ملتا ہے۔ ایک پاس سی ہوتی ہے۔ پھر بھی کھانا کھاتے ہوئے سب کڑاہی گوشت کی تعریف کررہے تھے ماسوائے میرے۔ میں کیونکہ چار ماہ پہلے پشاور کی نمک منڈی سے یہ کھا کر آیا تھا اور میرے ساتھ بیٹھے نہ جانے کب سے پاکستان نہیں گئے تھے۔

واپسی پر گاڑی میں، میں خاموش بیٹھا تھا اور طارق مجھے یہاں آنے والوں کے واقعات سنا رہا تھا۔ گھر پہنچے تو میں سونے کے لیے لیونگ روم میں کمبل لپیٹ کر صوفے پر لیٹ گیا اور طارق یہ کہہ کر سونے چلا گیا کہ کل میں جلدی آجاؤں گا کیونکہ ہمیں اٹلانٹک سٹی جانا تھا۔

میں صبح صوفے پر لیٹا تھا کہ شہروز اسکول جانے کے لیے بیدار ہوگیا۔ اپنے معمول کی طرح میری جانب بڑھا۔ میں بھی ایک طرح سے تمام رات اسی کا انتظار کررہا تھا۔ ساری رات ٹائم دیکھتا رہا کہ کب شہروز اٹھے اور اس سے پہلے کہ میرا کمبل کھینچے تو میں نیچے تہہ خانے کی اندھیری قبر میں اتر جاؤں۔ وہ میری جانب منہ پر ہاتھ رکھے، اپنی ہنسی دبائے آہستگی سے چلا آرہا تھا۔ اس کے حملے سے پہلے ہی میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنا کمبل لپیٹا اور تہہ خانے میں اتر گیا۔

میں جارہا تھا تو وہ حیرانگی سے کھڑا مجھے دیکھ رہا تھا۔ نیچے اپنے کانوں کے گرد تکیے کو لپیٹے میں سونے کی کوشش کرنے لگا کیونکہ اب اس کے کودنے کی آوازیں چھت سے نیچے آرہی تھیں اور ساتھ مشین بھی متواتر چل رہی تھی۔ اس بچے نے میرا سکون چھین لیا تھا اور مشین نے میرا جینا دوبھر کردیا تھا۔

سونے کی کوشش میں دو گھنٹے گزر گئے اور آخر تھک ہار کر اٹھ بیٹھا۔ جی چاہتا تھا کہ دروازے سے باہر لگی مشین کو اکھاڑ کر کہیں باہر پھینک آؤں، جو ایک طرح سے شہروز کی ہمزاد تھی۔ شاور سے فارغ ہوکر اوپر آیا تو تمنا بھابی بولیں۔ ''جلدی کیوں اٹھ آئے، تمہیں بھی چین نہیں ہے۔''

کیا کہتا کہ میرا چین تو تمہارے لاڈلے نے چھین رکھا ہے۔ میزبان کی دلجوئی کی خاطر خون کے گھونٹ پی کر چپ ہورہا۔ ناشتا کرنے کے بعد شہروز کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں صوفے پر سکون سے بیٹھ گیا اور

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

چائے پینے لگا۔ اسی اثناء میں شہروز کا آٹھ مہینے کا چھوٹا بھائی، ارشیان، کہیں سے لڑکھتا ہوا آیا اور مجھ سے چائے کا کپ چھیننے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر ہماری ہاتھا پائی شروع ہوگئی۔ خالص خوراک کھا کر اس نیک بخت میں بلا کی قوت بھری تھی۔ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو اس سے بچایا تو وہ اپنی شکست پر بلبلا کر رونے لگا۔ ماں نے آکر اسے دبوچا اور اندر لے گئی۔ میں بے بسی سے سر پکڑے بیٹھ گیا۔

پھر تمنا بھابی آکر بولیں۔ ''طارق تو دو بجے کے بعد آئے گا۔ تمہیں K-Mart لے چلتی ہوں، کے مارٹ بھی وال مارٹ کی طرح کا ایک سپر اسٹور ہے۔''

ان دنوں وال مارٹ میں سبزیاں اور پھل نہیں ملا کرتے تھے۔ لیکن کے مارٹ میں وال مارٹ کی طرح کے سامان کے علاوہ سبزی منڈی بھی تھی۔ میں شلوار قمیص کے آسان لباس میں اپنی طرف سے تیار تھا۔ مجھے اس دیسی لباس میں دیکھا تو چلا پڑیں۔ ''تم ڈیرہ میں نہیں ہو۔ یہ نیویارک ہے۔'' پھر ڈانٹ کر کہنے لگیں۔ ''جلدی سے پینٹ شرٹ پہن آؤ۔''

میں بھاگم بھاگ تہہ خانے سے کپڑے تبدیل کر آیا۔ جب تک انہوں نے میرے کپڑے اوکے نہیں کر دیے، میں سانس روکے کھڑا رہا۔

تمنا بھابی نے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر رکھی ایک بے بی سیٹ میں ارشیان کو جکڑا۔ اس کی اسٹرولر گاڑی کے پیچھے رکھی اور ہم کئی ایک سڑکوں سے ہوتے ہوئے، بہت بڑے اسٹور کے سامنے بنے ایک وسیع پارکنگ میں آرکے۔ ارشیان کو سیٹ سے آزاد کر کے اسٹرولر پر رکھا اور پھر میں بھابی کے پیچھے پیچھے کے مارٹ میں گھس گیا۔ ٹورنٹو میں وال مارٹ کا احوال تو میں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔ اس میں بس ایک اضافہ یہ تھا کہ ایک بڑا حصہ تازہ پھلوں اور رنگ برنگی سبزیوں سے بھرا ہوا تھا۔ بھابی بھاگ بھاگ کر چیزیں خریداری کرتی رہیں اور میں سوئے ہوئے ارشیان کو اسٹرولر میں لیے ان کے پیچھے پیچھے بھاگتا رہا۔

میں نے کچھ کپڑوں کی قیمتیں دیکھیں تو مجھے ٹورنٹو سے سستی لگیں۔ وہاں تو ٹیکس بھی سولہ فیصد تھا مگر یہاں چھ فیصد تھا۔ کپڑوں کا معیار بھی کینیڈا سے بہت بہتر تھا۔ جو جیکٹ کینیڈا میں ڈیڑھ سو ڈالر میں نہ ملے وہ یہاں سیل پر پچاس ڈالر میں مل رہے تھے۔ تمنا بھابی نے ایسی ہی جیکٹ خرید کر تحفے میں مجھے دی۔ یہاں سردیوں کے کپڑوں کی خریداری اکتوبر میں شروع کی جاتی ہے اور نئے سال کے آغاز پر سارا سامان پہلے پچیس فیصد سیل پر لگایا جاتا ہے۔ پھر پچاس اور آخر کار مارچ میں نوے فیصد سیل پر لگا دیا جاتا ہے۔ میری طرح بہت سے لوگ اگلے سال کی خریداری مارچ میں کر لیتے ہیں۔ مارچ کے بعد سردیوں کا سارا سامان اٹھا لیا جاتا ہے اور چیریٹی میں دے کر اسٹوروں کی صفائی کر دی جاتی ہے۔ چیریٹی والے اسے اونے پونے داموں گوداموں کو بیچ دیتے ہیں۔ پھر یہ نیا ٹیگ لگا سامان دوسرے ملکوں میں شوکیسوں میں سجا دوہری قیمت پر بک رہا ہوتا ہے۔ میرا اس طرح کے ایک گودام میں جانے کا اتفاق ہوا تو میں ششدر رہ گیا۔ وہاں سامان نہیں بلکہ کنٹینر کے کنٹینر بک رہے تھے۔ میرے ایک جاننے والے نے پاکستان ایک کنٹینر بھیجا اور اس پر دس لاکھ کا منافع کما لیا۔

ہم واپس گھر پہنچے میں نے ٹی وی کے سامنے بیٹھ جانا پسند کیا۔ ٹی وی دیکھتے ہوئے طارق کا انتظار کرنے لگا۔

ہمیں اٹلانٹک سٹی جانا تھا۔ طارق کہہ رہا تھا کہ وہاں بہت بڑے بڑے کیسینو ہیں۔ لاس ویگاس کے بعد اٹلانٹک سٹی جوا خانوں کی وجہ سے مشہور ہے بلکہ اٹلانٹک سٹی کی شہرت لاس ویگاس کی وجہ سے ماند پڑ رہی ہے۔ ابھی پچھلے سال ٹرمپ کو اپنے دو کیسینو اٹلانٹک سٹی میں بیچنے پڑے۔

میں اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے ہر جگہ ایک بار ضرور گیا تاکہ اگر سفرنامہ لکھوں تو میرے پاس اپنی آنکھوں دیکھی معلومات ہوں۔ کئی کیسینوز میں تو پانچ چھ مرتبہ جا چکا ہوں۔ کروز شپ پر جب بھی گیا تو ان میں واقع کیسینو میں بیٹھ کر پوکر اور بلیک جیک کھیلی اور نت نئے تجربات سے روشناس ہوا۔ آج پہلی بار امریکی کیسینو میں جا رہا تھا۔

طارق آیا اور آتے ہی پوچھنے لگا۔ ''تم ابھی تیار نہیں ہوئے؟'' حالانکہ وہ دیکھ رہا تھا کہ میں تیار بیٹھا تھا۔ میں نے اپنی جیکٹ پہنی اور پھر ہم باہر گاڑی میں آبیٹھے۔ وہاں طارق کا ملازم ''جے'' بھی اپنے منہ پر مفلر اوڑھے بیٹھا تھا۔ میں نے طارق سے کہا۔ ''اسے آج گھر نہیں چھوڑا؟''

طارق نے پہلے اس کی شان میں انتہائی ناشائستہ کلمات ادا کیے اور پھر جواب دیا۔ ''یہ اٹلانٹک سٹی جوا کھیلنے کیسینو جاتا رہتا ہے، اسی لیے اسے ساتھ لے لیا ہے۔''

جے خاموشی سے مفلر لپیٹے بیٹھا تھا اور بلی کی طرح سبز آنکھوں سے کسی اور جانب دیکھ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

طارق نے اچھا کیا کہ اسے لیتا آیا۔ اس طرح جے سے ضروری معلومات بھی حاصل کرتا رہوں گا۔ میں نے اسے ''ہائے'' کہا اور اس نے سر اثبات میں ہلا کر مجھے جواب دیا۔

ہم روانہ ہوئے تو نیلے آسمان پر ہلکے ہلکے بادل تھے۔ سردی کا زور ٹوٹنا شروع ہو گیا تھا۔ ہمارا ڈھائی گھنٹے کا سفر تھا۔ طارق گاڑی چلا رہا تھا اور جے پیچھے اداس اور گم صم بیٹھا تھا۔ ہم نیویارک سے نیو جرسی اسٹیٹ جا رہے تھے۔ اٹلانٹک سٹی بحر اوقیانوس کے کنارے آباد تھا۔ مجھے اس کے بارے میں کچھ بنیادی معلومات لینی تھیں۔ کسی شہر میں جانے سے پہلے اگر اس شہر کی جان پہچان ہو جائے تو دل چسپی بڑھ جاتی ہے۔

میں نے طارق سے پہلے فاصلے کا پوچھا تو اس نے بتا دیا۔ پھر پوچھا۔ ''اٹلانٹک سٹی کی وجہ شہرت کیا صرف کیسینو ہیں؟''

میری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے اس نے کہا۔ ''پورے امریکا سے لوگ جوا کھیلنے یہاں آتے ہیں۔ بہت بڑی بڑی اور خوب صورت عمارتیں ہیں، جن میں یہ کیسینو ہیں۔'' یہ اس کی ساری معلومات تھیں جو اس نے میرے گوش گزار کر دی تھیں۔

جب میں نے پوچھا۔ ''یہ کیسینو کب بنے؟''

اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ اپنا تولیہ گود میں رکھا اور بولا۔ ''مجھے کیا معلوم؟ یہ میرے آنے سے پہلے ہی یہاں تھے۔'' اور پھر ہنستے ہوئے بولا۔ ''اب یہ نہ پوچھنا کہ کتنے کیسینو ہیں، کتنے لوگ آتے ہیں اور کیوں آتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''پھر جے کو پتا ہوگا۔''

اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''اس چڑی کو کیا معلوم؟ یہ کون سا ابن بطوطہ ہے؟''

طارق کو معلوم نہ تھا کہ میں آج انٹرنیٹ سے اٹلانٹک سٹی کی بہت سی معلومات پہلے ہی لے چکا ہوں۔ میں تو بس اسے اور جے کو چھیڑ رہا تھا۔ میں اکثر کہیں بھی جانے سے پہلے اس مقام کے بارے میں بہت سی معلومات اکٹھی کر لیتا ہوں۔

میں نے جے سے جب یہ سوال پوچھے تو وہ حیرانگی سے مجھے دیکھنے لگا کہ میں اس سے کس طرح کے مشکل سوال پوچھ رہا ہوں۔ مجھے انٹرنیٹ پر سرفنگ سے پہلے تک معلوم نہ تھا کہ کیسینو کیا ہوتے ہیں اور کس طرح کا جوا کھیلا جاتا ہے۔ میرے علم میں یہی تھا کہ جوا تو تاش کھیل کر لگایا جاتا ہے یا بٹیر لڑا کر۔ اس سے زیادہ معلومات میرے پاس نہ تھیں۔

تاش کا بھی ایسے ہی معلوم ہوا تھا کہ ہمارے محلے میں ایک بہت بڑی جگہ تھی جسے ''عبدالرحمٰن کی جھا'' کہتے تھے۔ شہر کے جواری وہاں آتے اور ٹولیوں میں بیٹھ کر تاش کھیلتے تھے۔ جھا کی یاد آئی تو بچپن کا دور ذہن کے پردۂ سیمیں پر رقصاں ہو گیا۔ جھا کے دو تین دروازے ایک ساتھ تھے جو ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ ہمیں وہاں سے گزرنے کی اجازت بھی نہ تھی۔ جب بھی گزرتے تو بھاگ کر گزرتے کیونکہ ہمیں یہی بتایا گیا تھا کہ یہ بدمعاش لوگ ہیں اور بھاگ کر گزرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ایک بہت بڑا کتا وہاں بندھا رہتا تھا۔ عبدالرحمٰن خود جوا نہیں کھیلتا تھا بلکہ پستول لگائے ایک طرف بیٹھا رہتا تھا۔ کبھی کبھار وہاں ریچھ اور کتے کی لڑائی بھی ہوتی مگر ہمیں وہ دیکھنے کی بھی اجازت نہیں تھی لیکن ہم کہاں ماننے والے تھے۔ گھر والوں سے چھپ کر لڑائی دیکھنے ضرور جایا کرتے۔ بٹیر بازی اور ان کی لڑائی بھی ہوتی رہتی تھی۔ ہاتھ میں بٹیر لے کر گھومنا ایک رواج تھا جوان ''بدمعاشوں'' کی پہچان ہوتی تھی۔

وہ ایک سردیوں کی تاریک رات تھی۔ میں سو کر اسکول جانے کے لیے بادل نخواستہ اٹھا تو گھر میں یہ چہ میگوئیاں تھیں کہ رات کو گولی چلی ہے۔ معلوم ہوا کہ کل رات پولیس نے ''جھا'' پر چھاپا مارا۔ عبدالرحمٰن نے اپنے پستول کی گولی تھانیدار کے سینے میں اتار دی تھی۔

تھانیدار نے کہا تھا کہ آج میں چھاپا مارنے آؤں گا اور عبدالرحمٰن نے کہا تھا کہ تو زندہ واپس نہ جائے گا۔ دونوں نے اپنی اپنی لاج رکھی اور پھر عبدالرحمٰن چودہ سال کے لیے جیل چلا گیا۔ علاقے کے اسکول اس دن بند ہو گئے کیونکہ ایک خوف کی فضاء تھی۔

بس میرے علم کے مطابق یہی جوا تھا اور اس کے خوفناک انجام سے میں سہما ہوا تھا۔ جوئے کے نام کی ایک دہشت لیے میں بڑا ہوا تھا مگر آج ایک جوا خانے بڑے اشتیاق سے جا رہا تھا۔ انٹرنیٹ پر سرفنگ سے پہلے میرے خیال میں ایسا ہی کوئی جوا اٹلانٹک سٹی میں ہوتا ہوگا۔ بس ''جھا'' کی جگہ کئی ایک بڑی عمارتیں ہوں گی اور پولیس کا کوئی ڈر نہ ہوگا۔

ہماری گاڑی ہائی ویز پر دوڑی چلی جا رہی تھی۔ میں طارق کو چھیڑنے کے موڈ میں تھا۔ اسے تپا کر میں اس کی سنتا اور سیریس بیٹھ کر اس کی باتوں کے مزے لیتا تھا۔ میں اس

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

سے انجان اور سادہ لوح بن کر سوال کرتا اور وہ میری سادگی پر کڑھتا رہتا۔

میں نے اس سے کہا۔ ''تم اتنے سالوں سے امریکا میں رہ رہے ہو اور اٹلانٹک سٹی کی تاریخ بھی نہیں جانتے؟''

ہمیشہ کی طرح پہلے اس نے ایک دو زوردار چھینکیں ماریں اور پھر تپ کر بولا۔ ''تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔ یہاں میں نے بہت محنت کی ہے۔ دن رات کام کیا ہے۔ برف ہٹائی ہے۔ کالنگ کارڈ بیچے ہیں۔ کوئی چھولے نہیں بیچے۔ تمہاری طرح جغرافیہ اور تاریخ کے چکروں میں نہیں پڑا۔'' پھر آج کے دن کی دوسری چھینک ماری۔

کچھ دیر تک ناک صاف کرتا رہا اور پھر ذرا خاموش ہوا تو مجھے الجھن ہونے لگی۔ اس سے پہلے میں اپنا کوئی اور داؤ آزماتا وہ خود ہی بولنے لگا۔ ''مجھے تمہاری فکر ہے۔ معلوم نہیں تم کس طرح سے یہاں اپنے آپ کو ایڈجسٹ کرو گے۔ یہ امریکا ہے امریکا۔ کوئی پاکستان نہیں۔ بہت محنت کرنی پڑتی ہے اور تم ہو کہ میوزیم دیکھتے پھر رہے ہو۔ ان جگہوں پر پاگل لوگ جاتے ہیں جن کو کوئی اور کام نہیں ہوتا۔'' اس کے بعد بہت دیر تک میں اس کی نصیحتیں سنتا رہا۔ جب تھکا تب وہ چپ ہوا۔

میں نے پھر اسے اکسایا۔ ''ویسے تم نے امریکا کو ٹھیک پہچانا ہے۔ تم تو مجھے اس کی رگ رگ سے واقف لگتے ہو۔''

اس بات پر اس نے پہلے تو شک بھری نظروں سے مجھے دیکھا کہ میں سچ کہہ رہا ہوں یا شرارت کر رہا ہوں۔ ادھر میں بے تاثر اور معصوم چہرہ بنائے بیٹھا تھا۔ کچھ دیر مجھے بغور دیکھنے کے بعد اس نے سڑک پر نظریں ٹکائیں اور ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ''بہت محنت کی ہے۔ برف، کالنگ کارڈز، چھولے۔'' اور وہی سب کچھ پھر سے دہرایا۔

اسی طرح تمام راستے اسے تپاتا اور پھر رام کرتا رہا۔

سامنے نیلے سمندر کے ساتھ ساتھ انتہائی شاندار، دلکش اور بڑی بڑی عمارتیں نظر آنے لگیں۔ شام اتر چکی تھی اور ہم اٹلانٹک سٹی میں داخل ہو رہے تھے۔ تاریکی سے پہلے ہی روشنیوں کا سیلاب تھا جو پورے منظر کو منور کر رہا تھا، ہر عمارت جگمگا رہی تھی۔ سڑکیں خالی تھیں۔ میں نے خالی سڑکوں کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''کیا لوگ رات گئے آتے ہیں؟''

پہلی بار جے بولا۔ ''رش اندر ہوتا ہے۔ باہر لوگ نہیں نکلتے۔''

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اتنی بلند و بالا اور دیدہ زیب عمارتوں کے اندر لوگ بھرے ہوئے تھے۔ میں تو ان طلسماتی عمارتوں کو دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ تعمیراتی حسن کا نمونہ تھیں۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ عمارتیں، کیسینوز، ہوٹل اور رزارٹ انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں۔ فن تعمیر کا شاندار مظاہرہ میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ آج میں بیٹھا اسے بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ بعد میں لاس ویگاس گیا تو وہاں بھی جو دیکھا تو کہیں اور نہیں دیکھا۔

جے، طارق سے کہہ رہا تھا کہ سیدھا ''سیزر'' چلتے ہیں۔ اس نے جے کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اس کے چہرے پر تغیر صاف نظر آ رہا تھا۔ ایک بے چینی سی پھیلی تھی۔ سارے راستے وہ سوتا آیا تھا مگر اب پہلو بدل رہا تھا۔ اس نے سیزر کا نام لیا تو میرے ذہن میں جولیس سیزر کا خیال آیا میں پوچھتا کہ طارق خود ہی بول پڑا۔ ''سیزر ایک بڑے کیسینو کا نام ہے۔''

طارق نے پہلے مجھے تاج محل دکھایا۔ یہ شاہ جہان کا تاج محل نہیں تھا بلکہ اس پر لکھا تھا۔

''ٹرمپ تاج محل'' ٹرمپ جو ان دنوں امریکا کا صدر ہے، اس کے امریکا کے مختلف شہروں میں کئی کیسینوز ہیں۔ تاج محل کیسینو کا مالک بھی وہی ہے۔ اس کو مغل طرز تعمیر کا رنگ دے کر اسے انتہائی جاذب نظر بنایا گیا تھا۔ اس کی تعمیر اور سجاوٹ دیکھنے کے لائق تھی۔ میں نے ''جے'' سے کہا کہ کیوں نہ تاج محل کے اندر چلیں مگر وہ جلدی سے بولا۔ ''سیزر اس سے کہیں بہتر ہے۔''

ایک لائن میں آگے پیچھے کھڑی دیوہیکل عمارتیں رہائشی یا کاروباری نہیں، سب کے جوا خانے تھے۔ جو ہوٹل ہیں ان میں ہزاروں کمرے ہیں۔ لوگ دنوں کے حساب سے یہاں ٹھہرتے ہیں۔ ٹھہرنے والے دن بیچ پر گزارتے ہیں اور شام کیسینو میں۔ یہ ایک الگ انداز کی دنیا ہے۔ یہاں ان کا طرز رہائش اور طرز زندگی ایک مختلف مزاج کا ہوتا ہے۔ جب میں لاس ویگاس اپنے پڑھنے والوں کو لے جاؤں گا تو ان کو اس دنیا کی سیر کرواؤں گا۔ فی الحال تو سیزر کی سیر کریں۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ عام طور سے امریکا کا یہ چہرہ دکھایا نہیں جاتا اور سفر نامہ نگار اس دنیا کے بارے میں بتانے سے گریز کرتے ہیں۔

ہم سیزر کے سامنے آئے تو میری آنکھیں روشنیوں کی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

جگمگاہٹ سے خیرہ ہو رہی تھیں۔ پڑھنے والے یہ نہ سمجھیں کہ میں روشنیوں کی بہتات کو بیان کرنے کے لیے ''خیرہ'' کا لفظ استعمال کر رہا ہوں۔ میں لفظوں میں کس طرح بیان کروں کہ ایسا نظارہ تو میں نے منہٹن میں بھی نہ دیکھا تھا۔ یہ کس طرح کی جگہ تھی جس کو میں سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ ہر کیسینو دوسرے سے بڑھ کر جگمگا رہا تھا۔ ست رنگی روشنیوں میں گھرا اٹلانٹک سٹی پہلی بار کسی کو بھی محو حیرت میں ڈال سکتا ہے۔

سیزر کیسینو کے سامنے آتے ہی میں گنگ ہو گیا تھا۔ رومن طرز تعمیر کا یہ شاہکار میرے سامنے تھا۔ چار سفید گھوڑوں کے مجسمے اس کے سامنے ایستادہ تھے اور پس منظر میں سینکڑوں گزوں میں پھیلی ایک بلند عمارت تھی۔ اس کے سامنے اور گھوڑوں کے پیچھے چار بڑے اور بلند ستون تھے جو نارنجی روشنیوں میں نہائے کھڑے تھے۔ ان ستونوں کے اوپر ایک پلیٹ فارم سا بنا تھا جس پر قدیم رومن ایمپائرز کے مجسمے ایستادہ تھے۔ میں منہ کھولے اور آنکھیں پھاڑے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ مجھے حیرت کے جھٹکے لگ رہے تھے۔

طارق نے ایک بڑی پارکنگ میں گاڑی پارک کی اور ہم کیسینو کے اندر داخل ہوئے۔ لابی میں برقی زینے اوپر نیچے چلے جا رہے تھے۔ اونچائی پر محرابیں بنی تھیں جس میں رومن طرز کے مجسمے کھڑے تھے۔ چھت انتہائی دیدہ زیب تھی۔ ایک آسمان سا بنا تھا جس پر جیسے بادل گھر آئے ہوں۔ میں انسانی تخلیقات کو دیکھ کر مسحور ہو رہا تھا۔

زینوں سے اوپر پہنچے تو سامنے ایک اور رنگ برنگی دنیا نظر آئی۔ سامنے ایک پب تھا۔ اسٹولوں پر لوگ بیٹھے مے نوشی کر رہے تھے۔ بائیں جانب ریسیپشن تھا اور دائیں جانب کیفے اور ریسٹورنٹ تھے۔

جے اب موج میں تھا۔ طارق بھی پہلی بار سیزر آیا تھا اور وہ بھی میری طرح حیرت زدہ نظر آ رہا تھا۔ جے سیدھا پب کی جانب گیا، اور ہم بھی اس کے ہمراہ چلے۔ اس نے ڈرافٹ بیر کا آرڈر دیا اور ہماری کسی سے بڑے سائز کا گلاس چڑھا گیا۔ ایک ختم کیا تو ایک اور پی گیا۔ طارق کہنے لگا۔ ''اب یہ کام سے گیا۔''

پینے کے بعد اس کی سبز آنکھیں سرخ ہونا شروع ہوئیں اور پھر مجھ سے کھل کر بولنے لگا۔ وہ یہاں آتا جاتا رہا تھا۔ وہ مجھے ریسٹورنٹ، شاپس، کیفے دکھا کر ان کے بارے میں بتانے لگا۔

پکا فرش ایسا لگ رہا تھا کہ پتھروں سے بنا ہے۔ اس کیسینو کو ایسے سجایا گیا تھا کہ جیسے ہم ایک پرانے مگر روشن ماحول میں داخل ہو گئے ہوں۔ فوارے لگے تھے اور روشنیوں میں ڈوبے پانی بہہ رہے تھے۔ آگے گئے تو دیکھا کہ سیزر کا مجسمہ لگا ہے اور بہت سے لوگ اس کی تصویریں بنا رہے تھے۔ مجسمے کے نیچے پانی کا تالاب تھا جس میں بے تحاشا سکے پڑے تھے۔ آس پاس دکانیں تھیں، لوگ تھے جن کو اپنے علاوہ کسی کی پرواہ نہ تھی۔ دونوں جانب بلند ستون تھے اور اوپر مجسمے تھے۔ ہر ایک جوا کھیلنے سے زیادہ اردگرد اور اوپر دیدہ زیب چھتوں کو دیکھ رہا تھا۔ مصنوعی درخت تھے اور رنگ برنگی ٹائلوں سے سجے فرش تھے جو ایسے چمک رہے تھے کہ جیسے آئینہ ہوں۔ کہیں کہیں دیز اور شوخ رنگوں اور خوش نما ڈیزائنوں کے کارپٹ بچھے تھے۔

ہم آگے بڑھے تو ایک گول چکر آیا جہاں فرش پر مہنگا ماربل لگا تھا جس طرح سے جے چل رہا تھا، مجھے ڈر تھا کہ کہیں لڑکھڑا کر گر نہ پڑے۔ میں نے اسے سہارا دینے کے لیے اس کے بازو کو تھاما تو پہلے حیران ہوا اور پھر خفا ہو گیا۔ یہاں آپ کسی کو ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ یہ بہت برا سمجھا جاتا ہے۔ میں تو ابھی سیکھنے کے مراحل میں تھا تو مجھے اس چیز کا پتا نہ تھا۔ ہر جسم کی اپنی پرائیویسی ہوتی ہے اور کوئی بھی اس میں بلاوجہ مداخلت پسند نہیں کرتا۔ میں نے اب جے کو اس کے حال پر چھوڑا اور ہم ان سلاٹ مشینوں کو دیکھ رہے تھے جو ایک ترتیب سے ہمارے دونوں جانب لگی تھیں۔ اس سلاٹ مشینوں سے رنگ برنگی روشنیاں پھوٹ رہی تھیں۔ اب فرش مکمل طور پر کارپٹ سے ڈھکا تھا جن پر خوش نما پھول بنے تھے۔

میں نے ایک جگہ سے سیزر کے بارے میں پمفلٹ اٹھا لیا تھا۔ جس میں بتایا گیا تھا کہ یہاں ساڑھے تین ہزار سلاٹ مشینیں ہیں۔ ایک ہزار سے زائد کمرے ہیں، نائٹ کلب، سنیما، مساج سینٹرز، ریسٹورنٹ، بارز اور بھی بہت کچھ ہے جو یہاں بتانا نامناسب ہے۔

ہم سلاٹ مشینوں کی جانب آئے۔ میرے لیے نئی چیز تھی۔ جے تو یہاں کا ماسٹر تھا اور طارق بھی کچھ سوجھ بوجھ رکھتا تھا۔ سلاٹس کے آگے لوگ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی نظریں گھومتے ہندسوں یا کچھ الفاظ یا پھر تصویریں پر لگائے بیٹھے تھے۔ مشین میں کچھ سکے ڈالتے، ایک بٹن دبا کر سانس روک کر بیٹھ جاتے اگر چار نمبر ایک جیسے آ جاتے تو ایک ڈالر

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ہزاروں سال پرانی کہانی

ہم نے اپنے بچپن میں آج سے کوئی ستر بہتر سال پہلے ایک کتاب پڑھی تھی۔ ''منتخب الحکایات'' جس میں تقریباً ساری کہانیاں جانوروں سے متعلق تھیں۔ جیسے شیر آیا، شیر آیا، پیاسا کوا، انگور کھٹے ہیں، بھیڑیا اور مینا اور کچھوا اور خرگوش وغیرہ۔ یہ اور اس کی دوسری کہانیاں ہمیں بڑی اچھی لگی تھیں۔

ہم نے اس زمانے میں یہی سمجھا تھا کہ یہ کہانیاں ہمارے ہی کسی کہانی کار نے اردو میں لکھی ہیں۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ ان میں سے کچھ کہانیاں ہمارے کورس کی کتابوں میں بھی شامل ہیں۔

پھر جب ہم بڑے ہوئے اور دنیا بھر کی باتیں کتابوں اور اخباروں میں پڑھنے لگے تو ہمیں معلوم ہوا۔ یہ ساری کہانیاں تو دنیا بھر میں سنی سنائی اور پڑھی پڑھائی جاتی ہیں۔ جس ملک میں جو زبان بولی جاتی ہے اس میں یہ کہانیاں کتابوں کی صورت میں موجود ہیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کہانیوں پر کارٹون فلمیں بھی بنائی جاتی ہیں۔ اس طرح ہمارے بچپن کا یہ خیال رد ہوگیا کہ یہ کہانیاں ہمارے ملک کے کسی کہانی نویس نے لکھی ہے۔ تو پھر کس نے لکھی ہے؟ اور کب لکھی ہے؟ جب اس بات کی کھوج لگائی تو پتا چلا۔ یہ کہانیاں تو ہزاروں سال پرانی ہیں۔ ان کہانیوں کا کہانی کار ایک غلام تھا، افریقی غلام۔ جس نے چھٹی صدی عیسوی قبل۔ سچ میں یہ کہانیاں تخلیق کی تھیں۔ وہ یونان میں رہتا تھا۔ یونانی زبان میں اسے ''ایسوپوس'' کہا جاتا تھا جسے باقی دنیا ''ایسوپ'' کے نام سے جانتی ہے۔ اس کی کہانیوں کے خاصے مجموعے موجود ہیں۔ جن میں سے بہت سوں کو یکجا کر کے ''ایسوپ کی حکایات'' کے نام سے شائع کیا گیا ہے اور مختلف ممالک دنیا بھر کے پرائمری اسکولوں اور کنڈر گارٹن کے نصاب میں بھی شامل ہیں۔

کے بیس ملتے۔ اگر تین ایک جیسے جاتے تو کچھ کم جیت پاتے۔ کچھ لوگوں کے پاس کیش نہ تھا۔ انہوں نے کیسینو کے کارڈ لیے ہوئے تھے۔ گلے میں بندھے ایک پٹے کے ساتھ وہ کارڈ بندھا تھا اور کارڈ مشین کے اندر ڈالا ہوا تھا۔ وہ اب ایک ڈالر لگائیں یا پانچ۔ پے منٹ کارڈ کرتا تھا۔ کیش بھی استعمال ہو رہا تھا۔ اب جو ہار رہا ہوتا وہ بھی خوش نہ تھا اور جو جیت بھی رہا تھا وہ بھی منہ لٹکائے بیٹھا تھا۔ ہارنے والا مغموم اس لیے تھا کہ وہ ہار کر اپنا نقصان پورا کرنے کی کوشش میں غرق تھا اور جیتنے والا زیادہ جیتنے کے چکر میں تھا۔

طارق کچھ ایک اور پانچ ڈالر کے نوٹ لایا تھا۔ کئی ایک مشینوں پر ترائی کی مگر ہارتا چلا گیا۔

جیک پاٹ ہر ایک کا نہیں لگتا مگر ہر ایک جیک پاٹ لگنے کا منتظر تھا۔ کئی ایک طرح کی مشینیں تھیں۔ ہر مشین میں کمپیوٹر چپ لگی ہوتی ہے۔ یہ چپ ایک طرح سے پروگرام ہوتی ہے کہ کتنے فیصد آپ کی لگائی رقم پر آپ کو ادائیگی کرے گی۔ ہر مشین اوسط پچاسی سے پچانوے فیصد ادائیگی کرتی ہے۔ ہر اسٹیٹ کا گیم بلنگ کمیشن ہوتا ہے جو جوا خانوں پر نظر رکھتا ہے کہ ان کی مشینیں صحیح ادائیگی کر رہی ہیں یا نہیں۔ کھیلنے والے اناڑی بھی ہوتے ہیں اور کھلاڑی بھی۔ ایک طارق تھا جو بلا سوچے سمجھے کھیل رہا تھا۔ کچھ ایک مشین پر بیس ڈالر لگاتے ہیں۔ اگر پچیس بن گئے تو دوسری مشین پر جا کر پانچ ڈالر لگا دیتے ہیں۔ میں ادھر خدانخواستہ آپ لوگوں کو جوا نہیں سکھلا رہا ورنہ آپ کو جغادریوں کے وہ کرتوت بتاتا جو پورا دن لگا کر ڈیڑھ دو سو ڈالر بنا کر لے جاتے ہیں۔ میں بہت غور و خوض سے سب کو کھیلتے دیکھ کر کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سلاٹ مشین پر کسی کا جیک پاٹ نکل آیا تو اس نے بہت بڑی رقم بھی بنالی۔

جوے کی یہ لت زیادہ تر بوڑھے مرد و زن کو پڑی تھی۔ ایک مشین سے اٹھے اور دوسری کے سامنے کرسی پر جم گئے۔ اگر جیت رہے ہوں تو ارد گرد مجمع لگ گیا۔ جیتنے پر تالیاں اور ہارنے پر واہ واہ کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ میں مغربی دنیا کے اس نئے روپ کو دیکھ رہا تھا۔ یہ کیسینو صرف مغربی ممالک میں نہیں بلکہ مشرق بعید کے ممالک کے علاوہ دنیا کے ہر ملک میں پھیلے ہیں۔ صرف اٹلانٹک سٹی میں اربوں ڈالر کا جوا ہر سال ہوتا ہے۔

روشنیوں کا راج تھا اور ہارے ہوئے بجھے دل تھے۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اس کے علاوہ ان کہانیوں پر فلمیں اور کارٹون بنا کر بھی بچوں کی اصلاح کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ''کچھوا اور بچھو'' کی کہانی۔

ایک بچھو ایک کچھوے سے درخواست کرتا ہے کہ وہ اسے دریا کے پار کرا دے۔ کچھوا اسے اپنی کمر پر بٹھا کر دریا پار کرانے لگتا ہے۔ اس دوران بچھو بار بار اس کی کمر پر ڈنک مارتا ہے۔ کچھوا اس سے کہتا ہے کہ وہ ایسا نہ کرے تو بچھو کہتا ہے۔ ''میں اپنی عادت سے مجبور ہوں۔''

اس پر کچھوے کو غصہ آجاتا ہے اور وہ کہتا ہے۔ ''تو پھر میں بھی اپنی عادت سے مجبور ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ دریا میں غوطہ لگا دیتا ہے اور بچھو دریا میں ڈوب کر مر جاتا ہے۔

اس کہانی کو سن کر یا پڑھ کر بچے آسانی سے سمجھ جاتے ہیں احسان فراموشی کا انجام برا ہوتا ہے۔ ایسوپ نے نہ صرف انسانوں کو اخلاق سکھانے کے لیے جانوروں کے کرداروں کی مدد سے کہانیاں بیان کرنے کا فن تخلیق کیا اور لاتعداد کہانیاں تخلیق کیں بلکہ جانوروں کے ذریعے کہانیاں بیان کرنے کا فن بھی ہمیں دیا۔

اس وقت ایسوپ کی حکایات کے نام سے جو مرتب شدہ کہانیاں موجود ہیں، ان کو مختلف ذرائع سے مرتب کیا گیا ہے۔ ان میں بہت سی کہانیاں ایسوپ سے بہت پہلے کے مصنفین سے اخذ ہیں۔ سقراط جب قید میں تھا تو افلاطون نے اس سے کہا۔ ''آپ اپنا وقت گزارنے کے لیے ایسوپ کی کہانیوں کو نثر کے پیرائے میں ڈھالیں۔''

ایک اور یونانی فلسفی دیمیتریس فلاریس نے 300 قبل مسیح میں ان کہانیوں کا پہلا مجموعہ مرتب کیا۔ بعد ازاں 25 قبل مسیح میں ایک اور غلام فیدرس نے ان کو لاطینی زبانی میں ترجمہ کیا۔ ان دونوں مجموعوں کی حکایات کو جلد ہی اکٹھا کر دیا گیا اور آخر کار 230ء میں بیبرس نے ان کو یونانی زبان میں ترجمہ کیا۔

جے کو مشینوں پر کھیلنے سے کوئی زیادہ دل چسپی نہ تھی۔ وہ صرف میرے سوالوں کے جواب دیتا اور مجھے کھیلنے کے طریقے بتا رہا تھا۔ طارق زیادہ تر ہار گیا تھا۔ ایک دو جگہ جیتا تو پھر اپنے پیسے پورے کرنے کی حسرت جاگی۔ پھر کھیلا اور دوبارہ ہار گیا۔

آگے بڑھے تو ایک بڑا سا پہیا لگا تھا۔ اس میں ڈالر ڈالیں اور اگر سوئی زیرو پر رکے تو چالیس گنا پیسے ملتے ہیں۔ کچھ ہندسوں پر کم جیت ہوتی ہے اور کچھ پر رقم ڈوب جاتی ہے۔ جے مجھ سے کہہ رہا تھا کہ میں ایک بار تو کچھ کھیلوں۔ طارق ہار کر اب کسی نصیحت کی پوزیشن میں نہ تھا۔ میں نے پیسے والی مشین میں دس ڈالر لگائے۔ پہیا گھمانے کا بٹن دبایا اور تیر کا نشان زیرو پر آگا اور مجھے چار سو مل گئے۔ میرے چاروں جانب تالیوں کی گونج تھی اور میں مڑ مڑ کر سب کو خوش ہوتے دیکھ رہا تھا جو میری اس ناگہانی جیت پر تمتما رہے تھے۔ جے نے کہا۔ ''اور لگاؤ، تم جیت رہے ہو۔''

میں بولا۔ ''کیا پاگل سمجھا ہے۔'' میں جیت کر اور جیتنے کی خواہش رکھنے والوں کا انجام دیکھتا آرہا تھا۔ جے کے ساتھ کاؤنٹر پر جا کر چار سو ڈالر کیش کروائے تو جے بولا۔ ''بیئر ہی پلوا دو۔''

میری مسلمانی غیرت نے جوش مارا اور بولا۔ ''شراب ہمارے مذہب میں ممنوع ہے۔''

وہ بولا۔ ''ایسا کیوں؟''

میں نے کہا۔ ''بس حرام ہے۔''

جے حیران ہو کر بولا۔ ''یہ حرام کیا ہوتا ہے۔''

میں جوئے میں جیتے ہوئے پیسے بٹوے میں رکھتے ہوئے بولا۔ ''شراب پینے اور پلانے سے روکا گیا ہے۔''

وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی سر ہلانے لگا اور میں جوئے کی کمائی پر اوپری طور پر مسرور تھا۔

اتنے میں طارق بھی ڈولتا ہوا آپہنچا۔ حیرت ناک طور پر اس کی چھینکیں کیسینو میں رک گئی تھیں۔ جے بولا۔ ''ٹیبل پر چلتے ہیں۔''

ٹیبلز پر پتے چلتے تھے۔ مشینوں پر تو لک چلتی ہے مگر ٹیبل پر ٹرک بھی چلتا ہے۔ اب میں اردگرد کی روشنیوں اور رونق میلہ سے لاتعلق ہو چکا تھا۔ نہ مجھے یہ معلوم تھا کہ چھتیں کیسی ہیں یا فرشوں پر قالین بچھے ہیں۔ کوئی مجسمہ لگا ہے... یا کوئی فوارے چل رہے ہیں؟ میری جیب میں جوئے کی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اس مجموعے کا عربی اور عبرانی زبان میں ترجمہ ہوا اور یوں ان حکایات میں ان دونوں تہذیبوں کا رنگ اور اضافی حکایات بھی شامل ہوگئیں۔

ایسوپ جس کی کہانیوں کی شہرہ آفاقیت کے بارے میں اب تک اتنی باتیں بتا چکا ہوں، اس کے بارے میں یہ بتانا بہت ضروری ہے کہ اس نے اپنی کہانیوں کو کبھی تحریری شکل نہیں دی تھی۔ روایت ہے کہ وہ زبانی کہانیاں سنایا کرتا تھا جو عام طور پر منظوم ہوتی تھیں۔ وہ تقاریب یا ملاقاتوں کے دوران مجذوبانہ رنگ میں جو باتیں کرتا تھا ان میں یہ منظوم کہانیاں بھی ہوتی تھیں۔ سقراط نے قید کے دوران اس کی کچھ حکایتوں کو نثر کے انداز میں تحریر کیا تھا جبکہ فیلام کے ڈیمیٹرس نے (345-283 B.C) کے دوران اس کی حکایتوں کو نثر کی شکل میں دس کتابوں میں جمع کیا۔ تاہم یہ مجموعات تاریخ میں کہیں کھو گئے۔ بیبرس نے تیسری صدی عیسوی میں ان حکایتوں کو نظموں کی شکل میں تحریر کیا۔ ان حکایتوں کو لاطینی زبان میں ڈھالنے والا مصنف فیدرس تھا جو کہ آگسٹس کا آزاد کردہ ایک غلام تھا۔

زمانہ قدیم سے ہی ایسوپ کی کہانیاں مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو کر مختلف تہذیبوں میں ڈھلتی گئیں۔ یوں یہ کہانیاں عالمی کہانیوں میں تبدیل ہوگئیں۔ جن کو آج دنیا بھر کے بچے نہایت شوق سے پڑھتے ہیں۔ ان کو مختلف انداز میں پیش کر کے بچوں کو اخلاقیات سے مزین کیا جاتا ہے۔

ایسوپ کے آباؤ اجداد کے بارے میں بہت کم معلومات دستیاب ہیں۔ اس کی جائے پیدائش کے بارے میں بھی اتفاق رائے موجود نہیں۔ امکان ہے کہ ایسوپ کا نام ایتھوپیائی زبان سے اخذ کیا گیا۔ کیونکہ عام طور پر یونانی لوگ اندرون افریقا کے سیاہ فام لوگوں کے لیے ایسوپ کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ ایسوپ کی زندگی کے بارے میں بھی زیادہ تر معلومات تاریخ کے دھندلکوں میں چھپی ہوئی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ 550 صدی قبل مسیح میں غلام کے طور پر

کمائی آئی اور میں گرد و نواح سے بیگانہ ہوگیا۔ یہ اس چار سو ڈالر کا جادو تھا جو میں اپنے علاوہ سب کچھ فراموش کرتا جا رہا تھا۔ جے نے ٹیبل پر جانے کا کہا اور میں بخوشی چلا آیا۔ FortuneOfWheel سے تو چار سو ڈالر بچا کر لے آیا تھا اور اب کسی ٹیبل پر اسے دوگنا کرنے کی خواہش دل میں ایسے اٹھی جیسے کالا ناگ اپنا پھن اٹھاتا ہے۔

ہم ایک بہت بڑے ہال میں آئے، جہاں بہت سی میزیں کچھ فاصلوں پر رکھی تھیں۔ اردگرد مجمع کھڑا تماشا دیکھ رہا تھا۔ کچھ ایسی میزیں بھی تھیں جن کے گرد ایک قسم کی زنجیر لگی تھی یا کوئی احاطہ سا بنا دیا گیا تھا۔ جے میری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ "یہاں بڑی رقمیں لگتی ہیں۔"

میں نے دانش مندی سے اپنا جیتا ہوا سر ہلایا۔

پھر ہم مختلف میزوں کے قریب جا جا کر صورتِ حال کا جائزہ لینے لگے۔ پوکر اور بلیک جیک مختلف میزوں پر کھیلی جا رہی تھی۔ ہر ٹیبل کا فرق یہ تھا کہ کسی پر زیادہ سے زیادہ پندرہ ڈالر لگا سکتے تھے اور کسی پر سو ڈالر سے زیادہ نہیں لگا سکتے تھے۔ ایک میز کے گرد دو اسٹول خالی تھے۔ ہر ایک پر سات یا آٹھ کھیلنے والے منہمک بیٹھے نظر آ رہے تھے۔

ہم ان دو اسٹولوں پر بیٹھ گئے اور طارق منہ لٹکائے ہمارے پیچھے کھڑا ہوگیا۔ جے نے مجھے بنیادی تربیت دی اور خود کھیلنے میں مصروف ہوگیا۔ اب میں کھیل کی تفصیل میں نہیں جاتا۔ پتے بانٹنے والے کو ڈیلر کہتے ہیں۔ دس یا شاید اس سے زیادہ گڈیاں ایک وقت میں استعمال ہوتی ہیں۔ ڈیلر کی پھرتی ناقابل یقین تھی۔ وہ ہر ایک کے آگے تین پتے پھینکتا تھا۔ پتے پکڑ کر کچھ بلائنڈ کھیلتے اور کچھ دیکھ کر چال چلتے۔ ٹیبل پر کیش نہیں چلتا۔ کھیلنے والا ڈیلر سے ڈالر دے کر ایک سے سو ڈالر کا چپس لے سکتا ہے۔ جے نے دو ڈالر کے چپس میز پر رکھ کر لگائے۔ پتے کام کے نہیں تھے اس نے پتے پھینک دیے۔ میز پر تین عورتیں اور دو مرد اور بیٹھے تھے اور سب بیئر پی رہے تھے۔ ایک عورت نے دس لگا کر پچاس ڈالر جیت لیے۔ خوشی سے چہرہ چمک اٹھا اور دو ڈالر کے چپس ڈیلر کو ٹپ میں دیے اور اپنے لیے ایک اور بوتل منگوالی۔

میں بڑی دلچسپی سے یہ سب ہوتا دیکھ رہا تھا۔ ایک گیم دو منٹ میں ختم ہو جاتی۔ جے ہارتے ہارتے جیتنے لگا۔ اس کی چال پانچ سے بڑھ کر پندرہ ڈالر تک آ پہنچی۔ اب جے سو ڈالر سے پانچ سو بنا چکا تھا اور تین بیئر بھی چڑھا چکا تھا۔ جے کے علاوہ وہی عورت جیت رہی تھی۔ پھر ایک اور ڈیلر آیا اور

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

جزیرہ ساموس میں رہتا تھا۔ وہ زانتھوس نامی کسی شخص کا غلام تھا۔ سامی زعما کے لیے اپنی خدمات اور ان کے عوامی دفاع پر ایسوپ کو غلامی سے آزاد کر دیا گیا تھا۔ وہ کروالیس کے دربار میں رہنے لگا جہاں اس نے خاصا نام اور بڑی عزت کمائی۔

شاہوں کے دربار میں شاہوں کے گن گانے والے ہی رہ سکتے ہیں۔ ایسوپ نے اپنی کہانیوں کے ذریعے جب ظلم و جبر کے خلاف آواز اٹھائی تو شہنشاہ وقت پسیس اسٹر اٹس بھڑک اٹھا جو آزادی رائے کے خلاف تھا۔

ایسوپ کی موت بڑے پر تشدد اور المناک انداز میں ہوئی۔ اسے ڈیلفی کے باشندوں نے ایک بلند چٹان سے دھکا دے کر نیچے پھینکا تھا۔ اس پر بہت سے الزامات لگائے گئے۔ قدرت کا کرنا یوں ہوا کہ اس کی موت کے بعد طاعون کی وبا پھیل گئی۔ جس کے بارے میں سمجھا گیا کہ قدرت کی طرف سے ایسوپ جیسے پیغمبر اخلاق کے قتل کی سزا ہے جس پر ڈیلفی کے باسیوں نے اعلان کیا کہ وہ ایسوپ کی موت کا کفارہ ادا کریں گے۔ کیونکہ ایسوپ کا کوئی قریب ترین رشتہ دار موجود نہیں تھا اس لیے یہ کفارہ ایسوپ کے سابق آقا تے پوتے لیڈمن نے وصول کیا۔

روایت کے مطابق ایسوپ نہایت بدصورت اور بدوضع تھا۔ یہی وجہ ہے کہ روم میں دلا البانی کے مقام پر اس کا سنگ مرمر کا جو مجسمہ ''ایسوپ کا پورٹریٹ'' کے نام سے لگایا گیا وہ بھی دیکھنے میں مضحکہ خیز ہے۔

ایسوپ کی تخلیق کردہ ہزاروں سال پرانی کہانیاں آج بھی تروتازہ ہیں اور شوق سے پڑھی اور سنی جاتی ہیں۔ دنیا بھر کے بچے آنے والے زمانے میں بھی ان کہانیوں سے اخلاقیات کا سبق حاصل کرتے رہیں گے۔ کیونکہ اچھی کہانی کبھی پرانی نہیں ہوتی۔

مرسلہ: عائشہ انور۔ کراچی

پہلے والے کو چلتا کیا۔ اس کے جانے پر سب نے احتجاج کیا۔ ایسا احتجاج علامتی ہوتا ہے اور جس نے جانا ہوتا ہے وہ رکتا نہیں۔

دوسرا آیا تو کھیل پھر شروع ہو گیا۔ جے اب پانچ سو سے بڑھ کر اپنی جیت کو ہزار ڈالر پر لا چکا تھا۔ طارق میرے کان میں بولا۔ ''اتنی تو اس کی پندرہ دن کی تنخواہ بھی نہیں ہے۔''

اب جوئے کے آکٹوپس نے مجھے جکڑ لیا تھا۔ بس جے کے یہ کہنے کی دیر تھی۔ ''چار سو میں سے صرف سو ہی لگا لو۔''

میں نے سوڈالر نکالے اور ڈیلر سے چپس لے لیے۔

کچھ دیر میں میرے پاس سو سے تین سو زیادہ ہو چکے تھے، اب میں طارق کی بھی نہ سنتا تھا جو میرے پیچھے کھڑا کچھ کہہ رہا تھا اور میں صرف برف، کالنگ کارڈ، محنت، رات دن اور چھولے ہی سن پایا تھا۔ میں جیتنے لگا تو وہ والا ڈیلر بھی تبدیل ہو گیا۔ اب ہنستی مسکراتی لڑکی ہمارے سامنے کھڑی تھی۔

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ ہر ٹیبل کے اوپر کیمرے لگے ہوتے ہیں۔ بہت باریک بینی سے ہر ٹیبل کو دیکھا جا رہا ہوتا ہے۔ جہاں ڈیلر ہارتا ہے تو اوپر سے فرش پر کالے سوٹ میں پھرتے سپروائزر کو بتا دیا جاتا ہے کہ اس ٹیبل کا ڈیلر تبدیل کر کے اس کو لگا دو۔ اب وہ لڑکی پتے بانٹنے لگی۔ جے اور میں خوش تھے کہ لڑکیاں نرم دل ہوتی ہیں۔ میرے پاس سو کی جگہ آٹھ سو تھے اور جے ہزار کراس کر چکا تھا۔ لڑکی کے ہاتھوں پہلے ہم تھوڑا سا ہارے اور پھر زیادہ ہارتے گئے۔ ہاری ہوئی دولت کو دوبارہ پانے کے لیے میں زیادہ لگاتا گیا اور سب لٹاتا رہا۔ ایک گھنٹے میں اس ہار جیت کے درمیان میں وہ چار سو بھی ہار چکا تھا جو ہیل پر جیت کر آیا تھا۔ جے کے پاس اپنے سو کے علاوہ ایک سو اور پر تھا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور میں بھی خالی ہاتھ کھڑا تھا۔

ہر ہارے ہوئے انسان کی طرح میں بھی پشیمان کھڑا تھا۔ یہ سوچ رہا تھا کہ وہی جیتے ہوئے چار سو ہی رکھ لیتا۔ جے کے کہنے پر نہ کھیلتا؟ مگر اب سب جیتے ہوئے ڈالر جا چکے تھے۔ پہلے انسان ہو کر پچھتایا تھا اور اب مسلمان بنا شرمندہ کھڑا تھا۔ کیوں میں نے گناہ بھی کمایا اور ہاتھ بھی کچھ نہ آیا۔ مجھے جوئے کے پہلے دن ہی معلوم ہو چکا تھا کہ جتنا زیادہ آپ جیتتے ہیں اتنا ہی کسی دلدل میں گرتے جاتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ پانے کی ہوس آپ کو اندھا کر دیتی ہے۔ پہلے جیت کر زیادہ بنانے کا لالچ اور پھر ہار کر واپس

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

لینے کی جستجو۔ میں اس کیسینو میں آنے سے پہلے ایک کھلے اور روشن دماغ والا انسان تھا جو ہر نئی چیز کو بغور دیکھتا تھا اور اب ہارنے کا غم اور گناہ کا بوجھ لیے ایک پریشان دماغ سوچوں میں گھرا کھڑا تھا۔ میں نے کچھ دیر کے لیے سوچا کہ ایک تو مجھے ہر نیا تجربہ کرنے کا شوق ہے اور یہ بھی کرلیا۔ پھر سوچا کہ میں جیسے آیا تھا ویسے ہی واپس جارہا ہوں۔ اپنے پلے سے تو نہیں گیا۔ یہ بھی سوچتا کہ اگر میں جیت کر ڈالر اپنے ساتھ لے آتا تو خرچ کہاں کرتا؟ اپنے کھانے پر، بچوں کے لیے یا اپنی اور ضرورتوں کے لیے؟ کس منہ سے خرچ کرتا کیونکہ ایک بوجھ سا دل میں رہتا۔ ان پیسوں کی تو میں خیرات بھی نہ کرسکتا تھا۔ جب ایسا سوچتا گیا تو دوبارہ سے اپنی پہلے والی حالت میں آتا چلا گیا جو غبار دماغ پر چھایا تھا وہ نکل گیا اور پھر سے میں اپنے اردگرد کے لوگوں اور ماحول کو دیکھنے لگا۔

طارق نے گھڑی پر ٹائم دیکھا تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ ٹائم دیکھ کر بولا۔ ''اب واپس چلنا چاہیے۔''

میں نے کہا۔ ''ایک بار بیچ کو دیکھ لینے دو۔''

یہ سن کر طارق بھڑک اٹھا اور ڈانٹنے لگا۔ ''اس وقت کون بیچ پر ہوگا جس کو تم نے دیکھنا ہے؟''

میں نے سرجی کی طرح بڑی نفاست سے کہا۔ ''مجھے بورڈ واک کو ایک نظر دیکھنا ہے۔''

یہ سن کر وہ پہلے تو اچھا خاصا حیران ہوا اور پھر اسی حالت میں بولا۔ ''یہ کیا ہے؟ اور تمہیں کس نے بورڈ واک کے بارے میں بتایا؟''

میں نے کہا۔ ''سب بتاؤں گا، پہلے لے تو چلو۔''

سردی اب کاٹے جارہی تھی۔ طارق بڑبڑا رہا تھا۔ جے کا نشہ خراب ہورہا تھا، وہ بادل نخواستہ ہمارے ساتھ چل رہا تھا۔

بیچ کے کناروں پر روشنیاں تھیں۔ کیسینو، کلب اور بہت سی جگہوں سے روشنیاں سمندر میں کودنے پر آپس میں لڑ بھڑ رہی تھیں۔ پانی دور تھا مگر اس کی لہریں بیچ سے سر ٹکرا کر واپس جھاگ چھوڑتی چلی جارہی تھیں۔ بیچ کے بعد سمندر میں ابھار تھا اور لہروں کا شور تھا۔ بورڈ واک دراصل لکڑی کا ایک چوڑا پلیٹ فارم ہے جو کئی میل لمبا ہے۔ گرمیوں میں اس پر ہزاروں لوگ ٹہلتے ہیں اور سمندر کو مختلف منظروں میں دیکھنے یہاں آتے ہیں۔

یہ بورڈ واک بیچ سے چند فٹ اوپر ہے۔ اب کہیں کہیں پختہ اینٹوں میں تبدیل ہوچکی ہے اور بہت سا حصہ لکڑی کے تختوں سے بنا ہے۔ ایک شاندار منظر تھا مگر اس میں بڑبڑاتا ہوا طارق اور نشے میں ڈولتا جے بھی تھا۔ میں یہاں کچھ دیر ٹھہرتا مگر ان دونوں کی موجودگی سمندر کو بھی ناگوار گزر رہی تھی۔ تبھی تو وہ اب باقاعدہ غرانے لگا تھا۔

ہم نے پارکنگ سے گاڑی نکالی اور واپس روانہ ہوگئے۔ جے بیٹھتے ہی اونگھنے لگا۔ ہم زیادہ روشنیوں سے نکل کر کم روشنیوں میں آگئے۔

طارق نے مجھ سے پوچھا۔ ''کل کتنے بجے واپسی ہے؟''

میں نے کہا۔ ''رات کو کوئی بھی بس پکڑ کر صبح ٹورنٹو پہنچ جاؤں گا۔''

اس کی کل چھٹی تھی۔ کہنے لگا کہ میرے ایک دوست کی والدہ پاکستان میں وفات پاگئی ہیں۔ ان کی دوپہر کے بعد فاتحہ خوانی ہے اور وہیں سے کھانا کھا کر میں تمہیں مونٹین میں گرے ہاؤنڈ کے ٹرمینل پر چھوڑ دوں گا۔ پھر کہا کہ پاکستان سے ایک بہت بڑے عالم بھی آئے ہوئے ہیں۔ وہ دعا کروائیں گے۔ میں سن کر خاموش ہوگیا۔

کچھ دیر یہی خاموشی رہی اور پھر اچانک اسے کچھ یاد آیا اور مجھے گھور کر بولا۔ ''یہ بورڈ واک کا تمہیں کہاں سے معلوم ہوا؟''

میں نے بتایا۔ ''1853ء میں یہاں پہلا ہوٹل اور ریزارٹ بنا تھا۔'' یہ سن کر وہ پہلے حیرت زدہ ہوا اور پھر اسے ایک زوردار چھینک آئی۔ کہنے لگا۔ ''تمہیں کس نے بتایا؟'' اور پھر اپنے سوال کا جواب بھی خود ہی دیا۔ ''میوزیم والوں نے بتایا ہوگا۔''

میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''یہ ریزارٹ چھ سو کمروں پر محیط تھا اور دو ہزار لوگوں کے ٹھہرنے کی گنجائش تھی اور ان دنوں امریکا کا سب سے بڑا ہوٹل تھا۔''

کہنے لگا۔ ''پہلے یہ بتاؤ، یہ سب تمہیں کس نے بتایا ہے۔ مجھے اتنے سال ہوگئے ہیں اور کسی نے مجھے آج تک نہیں بتایا۔''

میں نے پیچھے اونگھتے جے کی جانب اشارہ کیا۔ ''اس نے بتایا ہے۔''

یہ سن کر وہ بولا۔ ''اسے اپنے باپ کا پتا نہیں، یہ تمہیں کیا بتائے گا؟''

میں اسے بتانے لگا کہ پہلے ایک ریزارٹ بنا اور پھر

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کچھ اور بننے لگے۔ ہوٹل والے بیچ کی ریت سے ہوٹل کی لابی کو بچانے کے لیے پہلے بیچ کے کنارے لکڑی کے پلیٹ فارم بنادیا کرتے تھے۔ لوگوں نے اس پر کھڑے ہوکر سمندر کا نظارہ کرنا شروع کردیا۔ ہوٹل والوں نے سیاحوں کی دل چسپی دیکھی تو یہاں آٹھ میل لمبی بورڈ واک بن گئی۔ اس نے اتنی شہرت پائی کہ 1874ء میں یہاں ایک سال میں پانچ لاکھ سیاح ملک کے مختلف علاقوں سے آنے لگے۔ دن میں بیچ میں نہاتے اور شام کو بورڈ واک کرتے۔ بورڈ واک کرنے والوں کا ایسا ہجوم ہوتا جیسے کوئی بڑا جلسہ ہورہا ہو۔

طارق حیران تھا کہ مجھے آئے ہوئے تین ماہ ہوئے ہیں اور میں اسے بتا رہا ہوں کہ اٹلانٹک سٹی کی تاریخ کیا ہے مگر اب وہ غور سے میری باتیں سن رہا تھا۔

میں نے اپنی بات جاری رکھی اور اسے بتایا کہ دیکھتے ہی دیکھتے اٹلانٹک سٹی امریکا کی بہترین تفریح گاہ بن گئی۔ سول وار کا خاتمہ ہوچکا تھا۔ سرمایہ داروں کے ہاتھ دولت کے انبار لگنا شروع ہوگئے تھے۔ وہ جوق در جوق اٹلانٹک سٹی آنا شروع ہوگئے۔ شروع میں یہاں شراب ممنوع تھی مگر مقامی پولیس کی ملی بھگت سے یہاں الکوحل چوری چھپے مل جایا کرتی تھی۔ جب مشرقی یورپ کے بھوکے ننگے لوگ نیویارک میں بحری جہازوں سے لٹے پٹے آرہے تھے تو پیسے والے ہزاروں کی تعداد میں یہاں رنگ رلیاں منایا کرتے تھے۔

یہ سن کر وہ بولا۔ ''بیچ پر رنگ رلیاں نہ مناتے تو کیا نمازیں پڑھتے؟''

میں اپنی معلومات کے دریا بہاتے ہوئے اسے بتا رہا تھا کہ جنگ عظیم دوم شروع ہوئی تو یہاں کچھ ٹھہراؤ آیا۔ جنگ کے خاتمے کے بعد یہ پھر سے آباد ہونا شروع ہوئی۔ 1947ء میں یہاں ایک بڑا سمندری طوفان آیا۔ بورڈ واک اسی کی نظر ہوئی اور پانی شہر میں آگیا۔ بہت کچھ تباہ ہوا اور ہمیشہ کی طرح انہوں نے دوبارہ اسے آباد کرلیا مگر پھر یہاں ہوٹل انڈسٹری بیٹھنا شروع ہوگئی۔

''کیا سمندری طوفان کے ڈر سے؟'' طارق بولا۔

پھر خود ہی بڑبڑایا۔ ''یہ لوگ اندر سے بہت بزدل ہوتے ہیں۔ کوئی خطرہ ہو تو فوراً بھاگ جاتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں۔ وجہ یہ تھی کہ جنگ کے بعد موٹر انڈسٹری نے بہت ترقی کی۔ لوگ ٹرین کے لمبے سفر کی بجائے اپنی گاڑیوں سے آنا شروع ہوئے۔ ٹرین سے آتے تو ڈیڑھ دو ہفتے ٹھہر جاتے۔ اپنی گاڑیوں سے آنا شروع ہوئے تو دو تین دن بعد واپس ہوجاتے مگر اسی دوران میامی اور بہاماس کی گرم بچیں آباد ہوگئیں۔ ایئر لائن والوں نے وہاں کے لیے سستے ٹکٹ دینا شروع کردیے۔ میامی یہاں سے سستا تھا اسی لیے لوگ اٹلانٹک سٹی کو چھوڑ کر وہاں جانے لگے۔ پھر یہاں کے ہوٹل ویران ہونے لگے۔

طارق اب دل چسپی لے رہا تھا اس نے پوچھا۔ ''یہ پھر دوبارہ کیسے آباد ہوا؟''

1974ء میں ریفرنڈم ہوا کہ یہاں کیسینو کھولے جائیں یا نہیں۔ لوگوں نے کیسینوز کھولنے کے حق میں ووٹ دیا۔ پہلا کیسینو 1978ء میں بنا۔ پھر تو کیسینو بنتے چلے گئے۔ سینکڑوں کلب بن گئے۔ بورڈ واک کو نئے سرے سے بنایا گیا۔ اس طرح لاس ویگاس کے بعد سب سے زیادہ کیسینوز یہاں بن گئے۔ گو پہلے والی چہل پہل نہیں ہے پھر بھی سالانہ تین ارب ڈالر کا کاروبار ہوتا ہے۔

طارق سنتا رہا اور جب میں نے اپنی باتیں ختم کیں تو کہنے لگا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آرہا، آخر ان معلومات کا مجھے یا تجھے فائدہ کیا ہوا؟''

میں نے کہا۔ ''تم بتاؤ، نقصان کیا ہوا؟''

یہ سن کر وہ سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ اب اسے بھی جگہ جگہ کی تاریخ اور جغرافیے سے دل چسپی ہورہی ہے۔ جے کو گالی دے کر بولا۔ ''اس بھنگی کو بھی اس کے گھر اتارنا ہے۔''

ہم جے کو اتار کر گھر پہنچے تو صبح کے تین بج رہے تھے۔ فریج سے کھانا نکال کر گرم کیا اور لیونگ روم میں کپڑے تبدیل کیے بغیر صوفے پر سو گیا۔

پھر آنکھ کھلی تو صبح ہوچکی تھی۔ یہ میرا نیویارک میں آخری دن تھا۔ بہار کی چھٹیاں تھیں اور بچے ابھی سو رہے تھے۔ مجھے رات کو بس سے ٹورنٹو پہنچنا تھا۔ چند دن بعد میری ہیموسال میں جاب شروع ہورہی تھی۔ مجھے نیویارک دیکھنا تھا دیکھا اس دوران میں نے جتنا کچھ دیکھا تھا وہی میرے لیے بہت تھا مگر مجھے ویسا کچھ محسوس نہ ہوا جو میں سوچ کر آیا تھا۔ دیکھا جائے تو مجھے نیویارک کی زندگی پسند ہی نہیں آئی تھی۔ میں اس شور کا بھی عادی نہیں تھا جو یہاں ہر وقت بلند ہوتا رہتا تھا اور نہ اس رفتار کے ہم آہنگ ہوسکا تھا جو یہاں دوڑتی پھرتی تھی۔ مجھے دھیرے سے چلتی ہوائیں پسند تھیں نہ کہ تیزی سے چلتے شور مچاتے جھکڑ۔ مجھے ٹورنٹو لوٹ جانا تھا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

http://paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

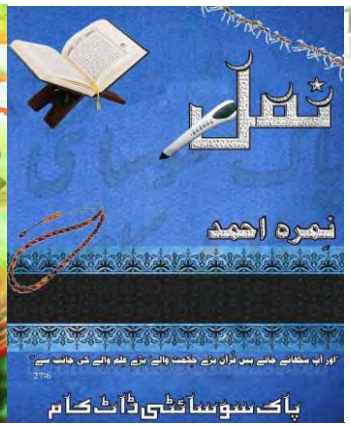

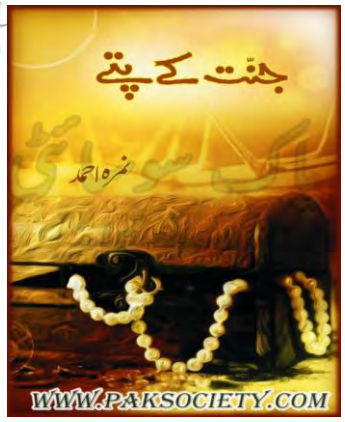

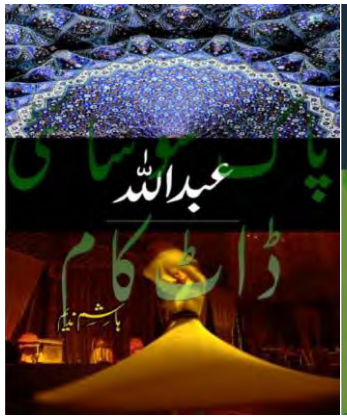

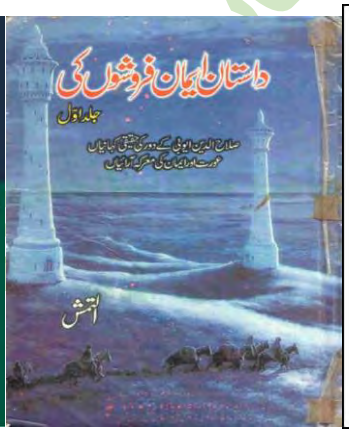

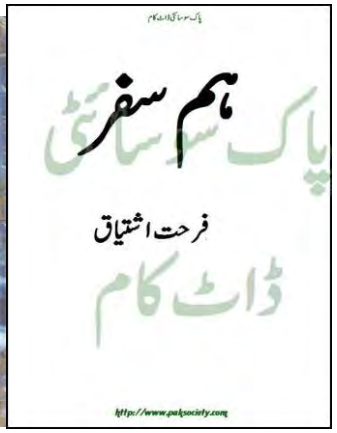

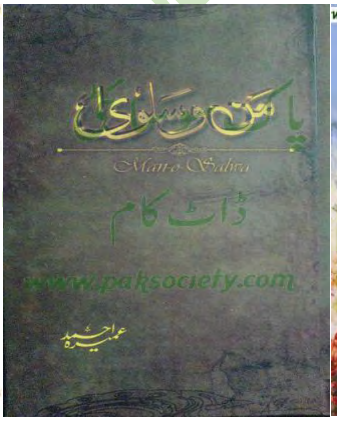

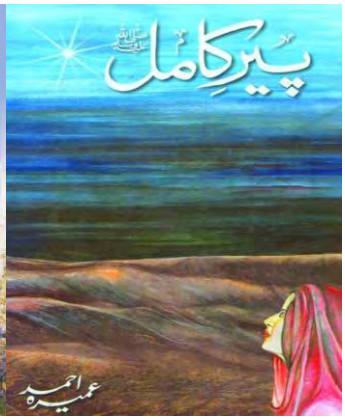

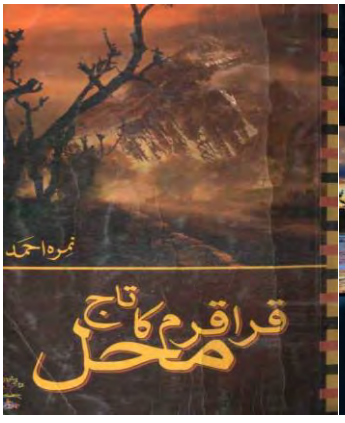

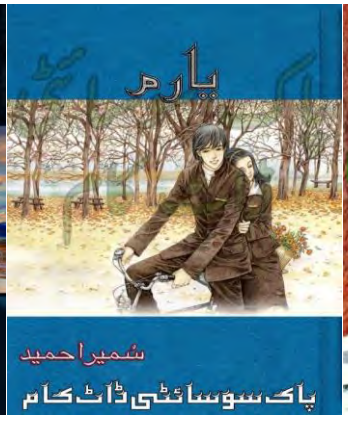

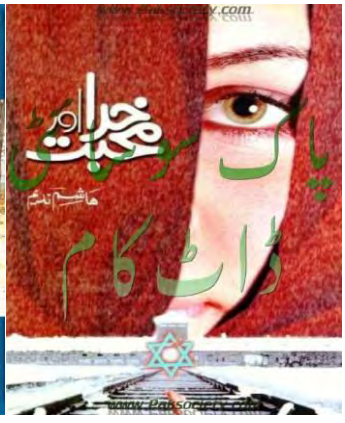

Downloaded from Paksociety.com

کیونکہ وہاں کی زندگی مدھم سروں میں بہتی تھی۔

دن نکل چکا تھا۔ تمنا بھابی صبح کی نماز پڑھ کر دوبارہ سو گئی تھیں۔ طارق اپنا قدیم تولیہ ہاتھ میں پکڑے برآمد ہوا۔ بڑا بے تکا سوال کیا۔ ''چائے پیو گے؟'' پھر ایک زوردار چھینک ماری، ذرا سا ڈگمگایا اور پھر سنبھل کر کچن میں چائے بنانے چلا گیا۔ واپس آیا تو بولا۔ ''آج دوست کے گھر قرآن پاک کے ختم پر جانا ہے، پھر وہیں سے میں بس تک تمہیں چھوڑ آؤں گا۔''

میں نے کہا۔ ''یہ تو تم نے کل بھی بتایا تھا؟''

اس نے جواب نہیں دیا اور کچن کی طرف بڑھ گیا۔ وہ بہت سنجیدگی سے چائے بنا رہا تھا۔ چائے تیار ہوئی تو وہ دو مگ لے آیا۔ ایک میرے حوالے کر کے خود صوفے پر کمبل اوڑھے بیٹھ گیا۔ تولیہ گود میں رکھا تھا اور سرخ آنکھیں کسی سوچ میں ڈوبی تھیں۔

میں نے پوچھا۔ ''رات تم نے کچھ پیا بھی نہیں مگر آنکھیں سرخ کیوں ہو رہی ہیں؟''

انہی آنکھوں سے وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ''اب تو میں حاجی بھی ہو گیا ہوں۔ نہ پیتا ہوں اور نہ پلاتا ہوں۔''

مجھے یاد آ گیا کہ وہ دو سال پہلے اکیلا حج بھی کر آیا ہے۔ میں نے حج کی مبارکباد دی۔ وہ خاموش بیٹھا چائے کی چسکیاں لیتا رہا۔

''حج کا سفر ہی سنا دو۔'' اسے خاموش دیکھ کر میں نے کہا۔ یوں بھی مجھے اس وقت تک حج یا عمرہ کرنے کی سعادت نصیب نہیں ہوئی تھی۔ ہر ایک سے جو بھی وہاں سے آتا تھا۔ اس سے میں مکہ اور مدینہ کے سفر کا حال پوچھا کرتا تھا۔ اس نے بتانا شروع کیا تو میں ان میں کھو سا گیا۔ چونکا تب جب اس نے یہ بتایا کہ وہاں میری جیب کٹ گئی تھی۔ میرا گرین کارڈ، کریڈٹ کارڈز اور نقدی بھی کوئی لے اڑا تھا۔ پھر جو کچھ اس نے بتایا وہ میرے لیے بہت انوکھی بات تھی۔

کہنے لگا۔ ''جب مکہ میں جیب کٹی تو میں بہت پریشان ہوا۔ سوچتا تھا کہ اب امریکا میں داخل کیسے ہوں گا؟ پیسے بھی نہ تھے اور سفری کاغذات بھی کھو چکے تھے۔ گروپ کے ایک بندے سے ڈالر لیے۔ پھر تمنا کو فون کیا اور اسے ہدایات دیں کہ میری فلائٹ کے دن تمہارے پاس جو کچھ بھی میری شناخت کا ہو، لیتی آنا۔ میں وسوسوں کا شکار تھا۔ ڈرا ہوا تھا کہ کہیں واپس پاکستان نہ بھیج دیں۔''

میں نے پریشانی سے پوچھا۔ ''پھر کیا ہوا؟''

''جب نیو یارک ایئر پورٹ پر پہنچا تو انہوں نے میری کہانی سنی۔ میرا انٹرویو لیا اور مجھے جانے دیا۔''

یہ سنا کر اس کی آنکھوں میں پانی پہنے لگا۔ میں نے پوچھا۔ ''اب رو کیوں رہے ہو؟''

گالی دے کر کہنے لگا۔ ''رو کون رہا ہے؟ یہ تو کمبخت الرجی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اسٹوری میں تھرل نہیں ہے؟''

وہ بولا۔ ''کون سا تھرل؟''

میں نے کہا۔ ''تمہیں پکڑ لیتے۔ ہولڈنگ سینٹر میں ڈالتے۔ پولیس اور امیگریشن والے تمہاری ناک رگڑتے اور تم کو بعد میں تنبیہ کر کے چھوڑتے۔''

یہ سن کر وہ بولا۔ ''اللہ اس مصیبت سے بچائے۔ جب پریشانی آتی ہے تو یہ گورے حشر کر دیتے ہیں، تمہیں تو اندازہ بھی نہیں۔''

میں اس کی بات پر ہنس رہا تھا کیونکہ مجھے کیا معلوم تھا کہ میرے ساتھ آج رات کیا ہونے والا ہے۔

تمنا بھابی نے ناشتے میں جو کچھ تیار کیا وہ ہم حلق سے اتار رہے تھے۔ طارق کہنے لگا۔ ''اب تمہیں امریکا کے فارماسسٹ لائسنس کی امتحان کی تیاری کرنی ہے۔ ہیموسال کی جاب پر نہ بیٹھ جانا اسے وقتی طور پر رکھنا۔'' پھر اس نے ایک بھاری بیگ میں اپنی ساری کتابیں مجھے بھر کر دے دیں اس بیگ کا وزن پندرہ کلو سے کم نہ ہوگا۔ اسے اٹھانا بھی جان جوکھوں کا کام تھا۔

کچھ دیر میں شہروز بھی اٹھ آیا۔ میرے تیار بیگ دیکھے تو ان پر چڑھ بیٹھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ میں آج واپس جا رہا ہوں تو گود میں آ کر لپٹ گیا۔ بار بار تقاضا کرنے لگا۔ ''چاچا! ابھی مت جاؤ۔''

طارق نے تمنا بھابی سے پوچھا۔ ''وہ فریدہ کے کیس کا کیا بنا؟''

بھابی نے جواب دیا۔ ''اس کمبخت کو کچھ پیسے تو مل ہی جائیں گے مگر ہمارا انشورنس کا پریمیئم بڑھ جائے گا۔''

میں نے پوچھا۔ ''ماجرہ کیا ہے؟'' تب اس نے مجھے جو کہانی بتائی تو امریکا کے نظام کی خوبی یا خرابی میرے سامنے آئی۔ چند ماہ پہلے میں بھی اپنا ایک واقعہ بیان کر چکا ہوں جب میرا روڈ پر کار کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا اور پھر میں وکیلوں کے چنگل میں پھنس گیا تھا۔ وکیل مجھے کہتے تھے کہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

میں دوسری گاڑی والے کی انشورنس پر کیس کردوں اور یہ کہوں کہ میں تو کام کرنے کے قابل بھی نہیں رہا۔ وکیل مجھے ایک تگڑی رقم دلانے کا وعدہ کررہے تھے اور میں نے اپنے آپ کو اپاہج پیش کرنے سے انکار کردیا تھا۔

اب تمنا بھابی نے جو بتایا اس کا خلاصہ یہ ہے۔ فریدہ کے پاس شہروز بے بی سٹنگ کے لیے جاتا تھا۔ ایک دن تمنا شہروز کو اسکول لینے گئی اور ساتھ میں فریدہ کو بھی لے لیا۔ اسکول پہنچنے سے پہلے تمنا بھابی نے گاڑی کسی دیوار میں یا کہیں اور ماردی۔ گاڑی تو ٹوٹل تباہ ہوگئی۔ لیکن ارشیان بچ گیا کیونکہ وہ بے بی سیٹ پر بندھا تھا۔ تمنا بھابی نے ایک فلک شگاف چیخ ماری ان کی چیخ پر فریدہ اچھل کر گر گئی، اس کا ایک ہاتھ فریکچر ہوگیا۔ فریدہ کے ہاتھ پر پٹی باندھ دی گئی۔ تمنا نے کہا کہ جب تک تمہارا ہاتھ ٹھیک نہیں ہوتا، بے بی سٹنگ کے پیسے تمہیں ملتے رہیں گے۔ فریدہ خوشی خوشی شکریہ ادا کر کے گھر چلی گئی۔ گھر پہنچ کر فریدہ نے شوہر کو تمنا کی سخاوت کے قصے سنائے۔ ڈھیر ساری دعائیں دیں مگر شوہر نامدار کے دیسی دماغ میں کوئی خیال پکنے لگا۔ اس نے اٹارنی کو فون کیا۔ ایسے اٹارنی تو بکروں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اٹارنی نے کہا کہ ایک لاکھ ڈالر انشورنس کمپنی سے دلوا دوں گا مگر سودا ففٹی ففٹی ہوگا۔ پچاس ہزار ڈالر کون چھوڑتا ہے اس نے تمنا بھابی کی انشورنس پر کلیم کردیا۔ فریدہ کو اپاہج بتایا گیا اور یہ بھی کہا کہ مینٹل شاک بھی لگا ہے جس کی وجہ سے وہ اب کچن کا کام بھی نہیں کرسکتی۔ انشورنس کمپنی نے رات دن کے کھانے کے پیسے تو پہلے ادا کردیے کہ ہوٹل سے منگوا لو۔ مینٹل شاک اور ہاتھ کے فریکچر کے علاج کا بندوبست بھی کردیا اور اب کیس کورٹ میں ہے۔ (میرے واپس آنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ ان کو ایک لاکھ ڈالرمل گئے ہیں۔) تمنا بھابی نے فریدہ کا سوشل بائیکاٹ کردیا ہے اور فریدہ کو کوئی پروا بھی نہیں کیونکہ اسے پچاس ہزار ڈالرمل چکے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ تمنا بھابی شدید تم کی کیفیت میں ہیں کیونکہ ان کی گاڑی کا پریمیم بڑھ چکا ہے۔

طارق کے دوست کے گھر دوپہر کا کھانا تھا۔ میں آرام سے آٹھ یا نو بجے کی بس سے اگلی صبح سات بجے ٹورنٹو پہنچ سکتا تھا۔ ہم روانہ ہوئے اور معلوم نہیں کن کن راستوں سے ہوتے ہوئے اس کے دوست کے گھر پہنچے۔ اب میں راستوں پر نظر نہیں رکھتا تھا۔ مجھے یہ فکر تھی کہ اپنا سامان اور کتابوں سے بھرا بیگ میں کس طرح اٹھاؤں گا۔

ایک بڑے گھر کے بڑے کمپاؤنڈ میں گاڑی رکی تو پہلے ہی سے کئی گاڑیاں وہاں پارک تھیں۔ پورا گھر درختوں میں گھرا تھا۔ اندر داخل ہوئے تو ایک روحانی ماحول تھا۔ کارپٹ پر سفید چادریں بچھی تھیں اور مرد حضرات تلاوت کررہے تھے۔ ہم بھی خاموشی سے ایک کونے میں سیپارے لے کر بیٹھ گئے۔ تمنا بھابی گھر کے اس حصے میں چلی گئیں جہاں تمام عورتیں جمع تھیں۔ ہمارے بیچ کچھ چادریں لٹکی تھیں اور وہاں سے متواتر بولنے کی آوازیں ہم تک پہنچ رہی تھیں۔

میں نے قرآن پاک کا پارہ پڑھا اور سب کے ساتھ کھانے کا انتظار کرنے لگا۔ دوپہر کا کھانا نہیں کھایا تھا کہ یہاں آکر پیٹ بھرلوں گا۔ کارپٹ پر بچھی چادر پر ہم اکڑوں بیٹھے تھے جس کی وجہ سے اب کمر میں درد محسوس ہونے لگا تھا۔ کچھ لوگ دیواروں سے ٹیک لگائے ذرا آرام سے بیٹھے تھے۔ اب انتظار کی کیفیت میں بیٹھنا دوبھر ہورہا تھا۔ کسی نے کہا کہ پاکستان سے آئے مولانا صاحب تشریف لارہے ہیں۔ وہ دعا کروائیں گے پھر کھانا ملے گا۔

کچھ دیر بعد مولانا صاحب سفید لباس پر سیاہ عبا پہنے تشریف لے آئے۔ سر پر سفید ٹوپی اور سیاہ داڑھی ان کی بھاری جسامت کے ساتھ انہیں معتبر بنا رہی تھی۔ ہم سب احترام کے ساتھ کھڑے ہوگئے۔ وہ بیٹھے اور ہم بھی حلقہ بنا کر ان کے گرد بیٹھ گئے۔ انہوں نے طائرانہ سی نظر سب پر ڈالی۔ اپنی سیاہ داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور مراقبے میں چلے گئے۔ وہ کسی اور جگہ سے دعا کروا کر آرہے تھے۔ انہوں نے میزبان سے چائے بنانے کا کہا۔ ایک کپ ان کے لیے بن کر آیا۔ چائے پی اور دوبارہ سوچوں میں پڑ گئے۔

میں مولوی صاحبان کی بہت عزت کرتا ہوں۔ وہ جنہوں نے مسجدوں کو بغیر کسی دنیاوی لالچ کے آباد کیا ہوا ہے۔ جاڑوں کے سرد موسموں میں بھی صبح سویرے اٹھ کر مسجد کا دروازہ کھولتے ہیں، جب کہ اس وقت ہم سب خواب خرگوش کے مزے لے رہے ہوتے ہیں۔ لائٹیں ہو یا لیمپ، مولوی صاحب اسی سے مسجد کو روشن کرتے ہیں۔ اذان دے کر ہمیں بتاتے ہیں کہ نماز نیند سے بہتر ہے، آؤ نماز کی طرف، آؤ فلاح کی جانب۔ اللہ اکبر کی گونج رات کے سناٹوں میں تیرتی ہم تک پہنچتی ہے۔ خوش قسمت کلمہ گو بیدار ہوتے ہیں اور اپنا سر اللہ کے آگے زمین پر ٹکا کر یہ اعتراف کرتے ہیں کہ پاک ہے وہ ذات جو سب سے برتر

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ہے۔

قدرت اللہ شہاب اپنی نوکری کے سلسلے میں ہندوستان کے ایک دور دراز علاقے میں تعینات ہوئے۔ وہاں آدمی واسی یعنی جنگلی لوگ رہتے تھے۔ کوئی سواری بھی وہاں نہ جاتی تھی۔ ہر مذہب کے لوگ مگر اپنے مذہب سے نا آشنا لوگ وہاں رہتے تھے۔ وہ گئے تو انہوں نے مسجد کا پوچھا۔ ایک مسجد پائی جس کو تالا لگا تھا۔ پوچھنے پر بتانے والوں نے بتایا کہ ایک مولوی صاحب شاید ایک ماہ میں ایک بار کہیں دور سے یہاں آتے ہیں۔ تالا کھولتے ہیں، مسجد کی صفائی کرتے ہیں۔ اذان گونجتی ہے اور ہم اس دن نماز پڑھتے ہیں۔ شادی ہو تو نکاح پڑھواتے ہیں۔ اسلام کے بنیادی مسائل بتاتے ہیں۔ معاوضہ کچھ نہیں لیتے اور کچھ دن ٹھہر کر کسی اور گاؤں یا مقام کی جانب چلے جاتے ہیں۔ اس مولوی نے اجاڑ لوگوں کو اسلام کے ایک ان دیکھے دھاگے سے باندھ رکھا تھا۔

میں آج ایک مولانا صاحب کے سامنے بیٹھا تھا اور وہ چائے پی کر سوچوں میں گم تھے۔ ہم سب ان کے رعب اور دبدبے سے خاموش بیٹھے تھے۔ وہ کھانا کھا کر آئے تھے اور اب چائے پی کر ہم سب سے دعا کروانے والے تھے سب کی نظریں ان پر ٹکی تھیں کہ ان میں ہلچل پیدا ہوئی اور ایک بیان شروع ہوا۔ پھر ایک گھنٹا گزر گیا اور بیان جاری رہا۔ سب کمزور ایمان کے لوگ پہلو بدل رہے تھے۔ میں بھی پہلو بدل کر دوبارہ اسی حالت میں بیٹھا تھا۔ اردگرد کے صاحبان نے دیواروں سے ٹیک لگائیں اور کچھ غنودگی کے عالم میں چلے گئے۔ کمر تختہ بن گئی تھی۔ پیٹ میں بھی مروڑ اٹھ رہے تھے۔ صاحب ایمان ہوتے تو ڈٹے رہتے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مولانا صاحب کیا فرما رہے ہیں۔ کیونکہ اب وہ ایک البم کھول کر اس مدرسے کی تصویریں دکھلا رہے تھے جو پاکستان کے ایک شہر میں زیر تعمیر تھا۔ وہ چندے کی اپیل کررہے تھے بلکہ نہ دینے پر جہنم کی منظر کشی بھی کررہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ آپ سب ایک جہنمی ماحول میں رہ رہے ہیں۔ اپنی اور اپنے بچوں کی بقا چاہتے ہیں تو دل کھول کر مدرسے کے لیے چندہ دیں۔ سب ڈر گئے اور اپنی حیثیت کے مطابق جو کچھ تھا وہ ان کو نواز دیا۔ ایک صاحب نے مدرسے کے بارے میں کچھ سوالات پوچھے تو بہت غضب ناک ہوئے۔ سوال کو کافرانہ سوچ قرار دے دیا۔ میز بانوں نے معافیاں مانگیں، سوال کرنے والے نے کچھ چندہ دیا تو کچھ سرد ہوئے۔

پھر فرداً فرداً سب سے پوچھا کہ آپ کو اپنے لیے دعا کروانی ہے؟ پھر پردے کے پیچھے خواتین سے باآواز بلند ہو کر کہا کہ میں اتنے دن نیو یارک میں ہوں۔ جس جس نے گھر پر دعا رکھوانی ہو تو اپنا نام، ایڈریس اور فون نمبر بتا دے۔ کچھ کاغذ لکھے ہوئے ان تک پہنچے۔ انہوں نے تعویذ بنا کر جیب میں رکھ لیے۔

شام اترنے والی تھی اور مجھے منہٹن بھی جانا تھا جو کم از کم یہاں سے ڈیڑھ گھنٹے کی ڈرائیو پر تھا۔ مولانا صاحب نے چیکس اور کچھ کیش اپنے سامنے فرش پر رکھا اور بہت رقعت آمیز دعا کروائی۔ ان کو جنت کے سندیسے دیے جنہوں نے چندہ پیش کیا تھا۔ مجھے جنت نہ مل سکی کیونکہ میں اپنی جگہ سے ہلا بھی نہ تھا۔ پھر مجھے بغور دیکھا۔ نام پوچھا اور پھر پوچھا کہ کیا یہیں نیو یارک سے ہوں۔ میں نے نفی میں سر ہلایا اور کہا۔ ”کینیڈا سے آیا ہوں۔“

ایک چمک ان کی آنکھوں میں آئی۔ سوالیہ نظروں سے پھر سب کو دیکھا اور آخر کار اجتماعی دعا کی جو لگ بھگ آدھا گھنٹے جاری رہی۔

دعا خیر کے بعد کھانے کا نقارہ بجا اور ہم تیزی سے اٹھے۔ پلیٹیں بھریں اور روزہ داروں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے ایک خالی کرسی دیکھی اور اس پر جا بیٹھا۔ کچھ دیر بعد مولانا صاحب بھی میرے ساتھ والی کرسی خالی کروا کر اس پر براجمان ہوگئے۔ فرمایا۔ ”آپ ٹورنٹو میں رہتے ہیں؟“

میں نے ادب سے جواب دیا۔ ”جی حضور۔ خادم وہیں رہتا ہے۔“

اس پر وہ بولے۔ ”میرا کینیڈا کا ویزا ہے۔ اگر تم وہاں میرا کچھ انتظام کرواؤ تو میں دعا کروانے وہاں آسکتا ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”دراصل ہمارے ساتھ ایک صاحب کشف بزرگ رہتے ہیں۔ وہ کچھ نہیں کرتے بلکہ رات دن ہمارے لیے دعائیں کرتے رہتے ہیں۔“

پہلے وہ چونکے اور پھر بولے۔ ”ماشاء اللہ، ماشاء اللہ۔ ان مولانا صاحب کا نام کیا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”سرجی۔“

بریانی کا بھرا چمچ ان کے منہ کے پاس جاتے جاتے رک گیا۔ بے یقینی سے میری جانب دیکھا اور میں یقین کے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

عالم میں اب کو فتے کھا رہا تھا۔ مجھ سے اسی عالم میں پوچھا۔ ''یہ ان کا اصلی نام ہے کیا؟''

میں نے کہا۔ ''اصلی نام شاید کوئی اور ہوگا مگر عقیدت مندوں نے انہیں یہ نام دے رکھا ہے۔''

اب مولانا صاحب کھانا چھوڑ کر مجھے شک بھری نظروں سے دیکھنے لگے۔ میں ان کی تشویش کو سمجھ گیا۔ اسی لیے پہلے ان کی توجہ کھانے کی جانب مبذول کروائی اور پھر کہا۔ ''وہ تعویذ نہیں دیتے مگر جب پاؤں پکڑ لیں تو دے بھی دیتے ہیں۔''

مولانا صاحب ایک سرد آہ بھر کر بولے۔ ''ان تعویذ اور گنڈے کرنے والوں نے لوگوں کا ایمان خراب کیا ہوا ہے۔ سب جعلی کام ہے۔'' پھر بریانی کا چمچ بھر کر اپنے حلق مبارک میں ڈالا اور فرمایا۔ ''بہت سے جعلی پیر لوگوں کے ایمان سے کھیل کر مفت کے پیسے بٹورتے ہیں۔''

میں نے سر جھکا کر جواب دیا۔ ''واللہ وہ پیسے نہیں لیتے۔ بس پاؤ دو پاؤ جلیبیاں لیتے ہیں اور وہ بھی گرم دودھ میں ڈال کر۔'' میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''جلیبیاں کھا کر ان کی طبیعت بھی جلالی ہو جاتی ہے اور کبھی کبھی تو حال پڑنے لگتے ہیں۔''

مولانا صاحب کو وہاں بیٹھنا دشوار ہوگیا تو وہ وہاں سے اٹھ کر کہیں اور جا بیٹھے۔

واپسی پر جب طارق مجھے گرے ہاؤنڈ کے ٹرمینل چھوڑنے جا رہا تھا تو میں نے ان مولانا صاحب کے بارے میں پوچھا۔ وہ بتانے لگا کہ ان کا ملٹی پل ویزا لگا ہوا ہے۔ سال میں دو مرتبہ آتے ہیں۔ مدرسے کا چندہ لیتے ہیں اور اس کے بدلے گھر گھر جا کر دعا کرواتے ہیں۔ سب کو یہی کہتے ہیں کہ تم لوگ کافروں کے ملک میں رہتے ہو۔ تمہارا اور بچوں کا ایمان خطرے میں ہے اور دعا کروانا ضروری ہے اور وہ بھی ان سے۔ عورتیں اپنا عقیدہ بچانے کے لیے ان سے دعا کرواتی ہیں۔ چندہ وغیرہ بھی مل جاتا ہے۔ اس طرح سے ہم سب کا ایمان بھی محفوظ ہے اور جہنم جانے کا خوف بھی نہیں رہتا۔

میں ان کا البم دیکھ کر مشکوک ہوگیا تھا لیکن طارق کو بتانا مناسب نہ سمجھا کہ میں ان کے ساتھ کیا کر آیا ہوں۔ کیونکہ تمنا بھابی بھی ساتھ بیٹھی تھیں اور انہوں نے بھی اپنا ایمان اسی طرح سے محفوظ کیا ہوا تھا۔

طارق نے مجھے منہٹن میں گرے ہاؤنڈ بس سروس کے ٹرمینل پر اتارا۔ شہروز بار بار یہی کہہ رہا تھا۔ ''آپ دوبارہ کب آئیں گے؟''

میں نے طارق اور تمنا بھابی کا شکریہ ادا کیا۔ طارق نے کچھ نصیحتیں کیں۔ تمنا بھابی نے نمازیں پڑھنے کی تاکید کی۔ کچھ وظائف بھی دیے اور پھر وہ چلے گئے۔

میں بھاری بیگوں کا بوجھ اٹھائے ٹرمینل کی عمارت کی جانب بڑھ گیا۔

جہاں پر اترا تھا آج وہیں واپس آ لوٹا تھا۔ پہلے سرجی اور شہباز ساتھ تھے اور آج بھاری بھر کم بیگ ساتھ تھا جو اٹھائے نہ اٹھتے تھے۔ ایک بریف کیس کے علاوہ مزید دو بھاری بیگ تھے جو میرے دو ہاتھوں کے بس کا روگ نہ تھے۔ کسی طرح سے میں نے دس بجے والی بس کا ٹکٹ لیا اور پھر اپنے آپ کو گھسیٹتا ہوا وہاں آ کھڑا ہوا، جہاں سے بس نے آدھے گھنٹے بعد روانہ ہونا تھا۔ سردی تھی مگر تنگ نہ کرتی تھی۔ میں باہر کھڑا بس کا انتظار کر رہا تھا کہ اتنے میں ایک بندہ جو اپنے خدوخال اور حلیے سے دیسی لگتا تھا، میرے ساتھ آ کھڑا ہوا۔ شکلیں اور رنگ ہمارے جیسا تھا، ہم نے ہاتھ ملایا۔ یہاں ایک مسئلہ یہ رہتا ہے کہ کوئی اپنے خدوخال جیسا ملے تو سلام نہیں کر سکتے۔ ہوسکتا ہے کہ انڈیا کا رہنے والا کوئی غیر مسلم ہو۔ اسی طرح ہندو نمستے کہنے سے پہلے نام یا ملک ضرور پوچھتا ہے۔ اس نے سیدھا سلام کیا اور میں نے جواب دے کر سوچا کہ یہ کوئی ٹورسٹ ہی ہوگا۔ عمر پکی تھی اور نام بھول گیا ہوں، اسی لیے فرض کر لیتے ہیں کہ رشید تھا۔

نارتھ امریکا میں رہنے والے پاکستانی ایک دوسرے سے زیادہ گھلتے ملتے نہیں ہیں۔ دور سے ایک بار دیکھ کر اجنبی بن جاتے ہیں۔ رشید صاحب نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا تو پکا یقین ہوگیا کہ یہ امریکا میں نہیں رہتا۔ تعارف ہوا تو معلوم پڑا کہ موصوف کی دبئی میں ایک کمپنی ہے۔ امریکا اور کینیڈا کا سیاحتی ویزا پاس ہے۔ امریکا کوئی پندرہ دن پہلے آیا تھا اور اب ٹورنٹو جا رہا تھا۔ میں بھی زیادہ پرانا نہ تھا اسی لیے اس کے ساتھ گھل مل گیا۔

اتنے میں بس آئی اور ہم ایک دوسرے کے برابر اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ رشید مجھے بتا رہا تھا کہ اس کی دبئی میں بہت بڑی کمپنی ہے جہاں سو کے قریب لوگ کام کرتے ہیں۔ وہ امریکا یہ دیکھنے آیا تھا کہ یہاں بھی کوئی کاروبار شروع کر سکے۔ امریکا کا جائزہ لینے کے بعد وہ اب کینیڈا جا کر حالات کا جائزہ لینا چاہتا تھا، کسی نے اس کے کان میں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

یہ بات ڈال دی تھی کہ کینیڈا میں امیگریشنس بہت آرہے ہیں اور یہ اچھا موقع ہے کہ وہاں کوئی کاروبار شروع کردیا جائے۔

ہماری بس روانہ ہوچکی تھی۔ منہٹن سے نکل کر اب ہم ہائی وے پر آگئے تھے اور بیغلو کی جانب رواں دواں تھے۔ کچھ لوگ سو گئے تھے اور کچھ جاگ رہے تھے مگر خاموش بیٹھے تھے۔ بس میں ہم دونوں کے علاوہ کسی جانب سے کوئی آواز نہ آتی تھی۔

رشید کچھ پریشان بیٹھا تھا اور بار بار مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ ''کیا کینیڈا والے مجھے داخل ہونے دیں گے؟''

میں حیران تھا کہ اسے ڈر کس بات کا ہے۔ جب وہ امریکا آچکا ہے اور کینیڈا کا ویزا بھی ہے تو اسے روکنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ میں اسے تسلی دیتا اور وہ مطمئن ہوجاتا ہم دوبارہ سے باتیں کرنا شروع کردیتے۔ کچھ دیر بعد وہ اپنا سوال دوبارہ دہراتا اور میں پھر اسے تسلی دیتا۔

میں نے اس کی بے چینی کو دیکھا تو پوچھا۔ ''آخر آپ اتنا گھبرا کیوں رہے ہیں، کینیڈا میں آپ کو داخل ہونے سے کوئی کیوں روکے گا؟''

درحقیقت اس کی الجھن دیکھ کر میں خود گھبراہٹ کا شکار ہورہا تھا کہ کہیں مجھے ہی نہ روک لیں۔ کینیڈا نہ ہوا کہ کوئی جنت ہوگئی جس میں داخل ہونے کے کڑے معیار اور بڑے تقاضے ہیں۔ رشید کہنے لگا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ کینیڈا میں کاروبار کروں۔ مجھے ہر ایک یہی کہتا ہے کہ کینیڈا رہنے کے لیے بہت خوب صورت اور پرسکون جگہ ہے۔''

جو سکون میں پچھلے چار ماہ میں دیکھ چکا تھا، وہ تو میں ہی جانتا تھا مگر اس کے منہ سے یہ سن کر میں بھی اپنے آپ پر ناز کرنے لگا۔ پہلے میں اس کی دولت اور کاروبار پر رشک کررہا تھا اور وہ میرے کینیڈین ہونے پر، مجھے کسی اونچے مقام پر بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ اس کے کینیڈا کے بارے میں ان تعریفی الفاظوں کے بعد ہم دونوں کینیڈا پر رشک کررہے تھے۔

مجھ سے میرا فون نمبر مانگا اور میں نے حسب عادت دے دیا بلکہ اس کا لکھا پھر سے دیکھا کہ کہیں اس نے غلط تو نہیں لکھا ہے۔ ہماری بس اپنی رفتار سے چلی جارہی تھی۔ سفر کے ایک گھنٹے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا ہے کہ صدیوں سے اس سفر میں ہوں۔ گزرا کل ماضی بن جاتا ہے اور آنے والا کل منزل بن کر ذہن پر عکس بنا ہوتا ہے۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ''آپ کون کون سے ملک گھوم چکے ہیں؟''

وہ ذرا اترا کر بولا۔ ''دبئی، شارجہ، ابوظہبی، العین کے علاوہ مکہ، مدینہ اور امریکا گھوم چکا ہوں۔'' پھر سے دوبارہ پریشان ہوا اور سر دوآہ بھر کر بولا۔ ''اگر قسمت میں ہوا تو کینیڈا بھی۔''

میں نے اب کی بار اس کی پریشانی کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ ''پاکستان کے کس کس شہر میں جاچکے ہیں؟''

کہنے لگا۔ ''لاہور، فیصل آباد، جڑانوالہ اور شیخوپورہ۔'' میں نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھا اور کہا۔ ''ماشاءاللہ آپ پوری زندگی ٹک کر نہیں بیٹھے۔''

میری اس بات کو وہ تعریف سمجھ کر بہت خوش ہوا اور ایک بار پھر جیب سے کاغذ نکال کر میرا فون نمبر چیک کیا۔

ہماری بس یکساں رفتار سے چل رہی تھی کہ اتنے میں قانون نافذ کرنے والوں کی گاڑی نے ہماری بس کو روکا۔ رشید کے ساتھ ساتھ میں بھی بلاوجہ پیلا پڑ گیا۔ دو تین رسلر نما باوردی افراد بس پر چڑھ آئے۔ ہم سب کے کاغذات چیک کیے اور پھر اتر گئے۔ یہ امیگریشن والے تھے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ راستے میں بھی روک لیتے ہیں۔ بس روانہ ہوئی تو اب ہم دونوں خاموش تھے۔ وہم کے بچھو میرے بدن پر رینگ رہے تھے۔ بس چلتی رہی اور میں ان بچھوؤں کے ڈنک محسوس کرتا رہا۔

میں نے تناؤ کی کیفیت کو نارمل حالت میں لانے کے لیے اس سے پوچھا۔ ''آخر آپ کے ذہن میں کس قسم کا کاروبار ہے جو آپ کینیڈا میں کرنا چاہتے ہیں۔''

''کوئی پیٹرول پمپ، گروسری اسٹور یا پھر کچھ ٹیکسیاں لے لوں گا۔ پیسوں کی کمی نہیں ہے۔'' پھر اپنی جیکٹ کی جیب سے چیونگم نکالی۔ توڑ کر آدھی مجھے دی اور بقیہ خود چبانے لگا۔

رات کے بارہ بجے ہوں گے کہ بس ایک سروس اسٹیشن پر رکی۔ ہمارے اترنے سے پہلے امیگریشن پیٹرولنگ کی ایک اور گاڑی آرکی۔ ہم سیٹوں سے اٹھ چکے تھے مگر ڈرائیور نے اسپیکر سے اعلان کیا۔ ''آپ سب لوگ دوبارہ سے سیٹوں پر بیٹھ جائیں۔''

ہم دونوں بھی سب کی طرح بیٹھ گئے۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ یا تو رشید پکڑا جائے گا یا پھر میں۔ مجھے معلوم نہیں کیوں بے چینی ہورہی تھی۔ یہ بار بار کی تلاشی مجھے سمجھ میں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

نہیں آرہی تھی۔ پھر سے کچھ اہلکار سوار ہوئے۔ میں نے اپنے لینڈنگ پیپرز اور پاسپورٹ دکھایا۔ رشید نے اپنی بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ اپنے کاغذات دکھائے۔ انہوں نے سب مسافروں کو چیک کیا اور پھر اتر گئے۔ اس کے بعد ہم کو بھی نیچے اترنے کی اجازت ملی۔

میں نے رشید سے کہا۔ ''آتے ہوئے تو ایک بار بھی تلاشی نہیں ہوئی اور اب کی بار.....'' میں نے بات ادھوری چھوڑ دی کیونکہ مجھے خود معلوم نہ تھا کہ آگے کیا کہنا ہے۔ رشید ماتھے پر سلوٹیں رکھے خاموش تھا اور ہم سروس اسٹیشن کی عمارت کی جانب بڑھ رہے تھے۔ بعد کے سالوں میں معلوم ہوا کہ ایسی تلاشیاں معمول کی بات ہوتی ہیں۔ یہاں کے ادارے ہر دم چوکس رہتے ہیں۔

اسٹیشن کے اندر وہی کافی، آئس کریم اور برگر بک رہے تھے۔ صاف ستھرے واش روم اور چمکتے فرش۔ کئی اور بسیں بھی رکی تھیں۔ ایک رش سا لگا تھا۔ لوگ دھڑا دھڑ کھا پی رہے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مفت میں چیزیں بانٹی جارہی ہیں۔ ایک شاپ کے سامنے لائن لگی تھی۔ ہم رنگ برنگی کرسیوں پر ایک بڑے ہال میں بیٹھے تھے۔ واش روم سے ہاتھ منہ دھو کر ایک بار پھر سے میں فریش ہوگیا تھا اور چہک بھی رہا تھا۔ کافی سے مجھے چڑ تھی اور کچھ کھانے کو دل بھی نہ کررہا تھا۔

میرے لیے یہ عالیشان سروس سینٹر جو ہائی ویز کے کنارے مسافروں کے لیے بنے ہوتے ہیں، ہمیشہ سے پھیکے اور بدمزہ ثابت ہوتے رہے ہیں۔ میں عادی تھا کہ بس رکے اور ہم لوٹے اٹھائے بھاگے بھاگے کھیتوں میں جا گھسیں۔ پھر ساتھ کسی چھوٹی سی مسجد میں کوئی نہ کوئی نماز ادا کریں۔ نماز پڑھ کر باہر رکھی چارپائیوں پر بیٹھے پہلے تندور کی گرم روٹیوں کے ساتھ دال یا کچھ اور کھائیں پھر گرم گرم چائے کا لطف لیں۔ چائے کے بعد استاد (ڈرائیور) کا انتظار کریں جو کسی اسپیشل کمرے میں کڑاہی گوشت بڑی رغبت سے کھا رہا ہو۔ استاد اگر کچھ شوقین مزاج ہو تو کھانے کے بعد سگریٹ بھی پی لیتا ہے لیکن یہاں پھیکے برگر، کھولتی کافی یا آئس کریم کا لطف کیسے آسکتا ہے۔ جب تک قریب میں گرم پکوڑے کڑاہی سے نہ نکل رہے ہوں تو سفر کا رنگ بھی چوکھا نہیں ہوتا۔ یہاں لوگ کافی لاتے یا پھر برگر تو چینی، دودھ، کیچ اپ باہر میزوں پر رکھا ملتا ہے۔ ہر ایک اپنی مرضی سے استعمال کرتا ہے اور پھر ٹرے کو ایک بڑے ڈسٹ بن میں خالی کرکے اسے ایک میز پر رکھ دیتا ہے۔ نہ کوئی گند اور نہ دھکم پیل۔ اس سفر میں کوئی خاک لطف آئے گا جہاں ایک آدھ لڑائی بھی نہ ہو۔

میں اندر کے روکھے ماحول سے باہر نکل آیا۔ رشید بھی میرے ہمراہ چلا آیا۔ ہماری بس کا ''استاد'' ایک دراز قد گورا تھا۔ سفید شرٹ پر نیلا کوٹ پہنے کسی پائلٹ کی طرح نظر آرہا تھا۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور اس کے ساتھ کھڑا کش لے رہا تھا۔ رشید بس میں بیٹھ چکا تھا۔ میں نے ڈرائیور سے جو پوچھا وہ مجھے ہرگز نہیں پوچھنا چاہیے تھا۔ غیر ممالک کے سفر میں آپ ہمیشہ خاموش ہی رہیں تو بہتر ہے۔ ایک اور چیز میں نے یہ بھی سیکھی ہے کہ رستہ معلوم کرنے کے علاوہ کبھی کوئی غیر ضروری بات نہ کریں۔

میں نے ڈرائیور سے پوچھا۔ ''کیا آگے بھی کوئی اور تلاشی ہوگی یا یہ آخری تھی؟'' میرا یہ فضول سا بے محل سوال میرے لیے کیا مصیبت لاسکتا تھا مجھے اس کا کوئی اندازہ ہی نہ تھا۔

ڈرائیور نے مسکرا کر کہا۔ ''نہیں! اب کوئی اور تلاشی نہ ہوگی اور ہم کینیڈا کے بارڈر پر جاکر بریک لگائیں گے۔''

میں نے یہ سن کر سکون کا سانس لیا اور سگریٹ کا گہرا کش لے کر دھواں فضاء میں چھوڑ دیا۔ اب ڈرائیور بڑے غور سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔

بس روانہ ہوئی تو ساتھ بیٹھے رشید کو نیند کے جھونکے آنے لگے۔ سب سو رہے تھے اور میری بھی ذرا دیر کو آنکھ لگ گئی۔ میں اس وقت بیدار ہوا جب محسوس ہوا کہ بس رکی ہوئی ہے۔ یہ کینیڈا کی امیگریشن کا آفس تھا۔ اب ہم بارڈر پر رکے ہوئے تھے بلکہ بارڈر کراس کرکے کینیڈا میں داخل ہو چکے تھے۔

سب مسافر ایک ایک کرکے نیچے اتر رہے تھے۔ میں سیٹ سے اٹھا تو رشید بھی آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ اور کہنے لگا۔ ''کہیں کینیڈا امیگریشن والے مجھے واپس ہی نہ کردیں؟''

میں نے پہلے کی طرح اسے تسلی دی۔ ہم نیچے اترے تو ہمیں اپنا سارا سامان بھی ساتھ اندر لے جانا تھا۔ رات کے شاید دو بجے ہوں گے۔ سردی اپنے جوبن پر تھی۔ حالانکہ مارچ کا مہینہ شروع ہوگیا تھا مگر ان علاقوں میں بہار اپریل کے آخر یا مئی میں آتی ہے۔

ہم ایک لائن میں کھڑے تھے اور ڈرائیور لگیج باکس

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

جنید بن عبدالرحمان

جنید بن عبدالرحمان ایک نامور سپہ سالار اور والی۔ جنید کو ہشام نے 105ھ/724ء میں برعظیم پاک و ہند کے ان مسلم مقبوضات کا جنہیں محمد بن قاسم نے فتح کیا تھا والی مقرر کیا۔ یہ مقبوضات 96ھ/711ء سے 94ھ/713ء میں فتح کیے تھے۔ جنید 110ھ/729ء تک سندھ کا گورنر رہا۔ اس نے اپنے دور حکومت میں کئی مرتبہ فوج کشی کی۔ جنید نے کیراج کے راجا کے خلاف فوج کشی کی جو مجبور ہو کر فرار ہو گیا اور اس طرح کئی شہر جنید کے ہاتھ آئے۔ 110ھ/729ء میں جنید کو گورنری کے عہدے سے برطرف کر دیا گیا۔ اس وقت تک جنوبی ہند کی سمت مسلمان گجرات کے اندر تک اور مشرق کی جانب مالوہ کی سرزمین تک یعنی وسطی ہند تک پہنچ چکے تھے۔ جنید شمال میں غزوں کے علاقے تک پہنچا نیز چین کی ایک باجگزار ریاست کا ایک شہر اور قلعے پر بھی قابض ہو گیا۔ 111ھ/730ء میں جنید خراسان کا والی مقرر کیا گیا۔ بعد میں اسے ماوراالنہر کی طرف بھیجا گیا تاکہ اس کی حالت کو درست کر سکے۔ جو ترکوں کے حملوں کی وجہ سے ناقابل اطمینان ہو گئی تھی۔ نیز اس اشرس بن عبداللہ سلمی سابق والی خراسان کی مدد کرنا بھی مقصود تھی جو ترکوں سے برسرپیکار تھا۔ چنانچہ جنید ایک فوج کے ساتھ بخارا میں اشرس کی فوج سے جاملا اور ترکوں سے کئی لڑائیاں لڑیں اور زرمان کے مقام پر

سے ہمارا سامان نکال رہا تھا۔ میرا سامان اس نے وزن کی وجہ سے بے دلی سے نکالا۔ رشید کے پاس ایک چھوٹا بیگ تھا جو اس نے سیٹ کے اوپر رکھا تھا اور اب وہ اسے پکڑے امیگریشن کی لائن میں سب سے آگے کھڑا تھا۔ دور سے مجھے اشارہ کیا کہ اس کے لیے دعا کروں۔

میں نے سامان لیا اور گھسیٹتا ہوا لائن میں لگ گیا۔ کچھ مسافر میرے پیچھے کھڑے تھے۔ جب لائن آگے بڑھتی تو میں اپنا سامان اٹھاتا اور دو قدم بڑھ کر پھر زمین پر رکھ دیتا۔ میرے پیچھے کے مسافر میری وجہ سے چہروں سے پریشان لگے۔ میں انہیں سہولت دینے کی خاطر اپنا سامان لے کر سب سے پیچھے لائن میں جا کھڑا ہوا۔

میں پیچھے کھڑا تھا کہ میں نے رشید کو سب سے پہلے واپس نکلتے دیکھا۔ اس نے وکٹری کا نشان بنایا ہوا تھا اور خوشی خوشی میری جانب اس طرح آیا کہ جیسے کرکٹ ورلڈ کپ کا کپتان وہ تھا۔ مجھے آ کر اپنی خوش خبری سنائی کہ اسے کینیڈا میں داخلے کی اجازت مل گئی ہے۔ میں نے بھی خوشی کا اظہار کیا اور اس سے گرم جوشی سے ہاتھ بھی ملایا۔ اتنے میں امیگریشن آفس کی کھڑکی کے شیشوں سے ایک آفیسر مجھے ہاتھوں کا چھجا اپنے چہرے کے گرد بنا کر مجھے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے ہنس کر اس کو اشارہ کیا اور کہا۔ ''فکر نہ کرو، میں اسے اپنا سامان نہیں دے رہا ہوں۔''

میں نے اپنی جانب سے خوشگوار اور ہوشیار بننے کی کوشش کی تھی۔ اصولی طور پر رشید کو میرے پاس نہیں آنا چاہیے تھا کیونکہ وہ امیگریشن بھگتا چکا تھا اگر مجھے کوئی چیز چھپانی ہوتی تو میں اسے وہ سامان دے سکتا تھا۔ رشید چہکتا ہوا بس کی جانب چلا گیا اور میں لائن میں رینگنے لگا۔

کوئی پندرہ بیس منٹ بعد میں آفس میں داخل ہوا تو بس کا آخری مسافر تھا۔

میں نے اپنے چہرے پر مسکراہٹ رکھی اور ایک ڈیسک پر امیگریشن آفیسر کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ وہ آفیسر اٹھا اور دو مزید بھی میری جانب بڑھے وہ میرے اردگرد کھڑے ہو گئے۔ ایک نے بڑی تہذیب سے کہا کہ اس میز پر اپنا سارا سامان رکھ دوں۔ میں نے سامان رکھا تو دوسرے نے کہا۔ ''اپنی ساری جیبوں میں جو کچھ ہے وہ بھی نکال کر میز پر رکھ دوں۔''

میں اپنے ساتھ اس خصوصی سلوک پر حیران تھا کہ یہ میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ بہرحال میں نے جیکٹ اور پینٹ کی ساری جیبوں کو کھنگالا اور ساری چیزیں جو ان میں موجود تھیں، میز پر رکھ دیں۔ میرا بٹوہ اور معلوم نہیں کیا کچھ تھا وہ اب اسے اپنے قبضے میں کر چکے تھے۔

میں ذرا اسمارٹ بنا اور ان سے کہا۔ ''کیا یہ سب صرف میرے ساتھ ہو رہا ہے یا سب کی ایسے تلاشی لی گئی ہے۔'' ان میں سے ایک آفیسر نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

انہیں شکست دی۔ خراسان واپس آکر جنید نے طخارستان پر حملہ کیا لیکن اسے جلد ہی وہاں سے ماوراالنہر کے لیے واپس آنا پڑا جہاں اسے سمرقند کے حاکم سورۃ بن حرالتمیمی کی مدد کے لیے بھیجا گیا تھا۔ جنید نے دریائے جیحون عبور کر کے کش سے سمرقند جانے کے لیے پہاڑی راستہ منتخب کیا لیکن جب وہ الشعب نامی گھاٹی میں پہنچا تو صغد، شاش اور فرغانہ کے لوگوں نے حملہ کر دیا۔ اس لڑائی میں مسلمانوں کی بڑی تعداد ماری گئی۔ جنید نے یہاں سے سورۃ کو پیغام بھیجا کہ وہ سمرقند چھوڑ کر اس کی مدد کے لیے آجائے چنانچہ سورۃ جنید کی مدد کے لیے روانہ ہو گیا لیکن جیسا کہ وہ اس بات کا نتیجہ جانتا تھا۔ ترکوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ سورۃ خود اس لڑائی میں مارا گیا اور اس کی فوج بھی اس لڑائی میں ختم ہو گئی۔ جنید الشعب سے نکل کر سمرقند پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے چار ماہ تک صغد میں قیام کیا اور یہیں سے اس نے بخارا کو جس کا ترکوں نے محاصرہ کر رکھا تھا، بچانے کے لیے قطن بن قبیصہ کی مدد کے لیے ایک فوج تیار کی اور بالآخر طوالیس کے قریب ترکوں کو شکست دے کر بخارا میں داخل ہوا۔ 116ھ/736ء کے آغاز میں خلیفہ نے اسے واپس بلا لیا کیونکہ وہ جنید سے اس بنا پر ناراض ہو گیا تھا کہ اس نے خلیفہ کے باغی یزید بن مہلب کی بیٹی فاصلہ سے شادی کر لی تھی۔ خلیفہ نے اس کی جگہ عاصم بن عبداللہ کو خراسان کا والی مقرر کیا لیکن ابھی عاصم راستے ہی میں تھا کہ جنید مرو میں ایک بیماری سے انتقال کر گیا۔

مرسلہ: نوازش علی، استور، بلوچستان

''یہ ہم پر منحصر ہے کہ کس کی چھان بین کس طرح سے کریں۔''

میں خاموش ہو رہا۔

میرا سارا مال انہوں نے رکھ کر اب میرے بیگ کھولنا شروع کر دیے۔ ایک بیگ میں ساری کتابیں تھیں جو طارق نے مجھے فارماسسٹ کے امتحان کے لیے دی تھیں۔ اس کو ایک سائیڈ پر رکھا اور دوسرا بیگ کھولا۔

پاکستان میں جب ہمیں کسی میڈیسن کی ضرورت پڑتی ہے تو ہم سیدھا میڈیکل اسٹور پر جاتے ہیں اور اس سے کوئی بھی دوا بغیر ڈاکٹر کے نسخے کے خرید سکتے ہیں۔ کینیڈا اور امریکا میں ایسا نہیں ہو سکتا اگر آپ کا گلا بھی خراب ہے تو پہلے آپ کو ڈاکٹر کے پاس جانا پڑے گا۔ وہاں ایک دو گھنٹے انتظار کر کے اپنا معائنہ کروا کر اس سے نسخہ لینا ہوتا ہے۔ پھر آپ فارمیسی جاتے ہیں جہاں پر آپ کے کوائف لیے جاتے ہیں۔ انہیں کمپیوٹر میں ڈالا جاتا ہے۔ پھر میڈیسن کا لیبل پرنٹ ہوتا ہے اور دوائی ایک وائل میں ڈال کر اس پر لیبل لگایا جاتا ہے۔ پھر فارماسسٹ سے چیک کرتا ہے اور آخر میں اگر آپ کے پاس میڈیسن کی انشورنس نہیں ہے تو بھاری قیمت ادا کر آپ وہ میڈیسن حاصل کر پاتے ہیں۔ اسی طرح فارمیسی میں بھی کم از کم آدھ گھنٹا اور آپ کا لگ جاتا ہے۔ یہ ایک لمبا گورکھ دھندا ہوتا ہے اور اکثر لوگ پاکستان سے اپنے لیے اینٹی بائیوٹک اور دوسری بخار اور نزلہ کی دوائیں ساتھ لے آتے ہیں۔ میں آیا تو میرے پاس کچھ نہ تھا۔ ایک بار میرا گلہ خراب ہوا اور میں پورا دن ضائع کرنے کی بجائے گھر میں بخار سے تپتا رہا تھا۔ ڈاکٹر کی انشورنس تو تھی مگر میڈیسن کی نہ تھی۔ ایک عام اینٹی بائیوٹک کے لیے پندرہ بیس ڈالر مجھے ادا کرنا گوارہ نہ تھا۔ یہاں آپ کو ہلکا بخار بھی ہو جائے تو پورا دن میڈیسن لینے میں لگ جاتا ہے۔

جب میں طارق کے پاس اس کی فارمیسی گیا تو اس سے کہا کہ مجھے کچھ اینٹی بائیوٹک اور بروفین کی گولیاں دے دے۔ پہلے تو وہ خاموش ہوا اور پھر کہا۔ ''ٹھیک ہے، لے جانا۔ میں کچھ انتظام کرتا ہوں۔'' میرے لیے اس کا انتظام یہ تھا کہ کیپسول وائل میں ڈالنے تھے اور مجھے پکڑا دینا تھا۔ طارق فارمیسی میں اپنے کمپیوٹر پر بیٹھا اسٹاک مارکیٹ چیک کر رہا تھا تو میں نے کچھ اینٹی بائیوٹک اور درد و بخار کے لیے بروفین کی گولیاں ایک بڑی وائل میں ڈالیں اور پھر ان دو وائلز کو اپنے ہینڈ بیگ میں ڈال دیا تھا۔ اس کے علاوہ طارق سے میں نے کیلشیم اور وٹامنز کے دو بھرے ڈبے بھی لے لیے کیونکہ ان کے لیے ڈاکٹر کے نسخے کی ضرورت نہ تھی۔

اور اب ایک امیگریشن آفیسر اپنے ہاتھ میں دونوں بغیر لیبل کی وائلز اور دو ڈبے لیے کھڑا تھا۔ مجھ سے پوچھا۔

''یہ میڈیسن کس کی ہیں۔''

میں نے یہی جواب دینا تھا کہ میری ہیں۔ میرا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

جواب سنا اور کہا۔ ''ان پر لیبل کیوں نہیں ہے؟'' اس کا میرے پاس جواب نہ تھا اور اسی لیے خاموش کھڑا رہا۔

ان میں سے ایک نے کہا۔ ''ہم آپ سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''ضرور پوچھیے۔''

انہوں نے کہا کہ یہاں نہیں آفس میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔

پھر مجھے اور میرے سامان کو ایک کیبن میں شفٹ کر دیا گیا جہاں ایک میز پڑی تھی اور پیچھے ایک بڑی کرسی رکھی تھی۔ مجھے میز کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھا دیا گیا اور خود غائب ہو گئے۔ میں اطمینان سے بیٹھا تھا کیونکہ مجھے معاملے کی سنگینی کا احساس تک نہ تھا۔ مجھے صرف یہی فکر تھی کہ کہیں میری بس نہ چلی جائے۔

پھر چار امیگریشن اور کسٹم کے آفیسر کیبن میں آئے۔ ایک جو عہدے میں برتر تھا، وہ سامنے کرسی پر بیٹھ گیا اور باقی تین میں ایک میرے پیچھے اور دو کیبن کی دیوار سے لگے مجھے تیز نظروں سے گھورنے لگے۔ میں پریشان ہوا مگر زیادہ نہیں ہوا۔ میں نے ان سے کہا۔ ''آپ جلدی سے بات کریں، کہیں میری بس نہ نکل جائے؟''

کیبن کی دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے ایک آفیسر نے جواب دیا۔ ''بس کی فکر نہ کرو، وہ کہیں نہیں جاتی۔''

میں بھی مطمئن تھا کہ یہ اتنے ترقی یافتہ ملک ہیں اور یہاں بس اپنے مسافر کو چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہے۔

میں نے پچھلے دنوں اپنی فیملی کو اسپانسر کیا تھا۔ ایک پیپر پر اسپانسر کرنے کے لیے جن جن دستاویزات کی ضرورت پڑتی ہے، ان کی فہرست لکھی تھی۔ جن میں لکھا تھا پاسپورٹ، برتھ سرٹیفکیٹ، آئی ڈی کارڈ اور بہت سے قانونی کاغذات کا نام درج تھے۔ ایک آفیسر میرے بٹوے میں سے نکلی چیزوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے اس کاغذ کو پڑھنے کے بعد پوچھا۔ ''یہ لسٹ آپ نے اپنے پاس کیوں رکھی ہوئی ہے۔''

میں نے وجہ بتائی کہ اپنی فیملی کو اسپانسر کرنا تھا اور یہ ان سب کاغذات کی لسٹ میں نے اپنی سہولت کے لیے بنائی تھی۔ یہ بتا کر میں ایک بار پھر مطمئن ہو گیا۔

تبھی میز کے سامنے کرسی پر بیٹھے ان کے باس نے جو کچھ کہا اسے سن کر تو جیسے میرے سر پر آسمان ٹوٹ پڑا۔ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے یہ کہہ رہا تھا۔ ''آپ میڈیسن اسمگلنگ کے الزام میں زیرِ حراست ہیں اور ہم نے آپ سے کچھ سوالات کرنے ہیں۔'' پھر پھٹتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ اگر جواب نہ دینا چاہیں تو اپنے وکیل کو فون کر کے بلا سکتے ہیں۔''

زیرِ حراست اور وکیل کا سن کر میں ایک دم سے شاک میں آ گیا۔ مجھے کوئی اندازہ بھی نہ تھا کہ یہ میڈیسن کو بارڈر کے پار لانا غیر قانونی بھی ہو سکتا ہے۔ اور خاص کر جب لیبل بھی اس پر موجود نہ ہو۔ ان ملکوں میں بغیر لیبل کے میڈیسن اپنے ساتھ رکھنا بھی سخت ممنوع ہے۔

کچھ دیر تو میں منہ کھولے سکتے میں بیٹھا رہا۔ اب مجھے خیالات آنا شروع ہوئے۔ ایک تو میں نے ڈرائیور سے امریکن امیگریشن والوں کی تلاشی اور بار بار کی تلاشی کے بارے میں اپنے تحفظات کا اظہار کیا تھا۔ دوسرا میں نے لائن میں کھڑے ہو کر رشید سے بات کی تھی اور پھر شیشوں سے جھانکتے امیگریشن آفیسر کے ساتھ اسمارٹ بننے کی کوشش کی تھی۔ ڈرائیور نے بس روک کر سب سے پہلے انھیں میرے بارے میں مطلع کر دیا تھا۔ تبھی تو وہ مجھے شیشے سے جھانک کر دیکھ رہے تھے اور میں نے خوش دلی سے کہا تھا کہ فکر نہ کرو، میں اپنا سامان اسے نہیں دے رہا ہوں۔ اسی طرح سے میں اپنے لیے گڑھے کھودتا چلا گیا تھا۔ میری ان ہی حرکات کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ اب میں پریشان حال بیٹھا یہ سن رہا تھا کہ میں زیرِ حراست ہوں اور چاہوں تو اپنا وکیل بلا سکتا ہوں۔

مجھے اب حالات کی سنگینی کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اگر مجھے وہ چارج کر دیتے تو اس کے نتیجے میں کوئی سزا ہوتی تو کینیڈا سے ڈی پورٹ ہونا لازمی تھا۔ ادھر میں تین دن بعد ہیموسال کی جاب جوائن کرنے والا تھا۔ اگر یہ مجھے اپنے پاس رکھ لیتے تو وہ جاب تو ہاتھ سے ویسے ہی گئی تھی۔ جاب سے زیادہ مجھے ڈی پورٹ ہونے کا خدشہ تھا۔

میں خاموش بیٹھا یہی سوچ رہا تھا کہ سامنے والا آفیسر بولا۔ ''اگر تم ہمیں مطمئن نہ کر سکے تو تم سیدھا ہولڈنگ سینٹر جاؤ گے اور پھر واپس اپنے ملک کو ڈی پورٹ کر دیے جاؤ گے۔'' یہ سن کر تو میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے کہ جس ہولڈنگ سینٹر میں، میں جاب کرتا تھا اور اب وہاں قیدی بن کر جاؤں گا۔ گرنام اور باجوہ سمیت سب مجھے ایک قیدی کے روپ میں دیکھ کر کیا سوچیں گے؟ کچھ بھی سوچیں وہ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا مگر میں کس طرح سے ان کے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

سامنے قیدی بن جاؤں گا، ان کا سامنا کروں گا؟

میں نے تیزی سے بہت کچھ سوچا۔ وہ سب میری جانب عقاب نظریں رکھے کھڑے تھے۔ میں نے پہلے کہا ”مجھے ایک گلاس پانی چاہیے۔“

میں کچھ سوچنے کا وقت مانگ رہا تھا۔ ایک آفیسر پانی لینے چلا گیا۔ میں خاموش بیٹھا یہی سوچ رہا تھا کہ اب جواب کیا دوں؟ اگر یہ کہتا کہ طارق نے یہ میڈیسن دی ہے تو اس پر زلزلہ گر سکتا تھا اور حقیقت بھی یہ نہ تھی۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ سچ ہی بولوں گا، بھلے کچھ بھی ہو جائے۔ ایک بات بعد میں یہ سیکھی کہ ان ملکوں میں پہلے تو زیادہ نہ بولو اور جب بھی بولو تو سچ ہی بولو۔ سچ یہاں کیا ہر جگہ پر اپنی قوت ظاہر کرتا ہے۔

میں نے آٹھ گھورتی آنکھوں کے سامنے پانی کی بوتل ساری کی ساری پی۔ دل میں کچھ آیات کا ورد کیا۔ اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑا اور دماغ میں چلتی خدشوں کی آندھی کے آگے اللہ کے بھروسے پر خود اعتمادی کا بند باندھا اور ریلیکس ہو کر سامنے آفیسر سے کہا۔ ”پہلے تو میں کوئی وکیل نہیں بلاؤں گا اور آپ نے جو کچھ پوچھنا ہے وہ سچ سچ بتاؤں گا۔ پھر جو آپ کی مرضی آئے وہی کرنا۔“

میری آنکھوں میں ایک دم اٹھتی خود اعتمادی کو دیکھ کر سامنے بیٹھا آفیسر حیران ہو رہا تھا۔ میں اب مسکرا رہا تھا۔ پھر اپنی نظریں اس آفیسر کی آنکھوں میں گاڑ دیں۔ آنکھوں میں آنکھیں ملا کر بات کرنے کا سبق ویلکم ٹو کینیڈا والی کتاب سے ملا تھا۔

اس نے گہرا سانس لیا اور سوالات کی بھرمار شروع کر دی۔ پاکستان سے شروع ہوا اور کرید کرید کر پوچھنے لگا کہ کہاں پیدا ہوئے۔ کتنے بہن بھائی ہیں۔ وہاں کیا کرتے تھے اور کینیڈا کب آئے۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ میرے بارے میں سب معلومات کمپیوٹر سے نکال کر سامنے رکھے بیٹھا ہے۔ میں نے وہی کہا جو مجھے ازبر تھا۔ کیونکہ امیگریشن کے فارم کو بھرتے ہوئے میں نے سو مرتبہ اسے پڑھا ہوگا۔ اور وہ میرے بارے میں سوالات کر رہا تھا جن کو مجھ سے بہتر کوئی اور نہ جانتا تھا۔

پھر سوال کیا کہ امریکا کیوں اور کس کے پاس گیا تھا۔ میں نے وجہ بتائی کہ کزن سے ملنے گیا تھا کیونکہ وہ اور میں بھی یہی چاہتا تھا کہ اپنی نئی جاب شروع کرنے سے پہلے اس کے پاس چکر لگا آؤں۔ وہ کہنے لگا کہ تم فارماسسٹ ہو اور تمہیں ہی معلوم نہیں کہ بغیر نسخے کے تم نے اپنے کزن کی فارمیسی سے پچانوے کیپسول Amoxil کے لے آئے۔ میں نے کہا کہ میں پاکستان میں فارماسسٹ تھا، جہاں کسی فارمیسی پر کوئی بھی میڈیسن لینے کے لیے نہ تو نسخے کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ فارمیسی کو فارماسسٹ ملازم رکھنے کی کوئی قانونی ضرورت ہے۔

میری اس بات پر وہ بہت حیران ہوا کہ یہ کیسے ممکن ہے؟

میں نے کہا کہ مجھے کینیڈا آئے زیادہ وقت نہیں ہوا۔ ہم جاب کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہوتے ہیں۔ میڈیسن اتنی مہنگی ہیں کہ میری جیب انہیں خریدنے کی اجازت نہیں دیتی۔ میں نے اپنی بات جاری رکھی اور کہا کہ مجھے بالکل اندازہ نہ تھا کہ ایک عام سے اینٹی بائیوٹک کیپسول کے لیے مجھے ڈاکٹر سے نسخے کی ضرورت ہوگی۔ اگر مجھے اس بات کا ذرا بھی ادراک ہوتا تو یہ ناممکن تھا کہ میں اسے اپنے ساتھ لیے پھرتا۔ میں نے اپنی تقریر جاری رکھی اور کہا کہ میں تو بہت سے خواب لے کر کینیڈا آیا تھا۔ ڈھائی سال اپنی امیگریشن کا انتظار کیا کہ یہاں اپنی زندگی نئے انداز سے شروع کروں گا۔ پھر اپنے بچوں کو بلواؤں گا اور یہ کیسے ممکن ہے کہ میں جان بوجھ کر ایسی سنگین غلطی کرتا جس کا نتیجہ یہاں سے ڈی پورٹ ہونا تھا۔ میں اپنی کرسی پر ذرا سا آگے کھسکا اور اپنے دونوں بازو میز پر رکھے اور بولا ”آفیسر کیا آپ نے اپنی زندگی میں انجانے میں کوئی غلطی نہیں کی ہوگی؟ اگر کی ہوگی تو کیا آپ کو ایسی سزا دی جاتی

مصری سائنسدان کا منفرد کارنامہ

جاپان میں خدمات انجام دینے والے ایک مسلمان مصری سائنسدان ڈاکٹر شریف الصنعتی نے ماحول، پانی اور مٹی سے تابکاری کو علیحدہ اور ختم کرنے کی ٹیکنالوجی ایجاد کر کے ایٹمی ترقیات کے شعبے میں اہم کامیابی حاصل کر لی ہے۔ وہ دنیا کے پہلے سائنسدان ہیں جنہوں نے اس گراں ترین اور مشکل ترین کام کو اپنی ٹیم کے ساتھ صرف چند ہفتوں میں مکمل کر کے ایٹمی ٹیکنالوجی کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔ (بحوالہ: ”فیملی“ 28 اگست تا 3 ستمبر 2011ء)

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کہ آپ اور آپ کی فیملی کا مستقبل تباہ ہوجاتا تو کیا یہ انصاف ہوتا؟''

پھر میں نے اس سے سوال پوچھا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک بندہ جس کے پاس ماسٹر کی ڈگری ہو اور تین دن بعد اس نے اپنی جاب جوائن کرنی ہو اور وہ ان میڈیسن کے لیے اپنے پورے مستقبل کو داؤ پر لگا دے گا؟ یہ کہتے ہوئے میں نے اپنا ہیموسال کا اپائنٹمنٹ لیٹر اس کے سامنے رکھ دیا۔

میں نے شروع میں اپنے پڑھنے والوں سے کہا تھا کہ میں نے بے خیالی میں آکر ہیموسال والوں سے کہا تھا کہ مجھے کل لیٹر چاہیے اور دوسرے دن میں خود جا کر لے آیا تھا۔ اور یہ بھی کہا تھا کہ مجھے معلوم بھی نہ تھا کہ یہ لیٹر مجھے کس مصیبت سے بچائے گا؟

آفیسر نے وہ لیٹر دیکھا تو سوچ میں پڑ گیا۔ اسے سوچتے دیکھ کر کہا۔

'' آفیسر، یہ ایک انسانی غلطی (Human Error) ہے اور آپ بھی اسے اسی طرح لیں تو آپ کو میری بات سمجھ میں آجائے گی۔'' یہ سب میں بڑے اعتماد کی حالت میں کہہ رہا تھا۔ جب کچھ وقفہ آتا تو دل ہی دل میں کلام پاک کا ورد شروع کر دیتا۔

ایک بات پر میں خود حیران ہو رہا تھا کہ میری انگلش بولنے کی صلاحیت ایک دم کیسے بڑھ گئی ہے۔ مجھے اب ایسا لگ رہا ہے کہ میں اپنی صفائی میں اس دن کوئی بھی زبان روانی سے بول لیتا اگر اس کی ضرورت پڑتی۔

پھر میرا کتابوں سے بھرا بیگ کھولا گیا۔ اس میں وزنی کتابیں تھیں۔ میں نے کہا۔'' یہ کتابیں پڑھ کر مجھے اپنا امتحان پاس کرنا ہے۔''۔ پھر میز پر رکھی کیپسول کی وائل کی جانب اشارہ کر کے کہا۔'' جو شخص میرٹ پر کینیڈا کی امیگریشن لے اور اس کے سامنے ایک شاندار مستقبل ہو اور وہ اپنے بچوں کو بھی اسپانسر کر چکا ہو تو وہ کس طرح چند کیپسول جانتے بوجھتے بارڈر پر اسمگل کرنے کا سوچ سکتا ہے؟''

وہ بھی بال کی کھال اتارنے پر تلا تھا۔ اسے سوالات کرتے اور مجھے جوابات دیتے دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ صبح کے چار بج رہے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ میری بس چلی گئی ہوگی۔ وہ اب میری ڈائری اور ایلس آئی لینڈ کے وہ کاغذات لیے بیٹھا تھا جن کو سرجی وہاں کی انتظامیہ سے میرے کسی تھیسس کا حوالہ دے کر ان سے لے آئے تھے۔

مجھ سے پوچھنے لگا۔'' یہ امریکن امیگریشن کے اتنے سارے پیپرز کیوں ساتھ لیے پھر رہے ہو۔''

دراصل ہر قانون نافذ کرنے والے کی پہلی تربیت ہی یہی ہوتی ہے کہ ہر چیز کو پہلے شک کی نظر سے دیکھے۔ وہ بھی اپنی تربیت کے عین مطابق وہی کر رہا تھا۔ میں نے اس کے سوال کے جواب میں کہا'' میں آگے چل کر کینیڈا اور امریکا کی امیگریشن پر کتاب لکھنا چاہتا ہوں، اسی لیے ان کی لائبریری سے یہ فوٹو کاپی کروالایا ہوں۔''

میرا جواب سن کر بولا۔'' اس کا مطلب ہے کہ ہم نے تمہیں ڈی پورٹ کر دیا تو تم ہمیں بھی اپنی کتاب میں رگیدو گے۔''

میں نے کہا۔'' ہرگز نہیں! بلکہ یہ لکھوں گا کہ میں نے غلطی کی اور مجھے اس کی سزا ملی۔''

یہ سن کر اس کے چہرے کا تناؤ کم ہوتا گیا اور پہلی بار مسکراہٹ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھی۔ آس پاس کھڑے دوسرے آفیسر بھی مسکرانے لگے۔

پھر مجھ سے پوچھنے لگا'' اگر تمہیں معلوم تھا کہ اس طرح سے میڈیسن بارڈر کے پار لے جانا جرم ہے تو تم کیا پھر بھی لے آتے۔''

اس کے سوال میں بھی شرارت تھی اور میں نے جواب بھی ایسے ہی دیا۔'' یہ تو ایسے ہی ہے کہ میں پہاڑ کے اوپر کھڑا ہوں اور آگے کھائی ہے۔ پھر کوئی مجھ سے کہے کہ کھائی میں چھلانگ لگانے سے تم فوت بھی ہو سکتے ہو، کیا تم پھر بھی اس کھائی میں چھلانگ لگاؤ گے؟''

یہ سن کر سب نے مل کر ایک بلند قہقہہ لگایا اور پھر ماحول میں چھایا تناؤ اللہ اللہ کر کے ٹوٹا۔ اب مجھے صاف نظر آرہا تھا کہ اس مصیبت سے میری جان چھوٹ جائے گی مگر اس نے میری اُمیدوں پر یہ کہہ کر پانی پھیر دیا۔'' میں تو تمہارے سوالات سے مطمئن ہوں مگر یہاں پولیس کا آفیسر بھی آرہا ہے اور اگر تم اس کو مطمئن کر سکو تو ہم تمہارے بارے میں کچھ اچھا سوچ سکتے ہیں۔''

میں نے دل میں کہا کہ اس ڈھائی گھنٹے کی تفتیش سے جو میں نے حاصل کیا ہے، کہیں وہ مٹی میں نہ مل جائے۔ مگر اس نے بڑے اچھے انداز میں کہا۔'' نو پرابلم .....'' لیکن میں اندر سے دوبارہ دہل گیا تھا۔

(باقی آئندہ)

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

فلم ساز

کاشف زبیر

امریکی شہر ہالی ووڈ فلم سازی کے لیے اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔ اس شہر کے ایک معروف ہدایت کار کا عکسِ زیست جو تابشِ آفتاب و تابیدہ ماہِ کامل تھا۔ اس نے بہت کم فلمیں بنائیں لیکن اس کی فلمیں کامیابی کی ضمانت ٹھہریں۔

وہ حوادث کا منہ موڑنا جانتا تھا اور یہی بات کامیابی کی ضمانت ٹھہری

سام میش اپنے دفتر میں آرام کرسی پر جھول رہا تھا۔ ان دنوں اس کے پاس سوائے آرام کرسی پر جھولنے کے اور کوئی کام نہیں تھا۔ اس کے ساتھی بلکہ اس سے کہیں جونیئر بھی ان دنوں اس طرح مصروف تھے کہ ان کے پاس سر کھجانے کی فرصت بھی نہیں تھی۔ ان دنوں کوئی فلم ساز اور ہدایت کار اپنے دفتر میں نہیں پایا جاتا تھا سوائے سام میش کے۔ سام ایک فلم ساز و ہدایت کار تھا اور اس کا شمار انڈسٹری کے چوٹی کے لوگوں میں ہوتا تھا۔ وہ بیس سال پہلے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

بہ حیثیت نائب ہدایت کار سے ہالی ووڈ کے اس بڑے فلم ساز ادارے اور اسٹوڈیو میں ملازم ہوا تھا۔ دو سال تک وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہا اور اس دوران میں اس کے پاس کرنے کو کچھ نہیں تھا سوائے چند چھوٹی چھوٹی فلموں میں تیسرے درجے کی ہدایت کاری کرنے کے جن میں اس کا نام بھی نہیں آیا تھا۔

پھر اسے چانس ملا بہ ایں کہ ایک درمیانے درجے کی فلم کا ہدایت کار شوٹنگ کے دوران ایک حادثے میں شدید زخمی ہو گیا اسے اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ کئی مہینے تک اس کے وہاں سے نکلنے کے امکانات نہیں تھے۔ ادارے کے کرتا دھرتا پریشان تھے کہ اب اس فلم کا کیا کریں جو تیس فی صد مکمل بھی ہو گئی تھی اور تکمیل کے بعد اسے دو سو سے زائد تھیٹرز میں ریلیز ہونا تھا۔

کوئی یہ خاص فلم نہیں تھی اور اس کا شمار ان فلموں میں ہوتا تھا جو محض خانہ پوری کے لیے بنائی جاتی ہیں۔ تاکہ نئے فن کاروں اور فلم ساز عملے کی جانچ ہو جائے اور نیا ٹیلنٹ بھی سامنے آتا رہے اور ساتھ ہی ساتھ ادارے کے چار ہزار سے زیادہ موویٰ تھیٹرز میں ریلیز کرنے کے لیے مناسب تعداد میں فلمیں موجود ہوں۔ اس قسم کی فلموں کے فلاپ ہونے سے عام طور سے ادارے کی صحت پر کوئی فرق نہیں پڑتا ہے کیونکہ ان فلموں کی لاگت کو ہمیشہ نقصان والے کھاتوں میں جگہ ملتی ہے۔ لیکن یہ اتنی غیر اہم بھی نہیں ہوتی ہیں کبھی کبھی ان میں سے کوئی فلم غیر متوقع طور پر غیر معمولی کامیابی حاصل کر لیتی ہے۔ پھر ان کا تیار ہو کر ریلیز ہونا بھی لازمی ہوتا ہے۔ اس لیے ادارے کے مالکان بہر صورت اس فلم کی تکمیل چاہتے تھے۔ بڑے ہدایت کاروں نے اسے ہاتھ لگانے سے انکار کر دیا۔ درمیانے درجے کے تمام ہدایت کار بے حد مصروف تھے اس لیے قرعہ فال سام کے نام نکلا۔

سام خوشی سے اچھل پڑا تھا کہ اسے کوئی کام تو ملا۔ لیکن جب اس نے فلم کا اسکرپٹ اور اس کی شوٹ ہونے والی ریلیں دیکھیں تو اس کی خوشی ماند پڑ گئی۔ یہ ایک اچھے موضوع کو لے کر بنائی جانے والی نہایت بکواس فلم تھی۔ اسکرپٹ میں ہی اس کا حلیہ بگاڑ دیا گیا تھا اور رہی سہی کسر شوٹ میں پوری کر دی گئی تھی۔ بے شک سام نے اب تک کوئی فلم نہیں بنائی تھی لیکن اسے اتنا تو معلوم تھا کہ ایک اچھی فلم کیسی ہوتی ہے۔ یہ خراب سے بھی آگے کی کوئی فلم تھی اور اسے بنانے کا مطلب تھا سام آغاز میں ہی اپنے نام کو بٹا لگا لیتا۔ چوبیس سال کی عمر میں اس کے پاس ترقی کے لیے بہت وقت تھا اور اسے ایسی کوئی جلدی نہیں تھی کہ وہ اس فلم کے ساتھ برا آغاز کرتا۔ لیکن وہ ادارے کے مالکان کو انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے اس نے ڈپلومیسی سے کام لیا اور اس نے مطالبہ کیا کہ اسے فلم میں اپنی مرضی سے تبدیلیاں کرنے کی اجازت دی جائے۔ نیز وہ اسکرپٹ بھی نئے سرے سے لکھوائے گا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے مطالبات ماننے سے انکار کر دیا جائے گا لیکن اس وقت اسے حیرت ہوئی جب اس کے تمام مطالبات مان لیے گئے۔ اصل میں ادارے کے ایک بڑے نے سام کے اندر چھپے ہوئے ٹیلنٹ کو بھانپ لیا تھا۔ اس نے سام کے مطالبات دیکھے اور اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''اگر اس کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی اس فلم کے لیے یہی شرائط عاید کرتا ورنہ انکار کر دیتا۔ اس لڑکے میں صلاحیت ہے اس لیے میں اس کی حمایت کروں گا۔''

یوں سام کے مطالبات مان لیے گئے۔ لیکن جب اس نے فلم شروع کی تو اسے اندازہ ہوا کہ اس نے ایک جنجال اپنے گلے میں ڈال لیا ہے۔ فلم میں سب ہی دوسرے درجے کے اداکار تھے جن کو اداکاری نہیں آتی تھی۔ تکنیکی عملہ اور سامان تیسرے درجے کا تھا۔ لیکن اس سے بھی بڑھ کر اسے جو اسکرپٹ رائٹر ملا تھا۔ وہ سرے سے کسی بھی درجے میں نہیں آتا تھا۔ اس نے اتنے اچھے خیال پر اتنا واہیات اسکرپٹ لکھا تھا کہ سر پیٹ لینے کو دل چاہتا تھا۔ جب سام نے اسے سمجھایا کہ اسے اسکرپٹ کس قسم کا چاہیے تو اس نے ترمیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اسکرپٹ تبدیل کیے بغیر کام نہیں چل سکتا تھا۔ اب سام کے پاس اس کے سوا اور کوئی حل نہیں تھا کہ اسکرپٹ خود لکھے۔ اس نے آستینیں چڑھائیں اور اپنے نائب رائٹر میں جت گیا۔ اس وقت ان کو کمپیوٹر فراہم نہیں کیا گیا تھا۔ وہ سارا دن دفتر میں اسکرپٹ لکھنے کے ساتھ وہ فلم کے اداکاروں اور تکنیکی عملے سے بھی سر کھپا تا رہتا تھا۔ وہ شوٹنگ کے آغاز سے پہلے ان کا کام ان کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس میں اسے کچھ دشواری پیش آ رہی تھی کیونکہ وہ نو آموز تھا اور یہ دوسرے درجے کے اداکار و تیسرے درجے کا تکنیکی عملہ بھی اسے اہمیت دینے کو تیار نہیں تھا۔ سارا دن ان سے سر مارنے کے بعد وہ شام کو اسکرپٹ اپنے ساتھ لے جاتا اور ایک تھرڈ کلاس موٹیل کے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کمرے میں رات گئے تک اس پر کام کرتا جہاں وہ ہالی ووڈ آنے کے بعد سے ٹھہرا ہوا تھا۔

دن رات محنت کر کے اس نے پہلے اسکرپٹ مکمل کیا اور پھر اس کے مطابق شوٹنگ کا آغاز کیا۔ اس کے ساتھی اسے اہمیت نہیں دے رہے تھے لیکن جب اس نے پہلا سین شوٹ کیا اور اس کا نتیجہ پردے پر دیکھا گیا تو سب ہی سنجیدہ ہو گئے تھے۔ انہیں احساس ہوا تھا کہ ایک نو آموز ہدایت کار نے پہلا ہی سین بہت اچھا شوٹ کیا ہے۔ یہ کسی بھی بڑے ہدایت کار سے کم معیار کا کام نہیں تھا۔ اداکاروں نے اسکرپٹ پر غور کیا تو ان کو کہانی میں جان نظر آئی اور انہوں نے اپنی اداکاری میں جان مارنا شروع کر دی کیونکہ فلم ہٹ ہو جاتی تو وہ سب ہٹ ہو جاتے۔

ادارے کے بڑوں نے سام کی ایک بات نہیں مانی تھی۔ اس نے فلم کا بجٹ بڑھانے کا مطالبہ کیا تھا اسی مطالبے پر اسے بتایا گیا کہ اسے اسی بجٹ میں فلم تیار کرنی ہے اور سابق ہدایت کار جو خرچ کر چکا تھا وہ بھی نہیں ملے گا یعنی اسے مزید تیس فی صد کم بجٹ ملا تھا اور اس میں فلم کی تیاری بہت مشکل تھی۔ لیکن سام نے اس بات کو مسئلہ بنانے کی بجائے کام شروع کر دیا۔ توقع کے عین مطابق ابھی نصف شوٹنگ ہوئی تھی کہ بجٹ ختم ہو گیا۔ اس نے اوپر والوں کو اطلاع کر دی کہ بجٹ ختم ہو گیا ہے اب جب تک مزید رقم نہیں ملے گی شوٹنگ ممکن نہیں ہے۔ اس پر اس کی طلبی ہو گئی اور اس سے کہا گیا کہ اس نے اب تک جو کچھ شوٹ کیا ہے وہ بھی ساتھ لے کر آئے۔

سام ریلوں کے ڈبے بغل میں دبائے ڈائریکٹرز کے پاس پہنچ گیا جو اس کی گوشمالی کے لیے تیار تھے۔ سب نے اسے آڑے ہاتھوں لیا تھا اور اسے بہت کچھ سننا پڑا تھا۔ وہ سنتا رہا جب انہوں نے اپنی بات ختم کر لی تو سام نے اٹھ کر پروجیکٹر پر اپنی نامکمل فلم کی ریل لگا دی۔ فلم شروع ہوئی۔ پہلے ہی منظر سے اس نے میٹنگ ہال میں موجود تمام افراد کو متوجہ کر لیا۔ یہ کوئی ایک گھنٹے کی مووی تھی اور اس میں آواز اور ساؤنڈ مکسنگ بھی نہیں تھی۔ بلکہ اب تک ایفیکٹس بھی نہیں ڈالے گئے تھے۔ اس کے باوجود فلم کا ایک ایک سین دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ ایک گھنٹے تک کسی نے آواز بھی نہیں نکالی تھی البتہ جب فلم اچانک ادھوری ختم ہو گئی تو ایک ڈائریکٹر نے اعتراض کیا۔ ''باقی فلم کہاں ہے؟''

''باقی فلم کے لیے ہی تو بجٹ کی ضرورت ہے۔'' سام نے اطمینان سے جواب دیا۔

اس کے بعد بجٹ کی منظوری میں دس منٹ بھی نہیں لگے تھے اور اگلے روز سے سام نے شوٹنگ شروع کر دی۔ مقررہ وقت پر تکمیل کے بعد جب فلم کی ریلیز کا مرحلہ آیا تو اسے بی کے بجائے اے کیٹیگری دے دی گئی اور اسے بہترین تھیٹرز میں ریلیز کیا گیا۔

فلم نے شاندار کامیابی حاصل کی اور اس سے منسلک افراد راتوں رات سپر اسٹار بن گئے۔ سام کو فلم کی کامیابی پر صف اوّل کے ہدایت کاروں میں شامل کر لیا گیا تھا۔ اس کی غیر معمولی صلاحیتوں نے سب کو چونکا دیا تھا اور ادارے والے اب اس سے کام لینے کے لیے بے چین تھے۔

ٹیکساس کے ایک چھوٹے سے قصبے سے اٹھ کر ہالی ووڈ میں کامیابی حاصل کرنا کسی دیوانے کے خواب سے کم نہیں تھا۔ سام نوعمری سے ہدایت کار بننے کے خواب دیکھا کرتا تھا جب کہ اس کا زمیندار باپ چاہتا تھا کہ وہ فلم نگری کے خواب دیکھنا چھوڑ دے اور گریجویشن کر کے اس کا ہاتھ بٹائے۔ لیکن سام اپنی دھن کا پکا تھا اس نے باپ کے دباؤ پر گریجویشن کر لیا تھا۔ اس کے بعد اس نے اپنا چھوٹا سا سوٹ کیس اٹھایا اور گھر سے رخصت ہو گیا۔ اس کی جیب میں معمولی سی رقم تھی۔ لیکن اسے زیادہ فکر نہیں تھی۔ اپنے خواب کی تکمیل کے لیے وہ محنت مزدوری کرنے کو بھی تیار تھا۔ پھر اسے سچ مچ دو سال ہالی ووڈ میں محنت مزدوری کر کے اپنا گزارا کرنا پڑا تھا تب کہیں جا کر اسے اس فلم ساز ادارے میں ملازمت ملی تھی۔

سام کو فوری طور پر کسی نئی فلم کے آغاز کا کہا گیا لیکن اس نے ادارے کے مالکان پر واضح کر دیا کہ وہ اس طرح سے فلم سازی نہیں کرے گا۔ جب تک اسے کسی اچھی فلم کا خیال نہیں سوجھ جاتا۔

وہ اب ان لوگوں کی مجبوری بن گیا تھا اس لیے وہ سام کے جواب کو کڑوا گھونٹ سمجھ کر پی گئے اور صبر سے انتظار کرنے لگے کہ کب سام ان کو کوئی دوسری فلم تیار کر کے دیتا ہے۔ صف اوّل کے ہدایت کار فلم ساز بھی ہوتے تھے اور وہ اپنی اگلی فلم خود منتخب کر کے اوپر والوں سے صرف اس کی منظوری لیتے تھے۔

سام نے اگلی فلم بنانے میں دو سال لگا دیئے اور اس نے خوب چھان پھٹک کر ایسا موضوع لیا جس پر پہلے کم ہی فلمیں بنی تھیں اور اس نے اسے اس طرح بنایا کہ یہ اس کی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

پہلی فلم سے بھی زیادہ کامیاب ثابت ہوئی تھی جب کہ اس کی پہلی فلم ابھی تک بزنس کر رہی تھی۔ سام کی شہرت، عزت اور مرتبے میں کوئی کمی رہ گئی تھی تو وہ دوسری فلم نے پوری کر دی اور اس پر دولت کی بارش ہوگئی۔ اگرچہ اسے پہلے ہی شاندار تنخواہ کے ساتھ ادارے کی طرف سے مراعات بھی مل رہی تھیں لیکن اس فلم میں اسے منافع میں بھی حصہ ملا تھا اور وہ دوسری فلم سے ملینیر بن گیا تھا۔

سام اب تک کرائے کے مکان میں رہتا آ رہا تھا۔ دولت ہاتھ آئی تو اس نے بیورلی ہلز میں جہاں چوٹی کے فن کاروں کے گھر تھے ایک عالی شان ولا خرید لیا۔ اس کے پاس وہ سب آ گیا تھا جس کی ہالی ووڈ میں خواہش کی جا سکتی ہے۔ اس کے پاس بہترین گاڑیاں تھیں اور عورتیں اس کے آس پاس منڈلانے لگی تھیں۔ ان میں پرانی اداکارائیں بھی تھیں اور ابھرتی ہوئی اداکارائیں بھی۔ وہ جانتی تھیں کہ سام ایک ایسا فلم ساز تھا جو ایک ہی فلم میں ان کو آسمان کی بلندیوں تک لے جا سکتا تھا۔

سام نے پہلی محبت ایک اداکارہ سے کی تھی۔ نیٹ پارس نامی یہ اداکارہ صرف حسین و جمیل ہی نہیں تھی بلکہ بے حد ذہین بھی تھی اور اس کی ذہانت کا اندازہ تو اس بات سے بھی لگایا جا سکتا تھا کہ اس نے سام کو اپنی محبت پر قائل کر لیا تھا۔ دونوں ایک ساتھ نظر آنے لگے اور اکثر و بیشتر ایک دوسرے کے گھر میں پائے جاتے تھے۔ سام نے ہالی ووڈ کے رواج کے برعکس اپنی محبت چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس نے ایک صحافی سے کہا۔ ''ہم ٹیکساس والے کوئی کام چھپا کر نہیں کرتے۔ ہاں میں نیٹ سے محبت کرتا ہوں۔''

شادی کے معاملے میں دونوں ہی سنجیدہ نہیں تھے۔ نیٹ سام کی طرف آئی تو اس کا خیال تھا کہ سام اسے اپنی آنے والی فلم میں کاسٹ کرے گا۔ لیکن جب سام نے ایک سال بعد تیسری فلم کا آغاز کیا تو نیٹ اس میں نہیں تھی۔ ایک سوال کے جواب میں سام نے بڑی سادگی سے اس کی وضاحت کر دی۔ ''اس فلم میں کسی کردار کے لیے نیٹ موزوں نہیں ہے اس لیے وہ اس فلم میں نہیں ہے۔''

جب یہ خبر شائع ہوئی تو سام اور نیٹ کے تعلقات میں پہلی دراڑ آئی۔ اس کے باوجود یہ تعلقات جاری و ساری رہے تھے۔ ان کا خاتمہ اس وقت ہوا جب سام نے اپنی اگلی فلم میں بھی نیٹ کو نہیں لیا تو وہ ہمیشہ کے لیے اس کی زندگی سے نکل گئی۔

ان کے درمیان کیا ہوا تھا اس کا کسی کو علم نہیں تھا کیونکہ نہ تو نیٹ نے اور نہ ہی سام نے کبھی اس بارے میں اپنی زبان کھولی تھی۔ دونوں ہی اندر کی باتوں کو پی گئے تھے۔ خود کو تماشہ بنانے سے گریز کیا تھا۔

اس کے بعد سام نے کئی سال تک کسی عورت سے راہ و رسم بڑھانے سے گریز کیا۔ حالانکہ اس کے قرب کی خواہش مند عورتوں کی کوئی کمی نہیں تھی اور ان میں نامور سیلی بریٹیز بھی شامل تھیں۔ سام اپنے کام میں مگن رہا تھا۔ وہ جلدی جلدی فلمیں بنانے کا قائل نہیں تھا۔ وہ عام طور سے دو سال میں جا کر ایک فلم مکمل کرتا تھا۔ کسی فلم سے فارغ ہونے کے بعد وہ پہلے نئے آئیڈیے کی تلاش کرتا تھا اور پھر اسے اپنے ذہن میں پکاتا رہتا تھا۔ جب وہ پوری طرح تیار ہو جاتا تو اسے اسکرپٹ کی صورت میں لاتا تھا۔ پہلی فلم کے بعد وہ اسکرپٹ بھی خود تیار کرنے لگا تھا البتہ معاونت کے لیے وہ ادارے کے کسی اچھے اسکرپٹ رائٹر کو ساتھ رکھ لیتا تھا۔

سام کی تیسری اور پھر چوتھی فلم بھی بلاک بسٹر ثابت ہوئی۔ اس کی کامیابی کے بعد سام کا شمار آل ٹائم گریٹ ڈائریکٹرز میں ہونے لگا تھا۔ اس کی تیسری فلم پر اسے آسکر ایوارڈ سے بھی نوازا گیا تھا اور اسے بہترین ہدایت کاری پر یہ اعزاز ملا تھا۔ چوتھی فلم کے بعد وہ چھٹیاں گزارنے آسٹریلیا چلا گیا اور وہاں کئی مہینے تک مقیم رہا تھا۔ آسٹریلیا سام کا پسندیدہ ملک تھا اور اس کا ارادہ تھا کہ مستقبل میں یہیں رہائش اختیار کرے گا لیکن فی الحال تو وہ ہالی ووڈ سے دور نہیں رہ سکتا تھا۔

اپنی پانچویں فلم کے لیے اس نے زیادہ ہی وقت لگا دیا تھا اور اس بار اس نے تیس سال بعد اگلی فلم کا آغاز کیا۔ حسبِ معمول اس کا آئیڈیا اور اسکرپٹ بھی اسی کا تھا۔ اب تک سام واقعات پر فلمیں بناتا آیا تھا پہلی بار اس نے ایک کردار لیا اور یہ بھی اس کا تخلیق کیا ہوا تھا۔ اس کا کردار ایسا وش ماسٹر تھا جو صرف دوسروں کے کام آ سکتا تھا۔ اگر وہ اپنے لیے کوئی خواہش کرتا یا کوئی ایسی خواہش کرتا جس میں اس کا مفاد بھی ہوتا تو اس کی خواہش پوری نہیں ہوتی تھی۔ وش ماسٹر ایک ایسا شخص ہوتا ہے جو کوئی خواہش کرتا ہے تو وہ پوری ہو جاتی ہے۔ مغربی کامکس میں ایسے کئی کردار تھے۔

لیکن سام کا تخلیق کیا ہوا وش ماسٹر بینگ منفرد تھا۔ اس

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کے دشمن اس کی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہیں اور اسے ایسی خواہشات پر مجبور کرتے ہیں جن سے اسے نقصان اور دشمن کو فائدہ ہو۔ لیکن بینگ اپنی ہمت اور بہادری سے دشمن پر حاوی آجاتا ہے۔ سام کی یہ فلم اس کی سابقہ تمام فلموں سے زیادہ کامیاب رہی تھی اور فلم بین بینگ کے کردار کے دیوانے ہوگئے اور دیکھتے ہی دیکھتے بینگ برانڈ کی درجنوں اشیا مارکیٹ میں آگئیں۔ اس کامیابی کو دیکھتے ہوئے ادارے کے مالکان نے بینگ کے کردار پر فلم کی سیریز بنانے کا مشورہ دیا۔ یہ مشورہ سام کے دل کو لگا تھا اور فلم کی کامیابی نے بھی اسے اکسایا تو اس نے فوراً ہی بینگ کی اگلی فلم کی تیاری شروع کردی۔

بینگ کا ہیرو ایک معمولی سا اداکار تھا لیکن سام نے بھانپ لیا کہ وہ بینگ کے کردار میں یوں فٹ ہوگا جیسے انگوٹھی میں نگینہ۔ یہ ایک معصوم صورت اور بھولا بھالا نوجوان ہوتا ہے جسے اس کے دشمن چالاک بناتے ہیں۔ سام نے بینگ کو عام کومک کرداروں کے برعکس معاشرے کا حصہ دکھایا جو ہر اس مسئلے سے دوچار ہوتا ہے جو ایک عام آدمی کو پیش آتے ہیں۔ وہ صرف خواہش کرنے کے معاملے میں دوسرے انسانوں سے منفرد ہے اور اسی بات نے بینگ کو مقبول عام بنا دیا۔ بینگ کا کردار ادا کرنے والا اداکار ایک ہی فلم سے دنیا بھر میں جانا پہچانا بن گیا تھا۔

سام نے پہلی فلم میں کوئی ہیروئن نہیں ڈالی تھی لیکن دوسری فلم میں اس نے ایک نئی لڑکی کو متعارف کرایا۔ یہ ایک سماجی کارکن تھی اور بینگ کی پرستار بھی تھی۔ بینگ کا دشمن نئے انداز میں سامنے آتا ہے اور وہ لڑکی کو اس طرح استعمال کرتا ہے کہ خود لڑکی کو بھی پتا نہیں چلتا ہے۔ وہ آخر میں بینگ پر قاتلانہ حملہ کرتی ہے اور بینگ مرنے والا ہو جاتا ہے۔ وہ خواہش کرکے اپنی جان بھی نہیں بچا سکتا تھا کیونکہ اس کی ایسی کوئی خواہش پوری نہیں ہوتی تھی جو اس کی ذات کے بارے میں ہو۔ اس موقع پر پھر بینگ کی ذہانت کام آتی ہے۔ ہیروئن بینگ پر قاتلانہ حملہ کرکے پشیمان ہے اور رو رہی ہے۔ تب بینگ خواہش کرتا ہے کہ لڑکی جو خواہش کرے وہ پوری ہو جائے۔ لڑکی خواہش کرتی ہے کہ بینگ ٹھیک ہو جائے۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔ یوں بینگ ایک بار پھر اپنی ذہانت سے اپنے دشمن کو شکست دے دیتا ہے۔ یہ فلم پہلے سے بھی زیادہ کامیاب رہی تھی۔ بینگ اب فلم بین طبقے کی جان بن چکا تھا۔

فاس

مراکش کا ایک شہر اور سلطان کا مقام سکونت۔ آبادی دو لاکھ سے زائد۔ محل وقوع انتہائی اہم اور شاندار ہے۔ فاس درحقیقت دو شہروں پر مشتمل ہے۔ فاس الجدید (نیا شہر) اور فاس البالی (پرانا شہر) فاس الجدید سرکاری دفاتر کا شہر ہے۔ صرف دارالحکومت ہی نصف سے زیادہ شہر میں پھیلا ہوا ہے۔ دارالحکومت ان عمارتوں اور احاطوں کا مجموعہ ہے جہاں حکومت مراکش کے مرکزی دفاتر واقع ہیں۔ وزرائے دفاتر اور کوشک سلطانی بھی یہیں ہیں۔ ان کے علاوہ وہ محلات ہیں، جہاں سلطان اپنے کنبے کے ساتھ سکونت رکھتا ہے اور جو اپنی سبز رنگ کے ٹائلوں کی چھتوں سے پہچانے جاتے ہیں۔ یہاں غیر ملکی سفیروں سے ملاقات کے لیے ایک مخصوص کوشک، شاہی چڑیا گھر، اسلحہ خانہ اور باغات ہیں۔ متعدد مساجد ہیں، جن میں سب سے زیادہ قابل ذکر مسجد جامع، جامع احمر اور جامع اخضر ہیں۔ یہ مساجد اپنے میناروں کے رنگ کی وجہ سے مشہور ہیں۔ فاس الجدید، دراصل فاس البالی کا ایک ذیلی قصبہ ہے۔ فاس البالی کا نقشہ نئے شہر کی نسبت بہت متنوع اور دلکش منظر پیش کرتا ہے۔ یہ شہر دریائے فاس کی تنگ وادی کے ساتھ ساتھ پھیلا ہوا ہے۔ اس کے مکانات، مساجد اور باغات ان پہاڑیوں کی ڈھلواں چٹانوں پر واقع ہیں جو وادی کی گزرگاہ کو اس فصیل تک گھیرے ہوئے ہیں جو چٹانوں کے پشتوں پر بنالی گئی ہے۔ فاس صرف اپنے محل وقوع کی خوبصورتی کی وجہ ہی سے نہیں، بلکہ اپنی مذہبی یادگاروں کی اہمیت کی بدولت بھی سارے مغرب اقصیٰ میں ممتاز و معروف ہے۔ یہاں مختلف شاہی خاندان کے بعد دیگرے سریر آرائے سلطنت ہوئے۔ اور انہوں نے ہمیشہ اس قسم کی یادگاروں سے شہر کو مالا مال کرنے کی طرف اپنی توجہ مبذول کی۔ چنانچہ شہر میں تمام سلسلوں کی چھوٹی بڑی ہر طرح کی آٹھ سو پچاس مذہبی عمارتیں، مساجد، مدرسے، عبادت خانے، زاویے یا معبد ہیں جو کسی نہ کسی بزرگ کے مقبرے کے ساتھ تعمیر کیے گئے تھے۔

مرسلہ: سلطان محمد، کویت

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

فلم کی شوٹنگ کے دوران سام ہیروئن ربیکا کے خاصا قریب آگیا تھا۔ حالانکہ وہ صرف بیس سال کی تھی اور سام اب تیس کا ہونے والا تھا لیکن دونوں میں ذہنی ہم آہنگی تھی اس لیے وہ جلد ایک دوسرے کے قریب آگئے۔ فلم کی تکمیل کے دوران سام کے مخالفوں نے اس پر الزام لگایا کہ اس نے ربیکا کو بھرتی کیا ہے اور اس میں اس کا اپنا مفاد ہے۔ جب شوٹنگ کے دوران سام اور ربیکا قریب آئے تو ان الزامات میں شدت آگئی۔ سام نے میڈیا پر اسے بل شٹ قرار دے کر اس بارے میں بات کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ ربیکا سو فی صد میرٹ پر آئی ہے اور جب فلم ریلیز ہوئی تو سام کی بات کی تصدیق ہوگئی۔ ربیکا نے فلم میں غیر معمولی اداکاری کی تھی اور پہلی ہی فلم نے اسے سپر اسٹار بنا دیا تھا۔

سام نے سیریز کی دوسری فلم کی کامیابی کے بعد فیصلہ کیا کہ ابھی وہ آرام کرے گا۔ جب کہ ادارے کے مالکان اور ربیکا کا اصرار تھا کہ وہ جلد از جلد بینگ پر تیسری فلم بنائے کیونکہ ابھی یہ کردار مقبول تھا اور نئی فلم بھی کامیاب ہوتی۔ لیکن سام کا کہنا تھا کہ اتنی جلدی وہ فلم بنا کر اپنے کردار کو خراب نہیں کرنا چاہتا۔ جب تک اس کے ذہن میں کوئی بہترین آئیڈیا نہیں آجاتا وہ نئی فلم کا آغاز نہیں کرے گا۔ اس کے جواب نے مالکان اور فلم کے لوگوں کو مایوس کیا تھا۔ ربیکا اور بینگ کا کردار ادا کرنے والا اداکار شیلر دوسری فلموں کی طرف متوجہ ہوگئے۔ ان کی کامیابی کی وجہ سے فلم سازان پر ٹوٹ کر گرے تھے۔

ربیکا کی مصروفیات بڑھیں تو سام اور اس کا ملنا جلنا کم ہوگیا لیکن ان کا تعلق اور اس کی نوعیت برقرار تھی۔ ربیکا نے دوسری فلموں میں بھی کامیابی حاصل کی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے بالی ووڈ کی سب سے زیادہ معاوضہ لینے والی اداکارہ بن گئی تھی۔ اس وجہ سے میڈیا کی توجہ کا مرکز بھی بن گئی اور آئے دن اس کا نام کسی نہ کسی اداکار کے ساتھ لے کر خبریں شائع کی جاتی تھیں۔ شروع میں تو وہ پریشان ہوگئی تھی لیکن سام نے اسے تسلی دی کہ یہ معمول کی بات ہے اور سلی بریٹیز بننے کی قیمت بھی ہے اس لیے وہ پریشان نہ ہو۔ سام کو اس پر اور اس کی محبت پر پورا اعتماد تھا۔ سام نے ربیکا کی کامیابی کو اس کی صلاحیتوں کی مرہون منت قرار دیا۔ اس نے ربیکا پر دباؤ نہیں ڈالا تھا کہ وہ بینگ سلسلے کی تیسری فلم کے لیے بھی کام کرے کیونکہ اس فلم میں اصل کردار بینگ کا تھا، ہیروئن کا کردار بہت کم تھا جب کہ ربیکا اب ایسی اداکارہ بن گئی تھی جس کو لے کر خاص کردار تخلیق کیے جاتے تھے۔ لیکن سام نے اسے پیش کش ضرور کی تھی اور اس کی توقع کے عین مطابق ربیکا نے انکار کر دیا۔

ربیکا سے تعلق بنہ تو سام نے چھپایا اور نہ ربیکا نے البتہ انہوں نے ان افواہوں کو مسترد کر دیا کہ وہ چھپ کر شادی کر چکے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے محبت ضرور کرتے تھے لیکن انہوں نے شادی کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ سام کا خیال تھا کہ ابھی ربیکا کے کیریئر کا آغاز تھا اور اسے شادی وغیرہ کے چکر میں پڑے بغیر اپنے کام پر توجہ دینے کی ضرورت تھی۔

سام خود بھی بینگ پر تیسری فلم جلد بنانا چاہتا تھا لیکن ساتھ ہی وہ اس کی کہانی کو اتنا جاندار رکھنا چاہتا تھا کہ دیکھنے والے اسے پہلی دو فلموں سے کسی طرح بھی ہلکا نہ پائیں۔ اس سلسلے میں اس نے آسٹریلیا جانے کا فیصلہ کیا جہاں وہ تمام جھمیلوں سے آزاد ہو کر صرف کہانی پر غور کر سکے۔ ابھی وہ آسٹریلیا میں تھا کہ نائن الیون کا واقعہ پیش آگیا اور ساری دنیا میں بھونچال آگیا تھا۔ امریکا پر حملہ غیر معمولی تھا اور اس واقعے نے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ خود سام اتنا پریشان ہوا تھا کہ اس نے کچھ عرصے کے لیے کہانی پر کام ملتوی کر دیا تھا۔ لیکن پھر رفتہ رفتہ سب معمول پر آتا چلا گیا۔ سام نے بھی اپنی کہانی پر کام مکمل کیا اور امریکا واپس آگیا۔

اس کا خیال تھا کہ وہ ادارے کے مالکان سے منظوری لے گا اور فلم پر فوری کام شروع کر دے گا۔ لیکن جب اس نے اپنی کہانی مالکان کے سامنے رکھی تو انہوں نے اسے مسترد کر دیا۔ اس کے بجائے انہوں نے سام سے کہا کہ وہ بینگ پر عالمی دہشت گردی کے حوالے سے کوئی کہانی بنا کر اسے فلمائے۔ سام نے وجہ دریافت کی تو اسے جواب ملا۔ ''اس وقت ہمیں مورل سپورٹ کی ضرورت ہے۔''

سام کو حیرت ہوئی کہ دنیا کی واحد سپر پاور کو بھی مورل سپورٹ کی ضرورت ہے۔ اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے امریکیوں کو مورل سپورٹ کی ضرورت ہے لیکن میرا کردار صرف امریکا کا نہیں ہے بلکہ یہ ایک یونیورسل کریکٹر ہے۔''

''اس وقت امریکی بن کر سوچو۔'' اسے مشورہ دیا گیا۔

سام نے اس کی کوشش کی لیکن وہ خود کو قائل نہیں کر

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

سکا۔اس نے مالکان کو جواب دے دیا۔''میں اپنے کردار کو تبدیل نہیں کرسکتا۔''

''تب ہمیں اس کی مزید ضرورت نہیں ہے۔''

سام مایوس ہوا تھا کیونکہ اس نے کہانی پر بہت محنت کی تھی اور اب موقع تھا تو یہ مسئلہ سامنے آگیا تھا۔جلد اسے معلوم ہوگیا کہ ادارے والوں کی حب الوطنی نے جوش نہیں مارا تھا بلکہ فلم ساز اداروں کو حکومت کی طرف سے حکم آیا تھا کہ وہ اس موضوع پر زیادہ سے زیادہ فلمیں تیار کرکے عوام کا ذہن بنائیں۔یہی وجہ تھی کہ اس موضوع پر تواتر سے فلمیں سامنے آنے لگی تھیں۔سام نے شروع میں اس بارے میں کچھ سوچا نہیں تھا لیکن جیسے جیسے وہ حالات دیکھتا رہا اسے اپنے حکمرانوں کی پالیسیوں سے اختلاف ہونے لگا۔وہ اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے پورے ملک کو استعمال کررہے تھے۔

سام کو ایک فلم کا خیال آیا۔یہ جنگ کے موضوع پر طنزیہ فلم تھی۔کیونکہ بینگ والی کہانی مسترد ہوگئی تھی اس لیے اس نے اس خیال پر کام شروع کردیا اور بڑی عرق ریزی کے بعد اسکرپٹ مکمل کرکے ادارے کے کرتا دھرتا کو پیش کیا۔لیکن اس کا اسکرپٹ پھر مسترد کردیا گیا۔عملاً اسکرپٹ اس کے منہ پر دے مارا گیا۔ادارے کے ایک مالک جو عرف عام میں بگ برادر کہلاتا تھا اس نے اسکرپٹ کی فائل سام کی طرف پھینکی۔''یہ کیا بکواس ہے؟''

''یہ ایک فلم کا خیال ہے۔''

''ہمیں اس قسم کی فلموں کی ضرورت نہیں ہے۔''بگ برادر نے غرا کر کہا۔

''میرے خیال میں ضرورت ہے۔''سام نے اصرار کیا۔''کیونکہ لوگ پریشان ہیں ان کو تفریح کی ضرورت ہے۔''

''لوگوں کو کس چیز کی ضرورت ہے یہ تم سے زیادہ میں جانتا ہوں۔تم کسی جنگی موضوع پر کام کرو جس میں ملک کے مفاد کو اجاگر کیا گیا ہو۔''

''ایسی فلمیں تو آج کل درجنوں کے حساب سے بن رہی ہیں۔خود ہم ایسی کم سے کم تین فلموں پر کام کررہے ہیں۔''

''تم اس کی فکر مت کرو۔تم سے جو کہا جارہا ہے وہ کرو۔''

''سوری بگ برادر میں تفریحی فلمیں بناتا ہوں پروپیگنڈہ فلمیں نہیں۔''سام نے انکار کردیا۔

''تب تم جا کر آرام کرو۔''

جلد سام کو اندازہ ہوگیا کہ اسے صرف مشورہ ہی نہیں دیا گیا تھا بلکہ اسے آرام کرانے کا بندوبست بھی کرلیا گیا تھا۔اس کے پاس فی الحال کوئی فلم نہیں تھی اور اس کے دو آئیڈیے مسترد کیے جاچکے تھے۔کچھ عرصے بعد سام نے ایک رومانی اور حساس کہانی کا اسکرپٹ تیار کرکے منظوری کے لیے پیش کیا جسے پڑھے بغیر ہی مسترد کردیا گیا کیونکہ اسے جتنی جلدی مسترد کیا گیا تھا اسے پڑھنے کے لیے اس سے دوگنا وقت درکار تھا۔تب سام سمجھ گیا کہ اسے اس کے انکار کی سزا دی جارہی ہے۔اس نے مزید کسی آئیڈیے پر کام کرنے کے بجائے بہتر سمجھا کہ اپنے تیار اسکرپٹس کے لیے کوئی سرمایہ لگانے والا تلاش کرے۔اگرچہ وہ ادارے کا ملازم تھا لیکن اسے نجی طور پر کام کرنے کی آزادی حاصل تھی بہ شرط کہ وہ ادارے کی سرگرمیوں میں خلل نہ ڈالے۔وہ فارغ تھا اس لیے اس چھوٹ سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔

لیکن جب سام نے ہالی ووڈ میں آزادانہ کام کرنے والے سرمایہ کاروں سے رجوع کیا تو ان میں سے بھی کسی نے اسے لفٹ نہیں کرائی۔حالانکہ وہ سب جانتے تھے کہ سام کس پائے کا فلم ساز ہے اور اس کی بنائی کوئی بھی فلم ناکام نہیں ہوئی ہے۔یہ وہی سرمایہ کار تھے جو اس کے آگے پیچھے گھومتے تھے اور فلم بنانے کے عوض اسے منہ مانگا معاوضہ دینے کو تیار رہا کرتے تھے۔اب وہ اسے انکار کررہے تھے اور ظاہر ہے ان کے انکار کے پس پشت سام کے باس بگ برادر کا ہاتھ تھا۔ورنہ کوئی بھی فلمی سرمایہ کار کم سے کم بینگ کی فلم میں سرمایہ کاری سے انکار نہیں کرسکتا تھا۔

ہر طرف سے مایوس ہو کر سام بیٹھ گیا تھا۔وہ اب استعفا دینے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ادارے والے اسے خالی بٹھا کر ذلیل کررہے تھے اور وہ اس دوران میں سوائے کھیاں مارنے کے اور کچھ نہیں کرسکا تھا۔اسے اُمید تھی کہ وہ یہاں سے جان چھڑائے گا تو اسے کسی اور اسٹوڈیو کی طرف سے پیش کش ہوگی۔فیصلہ کرکے اس نے استعفا دینے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی جب اس نے استعفا بگ برادر کے سامنے رکھا تو اس نے سرد لہجے میں کہا۔''اس کا مطلب جانتے ہو؟''

''نہیں۔''سام نے جواب دیا۔

''اب تم ہالی ووڈ میں کوئی کام نہیں کرسکو گے۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''تم بگ برادر ضرور ہو لیکن گاڈ فادر نہیں ہو۔'' سام نے طنز کیا۔ ''میں کہیں نہ کہیں کام حاصل کرلوں گا۔''

''اگر کر سکو تو ضرور کر لینا؟'' بگ برادر نے طنزیہ انداز میں کہا اور اس کا استعفا منظور کرلیا۔

سام نے کوشش کی کہ اسے کسی اور ادارے میں ملازمت مل جائے۔ اس کا خیال تھا کہ اسے زیادہ دشواری پیش نہیں آئے گی لیکن اس وقت اسے دھچکا لگا جب اس کی درخواستوں کا کہیں سے جواب نہیں آیا۔ اس کے مینیجر نے ہر ممکن کوشش کر لی لیکن کوئی مستند فلمی ادارہ اسے رکھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس سے بھی زیادہ حیران کن بات یہ تھی کہ میڈیا میں بھی اس کے حق میں کوئی سامنے نہیں آیا تھا۔ اس کے بارے میں خبریں ضرور آتی تھیں کہ سام نے اسٹوڈیو سے استعفا دے دیا یا سام کی فلاں اسٹوڈیو میں ملازمت حاصل کرنے کی کوشش ناکام رہی لیکن ان میں اس کے لیے ہمدردی کا عنصر نہیں پایا جاتا تھا۔ خبر برائے خبر ہوتی تھی۔

پھر ہالی ووڈ کے جنگی جنون میں مبتلا گروہ نے اس کے خلاف مہم شروع کر دی اور اس پر الزام لگایا کہ امریکا سے کمانے اور عزت و شہرت حاصل کرنے کے بعد وہ ملک کے مفاد کے خلاف ہے۔

سام نے ان الزامات کی تردید کی اور وضاحت کی کہ وہ صرف حکمرانوں کی پالیسیوں کے خلاف ہے جو ملک کو تباہی کی طرف لے جا رہے ہیں۔ لیکن اس کی وضاحت نہ تو کسی نے سنی اور نہ ہی اسے زیادہ اہمیت دی گئی تھی۔ اس پروپیگنڈہ مہم کے زیر اثر رائے عامہ بھی اس کے خلاف ہوگئی تھی۔ کئی بار سام کے گھر کے سامنے لوگ پلے کارڈز اٹھا کر کھڑے ہو گئے جن میں اسے ملک کا غدار اور دشمن تک قرار دیا گیا تھا۔

سام کے لیے یہ مشکل وقت تھا اور اس کے پاس سوائے صبر کے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا وہ اس معاملے میں جتنا بھی بولے گا اور وضاحتیں پیش کرے گا وہ سب اس کے خلاف جائیں گی۔ اس کا بہترین حل یہی تھا کہ وہ خاموشی سے ملک کے اس جنونی دور سے گزر جانے کا انتظار کرے۔ سام کو آخری فلم بنائے ہوئے تین سال ہونے کو آئے تھے۔ اس کے بعد اسے کوئی فلم بنانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اسے پہلی بار اندازہ ہوا کہ اس کے لوگوں میں برداشت کا مادہ نہیں ہے۔ سارتر نے فرانسیسی ہوتے ہوئے بھی الجزائر کی تحریک آزادی کی حمایت ہی نہیں کی تھی بلکہ وہ اپنے ملک سے لڑا بھی تھا اس کے باوجود کسی نے اسے غدار قرار نہیں دیا بلکہ اس وقت کے صدر ڈیگال نے اس عظیم فلسفی کی گرفتاری کے مشورے پر حیرت سے کہا تھا کہ کیا میں فرانس کو گرفتار کرلوں۔ سارتر فرانس ہے اور میں پورے فرانس کو گرفتار نہیں کر سکتا۔ اور یہاں سام کو غدار قرار دیا جا رہا تھا۔

سام کے جاننے والے اور فلمی دنیا کے ساتھی رفتہ رفتہ اس سے دور ہونے لگے۔ انہیں بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ سام سرکاری عتاب میں آیا ہوا ہے اور اس کے قریب جانے والے یا اس سے ہمدردی رکھنے والے ہر شخص کا انجام سام جیسا ہی ہو سکتا تھا۔ سام کا خیال تھا کہ شاید ربیکا اس سے یہ سلوک نہیں کرے گی لیکن اسے دھچکا لگا جب ربیکا بھی اس سے دور ہونے لگی۔ سب کی طرح ربیکا کو بھی اپنا کیریئر عزیز تھا۔ لیکن اس نے دوسروں کی طرح منافقت کرنے کے بجائے سام سے صاف کہہ دیا۔ ''سام میں اب تم سے نہیں مل سکتی۔''

''مجھے معلوم ہے۔'' سام نے جواب دیا۔ ''یہ تمہارے کیریئر کا سوال ہے اور مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔''

''میں ساری عمر تمہاری شکر گزار رہوں گی۔'' ربیکا نے افسردگی سے کہا۔ ''میری بزدلی پر مجھے معاف کر دینا۔''

ربیکا نے جرأت کر کے اپنی بزدلی کا اعتراف کرلیا تھا لیکن سام کے دوسرے جاننے والوں کو جواب اس سے منہ چھپائے پھرتے تھے اتنی توفیق بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس سے اعلانیہ قطع تعلق کر لیتے۔ استعفے کے بعد سام زیادہ تر گھر میں وقت گزارنے لگا تھا۔ کبھی کبھی کسی فلمی تقریب میں شرکت کر لیا کرتا تھا جہاں کیمروں کے سامنے تو فلم والے اس کا گرم جوشی سے استقبال کرتے تھے لیکن آف دی کیمرا ان کا رویہ ویسا ہی تھا۔ دوسری محبت میں ناکامی نے اسے تنہائی پسند بنا دیا تھا اور وہ کسی سے ملنا پسند نہیں کرتا تھا۔

پھر رفتہ رفتہ قوم کا جنگی بخار اترنے لگا اور حقائق منظر عام پر آئے تو لوگوں میں ایک مخالف جذبہ نظر آنے لگا۔ اس کا اثر ہالی ووڈ کی انڈسٹری پر بھی پڑا تھا اور اب جنگ کے خلاف بھی فلمیں بننے لگیں۔ اگرچہ یہ بڑی محدود اور محتاط قسم کی فلمیں تھیں جن میں ڈھکے چھپے انداز میں جنگ کے منفی پہلو کو سامنے لایا گیا تھا۔ فارن ہائیٹ نائن الیون جیسی فلمیں کم تھیں اور ان کو بھی فیچر فلم کے بجائے ڈاکومینٹری کا درجہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

دے دیا گیا تھا۔ کسی ایک فلم میں بھی واضح نہیں تھا کہ اس ملک کے حکمران دوسرے ملکوں میں کیا کر رہے تھے۔ سام یہ سب دیکھ رہا تھا اور اس کے اندر ایک لاوا سا پک رہا تھا۔

بالآخر اس کے ذہن میں ایک فلم کا خیال پختہ ہو گیا۔ اس فلم میں تیسری دنیا کے ایک فرضی ملک کا ذکر ہے جہاں قیمتی معدنیات اور قدرتی وسائل کی بہتات ہوتی ہے اور جہاں کے لوگ پسماندہ لیکن پُرامن اور انسان دوست ہوتے ہیں۔ ایک استعماری ملک اس ملک کے وسائل پر قبضے کے لیے منصوبہ بناتا ہے اور اس ملک میں انتشار پھیلا کر خانہ جنگی کروا دیتا ہے۔ پھر اس خانہ جنگی کی آڑ میں اپنی فوج اس ملک میں داخل کر دیتا ہے۔ لیکن اس ملک کے حریت پسند اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور وہ بے پناہ قربانیوں کے بعد استعماری ملک کی فوج کو اپنے ملک سے نکال دیتے ہیں۔ سام نے استعماری ملک کا نام بھی فرضی رکھا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا اگر اس نے اصل نام استعمال کیے تو اس کی کہانی کبھی فلم کا روپ نہیں دھار سکے گی۔

سام کے ساتھ فلمی دنیا کی لاتعلقی برقرار تھی۔ اسے ابھی بھی کہیں سے ملازمت کی یا کسی فلم پر کام کرنے کی پیش کش نہیں ہوئی تھی۔ سام جانتا تھا وہ اس معاملے میں اکیلا شکار نہیں تھا بلکہ اس جیسے کئی باضمیر افراد تھے جو عتاب میں آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی صلاحیتوں کو جنگ کے لیے فروخت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اب وہ بیکاری کا عذاب بھگت رہے تھے۔ سام یہ بھی جانتا تھا کہ نہ تو اسٹوڈیو اور نہ ہی کوئی فنانسر اس کی فلم پر سرمایہ لگانے کے لیے تیار ہوگا اسے جو کرنا تھا خود ہی کرنا تھا۔

یہ بڑے بجٹ کی فلم تھی اور اس پر کم سے کم بیس کروڑ ڈالرز کی لاگت آتی۔ سام کا کل اثاثہ ایک کروڑ ڈالرز کا بھی نہیں تھا۔ اسے لازمی فلم سازی کے لیے کہیں سے قرض لینے کی ضرورت پیش آتی۔ اس نے بینکوں سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن ان دنوں بینکوں پر بھی بحران آیا ہوا تھا اور اسٹاک مارکیٹ کریش ہونے کے بعد بینک تیزی سے دیوالیہ ہو رہے تھے۔ لاکھوں لوگ اپنے سرمائے سے محروم ہو چکے تھے اور دیوالیہ بینک بند ہونے سے رقم کی واپسی کی اُمید بھی نہیں رہی تھی۔ بحران کی وجہ سے بینکوں کے قرض دینے کی صلاحیت بھی کم ہو گئی تھی اور ان کی طرف سے شرائط سخت ہوتی جا رہی تھیں۔

سام نے پہلے فلم کا اعلان کرنا مناسب سمجھا اس طرح اسے قرض کے لیے بات کرنے میں آسانی رہتی۔ اس نے اپنے گھر پر فلمی میڈیا کی ایک پریس کانفرنس رکھ لی۔ اگرچہ اس نے زیادہ صحافیوں کو نہیں بلایا تھا صرف گنے چنے لوگ تھے لیکن ان میں سے بھی کم ہی آئے تھے۔ مشکل سے ایک درجن افراد تھے اور یہ سب وہ تھے جو سام سے ہمدردی رکھتے تھے لیکن کھل کر اپنی ہمدردی کا اظہار بھی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ یہ بات ان کے اخبارات اور چینل والوں کو گوارا نہیں تھی۔ سام نے فلم کے مختصر سے خیال کے ساتھ ان کو بتایا کہ وہ اس فلم کو خود بنانا چاہتا ہے اور اسے فنانسر کی تلاش ہے۔ ایک صحافی نے سوال کیا۔

''کیا فلم کا خیال پرانا نہیں ہے؟''

''کوئی خیال نیا نہیں ہوتا ہے۔'' سام نے جواب دیا۔ ''دیکھنا یہ چاہیے کہ اس خیال کی ضرورت ہے یا نہیں ہے۔''

''تمہارے خیال میں اس کی ضرورت ہے؟''

''بالکل ہے آج کی دنیا چھوٹی ہوتی جا رہی ہے۔ گلوبل ویلیج کا سب سے زیادہ شور ہم مچاتے ہیں اور اتنی زحمت نہیں کرتے ہیں کہ اپنے پڑوسی کے گھر جھانک کر دیکھ لیں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔'' سام کا لہجہ کسی قدر تلخ ہو گیا تھا۔

''فلم کے لیے تم نے اپنے پرانے دوستوں سے رابطہ کیوں نہیں کیا؟''

سام مسکرایا۔ ''اگر پرانے دوست کچھ کرنے کے لیے تیار ہوتے تو کیا میں اس وقت اپنے گھر میں پریس کانفرنس کر رہا ہوتا۔''

سام کی یہ پریس کانفرنس میڈیا میں نمایاں جگہ تو حاصل نہیں کر سکی تھی لیکن اس نے ہلچل ضرور مچا دی۔ بہت سارے لوگ جو سام کو ریٹائر سمجھ چکے تھے ان کو پتا چلا کہ سام میں ابھی دم خم ہے اور وہ ان کے مقابلے پر آ سکتا ہے خاص طور سے بگ برادر کا رویہ منفی تھا اس نے سام کے ارادے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ اب ماضی کا حصہ بن چکا ہے۔''

سام نے اشتہاری تکنیک استعمال کی اور بگ برادر کے بیان کے جواب میں ایک صحافی کو بیان دیا۔ ''حیرت ہے ستر سال کا بگ برادر چالیس برس کے سام کو ماضی کا حصہ قرار دے رہا ہے۔ حالانکہ وہ خود ماضی میں جی رہا ہے اور اسے بدلتی دنیا کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہے۔ مجھے یقین ہے چند سالوں میں بگ برادر کو حیرت کے کئی جھٹکے لگیں گے۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اس بیان نے ایک جنگ سی چھیڑ دی اور بگ برادر کے بہت سارے حامی بھی میدان میں آ گئے اور ان کی طرف سے سام پر تنقید کی شدید بوچھاڑ ہونے لگی تھی۔ سام ان سب کو جواب دینے کی بجائے بگ برادر کو نشانہ بناتا تھا کیونکہ اس کے خلاف اس ساری مہم کے پس پشت وہی تھا۔ بگ برادر نے سام کی فلم اور اس کے خیال کو بھی احمقانہ قرار دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ آج کل ایسی فلموں کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ سام اسے برابر کا جواب دے رہا تھا اور اس جنگ کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ اب لوگوں کی توجہ حاصل کر رہا تھا۔ امریکا میں کامیابی کا نسخہ یہی ہے جو لوگوں کی توجہ حاصل کرتا ہے وہی کامیاب ہوتا ہے۔

سام نے رقم کے لیے بینکوں سے بات چیت شروع کی۔ اسے معلوم تھا کہ اسے آسانی سے رقم نہیں ملے گی کیونکہ اس کے پاس کوئی گارنٹی نہیں تھی اور رقم ملی بھی تو سخت شرائط کے ساتھ ملے گی۔ لیکن وہ اس وقت کسی بھی قیمت پر قرض لینے کے لیے تیار تھا۔ اس فلم کی تکمیل اس کی زندگی کا مقصد بن گئی تھی۔ بالآخر تین بینکوں کے ایک کنسورشیم نے اس کی فلم کے لیے رقم فراہم کرنے کی ہامی بھر لی لیکن وہ چاہتے تھے کہ نفع میں بھی شامل ہوں۔ سام نے اس سلسلے میں سخت مزاحمت کی کیونکہ وہ کنسورشیم سے کمرشل ریٹ پر قرض لے رہا تھا اور انہوں نے اس معاملے میں کوئی رعایت نہیں کی تھی۔ سخت شرائط کے ساتھ وہ نفع میں بھی حصے دار بننا چاہ رہے تھے۔ آخر معاملہ نفع میں پانچ فی صد شراکت پر طے ہو گیا۔

رقم ملتے ہی سام نے فلم کی تیاری شروع کر دی اور یہاں سے اس کے لیے مشکلات کا آغاز ہوا۔ اس نے فلم کے کرداروں کے لیے جن اداکاروں کا سوچ رکھا تھا انہوں نے اس کی فلم میں کام کرنے سے انکار کر دیا۔ فلم کے تین مرکزی کردار ہیرو، ہیروئن اور ولن تینوں نے انکار کر دیا تھا۔ اب اسے ان کرداروں کے لیے دوسرے اداکار تلاش کرنے تھے اس نے مزید کسی پرانے کو آزمانے کے بجائے نئے اداکاروں سے کام لینے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اشتہار دے کر نئے اداکار طلب کر لیے اور پھر ان میں سے تین افراد کو چن لیا۔ ان میں نئے ہونے کے باوجود اداکاری کی صلاحیت تھی۔

کاسٹ مکمل کرنے کے بعد جب اس نے تکنیکی عملے کی تلاش شروع کی تو یہاں بھی اسے خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ خدا خدا کر کے یہ مرحلہ بھی مکمل ہوا تو اسے معلوم ہوا کہ کسی اعلیٰ درجے کے اسٹوڈیو میں اس کی فلم کے لیے کوئی فلور دستیاب نہیں ہے۔ دوسرے تیسرے درجے کے اسٹوڈیوز میں جگہ تھی لیکن سام ان کے معیار سے مطمئن نہیں تھا اور نہ اس نے اس قسم کے اسٹوڈیوز میں کام کیا تھا۔ اس لیے اس نے ایک انوکھا فیصلہ کیا اس نے کینیڈا میں ایک فلم اسٹوڈیو والوں سے بات کی اور اپنی فلم کی تمام انڈور شوٹنگ وہیں کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اپنی ساری کاسٹ سمیت وہاں پہنچ گیا تھا۔

یہ ایک طویل فلم تھی اور اس میں بے شمار مناظر تھے اس لیے شوٹنگ کے اسپیل بھی بڑے تھے۔ نئے اداکار لینے کا فائدہ یہ ہوا کہ یہ اداکار ہمہ وقت اسے دستیاب تھے۔ ایک سال میں انڈور شوٹ ختم ہوئی اور سام نے واپس آ کر فلم کے بقیہ حصوں کی تیاری شروع کر دی۔ لیکن اس دوران میں ایک مسئلہ ہوا کینیڈا جا کر شوٹنگ کرنے سے اخراجات اس کی توقع سے بڑھ گئے تھے اور اب اسے فلم مکمل کرنے کے لیے مزید رقم کی ضرورت تھی۔ اس نے بینک کنسورشیم سے بات کی لیکن انہوں نے اسے مزید رقم دینے سے انکار کر دیا۔ ان میں سے دو بینکوں کی حالت خراب ہو رہی تھی اور وہ دیوالیہ پن کی طرف جا رہے تھے۔ اگر وہ دیوالیہ ہو جاتے تو سام کے لیے نیا مسئلہ کھڑا ہو جاتا کیونکہ اسے رقم ایک مخصوص انداز میں ملتی تھی۔ وہ بیس کروڑ ڈالرز میں سے پندرہ کروڑ ڈالرز لے چکا تھا اور ابھی مزید پانچ کروڑ ڈالرز لینے تھے جب کہ سام کو مزید رقم کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ اس نے شوٹنگ تیز کر دی تاکہ باقی رقم جلد حاصل کر سکے۔

لیکن قسمت کی خرابی زیادہ تیز نکلی تھی۔ ابھی دو کروڑ ڈالرز کی آخری قسط ملنا باقی تھی کہ کنسورشیم کے دو بینک دیوالیہ ہو گئے۔ ان کے معاملات دوسرے بینکوں کے سپرد کر دیئے گئے اور قسط کا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ سام پریشان ہو گیا۔ فلم کی لاگت اندازے سے بڑھ گئی تھی اور ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا وہ ان پروڈیوسرز میں سے تھا جن کی فلموں پر ہمیشہ معمول سے زیادہ لاگت آتی تھی کیونکہ وہ بہتر سے بہتر کی تلاش میں رہتا تھا لیکن اس کی فلمیں اندازے سے زیادہ کما کر بھی دیتی تھیں اس لیے جب تک وہ بگ برادر کے لیے کام کرتا رہا اسے فنانس کا مسئلہ نہیں ہوا تھا۔

ابھی فلم کا تقریباً بیس فی صد کام باقی تھا اور رقم ختم ہو چکی تھی۔ سام نے دوسرے بینکوں سے اس سلسلے میں بات کی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

لیکن کئی جگہ بینکنگ قوانین کی وجہ سے انکار کر دیا گیا اور بعض کی شرائط اتنی سخت تھیں کہ سام نے ان سے قرض لینے سے انکار کر دیا۔ مالی مشکلات کے باوجود اس نے فلم شوٹنگ کا کام جاری رکھا کیونکہ اس شعبے میں وہ ادائیگی موخر بھی کر سکتا تھا۔ اس نے رقم کے لیے اپنا ولا اور اپنی گاڑیاں بیچ دیں۔ اب اس کے پاس صرف ایک معمولی سی وین تھی۔ بد قسمتی سے جایداد کی قیمت گر گئی تھی اور اسے ولا کی قیمت کا صرف ستر فی صد ملا تھا۔ حالانکہ شوبز نس سے وابستہ مشہور افراد کی رہائش گاہیں اصل سے زیادہ قیمت پر بکتی ہیں۔ لیکن کساد بازاری نے اس شعبے کو بھی گرفت میں لے لیا تھا۔ حاصل ہونے والی رقم سے سام نے شوٹنگ جاری رکھی۔ فلم دو سال سے بن رہی تھی۔ جایداد اور گاڑیوں کی فروخت سے حاصل شدہ رقم بھی ختم ہو گئی۔ ابھی اسے ایک کروڑ ڈالرز کی مزید ضرورت تھی اور اسے کہیں سے رقم ملنے کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔

بگ برادر سے اس کی جنگ جاری تھی اور بگ برادر نے ایک بڑے بجٹ کی فلم شروع کر دی۔ اسے اسٹوڈیو کا ایک نامور ڈائریکٹر پروڈیوسر بنا رہا تھا۔ یہ اسٹارز کی فلم تھی اور بگ برادر کا ارادہ اسے سام کی فلم کے مقابل ریلیز کرنے کا تھا۔ گویا وہ پوری طرح اس کی مخالفت پر اتر آیا تھا۔ اس کی اور سام کی بیانات کی جنگ جاری تھی اور اب بگ برادر نے ایک بیان دیا کہ اس صدی میں سام کی فلم کی ریلیز کا کوئی امکان نہیں۔ سام نے جوابی بیان میں کہا۔

''بگ برادر فکر نہ کرے یہ فلم اس کی زندگی میں ہی ریلیز ہو گی۔''

لیکن حقیقت یہ تھی کہ سام بہت پریشان تھا اسے ایک کروڑ ڈالرز نہیں ملتے تو اس فلم کی ریلیز ناممکن تھی اور وہ تقریباً مکمل ہو کر بھی تھیٹرز کی زینت بننے سے رہ جاتی۔ اس نے ہر ممکن ذریعے سے کوشش کر لی تھی لیکن اسے کہیں سے رقم نہیں ملی تھی۔ صرف ایک شخص اسے رقم دینے کے لیے تیار ہوا تھا۔ یہ ہالی ووڈ کا ایک بڑا فنانسر پیری ایڈورڈ تھا لیکن اس کی شرط ناقابل قبول تھی۔ وہ فلم گروی رکھوانا چاہتا تھا اور اگر سام مقررہ تاریخ تک اس کی رقم واپس نہ کرتا تو فلم پیری کی ملکیت بن جاتی۔ درحقیقت پیری کو بگ برادر نے آگے کیا تھا کیونکہ پیری اس کے گہرے دوستوں میں سے تھا۔ سام اتنا بڑا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ جب کہ رقم کی شدید ضرورت تھی۔ فلم کا کام مکمل کرنا تھا اور بہت سارے لوگوں کو

ڈارفر کا بحران
(Darfur Crisis)

سوڈان کا مغربی شورش زدہ علاقہ، فروری 2003ء میں اس علاقے میں وہ سیاہ فام افریقی باغیوں کے مابین ڈارفر میں سیاسی اقتدار حاصل کرنے اور اس قدرتی وسائل پر قبضہ کرنے کے لیے باہمی تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا اور یہ دونوں گروپ مسلح تصادم پر اتر آئے۔ طالع آزما عناصر نے سوڈانی حکومت کے مخالف عناصر نے اسے عرب قبائل اور سیاہ فام افریقی قبائل کے مابین محاذ آرائی کی سی کیفیت پیدا کر دی اور 1989ء میں جنجاوید (Janja Weed) تنظیم کا قیام عمل میں آیا۔

دونوں قبیلوں کی باہمی لڑائی کے نتیجے میں ایک لاکھ افراد سے زائد ہلاک ہو چکے ہیں۔ جب کہ دو لاکھ ہمسایہ ملک چڈ کے کیمپوں میں مقیم ہیں۔ فریقین کے مابین اپریل 2004ء میں جنگ بندی کا معاہدہ بھی طے پایا تھا، لیکن فریقین نے معاہدے کی خلاف ورزی کی اور مصالحت کنندگان کی کوششوں پر پانی پھیر دیا کیونکہ وہ فرانس کے سائز کے برابر علاقے میں خوردونوش کی اشیاء فراہم نہ کر سکیں۔ علاقے میں خوراک کی عدم دستیابی کے باعث وہاں کے لوگوں کا جینا مشکل ہو گیا۔ 30 جولائی 2004ء میں اقوام متحدہ نے ایک قرارداد منظور کی، جس میں سوڈان کی حکومت سے کہا گیا تھا کہ وہ 30 دنوں کے اندر ڈارفر کے بحران کو حل کرے ورنہ اقتصادی پابندیوں کے لیے تیار ہو جائے۔ سوڈانی وزیر خارجہ نے اقوام متحدہ کی دی گئی مدت کو ناکافی قرار دیتے ہوئے کہا کہ سوڈان کو اس سلسلے میں 120 دن درکار ہیں، کیونکہ ڈارفر کا بحران بڑا پیچیدہ ہے، تاہم اگست 2004ء میں سوڈانی حکومت اور اقوام متحدہ کے مابین ڈارفر کے بحران کے حل کے لیے لائحہ عمل کے معاہدے پر خرطوم میں دستخط کر دیے۔ جس کی رو سے سوڈانی حکومت تیس دن کے اندر مہاجر کیمپوں کے علاقوں کو محفوظ بنائے گی، تاکہ شہریوں کو خوراک اور پانی کے حصول کی سہولت حاصل ہو سکے اور وہ کسی حملے کے ڈر کے بغیر کھیتی باڑی کر سکیں، نیز سوڈانی پولیس ڈارفر میں چوکیاں اور محاصرے بھی قائم کرے گی اور عرب ملیشیا کے حملے روکنے کے لیے پولیس اور فوج مل کر کام کر سکیں گے۔

مرسلہ: مبطین صدیقی، شورکوٹ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ہجرت حبشہ

جب مکّہ میں کفار کے ظلم وستم حد برداشت سے گزر گئے تو آپؐ نے حضرت جعفر بن ابی طالب کی قیادت میں اسّی مرد اور عورتوں کو حبشہ کی جانب ہجرت کر جانے کی اجازت دے دی۔ یہ واقعہ تاریخ میں ہجرتِ حبشہ کے نام سے مشہور ہے۔ جو ماہ رجب 5ھ میں پیش آیا۔ یہ دو بار ہوئی۔ پہلی بار کی ہجرت کرنے والوں کی تعداد پر اختلاف ہے۔ ایک رائے میں یہ گیارہ مرد اور چار عورتوں پر مشتمل ہے۔ تاہم ابن اسحاق لکھتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود ہجرت ثانیہ میں شامل تھے۔ اسی طرح ہجرتِ اولیٰ میں دس مرد شامل تھے۔ اس میں حضرت عثمانؓ بن عفان، ان کی زوجہ محترمہ رقیہؓ حضرت ابوحذیفہؓ ان کی زوجہ سہلاؓ بنت سہیل، مصعب بن عمیر، عبدالرحمان بن عوف وغیرہ شامل تھے۔ یہ دو تجارتی جہازوں کے ذریعے حبش پہنچے۔ وہاں کے بادشاہ نجاشی نے انہیں پناہ دی۔ کفار بھی ان کے پیچھے گئے اور واپسی کا مطالبہ کیا۔ نجاشی نے وفد کے قائد حضرت جعفر بن ابی طالب کو طلب کیا اور معاملہ پوچھا۔ آپ نے کہا ''اے بادشاہ! ہم جاہل قوم تھے، بتوں کو پوجتے تھے، کمزوروں کے ساتھ برا سلوک کرتے، ان کا حق مارتے، خدا نے ہماری طرف ایک رسول بھیجا۔ ہم اس کے حسب ونسب سے واقف ہیں۔ اس نے

ادائیگیاں کرنا تھیں اس کے بغیر اسے فلم ریلیز کرنے کی اجازت نہیں ملتی۔

سام نے ہالی ووڈ میں دفتر لینے کے بجائے ایک عام عمارت میں ایک چھوٹا سا دفتر لے لیا تھا اور وہیں سے اس پروجیکٹ پر کام کر رہا تھا۔ رقم ختم ہونے سے سارے کام ٹھپ ہو چکے تھے اب نہ فلم کی مکسنگ ممکن تھی اور نہ ایڈیٹنگ اور ابھی اسپیشل ایفکٹس کا کام بھی باقی تھا۔ اس روز سام اپنے دفتر میں سر تھامے بیٹھا تھا اب اس کے پاس کچھ باقی نہیں رہا تھا وہ اپنا سارا اثاثہ بھی اس فلم پر لگا چکا تھا اور اس کا بینک اکاؤنٹ صفر کے قریب پہنچ گیا تھا اگر یہ فلم مکمل ہو کر ریلیز نہ ہوتی تو اس کی مالی تباہی میں کوئی شبہ نہیں تھا اس کے بعد شاید اسے واپس ٹیکساس میں اپنے باپ کے فارم پر جانا پڑتا جو آج بھی زمیندار تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی تو سام چونکا تھا۔ یہ ایک ہی کمرے کا دفتر تھا اس نے آواز دی۔ ''آجاؤ۔''

دروازہ کھلا اور ربیکا اندر آئی تو سام بے اختیار کھڑا ہو گیا۔ ''تم؟''

وہ مسکرائی۔ ''ہاں میں۔''

''شاید تم میری ناکامی کا تماشا دیکھنے آئی ہو؟''

ربیکا نرمی سے بولی۔ ''سام کیا تم مجھے ایسا سمجھتے ہو؟''

سام کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ ''سوری.... میں تمہیں ایسا نہیں سمجھتا شاید حالات کی وجہ سے مجھے اپنے خیالات پر قابو نہیں رہا ہے۔ آؤ بیٹھو۔''

ربیکا اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ ''میں تمہاری فلم کے بارے میں سنتی رہتی ہوں اور میری خواہش ہے کہ یہ دنیا کی بہترین مووی ثابت ہو۔''

سام نے ہاتھ پھیلائے اور مایوسی سے بولا۔ ''اب اس کا کوئی امکان نہیں ہے۔''

''کیوں تمہاری فلم مکمل تو ہو گئی ہے۔''

''نہیں ابھی کچھ کام باقی ہے مسئلہ یہ ہے کہ میں مالی لحاظ سے بالکل خالی ہو چکا ہوں۔ اس لیے فلم ڈبے میں بند ہو جائے گی۔''

''ایسا نہیں ہونا چاہیے۔'' ربیکا نے بے ساختہ کہا۔ ''ایسا ہوا تو یقین کرو مجھے اور بہت سارے لوگوں کو شدید دکھ ہوگا۔''

''میں جانتا ہوں بہت سارے لوگ میرے خیر خواہ ہیں لیکن ان کی خیر خواہی فلم کی تکمیل میں میری کوئی مدد نہیں کر سکتی ہے۔'' سام نے مایوسی سے کہا۔ ''خیر چھوڑو تم اتنے دن بعد آئی ہو اور میں نے تمہیں اپنے مسئلے میں الجھا لیا۔ یہ بتاؤ کیا پیو گی۔ میرے پاس پورٹ کی ایک بوتل ہے۔''

''یہی نکال لو۔''

سام نے بوتل اور گلاس نکالے۔ ''اس سال تمہاری دونوں فلمیں بہت کامیاب گئی ہیں۔''

''ہاں میری قسمت کا ستارہ فی الحال عروج پر ہے۔'' ربیکا نے اپنا گلاس اٹھایا۔ ''میں یہ بات کبھی نہیں بھولوں گی کہ تم نے فلمی دنیا میں مجھے متعارف کرایا تھا۔''

''یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔'' سام نے بے پروائی سے کہا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ہمیں اللہ کی طرف بلایا اور سکھایا کہ اللہ ایک ہے۔ ایمان لاؤ، عبادت کرو اور بتوں کو پوجنا چھوڑ دو۔ اس نے ہمیں نمازوں کا حکم دیا اور تلقین کی کہ سچ بولیں، دیانت دار رہیں، اقارب و ہمسایوں سے اچھا سلوک کریں۔ خونریزی سے بچیں، ہم اس پیغمبر پر ایمان لائے۔ اسی وجہ سے یہ ہمارے دشمن ہوئے۔ یہ ہمیں واپس بتوں کی طرف لانا چاہتے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ ہم بری باتوں کو جائز سمجھیں۔ نجاشی نے کہا کہ وہ شخص جو پیغام وحی لایا ہے اس کا کوئی حصہ تمہارے پاس ہے۔ اس پر آپ نے سورۂ مریم کی ابتدائی آیتیں سنائیں۔ اس پر پادری رو پڑے۔ نجاشی نے کہا کہ یہ کلام اور کلام موسیٰؑ دونوں ایک ہی چشمۂ نور سے نکلے ہیں۔ وہ متاثر ہوا اور قریش کے دونوں سفیروں عمیرو بن العاص اور عمارہ بن ولید سے کہا کہ میں انہیں واپس نہیں کرسکتا، تم جاؤ اور مسلمانوں سے کہا تم میری زمین پر امن سے رہو۔ پھر تین بار کہا کہ ”جو کوئی تمہیں گالی دے گا اسے تاوان لگے گا۔“ اس واقعے کے بعد کفار نے نجاشی کے ملک پر حملہ کیا۔ اس پر مہاجرین نے بھی جنگ میں حصہ لیا۔ حضرت زبیرؓ جو اس وقت کمسن تھے انہوں نے بھی خود کو پیش کیا۔ اللہ نے نجاشی کو فتح دی۔

مرسلہ: ربیعہ قادری عطاری، جہلم

”اب تم کیا کرو گے؟“

”ممکن ہے میں واپس چلا جاؤں اور اپنے باپ کی زمینوں پر کام شروع کردوں۔ جب میں یہاں آرہا تھا تو میرے باپ نے کہا تھا کہ یہ دھوکے کی دنیا ہے جو مجھ سے بے وفائی کرے گی۔“

”تمہارے باپ نے درست کہا تھا۔ یہاں صرف چڑھتے سورج کی پوجا کی جاتی ہے اور کوئی زوال کا شکار ہو جائے تو لوگ اس سے آنکھیں چرا لیتے ہیں۔“

”خدا کرے تمہارے لیے وہ وقت کبھی نہ آئے۔“ سام نے خلوص سے کہا اور اپنا ہاتھ ربیکا کے نرم و نازک ہاتھ پر رکھ دیا۔ ”اگرچہ اب میں تمہارے لائق نہیں ہوں لیکن میں آج بھی تم سے محبت کرتا ہوں۔“

ربیکا کی آنکھوں میں نمی آگئی تھی۔ ”مجھے بھی کہنے دو سام میں تم سے محبت کرتی ہوں اور ہمیشہ کرتی رہوں گی۔“

”میں اس کے لیے تمہارا شکر گزار ہوں۔“ سام نے کہا اور پھر سرد آہ بھری۔ ”کاش کہ میں اور تم عام مرد و عورت ہوتے۔“

”اگر ایسا ہوتا تو....؟“

”تو میں کبھی تمہیں خود سے دور جانے نہیں دیتا۔“ سام نے جواب دیا۔ ربیکا سر جھکائے بیٹھی رہی تھی پھر اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”اب میں چلوں گی۔“

سام اسے دروازے تک چھوڑنے آیا تھا اور اس نے خدا کا شکر ادا کیا جب اسے دروازے کے باہر کوئی فوٹو گرافر یا کیمرا مین نظر نہیں آیا۔ ورنہ ربیکا جیسی مشہور شخصیت کا تو باقاعدہ تعاقب کیا جاتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ باہر نکلتے ہوئے احتیاط کرتی تھی۔ ربیکا کے جانے کے بعد وہ دروازہ بند کرکے اندر آیا تو میز پر ایک لفافہ رکھا تھا اسے نہیں معلوم کہ یہ لفافہ کب اور کہاں سے آگیا تھا۔ سام نے لفافہ اٹھایا تو اس میں سے ربیکا کی مخصوص مہک آئی تھی۔ وہ کھولے بغیر جان گیا تھا کہ اس میں کیا تھا۔ لفافے میں ایک بینک ڈرافٹ اور ایک چھوٹا سا رقعہ تھا جس پر ربیکا کے طرز تحریر میں لکھا تھا۔

”یہ میری طرف سے ایک محبت کرنے والے بے غرض انسان کو ایک چھوٹا سا تحفہ ہے اسے ٹھکرا کر میرے جذبات کی توہین مت کرنا۔“

سام نے دھندلائی آنکھوں سے ڈرافٹ دیکھا۔ اس پر ایک کروڑ ڈالرز کی رقم درج تھی۔ اس رقم کی مدد سے وہ اپنی فلم مکمل کرسکتا تھا۔ اس میں ربیکا کا تحفہ ٹھکرانے کی ہمت نہیں تھی۔ اگلے دن اس نے ڈرافٹ اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرایا اور جیسے ہی رقم اس کے اکاؤنٹ میں آئی اس نے فلم کا بقیہ رہ جانے والا کام مکمل کرانا شروع کردیا۔ شوٹنگ تو دو ہفتے میں نمٹ گئی تھی اور رش پرنٹ تیار تھے۔ سام کے ساتھ کوئی ادھار کام کرنے کو تیار نہیں تھا اور وہ خدا کا شکر ادا کررہا تھا کہ لوگ رقم لے کر اس کا کام کررہے تھے ورنہ حالات اس کے خلاف تھے۔

جس دوران میں فلم کی مکسنگ اور اسپیشل ایفکٹس کا کام جاری تھا سام نے فلم کی نمائش کے لیے ڈسٹری بیوٹرز

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

سے بات شروع کر دی۔ لیکن بدقسمتی سے یہاں بھی وہی سارے لوگ چھائے ہوئے تھے جو سام کو کسی صورت کامیاب ہوتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ بڑے ڈسٹری بیوٹر اسٹوڈیوز کے تھے اور زیادہ تھیٹرز ان کے پاس تھے۔ کچھ آزاد اور چھوٹے ڈسٹری بیوٹر تھے لیکن ان کے پاس زیادہ تھیٹرز نہیں تھے اور ان کو فلم دینے کا مطلب تھا کہ اس کی آدھی لاگت بھی نہیں پوری ہوگی۔ سام کم سے کم ایک ہزار تھیٹرز میں بیک وقت اس کی نمائش چاہتا تھا۔ اس نے ہالی ووڈ میں بگ برادر کے واحد حریف اسٹوڈیو کے مالکان سے بات کرنے کا فیصلہ کیا اگر وہ اس کی فلم ریلیز کرنے کو تیار ہو جاتے تو سام کو فلم کے لیے مطلوبہ تعداد میں مووی تھیٹرز مل سکتے تھے۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ حب الوطنی اور جنگی بخار میں وہ بگ برادر سے بھی بڑھ کر تھے اور نائن الیون کے بعد جنگی موضوعات پر سب سے زیادہ فلمیں اسی اسٹوڈیو نے بنائی تھیں۔

سام نے اسٹوڈیو مالکان سے بات کی لیکن ان کی طرف سے انکار ہو گیا۔ ہالی ووڈ والوں کی طرف سے مایوس ہو کر سام نے سب سے بڑی فلم ڈسٹری بیوشن کمپنی سے بات کی جس کے پاس کوئی پانچ سو مووی تھیٹرز تھے۔ سام کے خیال میں اگر وہ پانچ سو سے ہی آغاز کرتا تب بھی برا نہیں تھا مگر ہوا یہ کہ اس کمپنی نے فلم ریلیز کے لیے نہایت کڑی شرائط پیش کر دیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ فلم لے کر سام پر احسان کرنے جا رہے تھے۔ انہوں نے بہت معمولی سی پیشگی رقم کی پیش کش کی اور باقی رقم فلم کی کامیابی کی صورت میں دی جاتی۔ پیشگی رقم صرف دو کروڑ ڈالرز تھی یعنی کل لاگت کا دسویں سے بھی کم۔

سام سمجھ رہا تھا کہ فلم مکمل ہونے کے بعد اس کی مشکلات کم ہو جائیں گی لیکن یہاں تو مشکلات بڑھتی جا رہی تھیں۔ گرما تپش سے قریب آ گیا تھا اور بگ برادر کی بنائی ہوئی فلم بیک وقت ملک کے ڈھائی ہزار مووی تھیٹرز میں ریلیز ہونے والی تھی۔ جب کہ سام کی فلم کو کوئی گھاس ڈالنے کو تیار نہیں تھا۔ حالانکہ میڈیا نے اسے غیر معمولی فلم قرار دیا تھا جس میں فلم بینوں کی دل چسپی کی تمام چیزیں تھیں۔ اس کا میڈیا پر پیپر نہایت کامیاب رہا تھا۔ سام سمجھ رہا تھا کہ یہ سب اوپر والوں کی مخالفت ہے اور وہ اس کی فلم کی نمائش میں ہر ممکن روڑے اٹکا رہے تھے کیونکہ سام نے ان کا پول کھول کر رکھ دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ امریکی عوام اس فلم میں بیان کیے حقائق سے واقف ہوں۔ دوسری طرف عوام بے چینی سے اس فلم کے منتظر تھے کیونکہ سام کے ساتھ ہونے والے سلوک اور پھر فلم کی راہ میں روڑے اٹکانے سے ان کا تجسس بھڑک اٹھا تھا۔ پھر مخالفین کے پروپیگنڈے نے فلم کو مزید شہرت دی تھی۔ مگر فلم ریلیز ہوتی تو لوگ دیکھتے۔ سام کے مخالف اس کی بے بسی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

سام پریشان تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ فلم کی ریلیز کس طرح ممکن بنائے۔ ایک طریقہ تو یہ تھا کہ وہ ڈسٹری بیوٹر کمپنیوں کے رویے کے خلاف عدالت میں چلا جاتا۔ دوسرا طریقہ اسے ایک اسٹوڈیو کے مووی تھیٹرز کمپنی کے منیجر نے سمجھایا۔ اس نے فلم ریلیز کرنے سے انکار کرتے ہوئے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ ''جیسے تم نے فلم خود بنا لی ہے اب اسے ریلیز بھی خود کر لو۔''

مذاق اڑانے کے انداز میں دیے گئے اس مشورے نے سام کو سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ وہ اپنی ڈسٹری بیوشن کمپنی بنا لے اور اس کے بینر تلے فلم ریلیز کرے۔ جیسے جیسے وہ اس پر غور کرتا رہا اسے لگا یہی واحد حل ہے۔ اس نے اس بارے میں معلومات حاصل کیں تو اسے پتا چلا کہ کسی بھی کاروباری فرم کی طرح فلم ڈسٹری بیوشن کمپنی قائم کرنا بھی بہت آسان ہے۔ ابتدائی معلومات حاصل کرنے کے بعد اس نے فوراً اپنی کمپنی رجسٹرڈ کرالی اور اس کے ذریعے فلم ریلیز کرنے کی تیاری کرنے لگا۔ امریکا میں بڑی کمپنیوں اور فلم اسٹوڈیوز کے مووی تھیٹرز کے علاوہ بہت بڑی تعداد میں ایسے تھیٹرز بھی ہیں جو چھوٹی کمپنیوں یا فرد واحد کی ملکیت ہیں اور یہ براہِ راست فلمیں ریلیز کرنے کی بجائے ڈسٹری بیوٹرز سے لے کر ریلیز کرتے ہیں۔ سام نے اشتہارات کے ذریعے ان چھوٹی کمپنیوں اور انفرادی مووی تھیٹرز کو دعوت دی کہ وہ اس کی فلم ریلیز کریں۔

اس اشتہار کا ردِعمل سام کی توقعات سے بڑھ کر آیا اور دو دن میں اسے فلم کی ریلیز کے لیے آٹھ سو سے زائد درخواستیں موصول ہوئی تھیں۔ ان میں سے بیشتر انفرادی مووی تھیٹرز کی طرف سے درخواستیں تھیں۔ ان مووی تھیٹرز کو کوئی بڑی فلم عام طور سے ریلیز کے ایک مہینے بعد ملتی ہے جب اکثر لوگ اسے دیکھ چکے ہوتے ہیں اس لیے ان کو زیادہ بزنس نہیں ملتا ہے۔ یہ پہلی بار تھا کہ ان کو ایک بڑی مووی ریلیز کرنے کا موقع مل رہا تھا۔ ایک

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ہفتے میں کوئی دو ہزار مووی تھیٹرز فلم کی ریلیز کے لیے درخواست جمع کرا چکے تھے۔ یہ تعداد سام کی توقعات سے کہیں زیادہ تھی۔

پھر ایک ملٹی نیشنل کمپنی نے اس کی فلم کا لندن میں پریمیئر کرنے کی پیش کش کی جس میں دنیا جہاں سے فلم انڈسٹری سے تعلق رکھنے والے لوگ آتے۔ سام کی خوش قسمتی تھی ورنہ وہ سوچ رہا تھا کہ فلم کا پریمیئر کہاں کرے کیونکہ امریکا میں اسے اس معیار کا تھیٹر ملنا مشکل تھا۔ اب یہ ذمے داری ملٹی نیشنل کمپنی نے لے لی تھی اور وہ اس پریمیئر کے عوض سام کی ڈسٹری بیوشن کمپنی کو دس ملین ڈالرز ادا کر رہی تھی۔ پریمیئر میں فلم کی مکمل کاسٹ شامل تھی اور تقریب نہایت کامیاب رہی تھی۔ کئی ورلڈ ٹی وی چینلز نے اسے نشر کیا تھا۔ فلموں اور شوبزنس سے تعلق رکھنے والا کوئی چینل ایسا نہیں تھا جس نے اس کی کوریج نہ کی ہو۔

اس وقت تک ہالی ووڈ کے بڑے جان چکے تھے کہ وہ جنگ ہار گئے ہیں اپنے حکمرانوں کی طرح اور سام بازی جیت گیا تھا۔ وہ اسے فلم بنانے اور پھر ریلیز کرنے سے نہیں روک سکے تھے لیکن وہ ہار کر بھی ہار ماننے کو تیار نہیں تھے بالکل اپنے حکمرانوں کی طرح اور انہوں نے سام کی جیت کو پروپیگنڈے سے ہار دکھانے کا فیصلہ کیا۔ ان کا زرخرید میڈیا فلم پر منفی تبصرے کرنے لگا اور خیال ظاہر کیا جانے لگا کہ یہ باکس آفس پر وہ کامیابی حاصل نہیں کر سکے گی جو اس سے پہلے سام کی فلمیں حاصل کرتی رہی تھیں۔

لیکن فلم بینوں کے ردِعمل نے ہالی ووڈ کے بڑوں کے اندازے غلط ثابت کر دیئے تھے۔ فلم نے پہلے ہی ہفتے میں بزنس کا ریکارڈ قائم کر دیا اور یہ سارا بزنس اسے چھوٹے مووی تھیٹرز سے ملا تھا۔ اس ایک ہفتے میں سام کی فلم نے بائیس کروڑ ڈالرز کا بزنس کیا تھا، یہ اس کی لاگت کے مساوی تھا۔ فلم کی مقبولیت دیکھ کر درمیانی درجے کی ڈسٹری بیوشن کمپنیاں بھی میدان میں آ گئیں اور انہوں نے سام کی منہ مانگی قیمت ادا کر کے فلم کی ریلیز کا حق حاصل کیا۔ یہی کمپنیاں پہلے سام کو شرائط پیش کر رہی تھیں۔

پہلے مہینے میں فلم نے امریکا میں ریکارڈ بزنس کیا تھا اور یہ سام کو مجموعی لاگت سے تین گنا زیادہ کما کر دے چکی تھی۔ جب کہ آنے والے ایک مہینے میں یہ ہر اس تھیٹرز میں بک ہو چکی تھی جہاں اس کی نمائش جاری تھی۔ اس کامیابی کا خود سام نے بھی نہیں سوچا تھا۔ بگ برادر نے مقابلے کے لیے جو فلم بنائی تھی اگرچہ اس نے اپنے اخراجات نکال لیے تھے لیکن اسے کسی طرح بھی کامیاب فلم نہیں کہا جا سکتا تھا۔ پھر فلم کو عالمی نمائش کے لیے پیش کیا گیا۔ ایک ایک ملک سے سام کو بے تحاشہ رقوم موصول ہونے لگیں اور چھ مہینے میں اس کی فلم ایک ارب ڈالرز کا خالص نفع کما چکی تھی۔ سام ایک ہی فلم سے ارب پتی بن گیا تھا۔ ایسی بے مثال کامیابی اس سے پہلے کسی کو نہیں ملی تھی۔ سب کا خیال تھا کہ سام اب ہالی ووڈ کا کنگ بن جائے گا اور ہر کام اس کے اشارہ ابرو پر ہوا کرے گا۔ پرانی کمپنیاں اس کے اثر میں آ جائیں گی۔ لیکن سام کچھ اور سوچ رہا تھا۔ ایک سال بعد اس کی فلم بزنس کے لحاظ سے ٹائی ٹینک کا ریکارڈ توڑ کر اس سے بہت آگے جا چکی تھی۔ سام نے ایک پریس کانفرنس بلائی۔ اس بار اس نے ایک بڑا مووی تھیٹر منتخب کیا تھا جس میں دو ہزار افراد کی گنجائش تھی لیکن وہاں آنے والوں کی تعداد تین ہزار سے زیادہ ہو گئی تھی اور

پنڈت برجموہن وتاتریہ کیفی۔ 1866-1955ء

اردو کے نامور ادیب، شاعر۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ سینٹ اسٹیفن کالج دہلی سے فارغ التحصیل ہو کر ریاست کشمیر میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ ملازمت سے سبکدوش ہو کر زندگی کا زیادہ حصہ لائل پور (حالیہ فیصل آباد) اور لاہور میں گزارا۔ تقسیم ملک کے بعد دہلی چلے گئے اور وہیں انتقال ہوا۔ اردو زبان کی تحقیق، محاورات کی چھان بین اور اغلاط کی تصحیح کے سلسلے میں اہم خدمات انجام دیں۔ علم اللسان پر بھی کافی کام کیا۔ فارسی، عربی، انگریزی، سنسکرت، اردو اور ہندی زبانوں میں مہارت رکھتے تھے۔ کل ہند انجمن ترقی اردو کے صدر منتخب ہوئے اور آخر تک اس عہدے پر فائز رہے۔ تصانیف (نثر)، عورت اور اس کی تعلیم، چراغ ہدایت، پریم دیوی، راج دلاری، مراری دادا، تھتارنا، کیفیہ، منشورات کیفی۔ (نظم) مراۃ خیال، آئینہ ہند، صدائے کیفی، بھارت درپن، پریم ترنگی، جنگی نظمیں، توزک قیصری، خمخانہ کیفی، واردات۔

مرسلہ: نیاز حسن کراچی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

لوگ دیواروں کے ساتھ کھڑے تھے۔ کئی چینل اس کی پریس کانفرنس کو لائیو دکھا رہے تھے۔ سام ڈائس پر آیا تو ہال تالیوں سے گونج اٹھا تھا۔ آج وہ اس کی عزت کر رہے تھے جس کے بارے میں کل تک خبر لگانے کو بھی تیار نہیں تھے۔ سام نے کہنا شروع کیا۔

''میرے دوستوں آپ جانتے ہیں میں کل معتوب تھا بلکہ آج بھی معتوب ہوں لیکن کل میں ناکام تھا اور آج میں کامیاب ہوں۔ میری کامیابی یہ نہیں ہے کہ میں نے ایک سپر بلاک بسٹر مووی بنائی ہے جس نے بزنس کے سارے ریکارڈ توڑ دیئے ہیں بلکہ میری کامیابی یہ ہے کہ میں نے امریکا کے کردار کے بارے میں اپنے احساسات اور جذبات امریکی عوام تک پہنچانے کی کوشش کی اور مجھے اس میں کامیابی ہوئی۔ اس فلم کی کامیابی اس بات کا ثبوت ہے۔

جب نائن الیون کے واقعے کے بعد میں نے اپنے کامک کردار بینگ کو انسانیت کے بجائے امریکی مفادات کا محافظ بنانے سے انکار کیا تو مجھ پر فلم اسٹوڈیو کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ میں نے فلم بنانا چاہی تو مجھے اس سے روک دیا گیا۔ میں سیاست دان نہیں ہوں اور نہ ہی میں نظام کی اندھی تقلید پر یقین رکھتا ہوں۔ مجھے اپنے ملک سے محبت ہے۔ یہاں کے لوگوں سے محبت ہے۔ لیکن مجھے اتنی ہی محبت انسانوں سے بھی ہے۔ جب میں دیکھتا ہوں کہ میرے ملک کا سپاہی کسی اور ملک میں جا کر محض حکمرانوں کے کہنے پر اندھا دھند عمل کرتا ہے اور وہ ذرا بھی نہیں سوچتا کہ وہ انسانوں کے ساتھ کیا کر رہا ہے تو میں ایسے نظام کا حامی نہیں ہو سکتا۔ کسی اور ملک کی فوج آ کر امریکا پر قبضہ کر لے اور یہاں قتل عام کرے تو ہم میں سے کوئی برداشت نہیں کرے گا۔ ہمیں اسی رویے کی توقع دوسروں سے بھی کرنی چاہیے۔ حملہ آور فوج کو کوئی خوش آمدید نہیں کہتا ہے۔ حریت انسان کے لہو میں شامل ہے۔ میرا ایمان اس پر ہے۔

مجھے معلوم ہے بہت سارے لوگوں کو میری باتیں اچھی نہیں لگیں گی کیونکہ جنگوں سے اور دوسرے ملکوں کے استحصال سے ان کے کاروبار چل رہے ہیں لیکن مجھے یقین ہے جلد میرے ملک میں ایسا وقت آئے گا جب ہم دنیا کے دوسرے خطوں میں مداخلت کے خلاف مضبوط آواز اٹھائیں گے۔ ہمیں بالآخر جنگ بند کرنا ہو گی۔ اسی میں ہماری اور دنیا کی بقا ہے۔

میں کل بھی ایک عام فلم پروڈیوسر تھا اور آنے والے کل بھی میں ایک عام فلم پروڈیوسر رہوں گا۔ کیونکہ یہ دولت کی طاقت ہے جس نے میرا راستہ روکا۔ ہالی ووڈ کے بڑے دولت پاکر مغرور ہو گئے۔ میرے مقابلے میں خدا بننے کی کوشش کی لیکن وہ بھول گئے خدا کوئی اور ہے۔ اس لیے میں کامیاب رہا۔ میری یہ کامیابی ان پسے ہوئے لوگوں کی کامیابی ہے جو تیسری دنیا میں رہتے ہیں جو امریکا اور مغرب کے استحصال کا شکار ہیں۔ اس لیے میں اپنی فلم سے کمائی دولت ان لوگوں کے لیے وقف کرتا ہوں جن کو میرے وطن سے کبھی نقصان ہوا ہے۔ میں تلافی کرنے کی اپنی سی محدود کوشش کروں گا۔ مجھے اُمید ہے میرے کچھ نہ کچھ ہم وطن میرا ساتھ ضرور دیں گے۔ میں کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا آپ میری تقریر پر تبصرہ کرنے کے لیے آزاد ہیں شکریہ۔''

جب سام ڈائس سے اترا تو تالیاں بجانے والوں کی تعداد بہت کم تھی اس نے جو کہا وہ غیر متوقع تھا اور ناپسندیدہ بھی۔ لیکن وہ اسی چیز کی توقع لے کر آیا تھا اس لیے خوش اور مطمئن تھا۔ اس نے پہلے بھی اپنے بل بوتے پر کامیابی حاصل کی تھی اور آیندہ بھی ایسی ہی کامیابی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ نیچے اپنی نشست تک آیا تو اس کے کچھ جاننے والوں نے اسے گھیر لیا وہ اس کی تقریر کی مبارک باد دے رہے تھے۔

سام ان کو بتانے لگا کہ وہ فلم سے حاصل شدہ دولت سے ایک آرگنائزیشن بنائے گا جو ان ملکوں میں روزگار صحت اور تعلیم کے لیے کام کرے گی۔ جو امریکی پالیسیوں کا براہ راست نشانہ بنے تھے۔

''سام۔'' عقب سے ربیکا کی آواز آئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو وہ اس کے پاس ہی کھڑی تھی۔ ''میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

سام مسکرایا اور آہستہ سے بولا۔ ''میں تو پہلے ہی تمہارا مقروض ہوں۔''

ربیکا اس کے پاس آ گئی۔ ''تم فکر مت کرو وہ قرض میں تمہارے پاس رہتے ہوئے وصول کر لوں گی۔''

سام نے محبت سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''میری کامیابی کو اگر کوئی انعام دیا جا سکتا ہے تو وہ صرف تم ہو۔''

وہ دونوں ایک ساتھ باہر کی طرف بڑھ گئے تھے۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

حسِ مزاح

ثناثاقب

حسِ مزاح ہر ایک میں نہیں ہوتی لیکن جس میں ہوتی ہے وہ میر محفل بن جاتا۔ لوگ ایک لمحے میں اس کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ اس کی صحبت پسند کرتے ہیں۔

اسی حس کا مختصر سا بیان

حسن مزاح یا سنس آف ہیومر کا ذکر ہمیں اکثر سننے کو ملتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ ہے کیا چیز ہے اور کہاں ہوتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کہیں سے حاصل نہیں ہوتی اور نہ ہی تعلیم و تربیت سے آتی ہے۔ بلکہ یہ حسِ انسان کے اندر ہی ہوتی ہے۔ اس کے مزاج میں ہوتی ہے یا پھر ماحول پیدا کرتا ہے۔

یہ ایک زبردست انسانی خوبی ہے۔ انسان دو ہی باتوں سے جانوروں سے افضل ہے۔ وہ سوچ سکتا ہے اور ہنس سکتا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ہے۔اسی لیے انسان کو حیوانِ ظریف کہتے ہیں۔اس کے علاوہ انسانوں اور جانوروں کی جبلتیں ایک جیسی دی گئی ہیں جیسے جنس کی خواہش (Instinct) کھانے پینے کی خواہش۔

اسے بھی بھوک لگتی ہے۔انسان کو بھی لگتی ہے۔اسے بھی خوف محسوس ہوتا ہے۔ انسان بھی خوف محسوس کرتا ہے۔ انسان کو بھی سردی گرمی محسوس ہوتی ہے۔اسے بھی گرم سرد موسم سے پناہ کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی درد تکلیف محسوس کرتا ہے۔انسان بھی محسوس کرتا ہے۔فرق یہ ہے کہ وہ مسکرا نہیں سکتا، انسان مسکراتا ہے، قہقہے لگاتا ہے۔ خود بھی ہنستا ہے دوسروں کو بھی ہنساتا ہے۔ وہ لطیفے سنتا بھی ہے اور سناتا بھی ہے۔

آپ نے کبھی کسی کتے یا شیر یا بلی کو ایک دوسرے کو لطیفے سناتے ہوئے نہیں سنا ہوگا۔ یہ اور بات ہے کہ خود حضرت انسان نے ان جانوروں کے حوالے سے ان پر لطیفے بنا رکھے ہیں جیسے ایک دادا مچھر نے اپنے پوتے سے کہا کہ تم خوش نصیب ہو کہ تم عورت کو بھی کاٹ سکتے ہو۔ ہمارے وقت میں عورت اتنے کپڑے پہنتی تھی کہ ہمیں کاٹنے کے لیے کئی دن انتظار کرنا پڑتا تھا۔

اسی طرح کے اور بھی لطیفے ہیں۔ یاد رکھیں کسی کو ہنسانا ایک مشکل کام ہے۔ گھر سے مسجد ہے بہت دور چلو یوں ہی سہی۔ کسی روتے ہوئے بچے کو ہنسایا جائے۔

بعض مفکرین کا خیال ہے کہ کسی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لانا ایک عبادت ہے۔ کسی کے دکھ درد کو اپنی باتوں کے ذریعے کم کرنا ثواب ہے۔ ورنہ تو ہر طرف روتے سسکتے ہوئے لوگ ہی دکھائی دیں گے۔

انسان جب سے پیدا ہوا ہے یا تو ہنستا رہا ہے یا روتا رہا ہے۔ ویسے رونے کا تناسب زیادہ ہے۔ ہنسنے کا کم ہے۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ محرومی دوام بھی دے جائے گی خوشی۔ یہ سوچ کر ہنسو کہ بہت دیر رو لیے۔

ہنسیں، جی کھول کر ہنسیں۔ آپ جانتے ہیں کہ اپنے آپ پر بھی ہنسا جاتا ہے۔ طنز کا شمار اسی ضمن میں ہوتا ہے۔ آپ یہ دیکھیں کہ جو قوم اپنے آپ پر ہنسنا جانتی ہے اس میں سدھار کے امکانات بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے خوب صورت مستقبل کا کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیتی ہے۔ یہ عالمی ظرفی کی پہچان ہے۔

ہنسنے کا بہت گہرا تعلق صحت سے بھی ہوتا ہے۔ آپ نے لافٹر تھراپی کے بارے میں تو ضرور سنا ہوگا۔ اس میں دل کھول کر ہنستے ہیں۔ ''اتنا ہنسو کہ آنکھ سے آنسو نکل پڑیں۔''

اس سے کیا ہوتا ہے؟ ذہن کا بوجھ کم ہو جاتا ہے۔ اس کو ایک طرح کا کیتھارسس سمجھ لیں۔ ڈپریشن سے نجات مل جاتی ہے۔

سماجیات میں بھی اس خوبی کی بہت اہمیت ہے۔ آپ سفر میں ہوں اور کسی اجنبی کو مسکرا کر دیکھ لیں تو وہ آپ کا دوست بن جائے گا کیوں کہ آپ کے ہونٹوں سے نکلی ہوئی مسکراہٹ اس تیر کی طرح ہوتی ہے جس کا نشانہ کبھی خالی نہیں جاتا۔

اور اگر آپ میں بزلہ سنجی ہے۔ آپ مزاح پیدا کرنا جانتے ہیں۔ آپ کی گفتگو چٹکلے چھوڑنے والی ہے تو کیا کہنے۔ وہ اجنبی آپ کے قریب ہوتا جائے گا۔

ظرافت ایک بہت بڑی انسانی خوبی ہے اور یہ خوبی جن میں ہوتی ہے وہ جانِ محفل بن جاتے ہیں۔ لوگ ان کی باتیں سننے کے انتظار میں رہتے ہیں۔ ''وہ ہنس دے تو جان سی کلیوں میں پڑ گئی۔ وہ لب کشا ہوئے تو گلستاں بنا دیا۔''

تو آپ بھی ایسے بن جائیں کہ جب بات کریں تو لوگ آپ کی باتوں سے محظوظ ہوں۔ بوریت محسوس نہ کریں۔ آپ بھی ماحول کو گلستاں بنا دیں۔

مزاح ایک طرف اگر جبلت ہے تو دوسری طرف یہ ایک فن بھی ہے۔ اس کی بے شمار قسمیں ہیں۔

جہاں ایک طرف کسی محفل کو گلستان بنانے والے ہوتے ہیں وہاں دوسری طرف ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جن کے مسلک میں ہنسنا منع ہوتا ہے۔ وہ منہ بنائے اس طرح بیٹھے رہتے ہیں جیسے پیٹ میں درد ہو رہا ہو۔ ایسے لوگوں سے بوریت ہونے لگتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ زبردستی انہیں گدگدایا جائے تاکہ ان کا قہقہہ سنا جا سکے۔ ایسے لوگ اگر ذرا سا مسکرا بھی دیں تو ان کا احسان سمجھیں۔ یہ لوگ خود نمائی کا لباس پہنے رہتے ہیں اپنے آپ کو باوقار ظاہر کرنے کے چکر میں ماتم زدہ سے ہو جاتے ہیں۔

ایسے چہروں پر کرختگی سی آجاتی ہے۔ آپ ایسے لوگوں کو دیکھ کر ہی جان لیں گے کہ ان کے دل سخت ہیں۔ یاد رکھیں دل کی کیفیت کا اظہار چہرے سے ہوتا ہے۔ اگر دل سخت ہوتا ہے تو چہرہ بھی سخت ہو جاتا ہے۔

دنیا کے ہر دور میں ہر تہذیب میں ہنسنا یا مسکرانا ایک انسانی خوبی سمجھا گیا ہے۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

مغرب میں حسِ مزاح کی تھیوری افلاطون سے شروع ہوتی ہے۔ سقراط نے بھی اس کی تقلید کی ہے۔ اس زمانے کے تھیٹر میں ایسے مکالمے بھی ہوتے تھے جن میں مزاح کا پہلو ہوتا تھا۔ اپنے مزاج میں ظرافت پیدا کرنے کے لیے آپ کو بازار میں کوئی کتاب نہیں ملے گی اور نہ ہی اس کی تکنیک سکھائی جاسکتی ہے۔ یہ چیزیں سکھانے سے نہیں آتیں۔ تہذیب نفس سے پیدا ہوتی ہیں۔

بعض علاقوں میں جگت بازی تہذیبی اور سماجی رویہ ہے۔ ہر ایک آپ کو جملے کستا ہوا نظر آئے گا۔ بلکہ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ چاہے بندہ ضائع کردو لیکن جملہ ضائع نہ کرو۔

دنیا بھر کے ادب میں طنز اور ظرافت کے اعلیٰ نمونے مل جاتے ہیں۔

قدیم سنسکرت ادب میں آٹھ بنیادی جبلتوں میں ایک حسِ مزاح بھی ہے۔ یہ شاستر، نوٹنکی کے ذریعے سامنے آئی یا بیان کی جاتی تھی۔ ایک بات یاد رکھیں کہ کامیڈی انسان کو ہنسانے کا نام ہے۔ دل آزاری کا نام نہیں ہے۔ مذاق کرنا ایک فن ہے لیکن مذاق اڑانا ایک المیہ ہے۔

پریشانیوں کے حل کا ایک آسان طریقہ مزاح بھی ہے۔ اس کا تجربہ گھر کے ماحول میں کیا جاسکتا ہے۔ ماحول اگر ٹینس ہوگا تو گھر کے ماحول میں دل نہیں لگے گا۔ ہر وقت ایک بوجھل پن سوار ہوگا۔ A sense of humor is a major defence against minor trouble. اور اگر گھر کے لوگ ایک دوسرے سے ہلکے جملوں کا تبادلہ کرتے رہیں۔ تو گھر کے ماحول میں تناؤ کی کیفیت نہیں رہے گی۔

اسی لیے قاتل ٹائپ کے افراد اس خوبی یعنی حسِ مزاح سے عام طور پر محروم رہتے ہیں۔ کیوں کہ ان کی جبلت میں سختی ہوتی ہے۔ مذاق کرنے والے عام طور پر نرم مزاج کے ہوا کرتے ہیں۔

مزاح کو سمجھنے کے لیے بھی ایک خاص قسم کے تربیت یافتہ ذہن کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جو ایک بہت اچھا لطیفہ سن لینے کے بعد پوچھتے ہیں۔ ''اچھا تو پھر کیا ہوا۔'' یا اچھے سے اچھا لطیفہ ان کے سر سے گزر جاتا ہے۔ یا بہت دیر میں اس وقت ہنستے ہیں۔ جب وہ لطیفہ ان کی سمجھ میں آچکا ہے اور وہ خود اکیلے بیٹھ کر ہنستے ہیں۔

جیسے ایک صاحب نے بازار میں ایک آدمی کو مارنا شروع کردیا۔ ان سے پوچھا گیا کہ تم کیوں مار رہے ہو۔ اس نے جواب دیا۔ ''اس نے مجھے پچھلے سال گینڈا کہا تھا۔''

''پچھلے سال کہا تھا نا تو آج کیوں مار رہے ہو؟''

''میں نے زندگی میں پہلی بار گینڈا کل دیکھا ہے'' انہوں نے بتایا۔

پوری دنیا کو مسرتوں سے بھرنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اپنے آپ کو ہلکا پھلکا کرلیں۔ مزاح کرنٹ اپنے آپ میں محسوس کریں۔ اس کے بعد اس نعمت کو دوسروں میں بانٹ دیں۔ اس کی کئی قسمیں ہیں۔

1۔ کتاب یا تحریر کے ذریعے۔ لکھنے والوں نے مزاحیہ ادب تخلیق کیا ہے اور پڑھنے والوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں بکھیر دی ہیں۔ اس کے بھی دو حصے ہیں۔ نثر اور نظم۔ شاعری۔

2۔ سماعت کے ذریعے۔ یعنی آپ کوئی مزاحیہ جملہ سنیں یا خود کہیں۔ لطیفہ بھی اسی ضمن میں آتا ہے۔

3۔ بصارت کے ذریعے۔ اس کیٹیگری میں تھیٹر، فلم ڈراما وغیرہ آجاتے ہیں۔ اس کی بھی تاریخ بہت پرانی ہے۔

اب ان شعبوں کے بھی کئی شعبے ہیں۔ جیسے اگر آپ کامیڈی کو لیتے ہیں تو کئی اقسام کی کامیڈی آتی ہے۔ جیسے۔ Slapstick comedy۔ اس کو ایکشن کامیڈی بھی کہہ سکتے ہیں۔ یعنی اچھل کود اور بے معنی حرکتیں۔ بچے اس قسم کی کامیڈی سے بہت محظوظ ہوتے ہیں۔ اسی لیے کارٹون تخلیق کیے گئے۔ ہر دور کے عظیم فنکار چارلی چپلن کو اس کامیڈی کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ تھری اسٹوجیز بھی قابلِ ذکر ہیں۔ موجودہ دور میں مسٹر بین بھی اپنی حرکتوں سے ہنساتا ہے۔

ڈائیلاگس کامیڈی۔ اس میں دلچسپ، بامعنی، طنزیہ، موقع کی مناسبت سے جملے ہوتے ہیں۔ اس کی بہترین مثال ہمارے یہاں لہری صاحب اور منور ظریف ہوا کرتے تھے۔ رنگیلا کے یہاں سلاپ اسٹک کامیڈی تھی۔

ایک اور قسم ہے اور وہ ہے سچویشنل کامیڈی۔ اس میں نہ تو سلاپ اسٹک کی حرکات ہوتی ہیں اور نہ ہی جملوں کو مزاحیہ بنانا پڑتا ہے۔ بلکہ حالات ایسے Creat ہو جاتے ہیں کہ کامیڈی خود بہ خود ہوتی چلی جاتی ہے۔ سٹ کام اسی کو کہا جاتا ہے۔ یعنی سچویشنل کامیڈی۔ ٹی وی پر آپ نے بے شمار سٹ کام دیکھے ہوں گے۔

ایک ہوتی ہے Standing comedy اس کو

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

دن میں شو بھی کہا جاتا ہے۔ ایک آدمی اپنے مزاحیہ جملوں سے ہنساتا جاتا ہے جیسے عمر شریف۔ کچھ لوگ کرداروں سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ (خاص طور پر ادب میں)۔

لیکن یہ کردار افسوس ناک پہلو نہیں رکھتے۔ بلکہ دلچسپ مزاح رکھنے والے ہوتے ہیں۔

ان کے علاوہ ایک بلیک کامیڈی بھی ہوتی ہے۔ اس میں منفی پہلوؤں سے مزاح پیدا کردیتے ہیں۔ ہمارے یہاں اس کا رواج بہت کم ہے۔

اس میں موت، مفلسی، دکھ، بیماری وغیرہ کو جو انسانی المیے ہیں، ان سے مزاح کی آبیاری کی جاتی ہے۔ جیسے کوئی شخص شیو بنوانے نائی کی دکان پر گیا۔ نائی نے آدھی شیو بنائی تھی کہ اس کا ہارٹ فیل ہوگیا۔ اب اس کی لاش اس طرح پڑی ہوئی ہے کہ آدھے چہرے پر شیو ہے، آدھا بالکل صاف ہے۔ اس طرح ایک مزاحیہ سچویشن پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی بلیک کامیڈی ہے۔

ایک چیز پیروڈی ہے۔ اس میں ہوتا یہ ہے کہ کسی بھی اصل شاہکار کو اس انداز سے الٹ پھیر کر کے پیش کیا جاتا ہے کہ وہ چیز انتہائی مزاحیہ ہو جاتی ہے۔ جیسے

آہ بھرتی ہوئی آئی ہو سلمنگ سینٹر
آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
ڈائٹنگ کھیل نہیں چند دنوں کا بیگم
اک صدی چاہیے کمرے کو کمر ہونے تک

علامہ اقبال کی شکوہ تو آپ کے ذہن میں ہوگی۔ اب اس کی پیروڈی سنیں۔

ہے بجا حلقہ ازواج میں مشہور ہوں میں
تیرا بیرا تیرا دھوبی تیرا مزدور ہوں میں
زن مریدی کا شرف پا کے بھی رنجور ہوں میں
قصہ درد سناتا ہوں کہ مجبور ہوں میں
میری مخدومہ میرے غم کی حکایت سن لے
ناز بردار سے تھوڑی سی شکایت سن لے
زچہ بن بن کے بجٹ میرا گھٹایا تو نے
ہر نئے سال نیا گل ہے کھلایا تو نے
اپنا شو روم میرے گھر کو بنایا تو نے
اس میں ہر رنگ کا ماڈل ہے سجایا تو نے
گورا کالا بھی ہے کانا بھی ہے کافی بھی
اس میں انگلش بھی ہے دیسی بھی جاپانی بھی
ایک مشہور شعر ہے۔

شاید مجھے نکال کے پچھتا رہے ہوں آپ
محفل میں اس خیال سے پھر آگیا ہوں میں
اب اس میں تھوڑی سی تبدیلی کی تو شعر کیا سے کیا ہو گیا۔

شاید مجھے نکال کے کچھ کھا رہے ہوں آپ
محفل میں اس خیال سے پھر آگیا ہوں میں

دنیا بھر کے ادب میں طنز و مزاح کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اسے تحریر کی خوبی کہا جاتا ہے۔ سنسکرت میں اس کی ابتدا بھارتیہ ناٹیم سے ہوئی۔ عربی میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ جدید عربی ادب میں مصر کے نسیم رفعت محمد یوسف کا نام بہت مستند ہے۔

ہجو یہ شاعری عربی ہی سے فارسی پھر اردو میں آئی ہے۔ فارسی میں طنز و مزاح کا ایک رسالہ نکلتا تھا جس کو جاوید علی زادہ نکالا کرتے تھے۔

انگریزی ادب میں بے شمار نام ہیں۔ جو طنز و مزاح کے لحاظ سے اپنا مقام رکھتے ہیں۔ جیسے ڈکنس آڈم، ولیم شیکسپیئر، جین آسٹن، مارک ٹوین، آسکر وائیلڈ، مارٹن لیوس، کرسٹوفر بکلے وغیرہ۔ ادب کے علاوہ فلم تھیٹر اور ٹیلی ویژن بھی ابلاغ کا ایک موثر ذریعہ ہے۔ ہمارے یہاں بھی اس پر بہت کام ہوا ہے۔

کیسے کیسے مزاحیہ کردار ادا کرنے والے پیدا ہوئے۔ انہوں نے کمال کر دکھایا۔ چارلی چپلن کا حوالہ دے چکا ہوں۔ اس کے علاوہ نارمن وزڈم، جیری لوئیس، پیٹر سیلر وغیرہ۔

ہندوستان میں گوپ، یعقوب، جانی واکر وغیرہ۔ یہ بہت باکمال لوگ تھے۔

کیسی فلمیں کامیڈی کی آئیں؟ The great diictator چارلی چپلن کی یہ بے مثال فلم تھی۔ اس کو خود چارلی چپلن نے لکھا اور ڈائریکٹ کیا تھا۔ divorce italian style. Doctor strange love..the milky way وغیرہ۔

اسی طرح ہندوستان میں بھی بہت سی مکمل مزاحیہ فلمیں بنیں۔ جیسے پڑوسن، انداز اپنا اپنا، انگور، چلتی کا نام گاڑی، ہاف ٹکٹ، گول مال، ہیرا پھیری وغیرہ۔

پاکستان میں بھی ایسی فلمیں بنتی رہیں۔

بنیادی طور پر ہمارے یہاں کامیڈی تھیٹر پر بہت کام ہوا ہے۔ بہت بڑے بڑے نام آتے رہے ہیں، جیسے کمال

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

یومِ آزادی کی مناسبت سے خصوصی تحریریں لیے اگست 2017ء کا جشن آزادی نمبر

کراچی

ماہنامہ

پاکیزہ

شیریں حیدر اور رفعت سراج کے ماہرانہ قلم کی جولانیاں...... قسط وار ناول کی صورت

سحر ساجد نے من جاں بازم کا کیا دلنشیں اختتام

سیما رضا ردا اپنے منی ناول...... ہم کو عبث بدنام کیا...... کو ایک دلکش انداز میں آگے بڑھاتے ہوئے

14 اگست کی مناسبت سے ناہید سلطانہ اختر، دردانہ نوشین خان، منشا محسن علی اور نرمین سرھیو کی خصوصی تحریریں

ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی اور اختر شجاعت کے روح پرور مضامین

نامور مزاح نگاروں کے شہ پاروں سے انتخاب...... فکاھیہ کالم کی صورت

وہ آئے بزم میں......

نزھت اصغر سے مصنفہ عذرا آفتاب

کی پُر لطف باتیں

اس کے علاوہ

طیبہ عنصر مغل، فرح بھٹو، غزالہ عزیز، ہاجرہ ریحان، افشین جہاں آرا کی خوب صورت کہانیاں

دیارِ غیر میں بسنے والے اپنا یومِ آزادی کیسے مناتے ہیں۔ یہ پڑھیے شائستہ زریں کے خصوصی سروے میں......

اس کے ساتھ ساتھ سحر کن شاعری خوش ذائقہ پکوان قابل غور تراشے اور دلچسپ و پُراثر مستقل سلسلے صرف آپ کے ذوق کے لیے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

احمد رضوی، ننھا، عمر شریف، معین اختر، بوبو برال وغیرہ اور خواجہ معین الدین۔ جنہوں نے مرزا غالب بندر روڈ پر اور تعلیم بالغان جیسے ڈرامے لکھے۔ انور مقصود جن کے یہاں طنز بہت زیادہ ہے۔

اردو نثر میں کامیڈی یا مزاح لکھنے والے بہت کم سہی لیکن باکمال لوگ ہیں۔ جیسے رشید احمد صدیقی، پطرس، کرشن چندر، مرزا عظیم بیگ اور سب سے بڑھ کر مشتاق یوسفی صاحب۔ جن کے یہاں چٹکیاں ہی چٹکیاں ہیں جو کسی ایک لفظ کو جس انداز سے چاہیں استعمال کرتے ہیں اور ایک نیا لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی سے اندازہ لگالیں کہ ان کی آپ بیتی کا نام زرگزشت ہے کیونکہ وہ ایک بہت بڑے بینکار رہ چکے ہیں۔ ابن انشا، ابراہیم جلیس، عطاء اللہ قاسمی، شفیق الرحمٰن اور بہت سے نام ہیں۔

اردو شاعری کا دامن اس لحاظ سے بہت بھرا ہوا ہے۔ مرزا غالب کے یہاں بے پناہ طنز اور چٹکیاں لیتا ہوا مزاح ملتا ہے

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصے میں میرا لپٹا ہوا بستر کھلا
ایسی جنت کا کیا کرے کوئی
جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں
جس کے پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

غالب کی پوری شاعری اس قسم کے اشعار سے بھری ہوئی ہے۔ ان کے علاوہ سودا نے بھی ایسی شاعری کی ہے۔

علامہ اقبال نے بھی ایسی شاعری کی ہے جس میں طنز و مزاح کا عنصر شامل ہے۔

شیخ صاحب بھی تو پردے کے کوئی حامی نہیں
مفت میں کالج کے لڑکے ان سے بدظن ہو گئے
وعظ میں فرما دیا کل آپ نے یہ صاف صاف
پردہ آخر کس سے ہو جب مرد ہی زن ہو گئے

طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کا ایک بہت بڑا نام ہے اکبر الہ آبادی۔ انہوں نے اپنی ظریفانہ شاعری سے نشتر کا کام لیا ہے جیسے

عاشقی کا ہو برا جس نے بگاڑے سارے کام
ہم تو اے بی میں رہے اغیار بی اے ہو گئے
بوٹ ڈاؤسن نے بنایا میں نے اک مضمون لکھا
ملک میں مضمون نہ پھیلا اور جوتا چل گیا
شیخ کعبے کو جائیں ہم تو انگلستان دیکھیں گے
وہ دیکھیں گھر خدا کا ہم خدا کی شان دیکھیں گے
ہم ایسی کل کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے بچے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

ایک اور نام سید ضمیر جعفری کا ہے۔
چند اشعار ان کے بھی سن لیں۔

سوچتا ہوں کہ اس زمانے میں
دادی اماں کا کیا کرے کوئی

ولاور فگار جن کا ایک شعر کرپشن کرنے والوں کا قومی ترانہ بن گیا۔

آ تجھے بتلاؤں میں تدبیر رہائی مجھ سے پوچھ
لے کے رشوت پھنس گیا ہے دے کے رشوت چھوٹ جا

میں آپ کو شاعری میں پیروڈی کے حوالے سے بتا چکا ہوں۔ ایک صنف گرہ لگانا بھی ہے۔ اس میں کسی مشہور شعر پر گرہ لگائی جاتی ہے۔ جیسے غالب کا مشہور شعر ہے۔

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد
مجھ سے میرے گناہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

اب جو گرہ لگی ہے وہ بھی کمال ہے۔

بیگم بھی ہیں کھڑی ہوئی میدان حشر میں
مجھ سے میرے گناہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

خود میں نے بھی بے شمار مشہور اشعار پر گرہیں لگائی ہیں جیسے

چاروں نے شیخ جی کے بارے میں یہ بتایا
کچھ اور تم نہ سمجھو یہ ہے میاں ہمارا
چہکار گونجتی ہے اس کے بدن میں اپنی
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
تفریح کے لیے انہیں لائے تھے بیچ پر
واللہ اس میں اپنے ارادے دگر نہ تھے
ان کو اٹھا کر لے گئی موبائل کی پولیس
منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

بہرحال یہ موضوع ایسا ہے کہ ہر شعبے پر پی ایچ ڈی ہو سکتی ہے۔

مزاح کی حس بے حسی سے نہیں آتی۔ چہرے کی سختی سے نہیں آتی۔ تکبر سے نہیں آتی۔ دولت سے نہیں آتی بلکہ زندگی سے پیار کرنے سے آتی ہے۔ زندگی کو برتنے سے آتی ہے۔ نرمی اور رحم دلی سے آتی ہے۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کہا جاتا ہے کہ اولاد کے لیے ماں اور باپ دونوں کا ہونا بہت ضروری ہے۔ ماں اگر بچے کو پیار دیتی ہے تو باپ اس کی تربیت کرتا ہے۔ اس کے مستقبل کو بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔

باپ کا سایہ گھنی چھاؤں کی طرح ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا کا واحد رشتہ ہے جو یہ چاہتا ہے کہ اس کی اولاد زندگی کے ہر میدان میں اس سے زیادہ کامیابیاں حاصل کرے۔

باپ کے بغیر

کشمالہ حسن

اس دنیا میں ایسے لاکھوں بچے ہوں گے جن کے باپ نہیں ہیں۔ وہ بن پتوار کی کشتی جیسی زندگی گزارنے پر مجبور تھے لیکن حوصلے اور انتھک محنت سے اوپر، بہت اوپر پہنچے ایسے ہی کچھ بنیر باپ کے بچوں کا ذکر جنہوں نے تاریخ عالم پر انمٹ نقوش چھوڑے۔

ایک مختصر سی لیکن انتہائی دلچسپ تحریر

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

وہ بیٹے کو پروان چڑھتے اور ترقی کرتا دیکھ کر بے حد خوش ہوتا ہے۔ اس کے لیے دعائیں کرتا رہتا ہے۔ اس کے لیے مواقع نکالنے کی جدوجہد کرتا ہے۔

دنیا کے بہت سے نامور لوگ اپنے باپ کی بے پناہ شفقت ہی کی وجہ سے اس مقام پر پہنچے ہیں کہ ان کے نام زندہ ہیں۔ لوگ ان سے اور ان کے کارناموں سے اچھی طرح واقف ہیں لیکن بہت سے لوگوں کے ساتھ صورتِ حال مختلف بھی ہوئی ہے۔ یعنی وہ بچپن ہی میں باپ کے سائے سے محروم ہوگئے یا بہت کم عمر تھے جب ان کے باپ کا انتقال ہوا۔ پھر خدا نے انہیں اپنے سائے میں لے لیا اور انہوں نے کمال حاصل کیا۔ عروج حاصل کیا اور انسانی تاریخ میں ہمیشہ کے لیے زندہ ہوگئے۔

آئیں کچھ ایسی ہی عظیم شخصیات سے آپ کا تعارف کرواتے ہیں۔

سب سے پہلا نام تو خود ہمارے حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہے۔

حضرت محمدؐ کے والد کا انتقال آپؐ کی پیدائش سے پہلے ہی ہوگیا تھا اور جب صرف چھ برس کے تھے تو والدہ محترمہ کا انتقال ہوگیا۔

تاریخ انسانی میں آپؐ سے بڑی اور عظیم شخصیت اور کس کی ہوسکتی ہے؟ آپؐ نے عاجزانہ طور پر اپنی مساعی کا آغاز کیا اور دنیا کے عظیم ترین مذہب کی بنیاد رکھ دی۔ وہ ایک انتہائی موثر سیاسی رہنما بھی ثابت ہوئے۔

دنیا کے بہت سے نامور لوگوں کی یہ خوش نصیبی رہی کہ وہ دنیا کے تہذیبی مراکز میں پیدا ہوئے اور وہیں ایسے لوگوں میں پلے بڑھے جو عموماً اعلیٰ تہذیب یافتہ یا سیاسی طور پر مرکزی حیثیت کی اقوام تھیں۔

اس کے برعکس آپ کی پیدائش جنوبی عرب میں مکہ شہر میں 570ء میں ہوئی۔ یہ علاقہ تب تجارت، فنون اور علم کے مراکز سے بہت دور تھا۔

شاید خدا نے اس لیے آپؐ کو اس خطے میں پیدا کیا تھا کہ آپؐ دنیا کے تند خو ترین لوگوں کو سدھار سکیں اور اس میں اتنی کامیابی حاصل کی کہ پوری دنیا انگشت بدنداں ہے۔ وہی صحرائے عرب کے بدو، اجڈ پن میں اپنی مثال آپ جب اسلامی تعلیم سے روشناس ہوئے تو اعلیٰ اخلاق و آداب کے پیکر کہلائے۔

میں اس مضمون میں آپؐ کے بارے میں کیا لکھ سکتا ہوں۔ کیونکہ آپؐ کی سیرت پر روشنی ڈالنا میرے لیے ممکن نہیں۔

لیکن یہ ذکر اس لیے ضروری تھا کہ یہ مضمون ایسی شخصیات کے بارے میں ہے جن کے سروں پر باپ نہیں تھے۔ پھر انہوں نے انسانی تاریخ کے صفحات کو اپنی روشنی سے روشن کردیا۔

نیوٹن

جو ایک عظیم ترین سائنس دان تھا۔ اسے لوگ آئزک نیوٹن کے نام سے پکارتے ہیں۔ وہ 1642 عیسوی میں کرسمس کے روز انگلستان کے وولز تھورپ کے مقام پر پیدا ہوا اور اسی برس گیلیلیو کی موت ہوئی تھی۔ یعنی ایک بڑے سائنس داں موت کی گود میں پہنچا تو دوسرا سائنس داں زندگی کی گود میں آیا۔

یہ بھی اپنے والد کی وفات کے بعد پیدا ہوا۔ بچپن ہی میں ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کے مترادف اس کے اوصاف ظاہر ہونے لگے اس نے میکانکی مظاہر کی طرف اپنا رجحان ثابت کرنا شروع کردیا تھا۔

اٹھارہ برس کی عمر میں وہ کیمبرج میں داخل ہوا۔ وہاں اس نے سائنس اور ریاضیات کے لیے خود کو وقف کردیا۔ پچیس سے ستائیس برس کی عمر تک اس نے ان سائنسی نظریات کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں، وہ تمام نظریات جو بھی سائنس کی بنیاد سمجھی جارہی تھیں انہیں غلط ثابت کرتا جارہا تھا۔ اس کے مقالوں نے بعدازاں دنیا میں انقلاب برپا کرنا تھا۔

نیوٹن اپنی تحقیقات کے ذریعے بنیادی نظریات کو 1669 عیسوی تک وضع کر چکا تھا لیکن اس کے زیادہ تر نظریات دیر بعد منظر عام پر آئے۔

اس کے شائع ہونے والے اوّلین تہلکہ مچادینے والے نظریات روشنی کی ہیئت سے متعلق تھے محتاط تجربات کے ایک سلسلے کے بعد نیوٹن نے دریافت کیا کہ عام سفید روشنی قوس و قزح کے تمام رنگوں کا آمیزہ ہے۔

اس نے روشنی کے انعکاس اور انعطاف کے قوانین کا بھی محتاط تجزیہ کیا۔ 1669 عیسوی میں روشنی منعکس کرنے والی پہلی دوربین کا نقشہ اور ڈھانچا تیار کیا۔ یہ خاص وضع کی دوربین ہے جو آج بھی بڑی فلکیاتی مشاہدہ گاہوں میں استعمال ہوتی ہے۔

اس نے اپنی دریافتوں کو جب برٹش رائل سوسائٹی کے سامنے پیش کیا تو اس کی عمر صرف انتیس برس تھی۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کنفیوشش

عظیم چینی فلسفی۔ کنفیوشش پہلا آدمی تھا جس نے چینی عوام کے بنیادی اعتقادات کو ملا کر عقائد کا ایک مقام وضع کیا۔ کنفیوشش لیو کی مختصر ریاست میں 551 قبل مسیح پیدا ہوا۔ یہ شمالی چین میں شان تنگ کے موجودہ قصبے میں واقع تھی۔ بچپن ہی میں وہ باپ کے سائے سے محروم ہو چکا تھا۔

اس کے مطابق دو عظیم اہم فضیلتیں... SEN اور Li ہیں۔ عظیم انسان ان ہی سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔

S EN کو بعض اوقات محبت کے معنوں میں ترجمہ کیا جاتا ہے لیکن اسے دیگر انسانوں سے ایک محبت بھرا تعلق کے طور پر زیادہ بہتر سمجھا جاسکتا ہے۔

Li سے آداب، رسومات، رواج، اطوار اور خوش اخلاقی مراد لی جاتی ہے۔

کنفیوشش مت انفرادی حقوق کی نسبت افراد کی ذمّے داریوں پر اصرار کرتا ہے۔ چینی تہذیب میں بری طرح پیوست کنفیوشش کے اعتقادات مشرق ایشیا میں اس درجہ موثر ثابت نہیں ہوئے لیکن کنفیوشش کی اہمیت سے کسی بھی دور میں انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔

گیلیو گیلیو (1642۔1564 عیسوی)

عظیم اطالوی سائنس دان۔

سائنس طرزِ فکر کی ترقی میں اس کا سب سے زیادہ ہاتھ ہے۔ وہ 1564ء میں پیسا شہر میں پیدا ہوا اور باپ کچھ ہی دنوں بعد چل بسا۔

نوجوانی میں جب وہ پیسا یونیورسٹی کا طالب علم تھا تو مالی بدحالی کے سبب اسے تعلیمی سلسلہ ختم کرنا پڑا تھا۔ تاہم 1589ء میں اسے اس یونیورسٹی میں پڑھانے کی ملازمت مل گئی۔ چند سال بعد اس نے پاؤڈا یونیورسٹی میں نوکری حاصل کی۔ 1610ء تک وہیں رہا۔

اس دور میں اس کی زیادہ تر سائنسی ترجیحات سامنے آئیں۔

اس کی اوّلین اہم دریافتیں میکانکس کے شعبے میں رونما ہوئیں۔ اس نے ارسطو کے خیال کے برعکس یہ ثابت کیا کہ وزنی اور ہلکے اجسام ایک سی رفتار سے نیچے گرتے ہیں۔

گیلیو کی دریافتوں میں ایک اہم دریافت جمود کا قانون بھی ہے۔ Law of iner tia اس نے فلکیاتی مشاہدے کے لیے عظیم دوربین تیار کی۔

دوربین کی ایجاد اور اس کی دیگر دریافتوں نے اسے

پروفیسر حمید الدین شاہد

(2001-1919) اردو کے ممتاز شاعر، ادیب، دانشور اردو زبان کے سب سے قدیم جریدے ''سب رس'' کے مدیر۔ وہ خواجہ شجاع الدین کے ہاں حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے۔ 1943ء میں ایم اے اردو کیا اور اسکول آف کامرس اردو سٹی کالج اور عثمانیہ یونیورسٹی میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ قیام پاکستان سے قبل انہوں نے پروفیسر محی الدین زور کے رسالے سب رس کی ادارت سنبھالی۔ ترقی اردو بورڈ کراچی کے مشیر اور رکن رہے۔ اردو، فارسی، انگریزی، ہندی اور عربی کے عالم تھے۔ اردو لغت بورڈ کے قیام کے وقت 1959ء سے 1975ء کے دوران اردو زبان کے قدیم الفاظ کی تحقیق کے حوالے سے گرانقدر خدمات انجام دیں۔

وہ اعلیٰ پائے کے مصنف بھی تھے۔ ان کی تصانیف میں یہ کتب شامل ہیں۔ (۱) سرگزشت ادارہ ادبیات اردو (۲) شمس الامراء کے سائنسی کارنامے (۳) رباعیات امجد (۴) یادگار ماضی (۵) ادبی مطالعے (۶) نقوش ادب (۷) رسالہ محمود و خوشحال (۱۰) اردو میں سائنسی ادب (۱۱) لچھمی (۲۱) نارئن۔ وہ آخری دم تک سب رس کے مدیر اور بہادر یار جنگ اکیڈمی کے صدر نشین رہے، جو کہ ایک ریکارڈ ہے۔ ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر ساکنان شہر قائد ایوارڈ، بابائے اردو نشان سپاس، اردو فروغ ایوارڈ، دکن کا قلی قطب شاہ ایوارڈ اور پاکستان رائٹر گلڈ کی جانب سے طلائی تمغہ ملا۔ کراچی میں انتقال کیا۔ مدفن پاپوش نگر میں ہے۔

مرسلہ: ناصر حسن، لاہور

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

مقبول بنادیا۔ یہ اور بات ہے کہ کلیسا اس کے خلاف ہوگیا تھا۔

حضرت موسیٰ

ایک قد آور مذہبی شخصیت، خدا کے نبی، پیغمبر۔ قرآن نے جن کا تذکرہ بار بار کیا ہے اور تاریخ بھی بتاتی ہے کہ ان کے ساتھ بچپن میں کیا ہوا۔

آپ کی والدہ نے فرعون کے ڈر سے آپ کو ٹوکری میں لٹا کر دریا کے سپرد کردیا تھا اور خود فرعون کی بیوی نے آپ کی پرورش کی۔

یعنی آپ پیدا ہوتے ہی باپ کے سائے سے دور ہوگئے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد اگرچہ آپ کی والدہ آپ کو دودھ پلانے کے لیے آپ کے پاس خدا کی طرف سے بھیج دی گئی تھیں لیکن تاریخ اس کے بارے میں خاموش ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ حضرت موسیٰ کو کبھی باپ کا سایہ نصیب نہیں ہوسکا تو یہ بالکل درست ہوگا۔

آپ کے بارے میں زیادہ لکھنا اس لیے غیر ضروری ہے کہ ہم میں سے ہر شخص کو آپ کے بارے میں معلوم ہے۔

حضرت عیسیٰ

آپ کے بارے میں بھی ہر شخص یہ جانتا ہے کہ خدا نے آپ کو بغیر باپ کے پیدا کر کے یہ بتا دیا تھا کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

آپ کی والدہ بی بی مریم آپ کے ساتھ رہیں۔

جوزف اسٹالن (1879-1953 عیسوی)

اسٹالن جس کا اصل نام آئیوسف وساریونووچ زرگا شویلا تھا۔ کئی سال تک سوویت یونین کا آمر رہا۔

وہ جارجیا کے قصبے گوری میں 1879ء میں پیدا ہوا۔ اس کی پرورش انتہائی غریب ماحول میں ہوئی۔ اس کا بیمار باپ ایک شرابی تھا اور بیٹے کو بے تحاشا مارا کرتا۔

اسٹالن جب سات یا آٹھ برس کا تھا تو باپ کا انتقال ہو گیا۔

اسٹالن نے گوری میں ایک کلیسائی مدرسے میں تعلیم حاصل کی۔ پھر نوجوانی میں الہیاتی علوم کے مدرسے میں داخل ہوا۔

1899ء میں مخرب اخلاق خیالات کے پرچار کے الزام میں اسے مدرسے سے نکال دیا گیا۔ وہ خفیہ مارکس تحریک میں شامل ہوگیا۔

اسٹالن کی وضع کردہ معاشی پالیسیاں زراعت کے جبری ارتکاز پر مبنی تھیں۔ یہ پالیسی کسانوں میں انتہائی ناپسندیدہ تھی۔ اس کی مخالفت بھی بہت ہوئی۔

1930ء کی دہائی کے شروع میں اسٹالن کے فرمان کے تحت ہزاروں مزدوروں کو مار دیا گیا یا فاقوں سے وہ خود مر گئے۔

اپنی زندگی میں اسٹالن نے روس کی سرحدوں میں توسیع کی۔ مشرقی یورپ میں ایک بڑی سلطنت قائم کی اور ریاست ہائے متحدہ سوویت روس کو ایک بڑی طاقت بنا دیا۔

ولیم فاتح۔ ولیم دی گریٹ (1087ء۔ 1027 عیسوی)

1066ء میں نارمنڈی کا نواب ولیم انگلستان کا حکمران بننے کی خواہش میں چند ہزار فوجیوں کے دستے کے ساتھ خلیج انگلستان عبور کر گیا۔

یہ انگلستان میں یورش کر کے داخل ہونے کی تاریخ میں آخری فوجی دستہ تھا۔ نارمن قوم کی اس فتح نے ولیم اور اس کے جانشینوں کو انگلستان کا تخت ہی نہیں دلوایا بلکہ تمام برطانوی تاریخ پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

ولیم فرانس کے قصبے نارمنڈی میں 1029 عیسوی کو پیدا ہوا۔ اس کا کوئی باپ نہیں تھا (ناجائز اولاد) اس کے باوجود وہ ترقی کرتا ہوا کہاں سے کہاں جا پہنچا۔

ژاں زیکوئس روسو (1778۔1772 عیسوی)

معروف فلسفی ژاں زیکوئس روسو سوئٹزر لینڈ میں جنیوا کے مقام پر 1712 عیسوی میں پیدا ہوا۔ اس کی پیدائش کے کچھ عرصے کے بعد اس کی ماں چل بسی اور جب وہ سات یا آٹھ برس کا تھا تو باپ اسے چھوڑ کر بھاگ گیا۔

اس طرح اس فلاسفر نے ماں اور باپ کے سایوں کے بغیر اپنی زندگی گزار دی۔ اس کی شہرت اس مضمون سے ہوئی جس کا عنوان تھا۔ ''انسان معاشرے اور اخلاقیات کے فنونِ لطیف اور سائنس سود مند ہے یا نہیں۔''

اس کے بعد اس کے کئی مضامین سامنے آئے جیسے عدم مساوات کے آغاز پر تفکر، ایلی، عمرانی معاہدہ وغیرہ۔ بالآخر بغیر ماں اور باپ کے پروان چڑھنے والا یہ بچہ دنیا کے چند بڑے فلاسفر میں شمار ہوا۔

یہ میں نے چند نام درج کیے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی نہ جانے کتنے ہوں گے جنہیں باپ کا سایہ نصیب نہیں ہوا ہوگا لیکن انہوں نے اپنی مسلسل جدوجہد اور عزم سے دنیا میں اپنا مقام حاصل کرلیا ہے۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

زندگی جیت گئی

فرزانہ نکہت

اسے کیا خبر تھی کہ وہ صرف تفریح کے لیے نکل تو رہی ہے مگر یہ تفریح اسے بہت مہنگی پڑے گی۔ جان عذاب میں آجائے گی۔ زندگی کے لالے پڑ جائیں گے لیکن ابھی موت کا وقت نہیں آیا تھا، سو وہ زندہ سلامت گھر لوٹ آئی۔

ایک باہمت دوشیزہ کے حوصلے کا بیان

ریاستِ ہائے متحدہ امریکا کے شمال مشرق میں واقع بیلز آئی لینڈ اور جونز پورٹ مین کے ساحلی علاقے کے باشندے آج بھی 25 جنوری 1991ء کے دن کو اس سال کے سرد ترین دن کی حیثیت سے یاد کرتے ہیں۔ اس دن ٹمپریچر منفی اٹھارہ ڈگری سینٹی گریڈ کو پہنچا ہوا تھا۔ لابسٹر اور مچھلیوں کے شکاری اپنے گھروں میں دبکے ہوئے تھے لیکن چونکہ پیری ونکلو نامی سدا بہار سمندری پودوں کی بیلیں بڑی اچھی قیمت دے جاتی تھیں اس لیے راجر چیڈلر نے ایک

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

دس فٹ لمبی پلکی کشتی جو اس کے آنجہانی باپ کی ملکیت رہ چکی تھی لی اور اپنے دوست فل راس کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔ وہ بہت سی ایسی جگہوں کے بارے میں جانتا تھا جہاں اب تک ان کی رسائی نہ ہو سکی تھی۔ ان دونوں کو اس وقت رقم کی اشد ضرورت تھی۔ اس لیے وہ تند و تیز چیرنے والی ہواؤں کی پروا کیے بغیر اس مہم پر جانے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔

بیلز آئی لینڈ کے ساحل پر پہنچ کر اکتیس سالہ راجر اور تیس سالہ فل کشتی کو گھسیٹ کر منفی سولہ ڈگری یخ بستہ پانی میں لے گئے۔ فل کا چہرہ شدید سردی سے سرخ ہو رہا تھا۔ اسے چیختی چنگھاڑتی ہواؤں میں اپنی آواز راجر تک پہنچانے کے لیے حلق پھاڑنا پڑ رہا تھا۔ دوپہر کے قریب وہ اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ سدا بہار سمندری بیلیں اور گھونگھوں بھری چٹانیں ساحل سے پچاس گز کی دوری پر تھیں۔

دو گھنٹے بعد وہ دو مگروں کو چھاننے کے بعد تیسرے مگر پر پہنچے اور متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ اس جگہ سے سمندری بیلیں اور گھونگھے اکٹھے کرنے کے بعد وہ واپسی کا سفر کریں گے۔ انہوں نے تقریباً سو پاؤنڈ کے قریب سمندری بیلیں اکٹھی کر لی تھیں۔ شدید سردی سے انہیں اپنی کمر تختہ محسوس ہو رہی تھی اور گھٹنے جواب دیتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ مزید برآں مدوجزر بھی بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ مگروں نے جلد ہی پانی میں ڈوب جانا تھا۔

جب فل اس مگر پر چڑھنے لگا تو راجر نے وہ بغیر بادبانوں والی کشتی پانی سے نکال لی۔ پھر دونوں آدمی تیزی سے وہاں سے سمندری پودے اور بیلیں اکٹھی کرنے میں مصروف ہو گئے۔ اس مصروفیت میں وہ کشتی کو بالکل فراموش کر بیٹھے۔ تیز و تند ہواؤں کے تھپیڑے ان کے جسموں سے ٹکرا رہے تھے۔ اپنی بالٹی پودوں سے بھر چکنے کے بعد فل اسے خالی کرنے کشتی کی طرف مڑ گیا مگر کشتی اپنی جگہ سے غائب تھی وہ بدحواس اور سراسیمہ سا ہو گیا اور چلا کر راجر سے بولا۔

''راجر! تم نے کشتی کے ساتھ کیا کیا ہے؟''

اسی وقت انہیں کشتی دکھائی دے گئی۔ بڑھتے ہوئے مدوجزر نے اسے اپنی جگہ سے ہٹا کر سمندر میں دھکیل دیا تھا۔ اب وہ تیز و تند ہواؤں میں دور سے دور تر ہوتی جا رہی تھی۔

صورتِ حال کی خطرناکی نے دونوں کو شدید پریشانی اور اضطراب سے دوچار کر دیا۔ وہ تیزی سے بلند ہوتے مدوجزر میں منجمد کر دینے والی ہواؤں کے تھپیڑے سہتے ان چٹانوں پر کھڑے تھے۔ انہیں اس تمام دن کوئی اور کشتی بھی دکھائی نہ دی تھی بالآخر راجر نے فل سے کہا۔ ''ہم تو مر گئے۔''

کشتی اب انہیں بمشکل ہی دکھائی دے رہی تھی۔ یہ جلد ہی نظروں سے اوجھل ہو جانی تھی۔

''کشتی کو اب بھول جاؤ راجر۔'' فل بولا۔ ''وہ جا چکی ہے اب ہمیں تیر کر ساحل پر پہنچنا ہوگا۔''

''نہیں میں ایسا نہیں کر سکتا۔'' راجر جھرجھری لیتے ہوئے بولا۔

لمحہ بھر کے لیے فل نے سوچا کہ وہ اکیلا تیرتا ہوا ساحل پر جائے اور لوگوں کو مدد کے لیے بلا لائے لیکن اگر وہ ساحل پر پہنچنے میں ناکام رہا؟ اس طرح راجر یقیناً وہیں چٹانوں پر سردی اور انجماد سے مر جائے گا۔

''ہمیں ساحل پر پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے راجر، ہمیں ایک دوسرے کی مدد کرنی چاہیے۔'' اس نے کہا۔

لیکن چار دفعہ کی کوششوں کے باوجود وہ پانی میں چھلانگ نہ لگا سکے۔ ہر مرتبہ وہ جھجک کر رہ جاتے تھے۔ پانی تیزی سے اتر رہا تھا اور ساحل محض دو سو گز کی دوری پر تھا۔

''اب ہمیں ضرور چل دینا چاہیے۔'' فل حتمی لہجے میں بولا۔

انہوں نے اپنے جسموں سے بھاری فالتو کپڑے اتارے، کوٹ اور بوٹ بھی اتارے۔ اپنے جمع کیے ہوئے پودے چٹانوں میں محفوظ کیے پھر دونوں نے گھٹنوں کے بل جھک کر اللہ سے دعا کی۔ ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئے۔

''تم ایک بہترین دوست ہو فل۔'' راجر نے کہا۔

''مجھے یقین ہے کہ تم یہ مشکل مرحلہ ضرور طے کر لو گے۔ اب میں تین تک گنتی کرتا ہوں۔ پھر ہم اکٹھے پانی میں چھلانگ لگا دیں گے۔ ایک..... دو.....'' اس کے تین کہنے سے پہلے ہی فل نے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ پانی نے اس کے پھیپھڑوں سے ایک دم ہی ہوا نکال دی اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی دیوار سے ٹکرا گیا ہو۔ اسی وقت اس نے راجر کے پانی میں چھلانگ لگانے اور چیخنے کی آواز سنی۔ ''ایک شخص ایسے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

سرد پانی میں آخر کتنی دیر تک زندہ رہ سکتا ہے؟ پانچ منٹ یا شاید دس منٹ۔''

فل نے اپنے آپ کو سطح آب سے نیچے رکھنے کی کوشش کی کیونکہ سمندر ہوا کے مقابلے میں گرم تھا۔ تیرتے تیرتے وہ مڑ مڑ کر راجر کو بھی دیکھتا جا رہا تھا وہ ڈر رہا تھا کہ راجر کہیں ہمت ہی نہ ہار جائے اور ساحل تک پہنچنے سے پہلے غرقاب ہو جائے۔

ساحل سے آدھے فاصلے پر پہنچ کر راجر نے اپنے بازو سن ہوتے محسوس کیے اور مڑ کر اپنی ٹانگوں کو دیکھا کہ آیا وہ حرکت کر رہی تھیں یا نہیں۔ ''مجھ میں تو اب ساحل تک پہنچنے کی سکت نہیں۔'' اس نے مایوسی سے سوچا۔

اس دوران فل اتھلے پانیوں میں پہنچ چکا تھا۔ اس نے مڑ کر راجر کو دیکھا اور پکارا۔ ''چلے آؤ راجر! ہمت کرو۔'' اس کی کھال تیز و تند ہواؤں سے جمی جا رہی تھی۔ پھر بھی وہ اپنے دوست کو بچا لانے کے لیے دوبارہ سمندر میں جانے کے لیے تیار تھا۔

راجر ساحل سے پچاس فٹ کی دوری پر پشت کے بل تیر رہا تھا کہ بہتر طور پر سانس لے سکے۔ وہ اس وقت اپنے باپ کے بارے میں سوچ رہا تھا جو چند ماہ پیشتر انتقال کر گیا تھا۔ پھر اسے اپنی بیوی کا خیال آیا جسے وہ شاید اب کبھی نہ دیکھ سکتا۔ پھر اس نے سمندر کا سرد پانی اپنے منہ میں جاتے محسوس کیا اور اپنے پیروں کے نیچے زمین بھی محسوس ہوئی۔ آبی دھارے کی مدد سے وہ رینگتا ہوا چٹانی ساحل پر چڑھ گیا۔ اس نے لڑھک کر سمندر میں جا گرنے سے بچنے کے لیے سمندری گھاس اپنی گرفت میں لے لی۔ اس میں اب مزید آگے بڑھنے کی سکت نہیں تھی۔

ادھر ساحل پر اترنے کے بعد فل اس کاٹیج کی طرف روانہ ہو گیا جہاں انہوں نے اپنا ٹرک کھڑا کیا تھا۔ ''میں مدد لینے جا رہا ہوں۔'' اس نے زور سے چلا کر کہا کہ شاید راجر اس کی آواز سن لے۔ اس کے کپڑے جم کر سخت ہو چکے تھے۔ اس کے بازو اور ٹانگیں سن تھیں۔ اس لیے وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا رہا تھا۔ برف کی وجہ سے چٹانیں پھسلواں ہو رہی تھیں اور بار بار گر جاتا تھا۔ ایک جگہ وہ بری طرح سے پھسل گیا اور پشت کے بل گر گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور چاہا کہ سو رہے مگر پھر اسے راجر کا خیال آ گیا وہ اگر کچھ نہ کرتا تو راجر کو ہمیشہ

ملا محمود فاروقی

1652_1585ء

ملا محمود بن محمد بن شاہ محمد جونپوری۔ ہندوستان کے ایک عظیم عالم اور منطقی۔ ابتدائی تعلیم اپنے دادا اور اس کے بعد استاذ الملک محمد افضل جونپوری سے حاصل کی۔ سترہ سال کی عمر میں منطق اور فلسفے کی تکمیل کی۔ جب ان کی شہرت شاہجہان بادشاہ تک پہنچی تو بادشاہ نے انہیں آگرے میں طلب کیا اور اپنے وزیر اعلیٰ سعد اللہ خان کو حکم دیا کہ ان کے شہر پہنچنے پر ان کا شاندار استقبال کیا جائے۔ بالآخر انہیں درباری علماء میں شامل کر لیا گیا اور سہ صدی کے منصب سے نوازا گیا۔ وہ مصاحب کی حیثیت سے سفر میں شہنشاہ کے ساتھ رہے۔ لاہور کے شاہی دورہ کے موقع پر بادشاہ میر بدحشی نے انہیں سختی سے فہمائش کی کہ وہ دنیا داری میں بہت زیادہ الجھ گئے ہیں اور بادشاہ کی ملازمت ترک کرنے کی ہدایت کی۔ اس بات سے متاثر ہو کر ملا موصوف نے شاہی ملازمت سے علیحدگی اختیار کر لی اور اپنے گاؤں واپس جا کر تدریس کا کام شروع کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد شاہجہان کے دوسرے بیٹے اور اس وقت کے بنگال کے حاکم شاہ شجاع نے، جو ان سے فلسفے اور منطق کی کتابیں پڑھتا رہا تھا، انہیں ڈھاکہ بلا لیا۔ فلسفے اور علم البلاغت پر ایک عظیم سند کی حیثیت سے انہیں بلند عالم مانا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے منہ سے کبھی کوئی ایسا کلمہ نہیں کہا جسے بعد میں واپس لینا پڑا ہو، اور نہ کبھی کسی حلفیہ بیان کی تردید کی۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی نے ان کا شمار قدیم شیعی فقہا میں کیا ہے۔ جونپور میں ان کا مقبرہ اب بھی موجود ہے۔ ملا صاحب کی تصانیف یہ ہیں۔ 1۔ الشمس البازغۃ۔ 2۔ الفرائد فی شرح الفوائد۔ 3۔ الفرائد المحمودیہ۔ 4۔ حاشیہ علی الآداب الباقیہ۔

مرسلہ: نوازش علی، کراچی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کے لیے کھودیتا۔

وہ بالآخر ٹرک تک پہنچ ہی گیا۔ خوش قسمتی سے اس نے اس میں چابیاں لگی رہنے دی تھیں اس نے انجن اسٹارٹ کیا اور وہاں سے روانہ ہوگیا۔

نارم لیبی اور اس کی بیوی وہاں سے آدھ میل کی دوری پر سڑک کے کنارے رہتے تھے۔ ڈھائی بجے کے قریب ان کے کتے نے بھونکنا شروع کیا۔ جب نارم نے دروازہ کھولا تو اپنے سامنے عجیب سے یخ بستہ آدمی کو کھڑے پایا۔ اس کے بالوں اور داڑھی پر برف جمی ہوئی تھی۔ اس کی کھال سفید اور موم کی طرح چمک رہی تھی۔ ہونٹ نیلے پڑے تھے۔

''میرا دوست وہاں ساحل پر پڑا ہے۔'' اس نے چلّا کر نارم سے کہا۔

''وہ کون ہے اس کا کیا نام ہے؟'' نارم نے کوئی خیال آتے ہی پوچھا۔

''راجر..... راجر جینڈلر..... میں اسے ساحل پر چھوڑ کر مدد لینے یہاں پہنچا ہوں۔ ہم دونوں سمندر میں گئے تھے۔''

نارم نے اپنی بیوی کے رشتے دار کا نام پہچان لیا۔ اس نے اپنی بیوی اور بیٹی کو آواز دی اور انہیں فل کو اندر لے جاکر بستر پر لٹانے اور کمبل اوڑھانے کی ہدایت کر کے خود راجر کی تلاش میں ساحل کی طرف روانہ ہوگیا۔

فل کی بین سنڈی فیکن چار سال سے بیلز آئی لینڈ کے اسپتال میں ایمرجنسی میڈیکل ٹیکنیشن چلی آرہی تھی اور ہنگامی حالات کی صورت میں وہاں کے لوگ اسے گھر پر بھی فون کیا کرتے تھے۔ دو بج کر بیس منٹ پر ایک نوجوان خاتون نے اسے فون کیا۔ ''آپ کا بھائی، وہ سمندر میں گئے تھے، جلدی پہنچیے۔'' اس کے ساتھ ہی لائن بے جان ہوگئی۔ نارم لیبی کی بیٹی یہ بتانے میں ناکام رہی کہ فل کہاں تھا اور وہ خود کون تھی۔

سنڈی نے جونز پورٹ میں ایمبولینس کے عملے کو فون کیا لیکن لائن مصروف تھی۔ اس پر اس کا شوہر خود ان لوگوں کی طرف روانہ ہوگیا اور سنڈی کار میں بیٹھ کر فل کے ٹرک کی تلاش میں نکل گئی۔ وہ جانتی تھی کہ فل اور جو کوئی بھی اس کے ساتھ تھا اگر ڈوب نہیں گئے تو بھی ہائی پوتھرمیا سے ان کے بچ نکلنے کے امکانات پچاس فیصد ہوں گے۔ انہیں ہارٹ اٹیک بھی ہوسکتا تھا۔ بے ہوشی بھی۔ ان کے دماغ کو بھی نقصان پہنچ سکتا تھا۔

سنڈی کو راستے میں ایمبولینس مل گئی۔ وہ اس میں سوار ہوگیا۔ وہ اور ڈرائیور مل کر فل کو تلاش کرنے لگے۔ جلد ہی انہوں نے اس کے ٹرک کو نارم لیبی کے گھر کے باہر کھڑے دیکھ لیا۔

گھر کے اندر اچھا خاصا ہنگامہ برپا تھا۔ درجن بھر کے قریب افراد وہاں جمع تھے۔ لیبی نے راجر کو ساحل کے قریب درختوں میں پڑے دیکھ لیا تھا اب وہ اور فل دونوں تولیوں اور بھاری کمبلوں میں لپٹے بستروں پر پڑے تھے۔ سنڈی نے ان کے وائٹل سائنیز لیے، ان کی نبضیں بے ترتیب اور بلڈ پریشر گرا ہوا تھا۔ پٹھے اکڑے ہوئے اور آنکھوں کی پتلیاں بے ترتیبی سے حرکت کر رہی تھیں۔ اس نے پہلے راجر کو ایمبولینس میں ڈالا تاکہ اسے گرم آکسیجن دی جائے۔ پھر فل کو اندر لایا گیا۔ اس کے پٹھے اس حد تک اکڑے ہوئے تھے کہ سنڈی کو ڈر تھا کہ اسے حرکت دینے کی صورت میں اس کی کوئی ہڈی ہی نہ ٹوٹ جائے۔

جب فل اور راجر کو اسپتال پہنچایا گیا تھا تو اس وقت فل کا ٹمپریچر پینتیس ڈگری اور راجر کا چونتیس ڈگری تک پہنچا ہوا تھا۔ دونوں کو دوا دے کر گرم پانی کے کمبلوں سے ڈھانپ دیا گیا۔ ان کے خطرے سے باہر ہونے کی پہلی علامت اس وقت نمودار ہوئی جب فل نے کپکپانا شروع کیا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ اس کا جسم اس حد تک گرم ہو چکا تھا کہ سردی محسوس کر سکتا۔ ایک گھنٹے بعد راجر بھی کپکپانے لگا۔

اس رات کوسٹ گارڈز کی اطلاعات کے مطابق ان کی کشتی کہیں بھی نظر نہیں آئی ..... اس پر راجر کے بھائی اورین نے اسے اپنے طور تلاش کرنے کا فیصلہ کیا۔ تلاش بسیار کے بعد اسے کشتی سمندری پودوں کی ایک گٹھری سے چند میل دور خشکی پر پہنچی ہوئی مل گئی۔ اورین کو وہاں راجر اور فل کے جمع کیے ہوئے گھونگھے بھی مل گئے۔ وہ انہیں مارکیٹ لے گیا۔ پھر اگلے دن راجر اور فل کو اسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا۔ راجر نے اسپتال سے گھر پہنچنے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ کشتی پر بادبان لگا دیا۔

اس حادثے نے راجر اور فل کو عمر بھر کے لیے یک جان دو قالب بنا دیا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

نام

عائشہ انور

اس کے والد نے ایک ایسا نام رکھا تھا جس میں کوئی جاذبیت نہ تھی، اسی لیے فلم ساز نے اسے نیا نام دیا اور یہ نام ایسا مقبول ہوا کہ اب اس کے اصل نام سے اسے کوئی بھی پہچانتا نہیں۔

یہ نام اسے کس نے دیا اب کسی کو بھی یاد نہیں

آج سے 80 سال پہلے یعنی 1926ء کے ستمبر مہینے میں پنجاب کے شہر قصور کے محلے مراد میں ایک غریب خاندان میں ایک بچی پیدا ہوئی۔ پیدا ہونے کے بعد سارے بچے روتے ہیں۔ وہ بھی روئی۔ زچہ فتح بی بی کے پاس اس کی نند اور نومولود کی پھوپی بھی موجود تھی۔ اس نے بچی کو روتے ہوئے دیکھا تو چونکے بغیر نہیں رہی۔ ذرا دیر بعد اس نے بچی کو گود میں لیا اور اپنے بھائی مدد علی کی گود میں دیتے ہوئے کہا۔ ''مبارک ہو ایک اور بیٹی کا باپ بننا۔''

غریب مدد علی جو دو بیٹیوں سمیت بارہ بچوں کا باپ پہلے ہی تھا یہ سمجھا کہ بہن اس پر طنز کر رہی ہے مگر بہن بولی۔

''بھائی! تمہاری یہ بیٹی تو روتی بھی سر میں ہے۔''

''برسالو طنز کے تیر'' مدد علی دل ہی دل میں بولا۔ ''میں گاتا بجاتا ہوں نا، میرا پیشہ موسیقی ہے نا، اس لیے میری بہن مجھے جلا رہی ہے۔ مگر اس کی گود میں جو بچی روئی تو اس نے بھی چونک کر بچی کو دیکھا۔ ''ارے یہ تو واقعی سُر میں رو رہی ہے۔'' وہ خود کلامی کے انداز میں بولا۔

''پرا! میں کوئی غلط کہہ رہی تھی؟'' بچی کی پھوپی پُرمسرت لہجے میں بھائی سے بولی۔ ''اللہ اسے نظر بد سے بچائے۔''

''ہاں پرا! اللہ اسے حیات دے اپنے امان میں رکھے،

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

میرا تو دل کہتا ہے یہ بچی اپنی آواز کی بدولت ایک دن بہت مشہور ہوگی بڑا نام کمائے گی۔"

اور پھر گھر کے تمام بڑوں کے مشورے سے اس کا نام اللہ وسائی رکھ دیا گیا۔ بچی جیسے جیسے بڑی ہوتی گئی اس کے اندر چھپی صلاحیتیں سامنے آنے لگیں۔ چار پانچ سال کی عمر میں وہ ہر بات آسانی سے ذہن نشین کرلیا کرتی تھی۔ وہ کوئی لوک گیت ہو یا تھیٹر کا پاپولر گانا، اب اس کے باپ مدد علی اور ماں فتح بی بی کو احساس ہوا کہ ان کی یہ بیٹی غیر معمولی صلاحیتوں کی مالک ہے۔ اللہ نے چاہا تو دنیا میں کچھ خاص کام کرے گی۔ جس شخص کا جو پیشہ ہوتا ہے اس کی اولین خواہش ہوتی ہے کہ اس کی اولاد بھی اس پیشے سے وابستہ ہوجائے۔ میاں بیوی کے باہم مشورے سے اپنی تینوں بیٹیوں عیدی بائی، حیدر باندی اور اللہ وسائی کو موسیقی اور رقص کی تربیت دلوانا شروع کردی گئی۔ لڑکیوں کا باپ مدد علی پیشہ ور موسیقار تھا اور گھروں میں ہونے والی نجی تقریبات کے علاوہ مقامی تھیٹر میں بھی اپنے فن کا مظاہرہ کرتا تھا۔ تربیت کے دوران سب سے چھوٹی بہن اللہ وسائی بڑی بہنوں سے زیادہ تیزی سے سرتال کے مدارج طے کرتی گئی۔ کجن بیگم جو ان کی استاد تھیں انہوں نے بھی عیدن بائی اور حیدر باندی سے زیادہ توجہ اللہ وسائی پر دینا شروع کردی۔ وہ اسے روزانہ بارہ گھنٹے ریاض کرواتیں۔ اس کے باوجود بچی نہ گھبراتی نہ اتنی محنت کرنے سے کتراتی۔ اس کے شوق اور اس کی دلچسپی کو دیکھ کر کجن بیگم بھی خوش ہوتیں اور ماں باپ بھی۔ اس کے شوق کو دیکھ کر کجن بیگم نے مدد علی اور فتح بی بی کو مشورہ دیا کہ اب اس کی تربیت کے لیے استاد غلام محمود کی خدمات حاصل کرو۔ استاد غلام محمود نے اس بچی کو آواز کے اتار چڑھاؤ کے اسرار و رموز بتائے۔ انہوں نے اسے ٹھمری، خیال اور دادرا میں مہارت دلائی۔ استاد نے مدد علی کو کہا۔ "یہ غیر معمولی صلاحیتوں کی بچی ہے اگر اس کی پوشیدہ صلاحیتوں کو بروئے کار لانا چاہتے ہو تو اسے فن اور آرٹ کی دنیا سے متعارف کراؤ۔"

یہ بچی گانے کے ساتھ ساتھ ناچنے اور نوٹنکی والوں کی نقلیں بھی اتارنے لگی تھی۔ اس کے موسیقار باپ نے استاد کے مشورے پر اس کو فن کی دنیا تک لے جانے میں کسی تاخیر سے کام نہیں لیا اس کی خداداد صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے اسے بطور چائلڈ اسٹار خاموش فلم "ہند کے تارے" میں کاسٹ کرلیا گیا۔ یہ فلم 1930ء میں ریلیز ہوئی تو وہ ایک نئے روپ میں نمودار ہوئی تھی۔ اس کی آواز سے ہٹ کر اس کی یہ خوبی تھی کہ اسے اس روپ میں زبردست پذیرائی حاصل ہوئی۔ اس زمانے میں کلکتہ آرٹ اور فن کا بہت بڑا اور ممتاز مرکز تھا۔ مدد علی دوستوں اور بہی خواہوں کے مشورے پر اپنے خاندان کے ہمراہ کلکتہ منتقل ہوگیا۔ وہاں بھی اس پیاری سی بچی کو کئی خاموش فلموں میں کام کرنے کا موقع ملا۔ جس کے بعد اسے ایک کامیاب چائلڈ اسٹار تسلیم کرلیا گیا۔ کلکتے کے دوران قیام نامور گلوکارہ مختار بیگم نے اس بچی کو دیکھا تو بے حد متاثر ہوئیں۔ انہوں نے اپنے محبوب شوہر آغا حشر کاشمیری سے بچی کو متعارف کرایا کہ ان کی وساطت سے یہ بچی کلکتے کے تھیٹروں میں بھی چائلڈ اسٹار کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔

وقت گزرنے کے ساتھ یہ بچی بھی آہستہ آہستہ بڑی ہورہی تھی اور اس کا فن بھی روز بروز نکھرتا جارہا تھا۔ 1935ء میں ڈائریکٹر کے ڈی مہرا نے اس بچی کو اپنی فلم "شیلا عرف پنڈ دی کڑی" میں بطور اداکارہ وگلوکارہ کاسٹ کیا۔ یہ اس کی پہلی فلمی گائیکی تھی۔ اس فلم کا ایک گانا "لنگ آجا پتن دا یار" بے حد مقبول ہوا۔ اس فلم کے بعد اس نے بہت سی فلموں میں چائلڈ اسٹار اور پھر سائیڈ ہیروئن کے طور پر بھی کام کیا۔ ان فلموں میں مسٹر اینڈ مسز بمبئی (1936ء)، ہیر سیال (1937ء)، سسی پنوں (1938ء)، گل بکاؤلی (1939ء)، یملا جٹ (1940ء) اور چودھری (1941ء) قابل ذکر ہیں۔ یادش بخیر، یہ ان دنوں کی بات ہے جب مختار بیگم نے آغا حشر کاشمیری سے اس بچی کا تعارف کرایا اور اس کی خداداد صلاحیتوں کا ذکر کیا تو آغا حشر کاشمیری نے بڑے پیار سے پوچھا۔ "کیا نام ہے تمہارا منی؟"

"اللہ وسائی۔"

"اونہہ......" کہنے کے ساتھ ہی آغا صاحب کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔

"کیا بات ہے۔ یہ نام جناب کو پسند نہیں آیا؟" مختار بیگم بولیں۔

"ارے بھئی! یہ بھی کوئی نام ہے؟ تم کہتی ہو کہ اس کے گلے میں بڑا نور ہے۔"

"ہاں وہ تو ہے۔"

"پھر تو...... پھر تو اس کا نام......" آغا صاحب پُرخیال انداز میں بولے۔ "پھر تو اس کا نام نور جہاں ہونا چاہیے۔"

"اور پھر...... اللہ وسائی اللہ وسائی نہیں رہی، نور جہاں ہوگئی اور اس کے گلے کا نور سارے جہان میں پھیل گیا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کہا جاتا ہے کہ موسیقی روح کی غذا ہے۔ موسیقی تقریباً ہر جان دار کی فطرت میں شامل ہے۔ مثلاً پرندوں کا چہچہانا، کوئل کی کوک، تیتر کی بولی مرغ کی اذان، بہتی ندیا کی گنگناہٹ، جھرنوں کا ترنم، بارش کی رم جھم یہ سب قدرتی موسیقی کے مختلف پہلو ہیں چنانچہ اشرف المخلوقات کیوں کر اس سے عاری ہو سکتی ہے۔ سو انسان نے نہ صرف اسے اپنایا بلکہ اسے مختلف صورتوں میں ڈھالا، کئی روپ بخشے پرورش و پرداخت کی ترقی دی ذہنی اور جسمانی تسکین کا ذریعہ بنایا۔ موسیقی کو باضابطہ اور باقاعدہ علم کا درجہ ہندو دھرم نے دیا جس کے پیچھے مذہبی عقیدت اور دیوی دیوتاؤں کو خوش رکھنے کا جذبہ کارفرما تھا اسی لیے سر، ٹھاٹھ، راگ اور راگنیاں وغیرہ۔ تقریباً سبھی نام ہندی اور سنسکرت زبان کے ہیں اور ان سب کے باقاعدہ اوقات مقرر اور مسلم ہیں۔ موسیقی کی دیوی کو سرسوتی ماں یا سرسوتی دیوی کہا جاتا ہے۔ سرسوتی سنسکرت زبان کا لفظ ہے جس کے کئی معنی ہیں۔ بولنے کی طاقت، نطق، علم، عقل، گائے آسمانی آواز، اچھی عورت، وہ ملک جس میں جھیلیں اور تالاب زیادہ ہوں۔ سرسوتی دیوی کا تہوار پانچ ماگھ کو ہوتا ہے جسے سرسوتی پوجا یا سرسوتی پوجن کہا جاتا ہے۔ عام لوگ اس تہوار کو بسنت پنچمی کا نام دیتے ہیں۔ سرسوتی دیوی برہما دیوتا کی استری (بیوی) ہے اور جملہ علوم وفنون کی موجد خیال کی جاتی ہے۔

موسیقی کی ابتدائی ابجد بھی ہندی ہی ہے یعنی سا۔ رے۔ گا۔ ما۔ پا۔ دھا۔ نی۔ سا۔ جو سا سے شروع ہو کے سا پر ہی ختم ہوتا یا رک جاتا ہے۔ وہی ہندو فلسفہ کہ وقت ایک دائرے کی صورت اپنا چکر مکمل کرتا ہے اور ہر دس ہزار برس بعد اپنا دور پورا

موسیقی سے رغبت رکھنے والوں کے لیے تحفۂ خاص

سُرتان کی ایک الگ دنیا ہے۔ ایک وسیع علم ہے۔ ہر کوئی گا سکتا ہے لیکن سُر پیدا نہیں کر سکتا ہے۔ میاں تان سین سے لے کر آج تک بے شمار افراد نے اس فن کی خدمت کی ہے۔

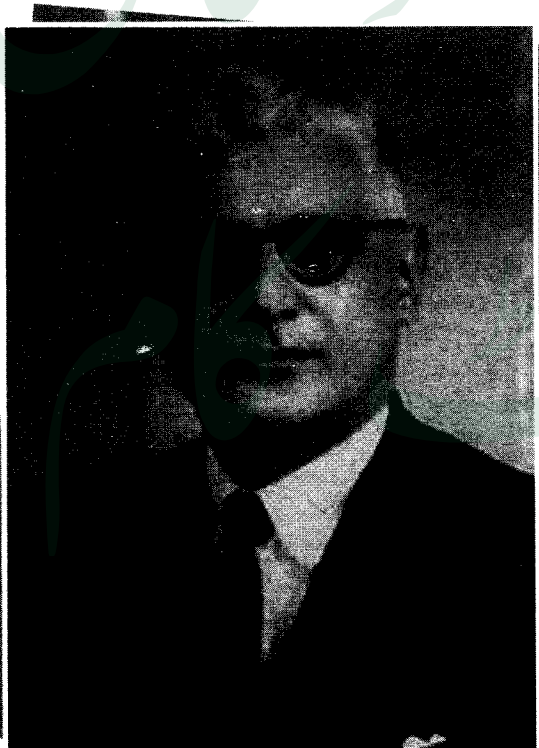

سُرچھاگل

ایاز راہی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کرتا ہے۔ سرسنگیت کے آٹھ ابتدائی حروف مختلف تیور رکھتے ہیں۔ انہی کو ایک دو تین چار پانچ چھ سات آٹھ۔ اور پھر الٹا آٹھ سات چھ پانچ چار تین دو ایک۔ بار بار دہرا کے مشق کی جاتی ہے یعنی سا۔ رے۔ گا۔ ما۔ پا۔ دھا۔ نی۔ سا۔ اور۔ سا۔ نی۔ دھا۔ پا۔ ما۔ گا۔ رے۔ سا۔ موسیقی کے ان آٹھ حروف کی مزید تفصیل کہ سا (کھرج رے)۔ (رکھب) گا (گندھار) ما (رہم) پا (پنچم) دھا (دھی وت) نی (نکھا) ساتی ور یہاں مزید گہرائی میں جانے سے طوالت کا خوف مانع ہے کہ دیگر علوم کی مانند علم موسیقی بھی ایک سمندر ہی ہے جہاں عمر بھر کی تیراکی اور غواصی کے بعد آدمی صرف قطرہ بھر ہی لے پاتا ہے۔ یہاں راگ راگنیوں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ ان گنت سُر اور صورتیں ہیں گو کہ کسی بھی دھن کو الفاظ کی شکل میں لکھا جاسکتا ہے لیکن موسیقی ساز و آواز کا ہی کلیتاً عملی اظہار ہے اس کے لیے مسلسل ریاض کرنا پڑتا ہے۔

تب نظر آتی ہے اک مصرعِ تر کی صورت

خواہ وہ موسیقار ہو گلوکار یا سازِندہ۔ لگاتار محنت شرط ہے کہ یہ تجربے اور مشق کی چیز ہے۔ جنوں کا پھل ہے ہندوؤں نے موسیقی کو اپنے دھرم کا اٹوٹ انگ بنایا اور لازم قرار دیا کہ دھرم کی بنیاد ہی فنون لطیفہ (ناچ، گانا، شاعری، مصوری، بت گری) پر مشتمل اور قائم ہے۔ مسلمان اس بزم رنگا رنگ میں آئے تو ہندو موسیقاروں اور علما کے دیے مدھم پڑ گئے۔ مسلمانوں نے میدان رزم کے ساتھ ساتھ اس بزم رنگار میں بھی وہ رنگ جمایا کہ بڑے بڑے ہندو گیانی۔ پنڈت اور گرو بھی مان گئے۔ انہیں سر جھکاتے ہی بن پڑی کہ مسلمان

نرم دم گفتگو گرم دم جستجو

کی عملی مثال تھے گو کہ آج زوال کا شکار ہیں۔ علم موسیقی کے حوالے سے برصغیر میں سب سے پہلے امیر خسرو کا نام آتا ہے یاد رہے کہ امیر خسرو ترکوں کے قبیلے لاچین کے چشم و چراغ تھے انہوں نے فن موسیقی میں بہت سی نئی اختراعات کیں اور ہندو علما و موسیقاروں پہ اپنی دھاک بٹھا دی۔ کسی بھی علم کا عالم اگر تخلیق کار بھی ہو تو سونے پہ سہاگا ہوتا ہے امیر خسرو نے نہ صرف بڑے بڑے جغادری پنڈتوں موسیقاروں اور گیانیوں کو زیر کیا بلکہ موسیقی کے نئے آلات طبلہ، سہ تار، ستار ایجاد کیے نئی راگ راگنیوں کو بھی تخلیق کیا۔ قول قوالی قلبانہ، خیال، ترانہ، ان ہی سے منسوب ہیں اسی بنا پر وہ طوطی ہند کے لقب سے سرفراز ہوئے۔ امر ہوئے۔ دوسری طرف ہندی شاعری میں بھی میر قافلہ بنتے ہیں۔ بلاشبہ امیر خسرو نغمہ و شعر دونوں کے عبقری تھے۔

تاتاریوں (چنگیزی فوج) کے خلاف میدان جنگ میں لڑے بھی گرفتار بھی ہوئے اور پھر رہائی بھی پائی یہ ملتان (پنجاب) کا واقعہ ہے۔ غالب خستہ حال ہند میں اگر کسی کو شاعر مانتے ہیں تو وہ صرف امیر خسرو ہی ہیں غالب جیسا نابغہ روزگار بھی سلجوقی ترک ہے۔ دونوں عبقری (امیر خسرو و غالب) ہندوستانی نہیں مگر فاتح علم و ادب ضرور ہیں اور مسلم ہیں۔ ان کے مقابل کوئی بھی ہندوستانی سپوت نہ آسکا۔ یہی نہیں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی جید عالم دین اور حدیث پڑھانے کے علاوہ بہت بڑے عالم موسیقی بھی تھے۔ بڑے بڑے ہندو موسیقار اپنے علمی جھگڑوں کا آخری فیصلہ انہی سے کراتے۔ شاہ صاحب کا فیصلہ مستند اور بالکل درست ہوتا سبھی سر جھکا دیتے۔ کسی بھی علم کا حاصل کرنا برا نہیں۔ ہاں اس پہ عمل سوچ سمجھ کر ہونا چاہیے۔ علم نافع کی آرزو اور اس پہ عمل ہی بندگی ہے۔ آج کی اس مختصر قلمی نشست میں ایک ایسے موسیقار کا ذکر و تعارف مقصود ہے جو پاکستانی قوم کا محسن بھی ہے اور اس کا یہ احسان رہتی دنیا تک پاکستانی قوم پہ رہے گا لیکن انہیں وہ شہرت نہ مل سکی جس کے وہ صحیح حق دار تھے اور جو ان کو بہ ہر حال ملنا چاہیے تھا مگر نہ ملا۔ زندہ قومیں اپنے محسنوں کو مشاہیر کا درجہ دیتیں اور ان کے سر پہ دائمی شہرت کا تاج رکھتی ہیں لیکن وائے قسمت "ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ" نہ جانے خود کو نوچنے کھسوٹنے کی یہ بری خو کب تک ہم پہ مسلط رہے گی؟ کہاں تک ہم اپنا حلیہ بگاڑتے رہیں گے؟ یہ سب تعلیم، علم اور شعور کے فقدان کا ہی مآل ہے۔ پتا نہیں ایسے کتنے مخلص اور باعمل لوگ اب بھی گم نامی کی تہہ میں ڈوبے پڑے ہیں جو اسلام اور پاکستان کے جاں نثار تھے جنہوں نے دین و ملت کی خاطر تن من دھن سب کچھ لٹا دیا لیکن ہماری غفلت نے ان پر گم نامی کی مٹی ڈال رکھی ہے۔ یقیناً کہ اللہ ان سے راضی ہوگا اور آخرت میں وہ بامراد، خوش اور مطمئن ہی ہوں گے۔ مگر کیا ہم نے ان کا حق ادا کیا؟ ان کا جائز مقام ان کو دیا؟ میری مراد قومی ترانے کے موسیقار احمد غلام علی چھاگلہ مرحوم ہیں جنہیں ہم نے بہ حیثیت قوم طاق نسیاں میں بٹھا رکھا ہے۔ دن میں کم از کم ایک بار تو ان کی تخلیق کردہ دھن۔

پاک سرزمین شاد باد
کشورِ حسین شاد باد

ہمارے کانوں میں ضرور ہی گونجتی ہے چاہے وہ سازوں کے بغیر سادہ طرز ہو یا سازینے کے ہمراہ نغمہ و شعری شکل میں لیکن احمد غلام علی کا نام کبھی بھی ذہن میں نہیں آتا۔ بہ قول شاعر۔

وہ لوگ جن سے تیری بزم میں ہیں ہنگامے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

گئے تو کیا تیری بزم خیال سے بھی گئے؟

پہلے مصرع میں تھوڑے سے تصرف کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ روزانہ صبح ہر اسکول میں اسمبلی اور ترانے کے بعد یہ تو بتایا جاتا ہوگا کہ قومی ترانے کے خالق شاعر حفیظ جالندھری مرحوم ہیں لیکن قومی ترانے کے خالق موسیقار کا کوئی ذکر نہیں ہوتا ہوگا کہ غالباً اساتذہ کرام بھی اس سے لاعلم ہوتے ہیں۔

احمد غلام علی چھاگلہ 31 مئی 1902ء کو کراچی کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئے ان کے والد غلام علی چھاگلہ دو سال تک کراچی میں میونسپلٹی کے تیسرے منتخب صدر رہے۔ احمد غلام علی چھاگلہ نے تعلیم کا آغاز مدرس الاسلام سندھ سے کیا۔ موسیقی سے انہیں خاص لگاؤ تھا چنانچہ ہندوستانی روایتی موسیقی اور مغربی روایتی موسیقی کی تعلیم حاصل کی۔ مشرقی اور مغربی دونوں اقسام کی موسیقی سے شغف گہرا ہوتا گیا۔ انہوں نے مغربی موسیقار وفن کار رجیمز کرنز کی شاگردی میں مغربی ومشرقی موسیقی کا درس لیا۔ اس سے انہیں مغربی اور مشرقی دونوں قسم کی موسیقی میں مشترکہ چیزوں کی جستجو ہوئی اور انہوں نے دونوں کو قریب لانے کی کوشش میں دلچسپی لی۔ دوسری طرف مشرقی موسیقی میں گہرائی حاصل کرنے کے لیے بہت سی جگہوں کا دورہ بھی کیا۔ 1923ء میں کراچی سے براستہ بلوچستان، عراق، ایران مع تہران، بحیرۂ کیسپئن، تبریز اور کرمان شاہ وغیرہ گئے واپسی میں بصرہ (عراق) سے ہوتے ہوئے کراچی لوٹے۔ لندن ٹرینٹی کالج سے موسیقی کی ڈگری لی۔ کراچی سے یورپ تک گھومے یہ دیکھنے کے لیے کہ مغرب میں مشرقی موسیقی کا سراغ کہاں کہاں ہے؟ ان امصار ودیار میں جرمنی، چیکو، سلواکیہ ہنگری (بیلجیئم) ترکی، شام، فلسطین اور عراق شامل ہیں۔ موسیقی کی عملی تعلیم بھی حاصل کی کہ پڑھانا آموختہ کیسے سامنے آتا ہے۔ مثلاً اوپیرا ہاؤس، سمفنی اور آرکسٹرا وغیرہ۔ اسی طرح روایتی مغربی موسیقی کے علاوہ جدید آرکسٹرا وغیرہ میں بھی پڑھنے پڑھانے کا عملی اظہار کیا۔ سفر بھی مسلسل کرتے رہے شوق کے لیے...... دوبارہ یورپ کا دورہ کیا۔ آخری دورے میں واپس آکر کچھ عرصہ کے لیے وہ کراچی سے بمبئی منتقل ہوگئے۔ وہاں ہندوستانی موسیقاروں سے مل کر مزید معلومات حاصل کیں۔ فن موسیقی اور تہذیب کے حوالے سے کئی سلسلہ وار مضامین لکھے۔ انہیں پاکستانی قومی ترانے کا ممبر چنا گیا کمیٹی کا مقصد پاکستان کے لیے مکمل قومی ترانہ بنانا تھا قومی ترانہ کسی بھی ملک کا چہرہ اور پہچان ہوتی ہے۔ ادھر شہنشاہ ایران (آریا مہر محمد رضا شاہ پہلوی) کا پاکستان کا دورہ طے پا گیا کہ ایران نے ہی سب سے پہلے پاکستان کو تسلیم کیا تھا چناں چہ شہنشاہ کے استقبال کے لیے ترانہ (مع شاعری یا بغیر شاعری) بہت ضروری تھا۔ کئی موسیقاروں نے دھنیں بنا کے پیش کیں لیکن احمد چھاگلہ کے آگے کسی کا چراغ نہ جل سکا کہ

این سعادت بہ زور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

کمیٹی نے بہت سی دھنوں میں سے چھاگلہ صاحب کی دھن کا انتخاب کیا۔ احمد چھاگلہ صاحب نے اپنے ایک ساتھی اور بحری فوج کے ساز ینے (نیوی بینڈ) کے ہمراہ دھن کو مکمل کیا اور شہنشاہ ایران کا استقبال صرف دھن بجا کے کیا گیا یوں اک اہم قومی فریضے کو تکمیل تک پہنچایا گیا۔ چھاگلہ صاحب پاکستان کے محسن اور قومی ہیرو قرار پا گئے۔ وہ اپنی زندگی کا بڑا مقصد حاصل کر چکے تھے۔ خوش قسمتی سے ان کی زندگی میں ہی حفیظ جالندھری مرحوم ترانے کے اشعار لکھ چکے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ احمد چھاگلہ صاحب حفیظ جالندھری صاحب سے ملے تو آب دیدہ ہوگئے کہنے لگے یار حفیظ! تم نے میرا مردہ خراب ہونے سے بچا لیا ہے۔ یہ ایک بڑے تخلیق کار کا دوسرے بڑے تخلیق کو خراج عقیدت اور سپاس گزاری تھا۔ بالآخر نغمہ وترنم سے چھلکتی یہ سر چھاگل ہم سے کھوگئی۔ احمد چھاگلہ صاحب نے فروری 1953ء میں اس جہان رنگ وبو کو الوداع کہہ دیا۔ نصف صدی کی عمر پا کر وہ صدیوں بلکہ رہتی دنیا تک کے لیے امر ہوگئے۔ زندہ ہیں اور رہیں گے۔ 1949ء میں دھن ترتیب دی۔ ان کی وفات کے بعد مکمل قومی ترانہ مع شاعری اگست 1954ء کو مرتب ہوا اور پہلی بار اگست 1955ء کو نشر کیا گیا۔ دھن کے بنانے میں اڑتیس ساز استعمال ہوئے دورانیہ ایک منٹ بیس سیکنڈز ہے۔ پہلی مرتبہ جن گلوکاروں اور گلوکاراؤں نے اس ترانے کے مکمل کرنے میں حصہ لیا ان کے نام یہ ہیں۔ احمد رشدی، کوکب جہاں، زوار حسین، شمیم بانو، اختر عباس، نجمہ آرا، غلام دستگیر، نسیمہ شاہین، انور ظہیر اور اختر وصی علی۔ احمد چھاگلہ صاحب کو قومی ترانے کی دھن تخلیق کرنے پر 1996ء میں صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی (پریذیڈینٹ پرائیڈ آف پرفارمنس) کے لیے نام زد کیا گیا اور پھر مارچ یوم پاکستان کے موقع پر انہیں یہ تمغہ صدر پاکستان (فاروق لغاری مرحوم) نے دیا جو ان کے لواحقین نے وصول کیا۔ احمد غلام علی چھاگلہ مرحوم موسیقار ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخ دان، صحافی اور مصنف بھی تھے۔ غالب اور اقبال پر کثیر مضامین لکھے۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

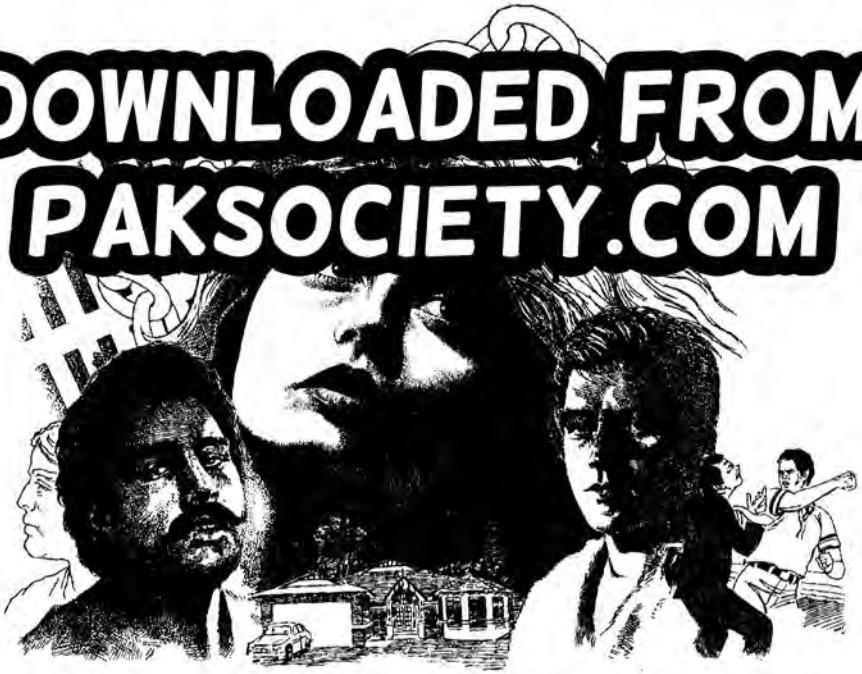

قسط:7

ناسور

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

وہ ایک سیدھا سادہ معصوم فطرت نوجوان تھا اور اس کے گرد سازشی ذہنیت والوں کا انبوہ تھا۔ ایسے سازشیوں کے لیے وہ ترنوالہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان کے پھیلائے ہوئے تارعنکبوت میں پھنسا چلا جارہا تھا کہ اسے احساس ہوا کہ اب مفر کی کوئی راہ نہیں ہے۔ اسے بھی ان کا جواب دینے کے لیے خم ٹھونکنا ضروری ہے اور پھر اس نے کمر کس لی۔ انہی کے لہجے میں انہیں جواب دینے کی کوشش کی۔

ایک ایسی طویل کہانی جس کا ہر باب ایک نئی کہانی ہے

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded from Paksociety.com

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

رانا بشیر کی بیوی کا قتل ہو گیا تھا اور الزام آیا تھا احمد حسین پر۔ اس جرم میں اسے پھانسی ہو گئی۔ احمد حسین کا بیٹا نعمان ایڈووکیٹ زنیرہ کے ساتھ مل کر اصل قاتل کو ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی دوران رانا بشیر اپنی بیٹی کے ساتھ نعمان کے دروازے پر پہنچا۔ وہ معافی مانگنے آیا تھا کیونکہ اب اسے بھی لگ رہا تھا کہ قاتل کوئی اور ہے۔ نعمان ایک لاری اڈے کی یونین میں نائب ضلعی صدر بن گیا تھا۔ کچھ لوگ چاہتے تھے کہ یہ اڈا ختم ہو جائے اور اس کی زمین پر عمارت بنا کر فروخت کی جائے۔ اس سلسلے میں کچھ لوگ تندہی سے کام کر رہے تھے لیکن ان کی چال نعمان انہی پر الٹ دیتا، ابھی وہ اس مسئلے پر غور کر ہی رہا تھا کہ رانا بشیر کی بیٹی نے اسے ایک ڈائری دی جو مقتولہ کی تھی جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ قاتل کوئی اور ہے۔ نعمان ان دونوں مسئلوں پر کام کر ہی رہا تھا کہ ایک دن اس کے بھائی فہیم نے اس سے کہا کہ میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا کہ ہم ایک جوان بہن کے بھائی بھی ہیں اس کے لیے کچھ سوچنا چاہیے پھر اس نے کہا کہ میں نے بہنا کو اکثر رات میں کسی سے فون پر بات کرتے دیکھا ہے۔ باتوں سے لگا کہ وہ کسی کو پسند کرنے لگی ہے۔ فہیم کے جانے کے بعد میں سوچ میں ڈوب گیا تھا کہ فرحانہ کا میسج آ گیا کہ اسے ڈائری کا پارٹ ٹو مل گیا ہے۔ اگلے دن زنیرہ کے ساتھ میں فرحانہ کے گھر گیا تو ڈائری کے واقعات سنے جس نے رفعت قتل کے واقعے کو مزید الجھا دیا تھا۔ اس دن میں اڈے پر بیٹھا تھا کہ کچھ لوگ آ گئے۔ ان میں عزیر خان بھی تھا جس کو اختر کی بہن ثوبیہ کی گمشدگی کا ذمے دار سمجھا جا رہا تھا۔ میں نے عزیر خان سے کہا کہ آپ سے مل کر خوشی ہوئی ہے۔ میں خود بھی چاہتا ہوں کہ کاروباری حضرات کو بھی سہولت ملے لیکن میں چاہتا ہوں کہ یہ معاہدہ پارٹنر بیس پر ہو لیکن ان لوگوں نے منع کر دیا۔ ان کے جانے کے بعد میں ستار ہا تھا کہ کالیا کا فون آ گیا۔ اس نے بتایا کہ عارف مچھندر جیل سے فرار ہوتے ہوئے مارا گیا۔ یہ خبر سنتے ہی میں الجھ گیا۔ گڈز ٹرانسپورٹ کی گاڑیاں آنی شروع ہو گئی تھیں۔ سدو بھائی نے اطلاع دی تھی کہ گڈز کی آڑ میں منشیات کا کاروبار ہوتا تھا۔ سدو کو رخصت کر کے میں بیٹھا ہی تھا کہ کالیا آ گیا۔ اس نے بتایا کہ میری ضمانت منسوخ ہو چکی ہے اور مجھے گرفتار کرنے کے لیے ایس ایچ او ولاور خان آ رہا ہے۔ میں اس کے ساتھ باہر نکلا اور اس کی بائیک پر بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ کالیا کے اڈے پر پہنچا تھا کہ بہن کا فون آ گیا۔ اس نے بتایا کہ پولیس گھر پر آئی تھی اور فہیم کو لے گئی ہے۔ مجبوراً میں نے گرفتاری دے دی۔ وہاں مجھ پر تشدد بھی ہوا۔ حوالات میں بیٹھا تھا کہ ایک سپاہی نے آ کر ایک اخبار دیا۔ اخبار میں چھپی خبر دیکھ کر میں پریشان ہو اٹھا۔

اب آگے پڑھیں

میں سناٹے میں آ گیا تھا۔ چھوٹے بھائی فہیم کے اس طرح مجھے تھپڑ مارنے کا دکھ اپنی جگہ مگر بہن عاصمہ کی اس اطلاع نے مجھے سرتاپا لرزا دیا تھا۔ پہلے تو مجھے اپنی سماعتوں پر شبہ ہوا تھا مگر تھپڑ نے مجھے یہ باور کرا ہی دیا تھا کہ فہیم کی اطلاع غلط نہیں ہو سکتی تھی، ورنہ وہ کیوں بڑے بھائی کو اس طرح تھپڑ مارنے کی بدتمیزی کرتا۔ یقیناً غم و غصے نے اس کے بھی اوسان خطا کر دیے تھے۔

مجھے اس طرح گم صم سا پا کر وہ میری طرف گھورتے ہوئے پھٹی پھٹی آواز میں چیخا۔

”بھائی جان! عاصمہ بہن بھاگ گئی ہے اب ادھر ہی آپ اپنی اور میری قبر کھود دیں جس میں ہم دونوں خود کو دفن کر سکیں، تاکہ ہمیں صبح دیکھنا اور محلے والوں کی باتیں سننا نصیب نہ ہوں۔“

”ش...... شش...... آہستہ...... مم میرے بھائی! آہستہ۔“ میرے منہ سے بس یہی الفاظ برآمد ہو سکے تھے اور میں جیسے بالکل ڈھے جانے کے انداز میں وہیں بستر پر گر گیا تھا۔ مجھے چکر سا آ گیا تھا۔

”میرے چشم تصور میں خورشید خاں المعروف منے میاں کی بیٹی ثوبیہ کی شبیہ ابھرنے لگی۔ کیا حالت تھی اس کے بدنصیب باپ اور بھائی اختر کی جب وہ اپنے گھر سے اچانک غائب ہو گئی تھی، پھر اس کے کچھ ہی دن بعد ثوبیہ کی لاش ملی تھی...... تو کیا، عاصمہ کی بھی...... تھوڑے دنوں بعد......“

”نن...... نہیں...... اللہ نہ کرے ایسا ہو۔“ میں چیخ اٹھا۔

یہ سب سوچ سوچ کر میرا اندر دھواں دھواں ہوئے جا رہا تھا۔

”کب تک ہم آہستہ بولیں گے بھائی جان؟ صبح تک یہ سب چلا چلا کر کہا جا رہا ہوگا...... ایک پھانسی کے سزا یافتہ اور قاتل غلام حسین کی جوان بیٹی گھر سے بھاگ گئی۔“

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

فہیم اپنے آپے میں نہیں آرہا تھا۔

میں نے اپنے کشیدہ پڑتے اعصاب اور تحمل پڑتے حواسوں کو معمول پر لانے کی عبث سی کوشش کرتے ہوئے اور اپنا ایک ہاتھ اس کی طرف اشارتاً اٹھاتے ہوئے بمشکل کہا۔

''فف.....فہیم! میرے بھائی..... سب ٹھیک ہو جائے گا، اس طرح پریشان اور غم و غصے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔''

''کیا اسی طرح ہی سب ٹھیک ہو جائے گا بھائی جان! جیسا کہ آپ کے کہنے پر اب تک سب ٹھیک ہو گیا؟'' وہ طنزیہ دکھ سے بولا۔ ''اسی سب ٹھیک ہونے کے انتظار نے ہی تو آج ہمیں یہ دن دکھایا کاش! آپ میری بات کو اتنا ہلکا نہ لیتے، کاش.....آپ اسی روز کوئی سخت قدم اٹھا لیتے تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔''

وہ یہ کہہ کر اور غصے سے اپنا پاؤں پٹخ کر کمرے سے نکل گیا، مجھ میں اسے آواز دینے کی بھی سکت نہ رہی تھی۔

میں چند ثانیے اسی طرح بستر پر گرا پڑا بیٹھا رہا، میرا حلق سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا۔ میں بھی ایک عام انسان تھا، روایتی انسانوں والی بعض کمزوریاں میرے اندر بھی ہو سکتی تھیں۔ کوئی دکھ کی خبر یا ایسا کوئی بحران مجھے بھی اندر سے توڑنے کا باعث بن سکتا تھا۔ تاہم میں نے کچھ سیکنڈوں تک گہرے گہرے سانس لیے اور پھر بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''فہیم.....فہیم! میرے بھائی! کہاں ہو تم؟''

اپنے بھائی کو پکارتے ہوئے میں کمرے سے نکلا مگر فہیم کی کوئی آواز مجھے نہ آئی تو میں نے لرزتی ٹانگوں کے ساتھ بہن عاصمہ کے کمرے کا رخ کیا۔

عاصمہ کا کمرا مجھے بھائیں، بھائیں کرتا محسوس ہوا۔ اس کے بستر کی چادر کی شکنیں بتا رہی تھیں کہ کچھ دیر پہلے یا شاید چند گھنٹوں پہلے یہاں سو رہی تھی۔ میں اب فہیم کو آوازیں دینے کی بجائے عاصمہ کو آوازیں دینے لگا۔

''عاصمہ..... بہنا..... عاصمہ بہنا.....! کہاں ہو تم؟''

ایسے نازک اور غیر یقینی سے حالات میں انسان کا دماغ باؤلا بھی ہو جاتا ہے۔ وہ خوش فہمیوں میں پڑ کر کچھ اور بھی سوچنے لگتا ہے، جیسا کہ میں اب سوچنے لگا تھا۔

''کیا خبر! عاصمہ ادھر ہی کہیں ہو..... باتھ روم میں ہو..... کسی کام سے یا کپڑے ڈالنے چھت پر چلی گئی ہو، یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ..... کسی اور کمرے میں ہو۔''

دل ہی دل میں یہی دعائیں مانگتا ہوا میں نے عاصمہ بہنا کی تلاش میں سارا گھر چھان مارا، چھت دیکھ لی، ایک ایک باتھ روم دیکھ لیا۔ دبی دبی آوازیں دے کر اسے پکارا بھی.....مگر کوئی جواب نہ ملا۔

مجھے اپنے حلق میں تھوہر اگتے محسوس ہونے لگے۔ میں نے پانی کے دو گلاس چڑھائے..... اپنے حواس بحال کرنے کی کوشش کی۔ کچھ سوچنے سمجھنے کا یارا حاصل ہوا تو میں نے غور کرنا شروع کر دیا۔

''ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ عاصمہ اتنا بڑا قدم نہیں اٹھا سکتی تھی۔ ابھی کل رات ہی تو میری اس سے اس نازک اور حساس موضوع پر بات ہوئی تھی اور اس نے پورے یقین سے کہا اور قدرے شرما کر کہا تھا کہ وہ ایسا کوئی قدم اٹھانے کا سوچ بھی نہیں سکتی ہے۔

نیز یہ کہ وہ جس لڑکے کو چاہتی تھی بقول اس کے وہ ایک شریف انسان تھا اور عنقریب شرعی طریقے سے اسے اپنانے اور رشتے وغیرہ کی بات چیت کرنے کے لیے اپنے والدین کو بھی ہمارے ہاں بھیجنے والا تھا تو پھر..... تو پھر یہ سب کیسے ہو گیا تھا؟''

میرا دل ہی کیا ذہن بھی یہ ماننے کو تیار نہ تھا کہ یہ سب کچھ ہو چکا تھا۔ قیامت سی قیامت گھڑی میرے سر پر مسلط ہو چکی تھی۔ اس کے پیچھے کچھ اور تھا، کیا تھا؟ اس کا کھوج لگانے کے لیے ایک وقت درکار تھا اور اسی بات پر مجھے ہول آرہا تھا کہ میرے پاس وقت صرف سورج کے ابھرنے تک کا تھا۔ اس کے بعد طرح طرح کے سوالات ابھرنا شروع ہو جاتے اور مجھے ہی ان کا جواب دینا تھا۔

رات کی کالی چادر بھاری سل کی طرح سرکتی محسوس ہو رہی تھی مگر اچھی بھی لگ رہی تھی کہ یہ سب کچھ ڈھانپے رکھتی ہے۔

مجھے ایک پل کے لیے بھی چین نہیں آرہا تھا۔ میری سانسیں پھول رہی تھیں۔ یہ دھیرے دھیرے سرکتا ہوا وقت مجھے کسی عفریت کی طرح اپنی جانب بڑھتا ہوا لگ رہا تھا، جیسے مجھے، اس گھر کو ہڑپ کرنے کے لیے بڑھا چلا آرہا ہو۔

میں کبھی اس کمرے میں جاتا تو کبھی دوسرے کمرے میں کبھی صحن میں آجاتا تو کبھی ٹہلنا شروع کر دیتا۔ ایسے نازک اور کڑے وقت میں مجھے اپنے بھائی فہیم کے ساتھ کی ضرورت تھی مگر وہ شاید بدنامی کے خوف سے اور لوگوں کے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

سوالات سے خوف زدہ ہوکر کہیں چلا گیا تھا۔ ایسے وقت، میں خود کو اس قدر تنہا محسوس کررہا تھا، جیسے میرے سواء دنیا میں اور کوئی تھا ہی نہیں..... میں کس کو بلاتا؟ کسے آواز دیتا کہ آؤ..... میری بہن رات کے اس پہر غائب ہوگئی ہے۔ اسے ڈھونڈو۔

میں صحن میں آگیا۔ سر اٹھا کر دیکھا۔ آسمان پر سپیدی سحر کی روشنی سی نمودار ہونے لگی تھی۔ وقت فجر کی اذان ابھری اور مؤذن کی روح پرور آواز سے مجھے سکون ملا۔

''اللہ اکبر!'' اللہ سب سے بڑا ہے۔

''بے شک میرے مالک! میرے خالق تو سب سے بڑا ہے۔ میری مدد فرما۔''

بے اختیار میرے دریدہ دہن سے یہ دعائیہ کلمات نکلے تھے۔ مجھے کچھ دلی سکون کا احساس ہوا۔ اندر راحت اترتے ہی میں نے سوچنا شروع کیا۔

یہ سب کیا ہوسکتا تھا؟ کون کرسکتا تھا؟

اچانک میرے ذہن میں ایک خیال کلک ہوا۔

''اغوا!''

کون لوگ ہوسکتے تھے یہ؟ میرے دشمن؟ یا پھر وہی لوگ جنہوں نے خورشید خاں کی معصوم بیٹی کے ساتھ بھی یہی کیا تھا۔ خورشید خاں کے دشمن میری اور میرے دشمن خورشید خاں کے نہیں ہوسکتے تھے تو کیا یہ کوئی اور لوگ تھے؟ کیا ایک ہی گروہ تھا۔ یا پھر یہ محض ایک اتفاق ہی تھا کہ خورشید خاں کی بیٹی کے قاتل اور لوگ تھے اور عاصمہ بہنا کو اغوا کرنے والے میرے دشمن۔

ایسے میں مجھے اس راشی پولیس افسر راجا دلاور اور سیٹھ ستار کی وہ دھمکیاں بھی یاد آنے لگی تھیں، جس کا اعادہ وہ میرے سامنے بار بار کرتے رہے تھے۔

''مت بھولو، نعمان! کہ تمہاری ایک جوان بہن بھی ہے۔''

اور واقعی میں یہ بات بھول گیا تھا۔ اب یاد آرہی تھی۔ آہ..... کیا ہوسکتا تھا اب۔

صحن میں سنک لگا ہوا تھا، وہاں جاکر میں نے اپنے چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے۔ اپنے اندر کی ہلچل کو پُرسکون کیا، دماغ میں ہونے والی یلغار کو سر جھٹک کر رد کیا مگر سانپ کی طرح یہ رینگتا، گزرتا اور پلٹتا ہوا وقت مجھے دوبارہ ہلکان کرنے لگتا تھا۔ صبح کاذب نمودار ہونے لگی تھی۔ آسمان سیاہ سے سپید ہورہا تھا اور میں جیسے فریاد کرنے لگا کہ کاش! یہ وقت ادھر ہی رک جائے، اسے موت آجائے۔ کاش! ابھی دروازہ کھلے اور عاصمہ بہن اندر داخل ہوکر مجھ سے ''بھائی جان'' کہہ کر لپٹ جائے۔

میں نے یہ سوچ کر کئی بار منہ اندھیرے دروازہ بھی کھولا تھا۔ باہر سنسان پڑی گلی کے دونوں طرف بھی جھانکا تھا۔

جب صحن میں روشنی پھیلنے لگی تو میں کوئی بیسویں بار دروازے کی طرف بڑھا ہوں گا۔

دروازہ کھولا، باہر جھانکا۔ دودھ والے کی موٹر سائیکل کو کھڑکھڑاتے ہوئے آتے دیکھا اور ایک دم اپنے چہرے پر تفکر، پریشانی اور تشویش آمیز آثار سے مبرا کرنے کی سعی کی۔

موٹر سائیکل کے دونوں طرف دودھ کے بھاری اور بڑے کین لدے جھول رہے تھے۔ مجھے تو اب اس دودھ والے سے بھی عجیب طرح کا خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ اسے دیکھ کر میں ایک دم اندر ہوگیا اور دروازہ بھی بند کردیا۔ وہ ہارن دینے لگا۔ مجھے ایکا ایکی یوں لگا جیسے اس نے میری کوئی چوری پکڑلی ہو۔ میں جلدی سے پلٹا اور رسوئی میں جا کر پتیلی نکال لایا۔ میں نے دروازہ کھول دیا اور پتیلی آگے کردی تاکہ وہ یہ نہ سمجھے کہ میں اسے دیکھ کر دروازے کے پیچھے چھپ گیا تھا۔

''ارے..... صاحب جی! لگتا ہے آج صبح سویرے ہی چائے کی طلب نے پریشان کردیا ہے آپ کو..... اسی لیے آج باجی کی جگہ آپ تیار کھڑے ہیں۔''

وہ بڑے من موجی لہجے میں بولا اور بائیک پر بیٹھے بیٹھے وہ گھوم کر پیتل کے پیمانے سے دودھ نکالنے لگا۔ پتیلی میری طرف بڑھائی تو وہ قدرے چونک کر اور اپنی بھنویں سکیڑ کر بولا۔ ''صاحب جی! خیریت تو ہے؟ آپ پریشان نظر آرہے ہیں، کہیں خدانخواستہ! باجی کی طبیعت تو خراب نہیں؟''

لاکھ اپنے چہرے کی پریشانی چھپانے کے باوجود اس نے تاڑ لی تھی۔ بھلا ہو اس کا کہ سبب بھی اس بھلے مانس نے خود ہی بتا دیا۔

''ہوں..... ہاں..... ہاں بھائی! بے چاری کو رات سے ہی بخار ہے۔'' میرے منہ سے الفاظ پھسلے۔

''اللہ خیر کرے گا۔'' وہ یہ کہہ کر اگلے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے ایک دم دروازہ بند کردیا۔ جیسے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

تھوڑی دیر اور دروازے پر رہا تو دھر لیا جاؤں گا۔

دودھ کی پتیلی میں نے کچن میں ڈھانپ کر رکھ دی۔

وقت تیزی سے گزرنے لگا اور میرے دل و دماغ کی حالت ایک بار پھر غیر سی ہونے لگی تھی۔

صبح ہو رہی تھی۔ لوگ جاگ رہے تھے۔ باہر گاڑیوں اور لوگوں کی باتوں کی آوازیں دھیرے دھیرے گونجنے لگی تھیں۔ اکیلا گھر مجھے کاٹنے کو دوڑنے لگا۔ عاصمہ نہیں لوٹی، پتا نہیں کہاں تھی وہ بے چاری! ایک جوان لڑکی کا ہمارے سماج میں کیا وقار ہوتا ہے، کیا حیثیت ہوتی ہے بھلا۔ محض ایک کچے گھڑے کی مثال، ایک ذرا سی خراش ایک لکیر جیسے شفاف آئینہ ہو اور اس پر بال برابر بھی داغ پڑ جائے۔ کئی سوال اٹھنا شروع ہو جاتے ہیں۔

ایک جوان بہن کے رات سے غیاب پر میرے دل و دماغ میں طرح طرح کے اندیشے اور وسوسے اٹھ رہے تھے، کالے ناگ تھے فکر و تشویش کے، جو مجھے رہ رہ کر ڈس رہے تھے۔ وہ کہاں تھی، کس حال میں تھی۔ رات بھی بیت چکی تھی۔ اب تک اس کے ساتھ کیا کچھ ہو گیا ہوگا۔ اس سے آگے کا تصور ہی میرے لیے جاں گسل تھا۔ میرا سینہ گھٹنے لگا، دماغ شل ہونے لگا وجود تھا کہ وسواں میں تحلیل ہو رہا تھا۔

میں نے سوچا گھر سے باہر ہی نہ نکلوں، پھر سوچا، آخر ایسا کب تک چلے گا، ایسے تو اور بھی شبہ ہوگا لوگوں کو اور کون سا لوگ میرے باہر نکلتے ہی سوالات کی بوچھاڑ کر دیں گے، ابھی لوگوں کو بھلا معلوم ہی کیا تھا مگر فہیم کدھر چلا گیا تھا؟ اس کے بارے میں قیاس آرائیاں، وقت سے پہلے کوئی گل کھلا سکتی تھیں۔

مجھے سب کچھ معمول کے مطابق ہی کرنا چاہیے تھا۔ بہت سے کام نمٹانا تھے مجھے۔ پہلا کام تو اس سولی پر لٹکنے کا ہی رہ گیا تھا کہ اپنی جوان بہن عاصمہ کی تلاش کے سلسلے میں کچھ کروں۔

اب ایک حل تھا، چاچا انور شاہ۔ وہی ہمارے بزرگ اور بڑے تھے۔ سب سے پہلے انہیں ہی آگاہ کرنا ضروری تھا۔

میں نے غسل کیا، کپڑے پہنے اور بغیر ناشتے وغیرہ کے باہر نکلا، گاڑی میں بیٹھا اور لاری اڈے تک پہنچنے تک مجھے کچھ نہیں احساس ہوا کہ میں خود چل کر یہاں تک پہنچا ہوں۔

اس وقت میرے دل میں و دماغ میں وہ سارے حالات اور وہ امور جو میں نے نمٹانے تھے مجھے یاد نہیں رہے تھے۔ صرف اور صرف عاصمہ کا خیال تھا میرے اندر اور اسی سے متعلق سوچیں تھیں میرے ذہن میں۔

میں اپنے کمرے میں آ کر بیٹھ گیا۔ دوسو نے مجھے چائے دی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''شاہ صاحب آئے ہیں۔''

''جی نہیں، سائیں! ابھی تو نہیں آئے۔'' اس نے جواب دیا۔

''اچھا!'' میرے منہ سے ہولے سے برآمد ہوا۔ میں جس قدر پریشان کن بے چینی کے ساتھ چاچا انور شاہ کا انتظار کر رہا تھا اس وقت وہ میں ہی جانتا تھا۔ حالانکہ وہ مجھ سے پہلے ہی یہاں موجود ہوتے تھے اور میں انہیں سلام کرنے کے بعد ہی اپنی سیٹ پر بیٹھتا تھا مگر آج کیا بات تھی کہ سیدھا اپنے ہی کمرے میں گھسا چلا آیا تھا۔

کام میں میرا کیا جی لگنا تھا۔ میں تو چاچا انور شاہ کا ہی انتظار کیے جا رہا تھا اور نصف گھنٹے میں کوئی دس بار دوسو سے پوچھ چکا تھا ان کی آمد کے بارے میں اور ہر بار اس نے نفی میں اپنا سر ہلایا تھا، ایک بار تو جھلا کر میں نے اس کو بھی بری طرح ڈانٹ دیا۔

''کیا تمہارے منہ میں زبان نہیں ہے؟ جو تم ہر بار اس طرح منہ سے کچھ پھوٹے بغیر انکار میں سر ہلا دیتے ہو؟''

میرے اس طرح اچانک غصے میں آنے سے وہ بے چارہ بوکھلا گیا۔ وہ اپنی صفائی میں کچھ بولنا چاہتا تھا کہ میں نے اسے بری طرح جھڑک کر اور یہ کہہ کر کمرے سے نکال دیا کہ جیسے ہی چاچا انور شاہ آئیں مجھے وہ بتائے۔

اس غریب کے لیے بھی یہ پہلا موقع تھا شاید کہ میں نے اسے یوں ڈانٹ پلا دی تھی۔ اس لیے اس کے چہرے پر کچھ حیرت کے آثار بھی میں نے محسوس کیے تھے۔

میں نے انور شاہ کے سیل فون پر بھی ان سے رابطہ کیا تھا جو مسلسل آف جا رہا تھا۔ مجھے ان پر بھی غصہ آنے لگا۔ پتا نہیں کہاں تھے اور سیل فون بھی آف کر رکھا تھا۔

میں نے فہیم کے سیل پر بھی رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ رنگ تو جا رہی تھی مگر وہ کال ریسیو نہیں کر رہا تھا، دوبارہ کرنے پر اس نے کال ہی میری ڈسکنکٹ کر ڈالی تھی۔

میں کرسی سے پشت ٹکائے مضطربانہ انداز میں ہلنے لگا، کبھی انگلیوں سے میز بجانے لگتا، اچانک میرے ذہن

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

میں کالیا کا خیال آیا۔ چاچا انور شاہ کے بعد میں اسی پر زیادہ بھروسا کرتا تھا۔

''کالیا! میرے یار! مجھے اس وقت تجھ سے بہت ضروری بات کرنی ہے، تو جلدی میرے آفس میں آجا!'' میں نے چھوٹتے ہی کہا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا تھا مگر میں نے رابطہ ہی منقطع کر دیا، مجھے یقین تھا، میرے اس طرح اچانک رابطہ منقطع کرنے پر وہ بھی پریشان ہوگیا ہوگا۔

اچانک میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا، جو وسیع و عریض میدان میں کھلتی تھی۔ ایک کار مجھے وہاں حرکت کرتی نظر آئی تھی، جسے پہچان کر میری کنپٹیاں سلگ اٹھیں۔ یہ کار عزیر خان اور اس کے دوست شاہ نواز کی تھی۔

عزیر خان کو دیکھ کر میری آنکھوں کے سامنے منے میاں کی مقتول بیٹی ثوبیہ کا چہرہ رقصاں ہوگیا۔ ثوبیہ کے بھائی اختر کی شکل ذہن میں در آئی، اختر کی بہن کے تعلقات اسی نوجوان عزیر جان کے ساتھ تھے اور جس کی بائیو ڈیٹا میں نے یہ جاننے کے بعد کہ وہ ثوبیہ کا کلاس فیلو تھا، خود یونیورسٹی جا کر نکلوائے تھے۔ اس لیے مجھے اسی پر شبہ تھا کہ ثوبیہ کے قتل کا عزیر جان سے ضرور تعلق تھا۔ پھر میرے مخبر سدو بھائی نے بھی کچھ ایسے شواہد مجھے فراہم کیے تھے، وہ زیادہ تو کامیاب نہ ہو سکا تھا تاہم اتنی معلومات بھی میرے لیے کافی تھیں۔ جانے کیوں مجھے لگا کہ عاصمہ بہنا کے کل رات اچانک گھر سے غیاب کا تعلق بھی اسی شخص سے ہی ہو سکتا تھا۔

میں اپنی جگہ سے اٹھا اور کمرے سے باہر نکلا۔ میرے اندر ایک جنگ کی سی کیفیت اور دماغ پک رہا تھا۔

میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس طرف بڑھ گیا جہاں ایک مستطیل عمارت بنی ہوئی تھی۔ یہ گڈز کی عمارت تھی جو ہم نے انہیں ٹھیکے پر دے رکھی تھی۔ وہ کار سے اتر کر اندر داخل ہو چکے تھے۔

کہتے ہیں انسان پریشان ہو اور غصے میں بھی تو اس سے سیدھا کام بھی الٹا ہو جاتا ہے، یہی کچھ شاید میں کرنے جا رہا تھا۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے اب تک ثوبیہ کے قاتل کا کھوج لگانے میں احتیاط کے نام پر کچھ زیادہ ہی تساہل برتا تھا۔ اگرچہ اس کے ٹھوس ثبوت کے بغیر مجھے اس کے شواہد ملے تھے مگر میں بھی کیا کرتا۔ کوئی ایک مسئلے میں تو گھرا ہوا نہ تھا۔ یہاں تو مسائل کے طومار تھے۔ کس کس کو میں دیکھتا۔

اندر ان تینوں دوستوں نے اپنے ذاتی خرچے سے اچھی خاصی سیٹنگ کی ہوئی تھی۔ ایئر کنڈیشن تھا، گیس ہیٹر بھی تھا۔ فرنیچر بھی بیش قیمت تھا۔ گویا یہاں بیٹھے یہ تینوں خوب ٹھسے کے ساتھ بزنس کر رہے تھے، یہ جگہ ہم نے ہی انہیں ٹھیکے پر دی تھی اور ہمارا اپنا آفس پرانے طرز کی تفسیر بنا ہوا تھا مگر مجھے یہی پسند تھا، میرا مزاج ذرا کلاسک کریز کا تھا۔

میں اندر داخل ہوگیا۔ سامنے ہی ان کا کمرا تھا۔ انہوں نے دو تین ملازم بھی رکھے ہوئے تھے، ظاہر ہے وہ مجھے بھی پہچانتے تھے، اسی لیے جھٹ سے مجھے سلام دیا۔

میں نے کمرے میں قدم رکھا تو دونوں کو ایک دوسرے سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے پایا۔ میرے چہرے پر گہری سنجیدگی کھنڈی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ ایک دم چپ سے ہوگئے اور میری طرف دیکھنے لگے۔ میں بہت کم ہی یہاں آتا تھا۔ یہی وجہ تھی، ان دونوں کو حیرت سی ہوئی تھی۔

''آیئے نعمان صاحب! کیسے آنا ہوا؟ خیریت تو ہے ناں؟ آپ کچھ پریشان سے نظر آرہے ہیں۔''

عزیر خان نے میری طرف دیکھ کر کہا اور میرے استقبال کے لیے کھڑا بھی ہوگیا مگر شاہ نواز اسی طرح اس کے سامنے والی کرسی پر ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھا رہا تھا۔

میں نے بھی صرف عزیر خان سے ہی ہاتھ ملانے پر اکتفا کیا اور اس کے چہرے پر اپنی کھنڈی ہوئی نظریں گاڑتے ہوئے بولا۔ ''مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا تھیں۔''

''ہاں! بیٹھو، کیا بات ہے؟'' اس نے ہاتھ ملانے کے بعد اپنی کرسی سنبھالتے ہوئے کہا اور مجھے بھی ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ یہ کرسی شاہ نواز کے ساتھ ہی دھری تھی۔ میں اس پر بیٹھ گیا اور ایک نگاہ قریب بیٹھے شاہ نواز پر ڈالی اور عزیر خان سے بولا۔ ''بہتر ہوگا کہ یہ بات تنہائی میں کی جائے۔''

وہ میرا مطلب سمجھ کر ہنسی والے انداز میں بولا۔ ''یہ میرا گہرا دوست ہی نہیں رازدار بھی ہے، تم بے فکر ہو کر اس کے سامنے کوئی بھی بات کر سکتے ہو۔''

''ہوں..... ہونا بھی چاہیے۔'' میں نے کہا۔ انداز میرا طنزیہ ہی تھا۔ اس کے بعد میں نے عزیر خان کے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کرتے ہوئے سوال کیا۔ ''کیا تم ثوبیہ کو جانتے ہو؟''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

بلاشبہ میرا یہ سوال اس کے لیے اچانک ہی نہیں غیر متوقع بھی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ پہلے تو گڑبڑا سا گیا، پھر ایک الجھی ہوئی سی نگاہ اپنے دوست شاہ نواز کے چہرے پر ڈالی، خود وہ بھی اس سوال پر قدرے چونک کر میرا چہرہ تکنے لگا تھا۔

''مم..... میں سمجھا نہیں تمہارے اس سوال کا مطلب؟'' عزیر خان نے میری طرف دیکھ کر کہا تو میں بدستور چبھتی ہوئی سی نگاہ اس پر مرکوز کیے ہوئے ہلکے طنز سے بولا۔ ''عزیر صاحب! میں نے تو بہت صاف اور واضح لفظوں میں آپ سے پوچھا ہے کہ آپ کسی ثوبیہ نامی لڑکی کو جانتے ہیں؟ جو محلہ کریم الدین مسجد کی رہائشی تھی۔''

''میں آپ کو کیا جواب دوں اس سوال کا؟'' وہ کچھ سنبھلتے ہوئے بولا۔ ''آخر آپ کا مطلب کیا ہے یہ سوال پوچھنے کا؟''

''آپ پریشان کیوں ہوگئے ہیں، عزیر صاحب؟ میں نے تو آپ سے سوال پوچھا ہے، آپ بس مجھے ہاں یا نہ میں جواب دیں کہ آپ اس لڑکی کو جانتے ہیں یا نہیں؟''

وہ ایک بار پھر میری بات کے جواب میں کچھ بولنے کی بجائے میز کی دراز سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر نکال کر اس میں سے ایک سگریٹ نکالنے لگا تو اس کا دوست شاہ نواز میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''شاید یہ سوال میرے دوست کے لیے کچھ ذاتی نوعیت کا لگتا ہے اور میرا خیال ہے کہ ہم یہاں کاروبار کرنے کے لیے بیٹھے ہیں ایک دوسرے کی ذاتی زندگیوں میں جھانکنے کے لیے نہیں۔''

اس کی بات پر میں نے تیز سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''شاہ نواز صاحب! اگر کوئی لڑکی، جس کا ریپ اور بعد میں مرڈر ہوجائے اور وہ میرے محلے سے تعلق بھی رکھتی ہو اور تفتیش کے بعد یہ بات ظاہر ہونے لگے کہ وہ بدنصیب لڑکی ثوبیہ نہ صرف عزیر خان کی کلاس فیلو رہ چکی ہے بلکہ اس کی دوست بھی تھی تو کیا میرا پوچھنے کا اتنا حق بھی نہیں بنتا جبکہ وہ مقتولہ جس کی دوست تھی وہ یہاں کام بھی کرتا ہو؟''

میرے پے تلے جواب نے شاہ نواز کو ہی نہیں بلکہ عزیر خان کو بھی تھوڑا پریشان سا کر دیا تھا۔ میں اپنی بات کا ردِعمل بڑے غور سے ان کے چہروں سے جھلکتے ہوئے تاثرات سے اخذ کرنے لگا۔

جزائر کیمین Cyman Islands

مغربی کیریبین میں تین بڑے اور متعدد چھوٹے جزائر کا مجموعہ۔ اس کے شمال میں کیوبا اور جنوب مشرق میں جمیکا ہے۔ رقبہ 100 مربع میل یا 160 مربع کلومیٹر، زبان، انگریزی، مذہب، عیسائیت دارالحکومت، جارج ٹاؤن، ویسٹ بے دوسرا بڑا شہر ہے۔ برطانیہ کا زیر اثر ایک خود مختار علاقہ ہے۔ اس کا انتظام گورنر اور ایگزیکٹو کونسل چلاتی ہے۔ اس کی اپنی دستور ساز اسمبلی ہے۔ سبزیاں اہم زرعی پیداوار ہیں۔ سمندری کچھوا بھی پالا جاتا ہے۔ سیاحت آمدنی کا بڑا ذریعہ ہے۔ کرسٹوفر کولمبس آئی لینڈز ڈالر، 1503ء میں کولمبس نے سیاحت کی 1670ء میں برطانیہ نے قبضہ کرلیا۔ 1962ء میں برطانیہ کی نوآبادی بنالیا گیا۔

کینبرا Canberra

آسٹریلیا کا دارالحکومت۔ جنوب مغربی آسٹریلیا میں واقع ہے۔ اس جگہ کا انتخاب 1908ء میں ہوا۔ 1913ء میں اس شہر کی بنیاد رکھی گئی۔ یہ آسٹریلیا کا دوسرا دارالحکومت ہے۔ پہلا دارالحکومت ملبورن تھا۔ 1927ء میں یہاں پہلی بار پارلیمنٹ کا اجلاس ہوا۔ دوسری جنگ عظیم میں عارضی طور پر دارالحکومت کو پھر ملبورن میں تبدیل کردیا گیا۔ یہاں ایئرپورٹ، ریلوے اسٹیشن، دو یونیورسٹیاں 1946-1989ء اور پارلیمنٹ ہاؤس 1988ء بھی ہیں۔

کیمیائے سعادت

امام غزالی 1058-1111ء نے اسی سے زیادہ کتابیں تحریر کی ہیں۔ ان میں سے احیائے العلوم کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ اسی کتاب کا خلاصہ کیمیائے سعادت ہے، جس میں عبادات، مہلکات، منجیات پر مبسوط اور لطیف تبصرہ ہے۔ علاوہ اس کے اس میں قرون وسطیٰ تک اسلامی فکر و نظر کا کامل لب لباب بھی دیا گیا ہے۔ اس کی زبان بہت سلیس ہے اور یہ دور سلاحقہ کی بہترین نثری کتابوں میں سے ہے۔

مرسلہ: شاہینہ امتیاز ڈی جی خان

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''تب پھر میرا خیال ہے، یہ سوال آپ کو نہیں بلکہ پولیس کو ہی مجھ سے پوچھنا چاہیے تھا۔'' دوسرے ہی لمحے عزیر خان نے سگریٹ سلگانے کے بعد ایک گہرا کش لگاتے ہوئے رکھائی سے کہا تو میں اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور جاتے جاتے بولا۔

''اچھی بات ہے، پولیس بھی آپ سے یہ سوال ضرور پوچھنے والی ہے لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ پولیس یہاں آئے، اس سے ہماری بدنامی ہوسکتی ہے جس کا اثر ہمارے معاہدے پر بھی پڑسکتا ہے۔''

یہ کہہ کر میں وہاں سے چلا آیا اور اپنے کمرے میں آ کر ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا کر حاجی کریم بخش صاحب سے رابطہ کیا اور انہیں گرین سگنل دے دیا۔ میں پہلے ہی انہیں وہ ساری معلومات دستاویزات کی صورت میں دے چکا تھا جو میں نے یونیورسٹی سے حاصل کی تھیں اور ان لڑکوں کی بھی جن کے علم میں تھا کہ عزیر اور ثوبیہ کے بیچ گہری دوستی جیسے روابط تھے، نیز اختر کا بیان بھی ریکارڈ کروانا تھا۔

حاجی صاحب نے مجھے تسلی دی کہ وہ اسی وقت منے میاں اور ان کے بیٹے اختر کو لے کر متعلقہ تھانے پہنچ رہے ہیں۔

اس کے بعد میں نے دوسو سے ایک بار پھر چاچا انور شاہ کا پوچھا۔ اس بار اس نے نفی میں سر ہلانے سے گریز کرتے ہوئے منہ سے بتایا کہ وہ ابھی تک نہیں آئے ہیں۔ میں نے ایک بار پھر ان سے فون پر رابطہ کیا تو اس بار وہ آن ملا مگر رنگ جاتی رہی کسی نے ریسیو نہیں کیا۔ میں ہونٹ بھینچ کر کچھ سوچنے لگا تو اسی وقت کالیا کا فون آگیا۔

''خیریت ہے جگری؟ تیرا فون آرہا تھا، میں اٹینڈ نہیں کرسکا، باتیک پر تھا۔ ویسے میں نے ایئر فون تو لگا رکھا ہوتا ہے۔ پر کسی ٹٹے کے ساتھ بحث کررہا تھا، ہیلمٹ جو نہیں پہن رکھا تھا میں نے، بڑی مشکلوں سے اس کی مٹھی گرم کرکے چھوٹا ہوں۔'' اس نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

''کالیا تم میرے پاس آسکتے ہو؟'' میں نے استدعا کی۔

''ابے لے..... جگری! ابھی آجاتا ہوں، ویسے خیریت تو ہے ناں؟''

''بس تو آجا فوراً۔'' میں نے یہ کہتے ہوئے رابطہ منقطع کردیا۔ ابھی سیل فون میز پر رکھا ہی تھا کہ اچانک میری نظر کھڑکی سے باہر پڑی۔

میں نے ان دنوں کو باہر نکلتے دیکھا۔ دونوں نے دھوپ کے سیاہ چشمے لگا رکھے تھے اور بیش قیمت کاٹن بوسکی کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ شاہ نواز میرے کمرے کی طرف ہی تکے جارہا تھا جبکہ عزیر خان اپنے سیل فون پر کسی سے بات کرنے کے دوران اپنی کار کا دروازہ کھول رہا تھا۔ پھر دونوں اس میں سوار ہوئے اور اگلے ہی لمحے ان کی کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھی اور گیٹ سے نکلتی چلی گئی۔ میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ ہویدا تھی، یہی وہ وقت تھا جب میں نے کالیا کو بائیک پر اسی گیٹ سے اندر داخل ہوتے دیکھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ میرے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ بہ غور میرا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے عاصمہ بہن والے سانحے سے آگاہ کیا تو اس کا چہرہ ایک دم دھلے ہوئے لٹھے کی طرح سفید پڑ گیا۔

''ابے لے، جگری! یہ کیا کہہ رہا ہے تو؟ مجھے یقین نہیں آرہا ہے، لل..... لیکن یہ کک..... کیسے ہوسکتا ہے؟'' وہ اٹک اٹک کر بولا۔

''یہ ہوچکا ہے کالیا! میری خود سمجھ میں نہیں آرہا ہے، بس یوں سمجھو میں نے بڑی مشکل سے اپنے دل و دماغ پر اس وقت قابو پا رکھا ہے۔''

''پولیس کو تو ابھی تم نے مطلع نہیں کیا ہوگا؟'' اس نے پوچھا۔ میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ بھی سمجھتا تھا کہ یہ معاملہ اتنا حساس تھا کہ سوچ سمجھ کر ہی قدم اٹھایا جاسکتا تھا۔ وہ بولا۔

''نہیم بھائی کے رویئے پر مجھے بہت افسوس ہوا ہے، وہ پڑھا لکھا نوجوان ہے اسے سمجھداری سے کام لینا چاہیے تھا، ایسے نازک موقع پر اس کا یوں گھر چھوڑ کر چلے جانا ٹھیک نہیں تھا۔'' اس کے بعد کچھ سوچ کر دوبارہ مجھ سے بولا۔ ''اللہ عاصمہ بہن کی عزت اور جان محفوظ رکھے، تم نے اس کے سیل فون پر.....''

''کیا تھا رابطہ عاصمہ کے سیل فون پر..... حسب توقع وہ بند ملا تھا۔''

''سچی بات کہوں گا جگری! یہ معاملہ گھر سے بھاگنے کا ہرگز نہیں ہوسکتا..... عاصمہ بہن کبھی بھی ایسی حرکت نہیں کرسکتی، یہ سو فیصد اغوا کا معاملہ ہے۔''

''کسی طرح اس لڑکے کا پتا چل جائے، جس سے عاصمہ باتیں کیا کرتی تھی، تو بھی بہت کچھ ہوسکتا ہے۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''تو نے اس لڑکے کو دیکھا ہے؟''

''یہی تو مشکل ہے، میں نے آج تک اسے نہیں دیکھا۔'' میں نے کہا۔ ''البتہ عاصمہ نے بتایا تھا کہ وہ بہت جلد اپنے والدین کو گھر لانا چاہتا ہے۔''

''تب پھر میرا خیال ہے کہ وہ خود ہی عنقریب تم سے رابطہ کرے گا اور اگر ایسا ہوا تو سمجھ لینا اس لڑکے کا کوئی قصور نہیں..... معاملہ کچھ اور ہے۔''

کالیا نے جیسے فوراً حالات کا تجزیہ کر ڈالا۔ اس کی بات میں وزن تھا۔ اس لیے میں نے اسے عزیر خان کی گفتگو سے آگاہ کر دیا۔ کالیا یہ سن کر چند ثانیے گہری خاموشی میں مستغرق رہا اس کے بعد بولا۔ ''جگری! یہ تم نے اچھا کیا، انہیں بھی مصیبت میں پڑنا چاہیے اور میرا خیال ہے تم ان سے اسی بہانے جان چھڑا لو اور ثوبیہ والا کیس ان کے خلاف مضبوط کرنے کی کوشش کرو، رہی بات عاصمہ بہن کی گمشدگی کی تو اس سلسلے میں تم اپنے چاچا انور شاہ سے بھی مشورہ کر لو لیکن میرا تو مشورہ یہی ہوگا کہ ہمیں کسی ذمے دار پولیس آفیسر کو اعتماد میں لے کر عاصمہ بہن کی گمشدگی کی رپورٹ کروا دینی چاہیے۔ تاخیر اچھی نہیں ہوگی۔''

میں نے پورے دھیان سے کالیا کی بات سنی تھی۔ وہ جو کہہ رہا تھا، میرے دل و دماغ میں بھی یہی کچھ تھا۔ اب صرف چاچا انور شاہ سے بات کرنا باقی رہ گیا تھا کیونکہ ان کے علم میں تو یہ سب باتیں لانا از بس ضروری تھا۔

میں اور کالیا تھوڑی دیر تک تبادلہ خیال کرتے رہے، اس کے بعد میں نے اس سے کہا کہ وہ اسپتال جا کر ایڈووکیٹ زنیرہ کی خیریت لے اور عارف مچھندر والے کیس کے سلسلے میں ثبوت اکٹھے کرنے کی کوشش کرے، نیز اس کا تعلق زنیرہ کے ایکسیڈنٹ سے جڑتا ہے لہٰذا جو جلا ہوا ٹرک پولیس کی کسٹڈی میں ہے اس کے مالک کا پتا کروا کر فوراً مجھے مطلع کرے۔ ابھی وہ مجھ سے رخصت ہونے ہی لگا تھا.... کہ چاچا انور شاہ بھی آ گئے۔ میں نے انہیں ساری بات سے آگاہ کر دیا۔ جسے سن کر وہ ایک دم سکتے میں رہ گئے۔

''ہمیں فوراً عطا محمد صاحب سے مدد لینا ہوگی اس سلسلے میں۔ وہ ایک معتبر شخصیت ہیں اور ان کی ضرور پولیس افسروں سے جان پہچان ہوگی۔''

''نہیں چاچا! یہ کام ہم خود ہی کریں گے۔'' میں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''آپ یہاں کا کام سنبھالے رکھیں اور آنکھیں کھلی رکھیں، میں نے عزیر خان اور اس کے دوست شاہ نواز کو ایک بے چینی میں ڈال دیا ہے۔ دیکھیں آگے کیا ہوتا ہے۔ اس کے مطابق ہی اس بارے میں کوئی آئندہ کا لائحہ عمل تیار کریں گے۔ میں ابھی کالیا کے ساتھ جا رہا ہوں۔''

یہ کہہ کر میں اپنی گاڑی میں سوار ہو گیا۔ کالیا نے اپنی بائیک وہیں لاری اڈے میں ہی چھوڑی اور میرے ساتھ روانہ ہو گیا۔

ہم سب سے پہلے اسپتال پہنچے اور ایڈووکیٹ زنیرہ سے ملے۔ اس کی طبیعت کافی بہتر ہونے لگی تھی۔ سر کی چوٹ کا زخم مندمل ہونے لگا تھا مگر ابھی انہیں کچھ دن اور یہاں رہنا تھا۔

ادھر مجھے فرحانہ کے بھی فون پر فون آ رہے تھے، مجھے یاد آیا کہ میں نے اس سے ملنے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ مگر حالات نے یکا یک پلٹا کھایا تھا جس کی وجہ سے میں الجھ گیا کیونکہ ضروری کام ایک ساتھ آن پڑے تھے، سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کون سے کام میں پہلے ہاتھ ڈالا جائے۔

زنیرہ سے ابھی میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی، جس سے وہ پریشان ہوتی۔ وہاں سے میں کار میں آ بیٹھا اور یہی فیصلہ کیا کہ پہلے فرحانہ کے ہاں چلا جائے۔ وہاں زیادہ دیر نہیں لگنی تھی۔ پن ٹائی سے متعلق ایک اہم کلیو ہمارے ہاتھ لگا تھا اور اسے ہم نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔

میں نے روانگی سے قبل فرحانہ کو فون کر دیا تھا کہ میں اسی کی طرف آ رہا ہوں۔

اس کی رہائش گاہ پہنچ کر میں کار سے اترا اور کالیا کو اسی میں بیٹھے رہنے کا کہا۔

اندر پہنچا تو فرحانہ میری ہی منتظر تھی۔ اس کے قریب صوفے پر ایک چرمی پاؤچ سا پڑا ہوا تھا۔ وہ عام گھریلو لباس میں تھی اور اس وقت سادگی کی تصویر بنی ہوئی تھی تاہم اس نے ہلکا پھلکا میک اپ کر رکھا تھا اور اس کا عام نظر آنے والا گھریلو لباس بھی اگرچہ کم قیمتی نہ تھا۔ طبقاء امراء کی یہی مجبوری ہوتی ہے کہ باتھ روم جانے والا لباس اور جوتی تک ان کی امارت کے مطابق ہوتی ہے۔

بہرکیف..... میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''رانا صاحب کدھر ہیں؟''

''پاپا! ادھر ہی ہیں۔ ابھی آ جاتے ہیں، آپ یہی ظاہر

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کرنا پاپا کے سامنے کہ آپ یہاں طے شدہ پروگرام سے نہیں آئے ہیں۔''

میں نے جواباً ہلکی مسکراہٹ سے کہا۔ ''یہ بات بھلا میں کیسے بھول سکتا ہوں جس کی خود میں نے آپ کو بھی تلقین کر رکھی ہے۔''

تھوڑی دیر میں رانا بشیر بھی آ گیا۔ اس نے گرے کلر کا سفاری سوٹ پہن رکھا تھا اور ہاتھ میں بریف کیس پکڑا ہوا تھا۔ صاف لگتا تھا کہ وہ دفتر جانے کی تیاری میں تھا، مجھے دیکھتے ہی وہ چونک پڑا۔ میں نے کھڑے ہو کر اسے سلام کیا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس نے طوعاً و کرہاً ہی مجھ سے ہاتھ ملایا تھا اور اسی انداز میں پوچھا۔

''ارے بھئی خیریت ہے، آج صبح ہی صبح کیسے آنا ہو گیا؟''

''جی ہاں! بہت دن ہو گئے تھے..... اور.....'' میری بات کو فرحانہ نے درمیان میں ہی اچک لیا اور مجھ سے بولی۔

''اچھا ہوا آپ آ گئے، نعمان صاحب! میں آج بہت اہم چیز دکھانے والی تھی جو میں نے کل ہی تلاش کی ہے۔''

اس کی بات پر رانا بشیر قدرے چونک کر اس کا چہرہ تکنے لگے پھر پوچھا۔

''تم نے مجھے بتایا نہیں، ایسی کیا شے تم نے تلاش کی ہے؟''

میری بھانپتی ہوئی نظریں رانا بشیر کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ جواب میں فرحانہ باپ سے بولی۔ ''پاپا! کل رات ہی میں نے تلاش کی تھی۔ ایک تصویر ہے، البم سے ملی تھی۔ بس! یوں سمجھیں ایک مضبوط کلیو ہاتھ لگا ہے۔''

''ہاں! ٹھیک ہے مگر!'' رانا بشیر کچھ کہتے کہتے رک گئے۔ انہیں شاید میری موجودگی نے اپنی بیٹی سے کوئی ایسی بات کہنے سے مانع رکھا تھا جو وہ میرے سامنے نہیں کہہ سکا تھا۔

''ٹھیک ہے، بتاؤ کیا بات ہے؟'' وہ ایک گہری سانس لے کر سامنے کے صوفے پر براجمان ہو گئے۔

''پاپا! وہ شے بتانے کی نہیں بلکہ دکھانے کی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے فرحانہ نے اپنے پاس ہی صوفے پر رکھے ہوئے چرمی پاؤچ کو اٹھا کر اس کی زپ کھولی اور وہی تصویر نکال کر پہلے اپنے باپ کی طرف بڑھا دی، جو وہ مجھے کچھ دن پہلے میرے آفس میں دکھا چکی تھی۔

میری نظریں رانا بشیر کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ پوسٹ کارڈ سائز کی اس تصویر کو اپنے ہاتھ میں لے کر بڑے غور سے اسے دیکھتے رہے۔ ان کی تنگ سی پیشانی پر اس وقت کچھ سلوٹیں نمودار ہوئی تھیں جو فوراً ہی غائب ہو گئیں، پھر وہ فرحانہ سے بولے۔ ''اس میں ایسا کیا ہے بیٹا؟ یہ تو عام سی تصویر ہے۔''

''مجھے دکھانا ذرا۔'' میں نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ رانا بشیر نے تصویر میری طرف بڑھا دی۔ حالانکہ میں نہ صرف یہ تصویر دیکھ چکا تھا بلکہ اس میں جو موجود کلیو کو بھی تلاش کر چکا تھا اور دانستہ ہی میں نے چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے خاصے جوش سے کہا۔ ''ارے!''

اس پر رانا بشیر چونک سا گیا جب کہ فرحانہ نے میری طرف دیکھ کر ڈرامے کے مطابق مسکرا کر کہا۔

''لگتا ہے، نعمان صاحب نے اس تصویر میں وہ اہم ترین شے پہچان لی ہے جو پاپا کی نظروں میں نہیں آ سکی۔''

بیٹی کی بات پر رانا بشیر نے اس سے کہا۔ ''ارے بھئی ایسی کیا بات ہے اس تصویر میں..... مجھے تو اس میں مجھ سمیت صرف چار افراد ہی کھڑے نظر آ سکیں ہیں۔''

''میرا خیال ہے آپ دوبارہ اس تصویر کو غور سے دیکھیں۔'' میں نے اپنے چہرے پر ایک جوش سا سموتے ہوئے کہا اور تصویر دوبارہ رانا بشیر کی طرف بڑھا دی۔

اس نے تصویر میرے ہاتھ سے لے کر دوبارہ اپنی نظروں کے سامنے کی تو میں نے کہا۔ ''میں آپ کو ایک چھوٹی سی ہنٹ دیئے دیتا ہوں، آپ صرف اس میں سے اس نوجوان کی تصویر کو غور سے دیکھیں جو تقریباً میری عمر کا ہے۔ اب اس کی ٹائی پر نگاہ مرکوز کر دیں۔''

اب میری ہی نہیں، فرحانہ کی بھی نگاہیں رانا بشیر کے چہرے پر جم سی گئی تھیں۔

وہ تصویر کو اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے، بظاہر اسے غور سے دیکھتے رہنے کے بعد بھی اپنے سر کو نفی میں جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''نہیں، میں کچھ نہیں سمجھ پایا۔'' وہ تصویر کو اپنی بیٹی کی طرف بڑھانے لگے تو میں نے اسے روک دیا اور کہا۔ ''ابھی یہ تصویر آپ اپنے ہاتھ میں ہی پکڑے رکھیں میں آپ کو بتاتا ہوں کہ اس میں کیا انوکھی بات ہے۔''

رانا بشیر کے چہرے پر کچھ ایسے آثار ابھرے تھے، جسے پریشانی اور تشویش کا نام دیا جا سکتا تھا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

میں نے کہا۔ ''رانا صاحب! اس نوجوان نے جو ٹائی پن لگا رکھی ہے یہ وہی ٹائی پن ہے جو وقوعے کے روز یعنی جب آپ کی بیگم صاحبہ رفعت خانم کا مرڈر ہوا تھا۔ آپ کی اسٹڈی روم میں پائی گئی تھی اور سب سے پہلے آپ ہی کے ہاتھ لگی تھی۔''

''اوہو!'' میرے اس انکشاف پر اس نے دوبارہ تصویر کو غور سے دیکھا اور پھر اچھلنے کے انداز میں یک دم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا، تصویر ہنوز اس کے ہاتھ میں ہی دبی ہوئی تھی۔

''ی ی ..... تو واقعی وہی ہے۔'' کہتے ہوئے، اس نے اپنی بیٹی کو مخاطب کیا۔ ''ذرا وہ ٹائی پن تو لانا۔''

''وہ میرے پاس ہی ہے۔'' کہتے ہوئے فرحانہ نے اسی پاؤچ سے وہ ٹائی پن نکال کر باپ کی طرف بڑھا دی وہ جس جوش سے صوفے پر سے اٹھا تھا اسی جوش سے دوبارہ بیٹھ گیا تھا۔ تصویر کو انلارج کر کے بھی دیکھا گیا اور ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹائی پن کو بھی تصویر کے قریب کیا۔ اس نے یہ دونوں چیزیں اپنی بیٹی کی طرف بڑھاتے ہوئے ایک جوش بھرے انداز میں بولے۔ ''تم نے بہت بڑا کام کیا ہے بیٹی! اس ٹائی پن اور تصویر والی ٹائی پن میں کوئی فرق نہیں ہے۔''

میں نے دیکھا کہ رانا بشیر کے چہرے پر بالکل ویسے ہی تاثرات تھے جو ہمارے ہونے چاہیے تھے۔ یعنی یہ تاثرات میرے ان خدشات کی نفی کر رہے تھے جو میں نے رانا بشیر کی شخصیت سے بھی وابستہ کر رکھے تھے۔ کیونکہ میرے مطابق اگر وہ بھی کسی نہ کسی حوالے سے مجرم تھے تو وہ یقیناً تشویش میں مبتلا ہو جاتے، بلکہ سب سے پہلے تو وہ اس اہم کلیو کو ہی نظر انداز کرتے، تاہم ابھی ایک شبہ میرا باقی تھا۔

میں نے ان سے سوال کیا۔ ''رانا صاحب! کیا یہ جو آپ کے ساتھ باقی تین افراد کھڑے ہیں، آپ یقیناً انہیں جانتے ہی ہوں گے۔ یہ کون ہیں؟ اور کیا اب بھی یہ آپ کے ساتھ ہوتے ہیں، میرا مطلب ہے۔''

''میں تمہارا مطلب اچھی طرح سمجھ رہا ہوں، نعمان میاں!'' وہ اچانک میری بات کاٹتے ہوئے بولے۔ ''یہ میرے سابقہ بزنس پارٹنر ہیں تمیز الدین اور ان کی فیملی یہ ان کی بیوی ہیں، شائستہ اور ان کا اکلوتا بیٹا خرم کچھ سال پہلے ہی یہ ملک سے باہر جا چکے ہیں۔''

میں ان کی بات پر چونکا، فرحانہ کا بھی یہی حال ہوا۔

اس کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی تھی۔ میں نے رانا بشیر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کس..... ملک میں ہیں؟''

''جرمنی۔''

''کیا اپنا بزنس بھی شفٹ کر چکے ہیں؟''

''ہاں!''

''برائے کرم ان کے متعلق مجھے ذرا تفصیل بتائیں گے، مثلاً یہ کتنے عرصے آپ کے ساتھ بزنس پارٹنر کی حیثیت سے رہے، آپ کے اور ان کے درمیان تعلقات کیسے تھے؟ نیز انہوں نے کب یہاں سے ہجرت کی؟ یہ آخری سوال بہت اہم ہے۔ میری مراد اس سوال سے یہ ہے کہ کیا یہ لوگ تینوں آپ کی اہلیہ کے قتل کے بعد گئے تھے یا پہلے؟''

میری بات پر رانا بشیر کسی گہری سوچ میں مستغرق ہو گیا۔ پھر اپنی رسٹ واچ پر ایک نظر ڈال کر بولا۔ ''میرا خیال ہے اس اہم ایشو پر رات کو بیٹھ کر بات کریں گے، آج اگر مجھے بورڈ آف ڈائریکٹرز کی اہم میٹنگ میں شامل نہ ہونا ہوتا تو میں آج دفتر جاتا ہی نہیں۔''

رانا بشیر کی اس بات پر مجھے اچنبھا ہوا۔ بولا۔ ''کمال ہے رانا صاحب! اس ایشو کو آپ اہم بھی کہہ رہے ہیں اور اس پر اپنی کاروباری میٹنگ کو ترجیح بھی دے رہے ہیں؟''

میری بات کا مطلب سمجھ کر اور میرے لہجے میں چھلی تلخی کو محسوس کرتے ہوئے ہلکی مسکراہٹ سے وہ بولے۔ ''نعمان صاحب! آپ کی بات اپنی جگہ لیکن اس وقت فوری طور پر جو معاملہ نمٹانے کا ہے وہ میری میٹنگ ہی ہے۔ رہا یہ معاملہ تو وہ مرحلہ وار آگے بڑھ ہی رہا ہے، اب ہمارے پاس جادو کا چراغ تو ہے نہیں کہ اسے رگڑیں اور جن حاضر ہو کر سارا مسئلہ حل کر دے گا تب تک مجھے بھی اس سے متعلق بہت سی باتوں کو سوچنے کا وقت مل جائے گا، بلکہ بہت سا اسٹف (مواد) مجھے اس سے متعلق اپنے دفتر کے ریکارڈ روم سے بھی حاصل ہو گا۔ آج رات تم آ جاؤ یا پھر جیسے تم اپنی سہولت سمجھو، بعد میں بھی آ سکتے ہو۔''

میں نے ان کی بات سن کر فرحانہ کی طرف دیکھا۔ وہ بھی تھوڑا الجھن کا شکار نظر آنے لگی تھی۔ اس نے اس سلسلے میں کچھ نہیں کہا تھا۔ شاید اس نے یہ بات کلی طور پر میری ہی صوابدید پر چھوڑ رکھی تھی۔ میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے رانا صاحب! پھر آج رات ہی نشست

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

جا لیتے ہیں۔''

''تم رات کا کھانا ہمارے ساتھ ہی کھاؤ گے۔'' وہ مسکرائے۔

''نہیں، میں اس سلسلے میں معذرت ہی چاہوں گا اور مجھے ابھی کنفرم بھی نہیں کہ میں آج ہی رات آسکتا ہوں یا اگلے دن، یہ میں اپنے یہاں آنے سے تھوڑی دیر پہلے ہی بتا سکتا ہوں۔''

''چلو ٹھیک ہے، جیسے تمہاری مرضی..... یوں بھی تم فرحانہ بیٹی سے رابطے میں تو ہو ناں، میں اسے جو بتاؤں گا یہ تمہیں ویسے بھی بتا ہی دے گی..... چلو میں تمہیں چھوڑ دوں۔''

اس نے آخر میں کہا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ مجھے یہاں ... چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا ہو۔

''جی شکریہ! میں چلا جاؤں گا میرے پاس گاڑی ہے۔''

''گڈ.....'' اس نے مختصراً کہا اور کھڑے کھڑے ایک بار پھر اپنی ریسٹ واچ پر وقت دیکھا۔

میں اور کالیا کار میں تھانے کی طرف روانہ ہوگئے۔ ساری باتیں سننے کے بعد کالیا بولا۔

''ابے لے..... جگری! ساری بات واضح ہوگئی۔ قاتل یہی خاندان ہوگا۔''

''ابھی ایسا کچھ نہیں کہہ سکتے۔ جب تک رانا بشیر ان کے متعلق مجھے پوری تفصیل سے نہ آگاہ کردے۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا اور کالیا نے کاندھے اچکا لیے۔

ہم ابھی اس تھانے کو جانے والی سڑک پر پہنچے ہی تھے، جہاں ایڈووکیٹ زنیرہ کے ایکسیڈنٹ کی ایف آئی آر اور ٹرک کسٹڈی میں رکھا ہوا تھا کہ میرے سیل فون کی بیل گنگنائی۔

اسکرین پر میں نے نمبر دیکھا تو میری پیشانی پر سلوٹیں نمودار ہوگئیں، وہ کوئی اجنبی نمبر تھا میں نے ایک ہاتھ اسٹیئرنگ پر ہی جمے رہنے دیا اور دوسرے ہاتھ سے فون کان کے ساتھ لگا کر 'ہیلو' کہا تو دوسری جانب سے ایک بھاری سی مردانہ آواز ابھری۔

''نعمان احمد ولد احمد حسین؟'' لہجہ استفاریہ تھا۔

''جی میں بات کر رہا ہوں، معاف کیجئے گا میں آپ کو پہچانا نہیں۔ آپ کون؟'' میں نے قدرے چونکتے ہوئے لہجے میں کہا تو وہی آواز دوبارہ ابھری۔

''ہمیں پہچاننے کی غلطی بھی مت کرنا، ورنہ تمہارے حالات اس سے بھی زیادہ خطرناک اور تنگ کردیئے جائیں گے۔''

اس کے لہجے میں رعونت پائی جاتی تھی۔ یکایک میرے پورے وجود میں سینکڑوں چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ دل تیزی سے دھک دھک کرنے لگا۔ ایک روایتی سے خوف کی لہر میرے پورے وجود میں دوڑ گئی۔

چند ثانیے تو مجھ سے کچھ بولا ہی نہ گیا تھا۔ تاہم کچھ سنبھالا لیتے ہوئے بولا۔ ''آپ جو بھی بول رہے ہیں بہتر ہوگا کہ پہلے اپنا تعارف کرادیں، ورنہ میں اسے کسی انجان آدمی کا مذاق سمجھ کر فون بند کردوں گا۔''

''بس! اپنی حرکتوں سے باز آجاؤ۔'' اس بار آواز غراہٹ سے مشابہ تھی۔

''کیسی حرکتیں؟'' میں نے خشک پڑتے ہونٹوں ..... اپنی زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''جو ہو چکا، اسے جانے دو، جو ہونے والا ہے، اسے ہونے سے روکنے کی کوشش مت کرو۔''

''بہتر ہوگا کہ پہیلیوں کی بجائے صاف بات کریں تاکہ میں بھی کچھ سمجھ سکوں۔''

''تم گڑھے مردے اکھاڑنے کی کوشش فوراً ترک کردو۔ تمہارے باپ کو پھانسی لگ گئی۔ چاہے بے گناہ ہی سہی..... وہ اب واپس تو نہیں آسکتا پھر کیوں رانا..... بشیر کے پیچھے لگے ہوئے ہو۔''

اس نے کہا اور میں سرتاپا ایک عجیب سی سنسناہٹ کا شکار ہونے لگا۔ پہلے تو میں یہی سمجھا تھا کہ یہ ان لینڈ مافیائی لوگوں میں سے کسی ایک کا فون ہوگا یا پھر ان کا جنہوں نے عاصمہ کو اغوا کیا تھا۔ مگر ایسا پہلی بار ہو رہا تھا کہ میرے باپ سے متعلق کیس کے سلسلے میں کسی نے مجھے دھمکایا تھا۔

یہ ایک طرح سے میری جیت کی طرف اٹھتا ہوا پہلا قدم تھا کہ اصل مجرم یا اصل قاتل کو میں نے پریشان کردیا تھا اور وہ اب سات پردوں کو چیر کر باہر نکلنے پر مجبور ہونے لگا تھا۔ یہی سوچ کر میں نے ہمت پکڑی اور پورے استحکام سے بولا۔ ''جس انسان کی زندگی کا مقصد ہی اپنے باپ کی بے گناہ پھانسی کو ثابت کرنے اور اصل قاتل کو بے نقاب کرنا بن چکا ہو وہ بھلا سوائے خدا کے کس سے اور کیوں کر ڈرے گا۔''

''مت بھولو کہ تم آسمان پر نہیں زمین پر چل رہے ہو

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

http://paksociety.com

پاک سوسائٹی پر مُوجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

Downloaded from Paksociety.com

اور میری نظروں میں ہو۔ میں چاہوں تو اسی وقت تمہاری سفید مہران کو بم سے اڑا دوں۔ جس میں اس وقت تم اور تمہارا ایک دوست بھی تمہارے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا ہے۔''

دوسری جانب سے پُرغرور آواز ابھری اور مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ تھوڑی دیر پہلے جو میں نے لہجہ مضبوط کرنے کی ہمت پکڑی تھی وہ ہوا ہونے لگی۔

اسی وقت میں نے جیسے غیر ارادی طور پر پہلے اپنی کھڑکی سے دائیں جانب دیکھا اور پھر بائیں سمت والی کھڑکی سے باہر جھانکا۔ تب ہی میں نے بیک ویو میں دیکھا تو عقب میں مجھے تین چار گاڑیاں، جن میں ایک ٹرک، دو بسیں اور ایک کار شامل تھی، کار میں فیملی سوار تھی۔ نظر آئیں۔

''یہ کم بخت مجھے کہاں بیٹھا دیکھ رہا تھا؟'' میں نے اپنے ہونٹ بھینچ کر سوچا۔

کالیا ایسا کوئی موقع بھانپ کر ایک دم چپ سادھ لیتا تھا اور جو میں کرتا تھا وہ خاموشی سے مجھے کرنے دیا کرتا تھا۔

میں نے بدستور اپنے ہونٹ پُرسوچ انداز میں بھینچ رکھے تھے۔ نظریں کار چلاتے ہوئے تیزی سے اطراف میں گردش کر رہی تھیں۔ کالیا خاموش مگر حیران سی نظروں سے میری ایک ایک حرکت نوٹ کر رہا تھا اور اب وہ بھی گویا بلامقصد اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

''وہ یہیں کہیں ہے کالیا! ہمارے قریب..... تاڑو اسے فوراً۔'' میں نے جوش سے تقریباً چلاتے ہوئے کہا۔

''کک..... کون؟'' وہ بوکھلا کر بولا۔

''وہی جو ابھی فون پر مجھ سے مخاطب ہے اور دھمکیاں دے رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

''ابے لے!'' کالیا نے ایک دم یہ کہا اور فوراً ہی بندر کی طرح چھلانگ مار کر عقبی سیٹ پر چلا گیا۔ وہ اب تیزی کے ساتھ اپنا سر گھما گھما کر اطراف میں تکے جا رہا تھا اور اچانک ہی وہ چلا کر بولا۔ ''جگری! ہوشیار باشد، ایک کار ٹرک کے پیچھے سے آگے نکلنے کی کوشش کر رہی ہے۔''

اس کے کہنے کی دیر تھی کہ اچانک میری سائیڈ کے مرر میں پیچھے سے آتے ہوئے ٹرک کے عقب سے ایک کار تیزی سے نمودار ہوئی اور اسے کراس کرتی ہوئی میری کار کے بالکل قریب آ گئی۔ میں بوکھلا سا گیا۔ وہ نسان ٹیڈا تھی، رنگ سیاہ تھا اور اس کی کھڑکی کے شیشے چڑھے ہوئے تھے جو کالے تھے..... پھر اچانک ہی اس کی پاور ونڈو نیچے اتری اور ایک نقاب پوش کی شکل مجھے نظر آئی، میں ابھی اسے جانچنے کی کوشش میں ہی تھا کہ سیکنڈ کے اندر اندر اس نے اپنے ہاتھ میں کوئی پکڑی ہوئی شے ہماری کار کی طرف اچھال دی جو میری کھڑکی سے ہوتی ہوئی میری گود میں گری اور لڑھک کر ساتھ والی سیٹ کے نیچے جا پڑی۔ وہ کار گولی کی طرح آگے نکل گئی۔

''باپ رے..... ی ی..... یہ تو آوان ہے۔''

مجھے عقبی سیٹ سے کالیا کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی، وہ شے اس نے بھی تاڑ لی تھی۔ مہران کار بڑی ہی کتنی ہوتی ہے اور اس نے کوئی عجیب سا نام لیا تھا ''آوان'' جو میرے جیسے آدمی کے لیے تو نیا ہی تھا، شاید کوئی دستی بم کی قسم ہوگی۔ تاہم میرے اوسان خطا ہونے لگے، میری سمجھ میں ہی نہ آسکا کہ میں کیا کروں مگر کسی بم کے خوف سے میں نے یک دم کار کو بریک لگا دیئے۔ اب پتا نہیں کالیا بریک لگنے کی وجہ سے یا پھر بم اگلی سیٹ کے نیچے اٹھانے کے لیے اچھل کر میرے ساتھ والی سیٹ پر آ پڑا تھا کہ ادھر ایک اور مصیبت ہمارے گلے میں آن پڑی۔

ہماری کار کو بریک لگتے ہی، پیچھے سے آتے ہوئے ٹرک کا ہارن بڑے زور سے چیخا اور اس کے بھی ٹائروں کے چرچرانے کی خوفناک آواز ابھری..... اس کے بعد وہ پیچھے سے ہماری کار کے ساتھ ایک دھماکے سے ٹکرایا۔ کار کو ایک طوفانی سا جھٹکا لگا اور ساتھ ہی ہمیں بھی۔ شاید پیچھے سے آنے والے ٹرک کے بھی بریک لگانے کی وجہ سے کچھ بچاؤ ہو گیا کہ ہماری کار الٹی نہیں تھی، اسے ایک جھٹکا ضرور لگا تھا۔ ساتھ ہی کالیا نے بھی بروقت اس جھٹکے سے خود کو سنبھالتے ہوئے وہ دستی بم جیسی شے بروقت اچک کر کھڑکی سے باہر پھینک دی جو سڑک کے کنارے دور خالی جگہ پر گری اور اسی وقت ساعت شکن دھماکا ہوا۔

''کار دوڑائے جا جگری! ورنہ مفت کی پھینگ میں پھنس جائیں گے۔'' کالیا نے کہا اور میں نے بھی سنبھلتے ہی کار کا ایکسیلیریٹر دبا دیا۔ شکر تھا کہ کار کا انجن بند نہیں ہوا تھا۔ اگرچہ یقینی طور پر اس کا عقبی حصہ ضرور پچک گیا ہوگا۔

بہرکیف! ہم تھانہ جانے کی بجائے آناً فاناً ہی وہاں سے کہیں اور رفو چکر ہو گئے۔

کالیا کے مشورے پر سب سے پہلے ہم نے مکینک کے گیراج کا رخ کیا اور کار کا پچھلا بمپر بنوایا۔ اس کام میں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

لگ بھگ دو گھنٹے سرف ہوگئے۔ اس کے بعد دوبارہ کار میں سوار ہوئے اور اسی طرف کو روانہ ہوگئے۔

وہاں کی ہلچل تھم چکی تھی۔ ایک پولیس موبائل وقوعے کا معائنہ کرنے میں مصروف تھی۔ جدھر بم پھٹا تھا وہاں بم ڈسپوزل اسکواڈ کے عملے سے تعلق رکھنے والے افراد بھی موجود تھے۔

ہم دونوں باہمی تبادلہ خیال کے بعد دانستہ اس مقام پر دوبارہ آئے تھے۔ دیکھنا چاہتے تھے کہ کہیں کسی نے ہمیں اس وقوعے کے حوالے سے پہچانا تو نہیں تھا یا ہماری کار کا نمبر وغیرہ تو نوٹ نہیں کیا تھا۔ وہ ٹرک والا بھی شاید کسی مصیبت میں پھنسنے سے بچنے کے لیے ہماری طرح رفو چکر ہو چکا تھا۔

وہاں موجود دیگر لوگوں کی طرح ہم بھی یہ سب دیکھنے لگے۔ لوگوں میں گھلے ملے بھی، یونہی دریافت کیا کہ ''ماجرا کیا ہے؟''

پولیس اور ان کا ایک افسر بھی کھڑا نظر آیا۔ اپنے شولڈر پر لگے ستاروں سے وہ پولیس انسپکٹر ہی لگتا تھا، ورنہ اس ینگ اور اسمارٹ سے نوجوان کو دیکھ کر لگتا نہیں تھا کہ وہ پولیس انسپکٹر تھا۔

ان کے قریب تو کسی کو جانے نہیں دے رہے تھے۔ تاہم کسی چینل کی وین کھڑی ضرور نظر آئی جس کی پوری باڈی پر مذکورہ چینل کا مونوگرام بنا کر رنگین کیا ہوا تھا۔ وہ البتہ ان سے سوالات کر رہے تھے اور جیسے ہی ہمارے کانوں کو یہ بھنک پڑی کہ واردات ہنوز نامعلوم تھی۔ ہم وہاں سے کھسک گئے اور سیدھا تھانے کا رخ کیا۔

وہاں احاطے میں پہنچ کر میں نے کار روکی اور اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اتر آیا۔

میں..... شلوار قمیص میں تھا اور پیروں میں پشاوری جوتے تھے جبکہ کالیا حسب معمول ٹائیٹ نیلی جینز میں تھا۔ پاؤں میں سیاہ رنگ کے نیلی لکیروں والے جوگر تھے اور چست بنیان ٹائپ شرٹ تھی۔ اس لباس میں اس کا کسرتی جسم کسی ریسلر کی طرح ہی لگتا تھا۔ شرٹ پر سینے کی طرف انگریزی میں ''no way'' لکھا ہوا تھا۔ اس نے چہرے پر دھوپ کا سیاہ چشمہ لگا رکھا تھا۔ اگرچہ قد میرا بھی اس کے برابر تھا مگر میں ذرا دبلا پتلا تھا۔ وہ کھردرے چہرے کا مالک اور ہلکی سی نولی رنگت تھی، میرا رنگ گندمی اور چہرہ خوبرو تھا۔

''وہ دیکھ جگری.....! ادھر.....جنازہ کھڑا ہے۔'' اس نے مجھے ٹہوکا دیتے ہوئے ایک طرف اشارہ کیا تو میں اس سمت ایک جلے ہوئے ٹرک کو دیکھ کر اس کا طنز سمجھ گیا۔ یہ یقیناً وہی ٹرک تھا جس سے ایڈووکیٹ زنیرہ کی کار کی ٹکر ہوئی تھی۔

میں نے ہونٹ بھینچ کر محض اپنے سر کو ہلکی سی جنبش دی اور پھر تھانے کی عمارت کی طرف بڑھے۔ ایک سنتری نے ہمیں روکا تو ہم نے تھانہ انچارج سے ملاقات کے بارے میں عندیہ دیا تو اس نے کہا۔ ''صاحب کہیں گئے ہوئے ہیں۔''

''کب تک آجائیں گے؟''

''کچھ نہیں کہہ سکتے۔'' اس نے مجھ پر سرسری نگاہ جبکہ کالیا کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں، ہم ویٹ کر لیتے ہیں۔'' کالیا نے کہا۔ اس نے اپنا چشمہ اتار کر ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔

''آپ کب تک انتظار کریں گے صاحب کا؟ پتا نہیں وہ کب آئیں، ہم اتنی دیر یہاں کسی آؤٹ سائیڈر کو نہیں بیٹھنے دے سکتے۔'' سنتری نے اس بار اپنی آواز کو رعب دار بلکہ کچھ کرخت بھی بنالی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''ہم کسی قریبی گلی سے نہیں آئے ہیں، میلوں کا سفر کر کے آئے ہیں اور اس ایکسیڈنٹ کی پیش رفت معلوم کرنے آئے ہیں، جس میں ایڈووکیٹ زنیرہ شدید زخمی ہوگئی تھیں۔''

میری بات پر اس کی اکڑی ہوئیں بھنویں ذرا نیچی ہوئیں، پھر اس نے ہم سے شناخت مانگی وہ ہم نے اپنے آئی ڈی کارڈ کے ساتھ کروائی۔ اس کے بعد اس نے ہمیں بے دلی سے باہر احاطے میں ہی ایک لکڑی کی بینچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہاں بیٹھ کر انتظار کرنے کو کہا۔

میں اور کالیا وہاں آکر بیٹھے تھے کہ ایک پولیس موبائل گیٹ سے اندر احاطے میں داخل ہوئی۔ اس کے رکتے ہی کچھ پولیس والے اور ڈرائیونگ کیبن سے ایک انسپکٹر ٹائپ کا اسمارٹ سا آدمی اترا تو ہم دونوں ہی اسے دیکھ کر چونک پڑے۔

یہ وہی نوجوان سا پولیس انسپکٹر تھا جسے ہم نے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی وقوعے کی جگہ پر دیکھا تھا۔ ہم اسے دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے کمرے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے ایک سرسری سی نظر ہم پر ڈالی تھی اور میں نے اس سے مخاطب ہونے کی کوشش چاہی تو کالیا نے میرا ہاتھ پکڑ کر دبایا۔ میں اس کا اشارہ سمجھ کر رک گیا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''اسے اندر براجمان ہونے دو۔'' کالیا نے میرے کان میں سرگوشی بھی کردی۔ پھر جب وہ اندر چلا گیا تو ہم آگے بڑھے اور کمروں والے برآمدے میں آگئے۔ وہاں اب پہلے والا سنتری تو غائب تھا مگر اس کی جگہ دو سنتری کھڑے نظر آئے۔ میں نے ان سے ''صاحب'' سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا اور جب ملاقات کی نوعیت بتائی تو ...

ان میں سے ایک نے ہمیں وہیں کھڑے رہنے کو کہا اور خود انسپکٹر کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ دوسرا سنتری وہیں کھڑا سگریٹ سلگانے لگا۔ اس کا ساتھی تھوڑی ہی دیر میں لوٹ آیا اور ہمیں اندر جانے کا کہا۔ ہم اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے انسپکٹر کے کمرے میں داخل ہوئے۔ داخل ہونے سے پہلے ہم نے اس کے کمرے کی دیوار پر لگی نیم پلیٹ میں اس کا نام ایس ایچ او کامران شانی لکھا دیکھ لیا تھا۔

وہ ہم سے بڑے پُرتپاک انداز میں ملا اور ہمیں اپنے سامنے کی دو کرسیوں پر بیٹھنے کا بھی کہا ہم اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کرسیوں پر براجمان ہوگئے۔ کالیا نے اپنا چشمہ اتار کر میز پر اپنے سامنے رکھ دیا تھا۔

میں نے کالیا کے دوست کی حیثیت سے تعارف کروایا اور پھر مذکورہ کیس سے متعلق بات کی تو اس نے ایک گہری سانس لے کر بتایا۔

''تفتیش تو ابھی جاری ہے۔ ٹرک کے مالک سے بھی رابطہ ہوا ہے۔ مگر ہمارا اصل ٹارگٹ ٹرک کا ڈرائیور ہے۔ جو ہنوز مفرور ہے۔''

''کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آئی انسپکٹر صاحب؟'' میں نے سوال کیا۔

''ایک شخص کو گرفتار کیا ہے۔ ملوک نام ہے اس کا۔ وہ اس ٹرک کا اصل ڈرائیور ہے۔''

''اصل ڈرائیور؟ میں سمجھا نہیں؟'' میں نے بھنویں سکیڑ کر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ایک گہری ہنکاری خارج کرتے ہوئے بولا۔

''اس ٹرک کا اصل ڈرائیور ملوک ہی تھا مگر اس روز اس کا ٹرک یاسر نامی شخص چلا رہا تھا۔''

''تو آپ نے گرفتار کسے کیا ہے؟'' اس بار کالیا نے پوچھا۔

''ملوک کو۔''

''تب تو اس نے مفرور یاسر کے بارے میں آپ کو بتا ہی دیا ہوگا کہ وہ کون تھا اور اس کا ٹرک اس روز کیوں لے کر گیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں!'' انسپکٹر کامران نے جواب دیا۔ ''وہ اسے کچھ زیادہ تو نہیں جانتا تھا، بہ قول اس کے وہ اسے دھو کے میں رکھ کے ٹرک لے گیا تھا۔''

''کمال ہے، وہ اسے جانتا تک نہیں تھا اور اس کا ٹرک لے اڑا؟'' کالیا حیرت سے بولا۔ اس پر انسپکٹر کامران نے ہلکی مسکراہٹ سے کہا۔

''اسی لیے تو وہ اب تک لاک اپ میں ہے۔ حالانکہ جمالی صاحب اس کی ضمانت کے لیے بھی آئے تھے مگر میں نے اسے نہیں چھوڑا اور ان کے سامنے بھی یہی شرط رکھی کہ جب تک یاسر نہیں مل جاتا میں ملوک کو کسی قیمت پر بھی نہیں چھوڑ سکتا۔''

میں نے اس کی بات پر غور کرنے کے انداز میں، اس کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے عام روایتی پولیس افسروں کے مقابلے میں تھوڑا مختلف لگا لیکن صرف ''مردم شناسی'' سے کام نہیں چلایا جاسکتا تھا۔

میرے چند مزید سوالوں کے جواب میں اس نے صرف اسی قدر بتایا کہ احسان جمالی کی گڈز ٹرانسپورٹ سے تعلق رکھنے والا ملوک گزشتہ پانچ سال سے ایک بار بردار ٹرک ڈرائیور ہے۔ وہ ایک بال بچے دار اور شریف انسان ہے۔ تھوڑا بے وقوف اور دوسروں پر جلد بھروسا کرنے والا ایک سادہ لوح آدمی ہے جس کے بارے میں انسپکٹر کامران نے بھی اپنے طور پر تفتیش کرلی تھی جبکہ یاسر وقوعے سے چند روز پہلے ہی چائے پانی لانے کے طور پر وہاں کام کرنے آیا تھا اور ایک روز جب مال لے جانا تھا تو ملوک کی بیوی کے ہاں ولادت ہونے والی تھی اور اسے ایک میٹرنٹی ہوم میں لے جانا تھا۔ ملوک پریشان تھا کہ مال لے جائے یا بیوی کو میٹرنٹی ہوم پہنچائے۔ اس پر یاسر نے ہی اس سے کہا تھا کہ اسے ٹرک چلانا آتا ہے اور کون سا دوسرے شہر جانا ہے۔ اسی شہر میں مال پہنچانا ہے، اس لیے وہ بے فکر ہوکر اپنی بیوی کو جا کر دیکھے، میں (یاسر) مال پہنچا آتا ہوں۔ سادہ لوح ملوک اس کی باتوں میں آگیا۔''

انسپکٹر کی اس کہانی پر ہم بھروسا نہیں کرسکتے تھے۔ بہ قول اس کے ملوک کی تلاش جاری تھی، نیز ہم نے بھی اسے اشاروں میں بتا دیا تھا کہ وہ ملوک کو کسی قیمت پر نہ چھوڑے جب تک اس مفرور ڈرائیور یاسر کا پتا نہیں چل جاتا۔ دوسری

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

بات میں نے انسپکٹر کامران کے علم میں یہ بھی لانی ضروری سمجھی کہ ایڈووکیٹ زنیرہ بہت جلد شفایاب ہونے کے بعد اپنا یہ کیس خود لڑنے والی ہیں۔ وغیرہ۔

اس پر وہ مسکرا کر بولا۔ ''مجھے معلوم ہے یہ بات، اسی لیے تو ابھی تک میں نے ملوک کو نہیں چھوڑا ہے جبکہ اپنے طور پر ہم مفرور یاسر کی بھی تلاش جاری رکھے ہوئے ہیں۔''

''گڈ!'' میں نے کہا پھر اس سے رخصت ہونے والے انداز میں پوچھا۔

''کیا ہم ملوک سے ایک ملاقات کر سکتے ہیں؟''

میری بات پر اس کے ہونٹوں پہ معنی خیز مسکراہٹ ابھری۔ اس کے بعد اس نے گھنٹی بجا کر ایک سنتری کو اندر بلوایا اور اس کے ساتھ ہمیں بھیج دیا۔

ایک پولیس انسپکٹر کا ہمارے ساتھ اتنا تعاون کرنا ہمارے لیے شاید خوش قسمتی ہی کی بات تھی۔ مجھے اس مقولے پر یقین سا آنے لگا کہ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں، ورنہ تو وہ راشی پولیس افسر اچھا دلاور بھی تھا۔

بہرکیف ہمیں لاک اپ میں ملزم ملوک سے ملوا دیا گیا۔ وہ ایک تیس، پینتیس سالہ دبلا پتلا شخص تھا، صورت سے تو مسکین ہی لگتا تھا اور اس وقت پریشانی میں تو اور زیادہ ستا ہوا چہرہ نظر آ رہا تھا اس کا۔ ہمیں دیکھ کر وہ کچھ حیران بھی ہوا اور اس کی پژمردہ سی آنکھوں میں امید کی کرن بھی چمکی تھی کہ شاید وہ یہ سمجھ رہا ہو کہ ہم اس کی ضمانت کے لیے آئے ہیں۔

''تمہارا نام ہی ملوک ہے؟'' میں نے اس کے چہرے پر اپنی نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

''جج..... جی ہاں!'' وہ پھنسی پھنسی سی آواز میں بولا۔

ہم نے اسے اپنے بارے میں مختصراً بتایا تو وہ یہ سن کر مزید پریشان سا ہو گیا کہ ہمارا تعلق ''فریادی پارٹی'' سے تھا۔

''دیکھو، ہم خود بھی یہ چاہتے ہیں کہ اصل مجرم جلد سے جلد گرفتار ہو جائے۔ تم ایک غریب اور شریف آدمی دکھائی دیتے ہو لیکن یہ تب ہی ممکن ہوگا کہ یاسر کو گرفتار کیا جا سکے۔''

''سائیں! میں تو خود یہ چاہتا ہوں کہ وہ مردار پولیس کے ہتھے چڑھ جائے اور میری جان چھوٹے مگر یہ کام تو سائیں! پولیس والوں کا ہی ہے ناں؟''

''پولیس کے پاس بھی جادو کا چراغ نہیں ہوتا ملوک!'' میں نے اس سے دانستہ اب سندھی میں باتیں شروع کر دی تھیں۔ اسے بھی کچھ حوصلہ ہوا۔

''ہم اپنے طور پر بھی یاسر کو تلاش کرنے کی کوشش میں ہیں۔ تم یاسر کے سلسلے میں کچھ چھپاؤ گے تو یہ تمہارے اپنے لیے اچھا نہ ہوگا۔ کیونکہ اس نے کسی عام شخصیت کو زخمی نہیں کیا ہے، وہ ایک ایڈووکیٹ ہے۔ وہ کسی صورت میں بھی تمہیں نہیں چھوڑے گی۔ اسی لیے پولیس نے بھی تمہاری کسی قسم کی ضمانت نہیں ہونے دی ہے۔''

''سائیں! میں آپ سے پورا تعاون کرنے کا وعدہ کرتا ہوں۔'' وہ جلدی سے بولا۔

''یاسر کے بارے میں کوئی ایسی بات بتاؤ، جس سے تم سمجھتے ہو کہ پولیس یا ہمیں بھی اس تک پہنچنے میں مدد ملے۔ باقی تو ہمیں اس کے بارے میں پتا چلا چل چکا ہے، مگر وہ ناکافی ہے۔ تم ذرا سوچ کر اس کے بارے میں کوئی نئی بات بتاؤ؟''

میں نے اس سے صراحت میں سوال کیا تو وہ بھی کچھ سوچتا بن گیا۔ پھر گومگو سے لہجے میں بولا۔

''میں کیا بتاؤں سائیں! میری تو خود سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ یہ میرے ساتھ ہو کیا گیا ہے؟ میں ایک غریب سا آدمی ہوں، بیٹھے بٹھائے یہ کس مصیبت میں پھنس گیا۔ اتنے سالوں بعد اللہ سائیں نے مجھے بیٹے سے نوازا مگر.....''

فرطِ رقت سے وہ آبدیدہ ہو گیا اور جملہ بھی اپنا مکمل نہ کر سکا۔ اپنی ہی قمیص کے دامن سے وہ اپنے آنسو پونچھنے لگا۔

مجھے اس غریب اور سادہ لوح سے آدمی پر بے حد ترس آنے لگا۔ ایک تو اپنا بھی مزاج کچھ رحم پرور اور ہمدردانہ تھا۔ بات بھی یہ جھوٹ نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اتنے سالوں بعد باپ کی خوشی حاصل کر پایا اور اس مصیبت میں پھنس گیا۔ اس نے بتایا کہ اس کی بیوی بھی اکیلی ہے اور بچہ بھی چند ہی دنوں کا ہے۔ خوشی غمی اور بیماری میں اس کے ساتھ سوائے اللہ کے اور کوئی نہیں ہے۔ تاہم اس نے یاسر کے بارے میں مجھے بھی وہی کچھ بتایا جو انسپکٹر کامران ہمارے علم میں لا چکا تھا۔ میں نے اس سے جمالی گڈز کمپنی کا پتا لیا اور پھر دوبارہ انسپکٹر کامران سے مل کر اس سے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ ملوک واقعی بے گناہ ہے، تاہم اس سے سادہ لوحی میں ایک بے وقوفی ہوئی، لگتا ایسا ہی ہے کہ اسے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

استعمال کیا گیا ہے۔ آپ مجھے یہ بتائیں کہ کیا آپ نے ملوک کے اس بیان کی تصدیق کی ہے کہ وہ اپنے بارے میں جو کہہ رہا تھا وہ غلط نہیں ہے۔ آئی مین، کیا وہ واقعی ایک بچے کا باپ بھی ہے جس کی ولادت بہت منتوں مرادوں اور سالوں بعد ہوئی ہے؟''

''جی ہاں!'' انسپکٹر کامران نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''میں خود اس کے بارے میں تصدیق کرنے جمالی گڈز کمپنی گیا تھا، وہاں بھی اس کے ساتھی ملازموں نے اس کے بارے میں یہی بتایا کہ ملوک ایک سادہ لوح اور شریف آدمی ہے۔ ہم گھر بھی گئے اس کے۔ وہاں اس کی بیوی اکیلی تھی، اس کا دودھ پیتا بچہ تھا۔ محلے کی کوئی بوڑھی عورت خدا ترسی میں وہاں رہتی ہے۔''

''بس تو پھر انسپکٹر صاحب! میری آپ سے ایک گزارش ہے۔'' میں نے فوراً کامران سے کہا۔ ''مجھے فریادی پارٹی کا ایک ذمے دار فرد سمجھتے ہوئے اسے چھوڑ دیں تو یہ اس غریب آدمی پر آپ کا احسان ہوگا۔''

میرا جملہ ختم ہوا تو انسپکٹر کامران کے چہرے سے یوں لگا جیسے وہ ایک دم ہی ہلکا پھلکا ہوگیا ہو۔ اسی لہجے میں وہ بولا۔

''اگر یہ بات ہے تو یوں سمجھیں آپ نے میرے سر سے ایک بڑا بوجھ اتار دیا۔ میں تو اسی دن اسے جمالی صاحب کی ضمانت پر چھوڑ دیتا مگر چونکہ ہم پر سب سے زیادہ دباؤ فریادی پارٹی کا ہوتا ہے، اس لیے ہمیں بھی احتیاط کرنا ہوتی ہے مگر اب یہ مسئلہ آپ نے حل کردیا۔''

''مگر انسپکٹر صاحب! اس کا مطلب یہ نہیں ہونا چاہیے کہ اصل مقصد تساہل کا شکار ہوجائے، میں اپنے طور پر بھی کوشش کروں گا کہ اصل جواب دار گرفت میں آجائے۔''

میں نے انسپکٹر کامران سے سنجیدہ لہجے میں کہا تو وہ فوراً خوش خلقی سے مسکرا کر بولا۔ ''آپ اس کی فکر نہ کریں، میں بھی یاسر کی تلاش میں نچلا نہیں بیٹھا ہوں۔''

''آئی ہوپ دیٹ..... آل ریڈی انسپکٹر!'' میں نے کہا۔

اسی وقت کامران نے ایک سنتری سے کہہ کر ملوک کو آزاد کرنے کا حکم دے دیا۔

میں اور کالیا وہاں سے نکل کر باہر آئے۔ کار میں سوار ہوتے وقت کالیا اپنے حلق سے ایک گہری سانس خارج

اندھیری رات میں جگنو کا چمکنا ایک عام سا مظہر ہے جسے تقریباً ہر شخص جانتا ہے مگر اس روشنی کی نوعیت سے بہت کم لوگ پوری طرح واقف ہوں گے جو جگنو کے جسم سے خارج ہوتی ہے۔ یہ ایک خاص قسم کی روشنی ہے جسے سائنس کی زبان میں بائیو لیومینیسنس کہتے ہیں۔ عام الفاظ میں ہم اسے ''ٹھنڈی روشنی'' بھی کہہ سکتے ہیں جگنو کے جسم میں دراصل آکسیجن کیلشیم اور دیگر چند کیمیکلز کے ملاپ سے لیوسی فیریز نامی ایک اینزائم پیدا ہوتا ہے جو یہ روشنی پیدا کرتا ہے دوسرے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ روشنی ایک کیمیائی عمل کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے جو جگنو کے مختصر سے جسم کے اندر وقوع پذیر ہوتا ہے۔ کرۂ ارض پر پائے جانے والے کئی دیگر حشرات بھی مختلف رنگوں کی روشنی خارج کرتے ہیں۔ یہ روشنی عام روشنی سے اس لحاظ سے مختلف ہوتی ہے کہ اس میں حدت یعنی گرمی نہیں پائی جاتی۔ جب کہ عام روشنی کے اکثر مآخذ روشنی کے ساتھ ساتھ حدت بھی پیدا کرتے ہیں اگر اس روشنی کے ساتھ حدت بھی پیدا ہوتی تو جگنو کا نازک جسم جل کر راکھ ہوجاتا۔

مرسلہ: انم سلطان۔ جھنگ

کرتے ہوئے بولا۔ ''جگری! تم نے یہ بہت اچھا اور نیک کام کیا کہ ایک ایسے غریب انسان کی جان چھڑا دی جو ہمارے آگے جواب دہ تھا۔ ورنہ لوگ کہاں دوسرے کی جان بخشی کرتے ہیں، جب تک اسے نچوڑ نہ لیں۔ یہ پتا ہونے کے باوجود کہ وہ بے قصور ہے، اس بے چارے کی خوب مٹی پلید کرتے ہیں اور جب وہ بالکل ادھ موا ہوجاتا ہے پھر اسے جانے دیتے ہیں، پولیس ایسے آدمی کو نچوڑ کر رکھ دیتی ہے اور اس کے وارثوں سے بھی خوب مال پانی کھاتی ہے۔ یہ اس غریب آدمی ملوک کی خوش قسمتی تھی کہ اسے پولیس بھی خلاف توقع اچھی ملی اور ہم بھی۔''

''ہاں! کالیا تیری بات سچ ہے۔'' میں نے گہرے دکھ سے کہا اور کار کا اسٹیئرنگ سنبھالا۔ ''میرا باپ بھی بے گناہ تھا اور اپنی سادہ لوحی کے باعث کچھ بھیڑیا صفت لوگوں کی سازش کا شکار ہوگیا۔ یہاں تک کہ وہ پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ اسے انصاف نہیں ملا اور اب میں یہ داغ دھونے کے لیے کوشاں ہوں۔ کالیا! میرے یار! میرے دوست! تو کیا سمجھتا ہے کہ میرے باپ نے مجھ سے جو وعدہ کیا تھا وہ صرف اتنا ہی نہیں تھا کہ میں یہ داغ دھونے کی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کوشش کروں۔ اس کے ذہن میں یقیناً یہ بھی ہوگا کہ ہماری یعنی اس کے بچوں کی نظروں میں بھی اگر کوئی تھوڑا بہت شبہ ہے تو وہ بھی باقی نہ رہے۔ ہاں! کالیا، کاش، اس وقت میرے باپ کے ساتھ بھی اسی طرح کی کوئی بھلائی کر دیتا۔ کاش رانا بشیر اسے معاف کر دیتا۔ اس کا دل بھی نرم پڑ جاتا وہ صرف ایک بار میرے باپ کا بیک گراؤنڈ دیکھ لیتا کہ وہ کیسی زندگی گزار رہا ہے، بھلا ایسا آدمی کیسے اتنا بڑا جرم کر سکتا ہے تو اس کا دل ضرور میرے باپ کی بے گناہی کی گواہی دیتا۔''

یہ کہتے کہتے میری آواز بھر آئی۔ آنکھیں باپ کو یاد کر کے آب دیدہ ہوگئیں۔ کالیا بھی ایک دم رنجور سا ہوگیا۔ اس نے بے اختیار اپنا ایک بازو میرے کاندھے کے گرد حمائل کر دیا اور بوجھل سے لہجے میں بولا۔ ''بس کر میرے جگری! تیرے دکھ کا اندازہ مجھے ہے مگر اتنا کبھی نہیں ہو سکتا جتنا تو اپنے اندر ایک درد اور کسک کی صورت میں رکھتا ہے۔''

''ہاں کالیا! مجھے یہی کسک بے چین کیے رہتی ہے کہ میرا نیک شریف اور حق حلال کی روزی کما کر کھانے والا باپ قتل جیسے بھیانک جرم کے جھوٹے الزام تلے بے گناہ پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ بعض لوگوں کی اموات کا دکھ وقت کے ساتھ ساتھ ماند پڑتا جاتا ہے مگر بے گناہ کی موت کا دکھ تا عمر ہی تڑپاتا رہتا ہے۔ ایک جاں گسل کسک میں مبتلائے غم دوراں رکھتی ہے۔ یہ دکھ ایک عذاب مسلسل ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''چل جگری! بے غم ہو جا، کبھی نہ کبھی ہم اصل قاتل تک پہنچ ہی جائیں گے۔ یہ پولیس والے ہمیں اب مشکوک نظروں سے دیکھنے لگے ہیں۔'' اس نے تھانے کے برآمدے کی طرف اشارہ کیا اور میں نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔

☆.....☆

اس ساری بھاگ دوڑ میں شام ہونے لگی تھی۔ میں نے اپنے گھر کا ایک چکر لگانا ضروری سمجھا اس کے بعد لاری اڈے جانے کا ارادہ تھا۔ یہ کالیا کا ہی مشورہ تھا کہ لاری اڈے جانے سے پہلے ایک چکر گھر کا لگانا ضروری تھا۔ نجانے کیا سوچ کر اس نے مجھے یہ مشورہ دیا تھا تاہم... گھر پہنچتے پہنچتے مجھے کچھ سمجھ میں آتا رہا۔

کچھ باتوں کا اظہار ضروری نہیں ہوتا اور یہ خود ہی سمجھنے کے لیے ہوتی ہیں۔ یہ مقولہ کالیا کا تھا اور برمحل تھا۔

ظاہر ہے، عاصمہ بہنا آج صبح ہی گھر سے غائب ہوئی تھی۔ فہیم بھی نہیں تھا، گھر پر صبح سے ہی تالا پڑا ہوا تھا۔ پیچھے کون آیا گیا کیا پتا۔

ہم گھر پہنچے تو سب کچھ بہ ظاہر معمول کے مطابق نظر آ رہا تھا۔ وہی محلے میں چہل پہل، دکانیں اور مختصر سا بازار بھی کچھ ایسے ہی معمولات اور معاملات زندگی کی طرح رواں دواں تھا۔ ایک میرا گھر تھا جس پر تالا لگا ہوا تھا اور وہ سنسان پڑا دکھائی دیتا تھا۔

محلہ کمیٹی کے ایک معزز ممبر اور یہاں کے لوگوں میں حاجی کریم بخش کے بعد مجھے ہی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ آتے جاتے لوگوں سے سلام دعا اور حال واحوال کرتا ہوا گھر میں داخل ہوتا تھا لیکن اب میں جیسے خود کو چور سا محسوس کرنے لگا تھا۔ لوگوں کی نظروں سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میں کوئی جرم کر کے اپنے گھر میں داخل ہونے والا ہوں۔ کار میں نے گھر کے دروازے پر روکی اور قفل کھول کر میں اور کالیا اندر آ گئے۔

واش روم وغیرہ جا کر میں اور کالیا کچھ فریش ہوئے اس کے بعد میں نے فریزر سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال لی۔ ہم دونوں نے آرام سے بیٹھ کر پانی پیا۔

خالی گھر سے مجھے اداسی سی محسوس ہونے لگی۔ بڑا بھائی ہونے کے ناطے میں فہیم اور عاصمہ کو اپنے بچوں کی طرح ہی سمجھتا تھا۔ اب ان دونوں کے بغیر یہ گھر مجھے کاٹنے کو دوڑنے لگا۔ دکھ اور کرب کے احساس تلے میرا اندر بھر آیا۔ کالیا گھر کا، بالخصوص عاصمہ کے کمرے کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ میرے پاس آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی جسے وہ غور سے دیکھتا ہوا میرے سامنے کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''کیا ہے یہ؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''لو خود ہی دیکھ لو۔'' کہتے ہوئے میری طرف وہ شے بڑھا دی۔ میں اسے دیکھنے لگا۔ وہ چوکور سا کوئی بکل نما چیز تھی۔ ابھی میں اس کے بارے میں غور کر ہی رہا تھا کہ کالیا بولا۔ ''یہ کسی مسٹینگ جینز کی بیلٹ کا کمپنی ہولڈر بکل ہے اس پر ''ایم'' کندہ تھا۔''

میں تو زیادہ تر شلوار قمیص ہی پہنا کرتا تھا، پینٹ شرٹ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

وغیرہ کا مجھے کوئی خاص کریز نہ تھا۔ کبھی کبھار پہن لیا کرتا تھا مگر کالیا کو نت نئی پینٹ اور شرٹ پہننے کا شوق تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس بکل کو دیکھتے ہی نہ صرف پہچان گیا تھا بلکہ اس کا ''میک'' بھی بتا دیا تھا۔

''تم نے شاید عاصمہ بہن کے کمرے کو کرائم سین بنا رکھا تھا۔ کیا تم نے اس کا جائزہ تک نہیں لیا تھا؟''

''نہیں یار! میں خود پریشان تھا اس وقت۔'' میں نے کہا۔

''کیا سمجھتے ہو تم کہ یہ کس کا ہو سکتا ہے؟''

''اغوا کاروں کے کسی ساتھی کا ہی ہو سکتا ہے۔'' وہ مجھ سے بکل دوبارہ لیتے ہوئے بولا۔ ''لیکن پہلے اپنی تسلی کرنا ضروری ہوگا۔ ممکن ہے یہ تمہاری یا فہیم کی پینٹ کے بیلٹ کا بکل ہو۔''

''میرے پاس تو اتنی پینٹیں نہیں ہیں، ہاں البتہ فہیم کے پاس بہت سی پتلونیں ہیں۔'' میں نے کہا تو وہ بولا۔

''سب سے پہلے گھر میں موجود سب پتلونوں کے بیلٹ چیک کرو، ایسا نہ ہو کہ بچہ بغل میں، ڈھنڈورا شہر میں، والی بات ہو جائے۔ اس کے بعد ہی کچھ سوچتے ہیں۔''

میں نے اس کی بات پر صاد کیا اور لگ بھگ کوئی پندرہ بیس منٹ میں سب دیکھ لیا۔

''نہیں، یہ ہماری کسی پینٹ کا بکل نہیں ہے۔''

''گڈ! اس کا مطلب ہے جو عاصمہ بہن کو زبردستی اٹھا کر لے گئے ہیں یہ انہی میں سے کسی ایک کی بیلٹ سے ٹوٹ کر گرا ہے، جو پہلے ہی ڈھیلا ہوگا۔'' کالیا بولا۔

میں نے اس کی بات پر غور کرنے والے انداز میں اس سے کہا۔ ''یار کالیا! کیا تجھے عاصمہ بہن کے کمرے سے ایسے شواہد نظر آتے ہیں کہ اسے کسی نے اغوا کیا ہوگا؟ جبکہ فہیم کا خیال کچھ اور تھا۔'' میں نے دانستہ ''بھاگ جانے'' کا لفظ استعمال نہیں کیا تھا جیسا کہ فہیم کا خیال تھا۔

کالیا بھی میری بات سمجھتے ہوئے اثبات میں اپنا سر ہلا کر بولا:

''خیال تو میرا بھی یہی ہے مگر یار جگری! کمرے کی حالت ظاہر یہی کرتی ہے کہ کوئی یہاں سے بڑے آرام سے نکلا ہے، جس کا مطلب ہے اغوا کاروں نے پوری پلاننگ کے تحت پہلے ریکی کی ہے اور رات کے کسی پہر یہ کام انجام دیا ہے۔''

''وہ بند گھر میں داخل کیسے ہوئے؟'' میں نے الجھ کر کہا۔

''تمہارے کھلے صحن سے انہوں نے اندر نقب لگائی ہے۔'' کالیا بولا۔ ''مجھے بیرونی اور اندرونی دیواروں کی منڈیروں پر رگڑ کے نشانات نظر آئے ہیں۔''

کالیا غلط نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ خود ایسے گروہ سے تعلق رکھتا تھا، جہاں یہ سب ہونا یا کرنا ان کے بھی بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ میں یہ سب اس لیے نہیں جانچ سکا تھا کہ میں خود اس وقت اسی پریشانی میں مبتلا تھا کہ اس سانحہ کی بھنک بھی باہر نہ پہنچے۔

''تو پھر یہ طے ہوا کہ معاملہ اغوا کا ہی ہے۔'' بالآخر میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

اسی وقت دروازے پر ہونے والی دستک سے ہم دونوں چونکے۔

''میں دیکھتا ہوں۔'' کہتے ہوئے میں دھڑکتے دل سے اٹھا۔ صحن میں آکر دروازہ کھولا تو سامنے حاجی کریم بخش کا ملازم اسلم موکا کھڑا نظر آیا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی پہلے سلام کیا پھر بولا۔

''نعمان صاحب! حاجی صاحب آپ کو یاد کر رہے تھے، میں پہلے بھی آچکا تھا۔ وہ کہہ رہے ہیں یا تو وہ خود آجائیں یا مجھے بلا لیں؟''

میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''انہیں میرا اسلام کہنا، میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔''

''جی بہتر۔'' وہ یہ کہہ کر لوٹنے لگا تو میں نے یونہی پوچھا۔

''ویسے خیریت تو ہے ناں؟''

''ہاں! خیریت ہی ہے، بس، وہ اپنے خورشید خاں والے مسئلے کے بارے میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتے تھے۔

''ان سے کہنا کہ پولیس تفتیش کر رہی ہے اور میں اپنے طور پر بھی کوشش کر رہا ہوں۔''

''جی بہت بہتر۔'' اس نے کہا اور چلا گیا۔ میں تھوڑی دیر ہونٹ بھینچے پُرسوچ انداز میں اسی طرح دروازے پر کھڑا رہا اس کے بعد جیسے ہی دروازہ بند کرنے لگا تو گلی کے بائیں جانب سے ایک نوجوان تیز تیز قدموں سے آتا ہوا نظر آیا۔

اس نے مجھے دیکھ کر اپنا ایک ہاتھ بھی لہرایا تھا کہ میں دروازہ بند نہ کروں۔

میں الجھ سا گیا اور کھڑا ہو گیا۔ وہ تقریباً بھاگتے ہوئے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

انداز میں دروازے کے قریب آیا اور پھولی ہوئی سانس سے مجھے پہلے سلام کیا۔ وہ میرے لیے اجنبی ہی تھا اور محلے کا بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ مجھے فہیم کی ہی عمر کا نظر آیا۔

''آپ کون؟'' میں نے اپنی آنکھیں ذرا سکیڑ کر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''آ..... آپ نعمان صاحب یا فہیم صاحب..... ہیں؟'' اس نے پوچھا۔ مجھے اس کے یوں پوچھنے کا انداز کچھ عجیب سا لگا۔

''جی! میں نعمان ہوں، فہیم میرا چھوٹا بھائی ہے، آپ کون ہو بھائی؟''

''میرا نام کاشف ہے..... اور.....'' اس نے اپنا اتنا ہی تعارف کروایا اور پھر نجانے کیوں آگے کچھ بولنے سے قبل ہی ہچکچاہٹ کا شکار ہونے لگا۔ پھر بولا۔

''کیا ہم بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں؟''

''مسئلہ کیا ہے آپ کا بھائی؟ ملنا کس سے ہے آپ کو؟'' میں نے اس بار قدرے بیزاری سے کہا تو وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔

''نعمان صاحب! وہ..... دراصل بات ایسی ہے کہ.....''

''اندر آجاؤ تم۔'' اچانک میرے عقب سے آواز ابھری۔ یہ کالیا تھا۔ وہ نجانے کب میرے پیچھے آن کھڑا ہوا تھا۔ ''راستہ دو اسے.....'' کالیا نے ہولے سے کہا۔

میں ایک طرف ہوگیا۔ کاشف اندر داخل ہوا۔ میں نے دروازہ بند کیا اور الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

کالیا اسے اندر آنے کا اشارہ کر کے پلٹا اور پھر ہم تینوں اندر آکر بیٹھ گئے۔ وہ دونوں تو کرسیوں پر براجمان ہوگئے، میں بیڈ پر بیٹھ گیا اور مستفسرانہ نظروں سے نووارد کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ہاں! کاشف میاں! اب کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟''

کاشف پہلے کن انکھیوں سے اردگرد کا جائزہ لینے لگا اس کے بعد اس نے کالیا پر نظر ڈال کر استفساریہ کہا۔ ''آ..... آپ، یقیناً فہیم صاحب ہیں۔''

''نہیں، میں نعمان کا دوست ہوں۔'' کالیا بولا۔ اس کی پُرغوری نظریں کاشف کے چہرے پر گڑھی ہوئی تھیں۔ وہ لڑکا پھر الجھن کا شکار نظر آنے لگا۔ مجھے لگا وہ کوئی ایسی ہی بات کرنا چاہتا تھا جو صرف میرے اور فہیم کے سامنے ہی کرنا چاہتا ہو۔ اسی لیے اس نے کالیا کو نہیم سمجھا تھا۔

میں نے اس کی الجھن دور کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ میرا بھائیوں جیسا ہی دوست ہے، تم جو کہنا چاہتے ہو، بے فکری سے کہہ سکتے ہو اور ذرا جلدی بھی، کیونکہ ہمیں ابھی کہیں جانا بھی ہے۔''

''عا..... عاصمہ نے شاید آ..... آپ سے میرا ذکر کیا ہو؟'' وہ پہلے اتنا بتا کر خاموش ہوا اور مجھ سمیت کالیا بھی چونک پڑا۔

''آگے بولو۔'' میں نے بدستور اس کے چہرے پر نظریں گاڑے رکھتے ہوئے جلدی سے کہا۔ عاصمہ بہنا کے ذکر پر میرا دل یکلخت تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ وہ آگے بولا۔

''ایسی باتیں ایک بھائی سے کرنا مناسب تو نہیں لگتیں لیکن حقیقت یہی ہے کہ میں اپنے والدین کو ہی لانا چاہتا تھا آج مگر آج سارا دن عاصمہ سے رابطہ ہی نہ ہوسکا، صبح سے اب تک جانے کتنی ہی بار میں اسے فون کرتا رہا مگر دوسری جانب سے مسلسل پاور آف ملا تو عاصمہ کی خیریت معلوم کرنے خود ہی چلا آیا۔'' وہ اتنا بتا کر چپ ہوگیا۔

کالیا اور میں نے ایک دوسرے کے چہرے کی طرف دیکھا تو کالیا نے اپنے سر کو ہولے سے اثباتی جنبش دے کر مجھے کچھ ایسا اشارہ کیا کہ میں کسی قسم کے جوش سے کام نہ لوں۔

''تم عاصمہ کو کب سے جانتے ہو؟'' میں نے بالآخر اس سے پوچھا۔

''کچھ زیادہ تو نہیں، بس یہی کوئی چھ سات ماہ ہی ہوئے ہوں گے۔''

''تم کہاں رہتے ہو؟''

''دو محلے چھوڑ کر عظیم پورہ میں۔''

''کتنے پڑھے ہوئے ہو؟''

''میں سائنس گریجویٹ ہوں ایک پرائیوٹ کمپنی میں جاب کرتا ہوں۔''

''ماں باپ کیا کرتے ہیں اور بھائی بہن؟'' میں نے اصل بات کرنے سے پہلے اس کا مختصراً بیک گراؤنڈ جاننا ضروری سمجھا۔ وہ جواباً بولا:

''میرے ابو بھی ایک پرائیوٹ کمپنی میں آفس سپرنٹنڈنٹ ہیں۔ والدہ ہیں۔ ایک بھائی ہے جو مجھ سے بڑے ہیں اور وہیں ایک الگ کرائے کے مکان میں رہتے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ہیں۔ میں، امی اور ابو ساتھ رہتے ہیں۔'' اس نے بتایا۔

مجھے کاشف نامی اس نوجوان میں کوئی برائی نظر نہیں آئی تھی۔ نیز میں نے اسے عاصمہ کے غیاب یا شبہے کی فہرست سے بھی اسی وقت خارج کردیا۔ پھر بولا۔

''کاشف! تمہارا کہنا صحیح ہے کہ مجھے عاصمہ بہنا نے تمہارے بارے میں بتا رکھا تھا اس نے بھی مجھ سے یہی کہا تھا کہ تم عنقریب اپنے والدین کو ہمارے ہاں لانا چاہتے ہو۔''

میری بات پر اس کے چہرے پر جو کچھ دیر پہلے ایک دباؤ کی سی کیفیت تھی وہ رخصت ہونے لگی۔ مجھے واقعی وہ شریف لڑکا محسوس ہوا۔ اسے کچھ بتانے سے پہلے میں نے قریب بیٹھے کالیا کی طرف کچھ ایسی نظروں سے دیکھا کہ وہ میرا اشارہ سمجھ گیا اور اس سے بولا۔

''کاشف! کیا تم واقعی عاصمہ کے ساتھ سنجیدہ ہو؟'' کاشف کو شاید اس کا یہ سوال عجیب سا لگا تھا۔ بولا۔

''جی ہاں! جناب! ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے ساتھ مخلص اور سنجیدہ ہیں۔ ہم چاہتے ہیں ایک دوسرے کو..... مگر..... کیا بات ہے میں یہاں کچھ کھینچاؤ کی کیفیت محسوس کررہا ہوں۔''

''اگر عاصمہ پر کوئی براوقت آئے تو تم کیا کرو گے؟'' کالیا نے اپنے ڈھنگ سے سوال کیا تھا اور میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ آگے وہی کاشف سے بات کرے کہ آیا اسے عاصمہ کے بارے میں کیا بتانا چاہیے تھا اور کیا نہیں۔ اسی لیے میں خاموش رہا۔

میں نے دیکھا کالیا کی بات پر کاشف کے بشرے سے پریشانی ہویدہ ہونے لگی۔ اس نے جواب دینے سے پہلے میرے چہرے پر ایک نگاہ ڈالی اور پھر کالیا کی طرف تکتے ہوئے بولا۔

''اللہ نہ کرے کوئی ایسی بات ہو مگر ہم دونوں نے تو کسی برے وقت میں بھی ایک دوسرے کا ساتھ نہ چھوڑنے کا وعدہ کررکھا تھا۔''

''تو بس پھر اپنا یہ وعدہ قائم رکھنا۔'' کالیا نے اس سے گھمبیر سے لہجے میں کہا اور وہ پریشان کن بے چینی کے ساتھ مجھ سے مخاطب ہوکر بولا۔

''میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے نعمان بھائی! پلیز آپ ہی کچھ بتائیے ناں معاملہ کیا ہے آخر؟''

''معاملہ یہ ہے کہ کل رات عاصمہ بہن کو کچھ نامعلوم افراد اغوا کرکے لے گئے ہیں۔'' کالیا نے جیسے دھماکا کیا اور کاشف یہ سن کر جیسے سکتے میں آگیا۔ پھر اس کے حلق سے اٹکتے ہوئے برآمد ہوا۔

''ی ی..... یہ کیا مذاق ہے..... ؟''

''تمہارا کیا خیال ہے کہ ہم اتنی بڑی بات مذاق میں کہہ سکتے ہیں؟'' کالیا اس کی طرف گھور کر بولا تو کاشف ایک دم ذرا خفیف سا ہوکر بولا۔

''سس..... سوری! میں پریشانی میں غلط کہہ گیا تھا مگر یہ ہوا کیسے کیا پولیس میں آپ لوگوں نے کوئی رپورٹ.....''

''ابھی سوچ رہے ہیں ہم۔'' میں نے کہا۔

عاصمہ کے اغوا کا سن کر کاشف کا چہرہ ست کر رہ گیا تھا۔ اس میں تشویش بھی پائی جاتی تھی اور گہری تفکر بھی۔

''تم بتاؤ، ہمیں کیا کرنا چاہیے؟'' کالیا نے بہ غور اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ لگتا کچھ ایسا ہی تھا کہ وہ اس لڑکے کاشف کو اپنے طور پر کسی کسوٹی میں جانچنے کی کوشش کررہا ہو۔

''مم..... کیا کہہ سکتا ہوں، اس خبر پر تو مجھے ابھی تک یقین ہی نہیں آرہا ہے کہ عاصمہ کے ساتھ اتنا بڑا سانحہ پیش آچکا ہے اور مجھے خبر نہیں تھی۔''

''ہم اگر پولیس کی مدد لیں گے تو اس میں جگ ہنسائی ہوگی۔ ہم ابھی انتظار کررہے ہیں کہ شاید اغوا کنندگان تاوان کے لیے ہم سے رابطہ کریں تو ہم کچھ آگے سوچیں۔'' میں نے کہا۔

''یہ بات بھی ٹھیک ہے، بہ صورت دیگر اگر ہم نے پولیس سے رابطہ بھی کیا تو کہیں وہ لوگ خدانا خواستہ عاصمہ کو جانی نقصان.....''

''ایک خدشہ یہ بھی ہے ہمیں۔'' کالیا نے کہا۔

''لیکن اب تو رات بھی ہوچکی ہے، کیا کوئی رابطہ کیا انہوں نے؟'' کاشف نے پوچھا۔

''نہیں''۔ کالیا نے نفی میں سر ہلایا۔ کاشف اپنے چہرے پر تشویش سمیٹے خاموش بیٹھا رہا۔

''ویسے ہم اپنے طور پر کوشش کررہے ہیں۔'' میں نے سکوت کے قفل کو توڑتے ہوئے اس سے کہا۔ ''یہ اچھا ہوا کہ تم آگئے، ورنہ ہمارا پہلا شبہ تم پر ہی تھا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے، یہ ایک فطری بات ہوتی۔'' کاشف سمجھداری سے بولا۔

''لیکن نعمان بھائی! ہمیں عاصمہ کے لیے جلد سے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

جلد کچھ کرنا ہوگا، اس اطلاع پر تو میرا سکون برباد ہو کر رہ گیا ہے۔ میں نے تو اپنی امی کو بھی بتا دیا تھا کہ!''

وہ شدید کرب تلے اپنا جملہ ہی مکمل نہ کر پایا اور پُر سوچ انداز میں اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا۔

''دیکھو بھائی! ابھی تم بھی اس سانحے کو راز میں ہی رکھنا۔'' بالآخر کالیا نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''بات تو بدنامی کی ہے مگر ہاتھ پہ ہاتھ دھرے ہم بھی نہیں بیٹھے ہوئے ہیں کیونکہ کچھ روز پہلے بھی اغوا کا ایک واقعہ..... اسی محلے میں ہو چکا ہے، کیا خبر یہ وہی لوگ ہوں، جو ایک گروہ کی صورت میں یہ ناپاک کام سرانجام دے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاتھ کچھ کلیو بھی لگے ہیں۔ تم اب اپنے گھر جاؤ اور اپنے امی ابو سے کوئی بھی بہانہ کر سکتے ہو، ہم کچھ کر رہے ہیں۔ انشاء اللہ جلد ہی کسی نتیجے تک پہنچ جائیں گے۔''

یہ کہتے ہوئے کالیا اٹھ کھڑا ہوا، اس کی دیکھا دیکھی میں نے بھی اپنی کرسی چھوڑ دی۔ کاشف بھی کھڑا ہو گیا۔ اس نے مجھ سے میرا نمبر مانگ لیا اور میں نے اس کا۔

اس کے بعد وہ پریشان پریشان سا چلا گیا۔ میں اور کالیا کمرے سے باہر نکل آئے۔ صحن میں آ کر میں بے اختیار اپنی پیشانی مسلنے لگا۔ مجھے اس قدر پریشان دیکھ کر کالیا نے تشفی آمیز انداز میں میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور اسی لہجے میں بولا۔

''ابے لے..... جگری! تو نے تو ابھی سے دل چھوٹا کر لیا۔ میں ہوں ناں! تیرے ساتھ، بے غم ہو جا، اب تک تو یہی کچھ ہو رہا تھا ناں، اب مجھے جانے دے اور ذرا اپنے طور پر کچھ کرنے دے۔ اپنا استاد بھابھا کم نہیں ہے، ایک میٹنگ میں نے آج اس کے ساتھ بھی ادھر اڈے پر لگانی ہے۔''

کالیا کی بات سے مجھے کافی حوصلہ ہوا۔ میں نے کہا۔

''یار! ایک اللہ کا اور دوسرا تیرے جیسے دوست کا ہی آسرا ہے ورنہ تو کب کا ڈھے چکا ہوتا۔''

''اللہ بہتر کرے گا۔ میں ذرا واش روم جا رہا ہوں، اس کے بعد اڈے پر چلتے ہیں۔ استاد بھابھا سے کوئی مشورہ کرتے ہیں اس کے بھی کچھ پولیس افسروں سے واقفیت ہے۔'' میں نے ہولے سے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

کالیا صحن میں بنے واش روم کی طرف بڑھ گیا اور میں اپنے کمرے میں آ گیا اور اپنا سیل فون دیکھا، کچھ میسج آئے ہوئے تھے۔ جنہیں میں دیکھ نہیں پایا تھا۔ سوائے دو میسجز کے باقی غیر ضروری تھے، ایک فوزیہ کا تھا اور دوسرا سدو بھائی کا۔

سدو بھائی کے میسج نے مجھے چونکا دیا تھا۔

''سر! آپ کہاں ہیں اس وقت؟''

یہ میسج تین گھنٹے پہلے آیا تھا جبکہ فوزیہ کا اس سے ایک گھنٹا پہلے۔ میں نے سدو بھائی کو میسج کیا کہ ''جاگ رہے ہو؟''

میرا میسج جاتے ہی اس کی کال آ گئی۔

''ہاں! سدو بھائی! خیریت؟'' میں نے بغیر کسی تمہید کے پوچھا تو وہ بولا۔

''سر! ایک اہم بات بتانا تھی۔'' وہ بولا۔

''ہاں! بولو کیا بات ہے؟'' میں نے جلدی سے کہا۔

''سر! آپ نے عزیر خان اور اس کے ساتھیوں پر اور سیٹھ ستار کے معمولات پر نگاہ رکھنے کا کہا تھا ناں کہ ان کے معمولات میں کوئی مشکوک شے محسوس کروں تو میں آپ کو فوراً آگاہ کروں؟''

''ہاں..... ہاں.....''

''سر! پہلے عزیر خان اور اس کے دوستوں کے بارے میں بتاتا ہوں، ان دونوں کو میں نے گلستان جوہر کے ایک فلیٹ میں آتے جاتے دیکھا ہے، وہ رہائشی پروجیکٹ نیا بنا ہے۔''

''یہاں تم نے کون سی خاص بات محسوس کی ہے۔ وہ بتاؤ۔'' میں نے کہا۔

''سر! کچھ ایسی خاص بات تو نہیں معلوم ہو سکی ہے، تاہم یہ ضرور ہے کہ ان تینوں کا یہ نیا ٹھکانا ہے۔''

''یہاں تم نے ان کی کوئی غیر معمولی یا مشکوک نقل و حرکت محسوس کی ہے؟''

''ابھی تک تو نہیں! لیکن میں کوشش میں ہوں کہ اندر داخل ہو کر ان کی گفتگو سن سکوں مگر اس پروجیکٹ میں سیکورٹی کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے۔ کچھ وقت لگے گا اس مہم میں۔''

''ٹھیک ہے لگے رہو کوشش میں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''اب سیٹھ ستار کے بارے میں بتاؤ..... مجھے۔''

''یس سر!'' وہ ایک دم بولا۔ ''آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے آپ کو ایک دن لاڈلہ سائیں کے بارے میں بتایا تھا، آج کل میں اسے سیٹھ ستار کے ساتھ دیکھ رہا ہوں پچھلے آجکل ان دونوں کو میں نے ملیر گوٹھ کے ایک جاگیردار حاجی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

مہران خان کے ہاں بھی آتے جاتے دیکھنے لگا ہوں۔''

''او کے گڈ! ان مذکورہ افراد کے معمولات میں مزید کچھ بھی دیکھو مجھے اسی طرح فوراً آگاہ کرتے رہنا۔'' میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

''رائٹ سر!'' سدو بھائی نے کہا اور میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

سدو بھائی نے جو کچھ مجھے بتایا تھا وہ میں پہلے ہی سے جانتا تھا۔ اسے میں ایک اتفاق ہی کہہ سکتا تھا، ورنہ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہی تھی کہ میرے ساتھ اب کالیا ہوتا تھا اور میں خود بھی پہلے سے زیادہ فعال ہو گیا تھا۔

لیکن سدو بھائی سے میں جو اُمید کیے ہوئے تھا، یعنی جس سے مجھے عاصمہ بہنا کی اغوا یا گمشدگی سے متعلق کوئی کلیو ملتا وہ پوری نہیں ہو سکی تھی۔

میں اب اس گمنام فون کال اور اس کار والوں پر غور کرنے لگا جس کی وجہ سے میں اور کالیا موت کے منہ میں جانے سے بال بال بچے تھے۔ دشمنوں کی اس چنڈال چوکڑی میں ایک نئے دشمن کا اضافہ ہو گیا تھا۔ اگرچہ یہ ''اضافہ'' غیر متوقع نہیں تھا، تاہم یہ تو ضرور ہی کہا جا سکتا تھا کہ وہ مقابل آ گیا تھا۔

دیکھا جاتا تو میرا اصل دشمن یہی تھا۔ مجھے اپنے اسی دشمن سے نمٹنا تھا۔ یہی وہ شخص تھا جس نے میرے شریف اور سادہ لوح باپ کو قربانی کا بکرا بنا کر اپنا کوئی بڑا مقصد حاصل کیا تھا۔ اسی دشمن نے میری زندگی کا ڈھب بدل کر رکھ دیا تھا۔ یہی وہ دشمن تھا جو کسی بھیانک عفریت کی طرح سات پردوں میں چھپا ہوا تھا اور اب سامنے آنے لگا تھا اور ظاہر ہے میں اسے اپنی کامیابی طرف بڑھتا ہوا پہلا قدم ہی سمجھوں گا کہ میری کوششوں نے بالآخر اسے بلی کو تھیلے سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔

سات پردوں میں چھپا ہوا دشمن ظاہری دشمن سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ یہ دشمن مجھے ہر صورت میں کوئی بھی موقع دیئے بغیر ختم کر ڈالنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے آناً فاناً اپنے اس مذموم مقصد کے لیے خود حرکت میں آنا از بس ضروری سمجھا تھا۔

اب میرے نزدیک سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ آیا عاصمہ کے اغوا میں اسی کا ہاتھ ہو سکتا تھا یا پھر دشمن کے کسی دوسرے گروپ کا۔

حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے مزید غور کیا تو یہی سمجھ آیا کہ مجھے بہن اور بھائی کے حوالے سے اب تک دھمکیاں دینے والا لینڈ مافیا گروپ تھا۔ ازیں علاوہ..... اغوا سے متعلق کوئی تیسرا چکر بھی ہو سکتا تھا۔

عاصمہ بہن کو اغوا یا غائب ہوئے چوبیس گھنٹے بیتنے والے تھے اور میرے اندر اس کی سلامتی سے متعلق طرح طرح کے اندیشناک وسوسے کوڑیالے ناگ کی طرح ڈسنے لگے۔ دل گھٹنے لگتا اور دماغ سن سا ہونے لگتا تھا۔ فہیم اور عاصمہ میرے چھوٹے بھائی بہن تھے اور ان کی ذمے داری میرے ہی شانوں پر تھی۔

باپ کے مرنے کے بعد میں نے ہی انہیں باپ جیسا لاڈ اور پیار دے رکھا تھا۔ فہیم اور عاصمہ میرے بچوں کی طرح تھے۔ فہیم ناراض ہو کر پتا نہیں کہاں چلا گیا تھا اور عاصمہ اغوا تھی۔ خالی گھر مجھے کاٹنے کو دوڑ رہا تھا ایسے میں مجھ جیسے حرماں نصیب کا دل و دماغ زبردست انتشار کی زد میں تھا، ساتھ ہی مجھے فہیم کے اس رویے پر دکھ بھی ہوا تھا، اس نے بے صبری اور غیر ذمے داری کا ثبوت دیا تھا۔ اس مشکل گھڑی میں اسے میرے ساتھ ہونا چاہیے تھا مگر وہ بدنامی کے خوف سے پہلے ہی گھر چھوڑ گیا۔

دفعتاً ہی میں انتشار زدہ خیالات سے چونکا۔ میسج کی بپ ابھری۔ میں نے دیکھا فوزیہ کا میسج تھا۔ ایسی دکھ بھری اور پُرمصلوب گھڑی میں فوزیہ کے تصور نے مجھے کچھ سنبھالا دیا، دل کرتا تھا کہ کوئی ایسا ہو جو جسم و جاں کے ہی نہیں بلکہ روح سے بھی قریب تر ہو اس سے اپنے دل کی بھڑاس نکالی جائے۔

یہ اس کا دوسرا میسج تھا۔ پہلا والا پڑھنے کے بعد میں اس سے رابطہ کرنے کا سوچ رہا تھا۔

میں نے ریپلائی کیا کہ وہ جاگ رہی ہے میں اسے کال کر سکتا ہوں؟

جواب آیا۔ ''کوئی خاص بات ہے؟ دن بھر کہاں رہے؟ خیریت تو ہے ناں؟''

میں نے مختصراً ریپلائی کیا۔ ''خیریت نہیں ہے، آسانی سے بات کر سکتی ہو تو ٹھیک ہے، ورنہ کل صبح میں کر لیتے ہیں، پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''

اس کا جواب آیا۔

''کمال کرتے ہیں آپ بھی..... خیریت بھی نہیں ہے اور مجھے پریشان نہ ہونے کا بھی کہہ رہے ہیں۔ چند منٹ بعد

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

فون کرتی ہوں۔ مجھے فکر ہوگئی ہے۔''

اس کے جواب سے مجھے حوصلہ سا ہوا۔ وجہ اس کی یہی تھی کہ میں خود بھی اس سے عاصمہ کے اغوا سے متعلق بات کرنا چاہتا تھا۔ انسان جب گونا گوں پریشانیوں کا شکار ہو تو اور کسی مشکل میں بھی تو چاہتا ہے کہ کسی اپنے سے بھی حال و احوال کرے اس.... کا مشورہ دیکھنے کی کوشش کرے۔

چند منٹوں بعد اس کی رنگ آگئی۔ میں نے جلدی سے کال ریسیو کی۔

''ہیلو'' اس کی دل و دماغ میں اترتی ہوئی مترنم سی آواز ابھری۔ جو اس مشکل گھڑی میں بھی دل و دماغ کو سرشار کرگئی۔ میں نے اسے عاصمہ کے متعلق یہ بری خبر سنائی تو دوسری جانب سے اس کی فوراً ہی کپکپاتی ہوئی سی آواز برآمد ہوئی۔

''نن..... نعمان! یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟''

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔'' میں نے پژمردہ لہجے میں کہا تو وہ بڑے کرب انگیز سے لہجے میں بولی۔ ''مجھے یقین نہیں آرہا..... کیسے ہوگیا یہ؟ اللہ عاصمہ بہن کی عزت و زندگی سلامت رکھے۔''

''آمین'' میں نے زیر لب کہا تو وہ سسکتے ہوئے انداز میں بولی۔ ''نعمان! اللہ آپ کی مدد فرمائے، یہ بتائیں کہ آپ نے اب تک کیا کیا ہے عاصمہ بہن کی تلاش کے سلسلے میں پولیس کو انفارم کیا؟''

''نہیں، مجھے کا ہی شکار ہوں۔'' میں نے دل میں ابھرنے والی درد و کرب کی لہر کو دباتے ہوئے جواب دیا۔ ''تمہیں تو پتا ہے کہ یہ معاملہ ہی ایسا حساس نوعیت کا ہے کہ پولیس جگ ہنسائی پہلے کرتی ہے اور مجرم کو بعد میں تلاش کرتی ہے۔''

''یہ غلط ہے نعمان!'' وہ ایک دم بولی۔ ''میرے خیال سے آپ کو ابھی تک کسی ذمے دار پولیس افسر سے رابطہ کرکے اسے ساری بات بتا دینا چاہیے تھی۔ ان سے مدد لینا آپ کا قانونی حق ہے، آپ نے غلطی کردی، تب تم کیا کرسکے ہو؟''

فوزیہ نے شدید تفکیر سے یہ کہا تو میرے اندر ایک۔ چھناکا سا ہوا۔ پل کے پل مجھے یوں لگا جیسے میں بہن کے معاملے میں خودغرضی سے کام لیتا رہا ہوں، مجھے اپنی بدنامی کی پروا تھی مگر بہن کی نہیں حالانکہ کالیا نے بھی مجھے یہی مشورہ دیا تھا۔ یہی سب تھا کہ جب میں بولا تو میرا لہجہ واضح طور پر لڑکھڑا رہا تھا۔

''شش..... شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو فوزی! میں نے اگرچہ ایسا کرنے کا سوچا بھی تھا مگر.....'' میری آواز حلق میں ہی اٹک گئی۔ اسی وقت بات کے دوران کچھ ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے کسی کی کال آرہی ہو۔ میں.... اسے ہولڈ نہیں کرانا چاہتا تھا تاہم اس سے تھوڑی اور باتیں کرکے رابطہ منقطع کردیا اور دیکھا، کوئی ان نون نمبر تھا۔ میری پیشانی پر سلوٹیں نمودار ہوگئیں۔

میں نے اس پر کال بیک کرنا مناسب نہیں سمجھا البتہ اس نمبر پر میں نے رابطہ کیا جس پر مجھے دھمکی دی گئی تھی جس وقت میں اور کالیا تھانے جارہے تھے۔

اسی وقت کالیا کمرے سے نکلا وہ واش روم سے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ وہاں سے نکلا تو ہم گھر سے باہر نکل آئے۔

اس کے بعد میں نے دروازے کو تالا لگایا اور ہم دونوں کار میں ایک بار پھر روانہ ہوگئے۔

اڈے پر پہنچے تو استاد بھابھا موجود تھا۔ کالیا نے اسے سب بتا دیا، استاد بھابھا نے پُرسوچ انداز میں اپنی بھنویں سکیڑ لیں۔ وہ چند ثانیوں تک بولا نہیں۔ کالیا نے اسے آج والے سارے حالات سے بھی آگاہ کردیا تھا۔

تھوڑی دیر... خاموشی میں مستغرق رہنے کے بعد استاد نے ہم دونوں سے کچھ سوالات پوچھے۔ اس کے بعد اپنا سیل فون نکال کر کسی سے بات کرنے لگا۔

''ہاں! میں بول رہا ہوں۔ کہاں ملے گا تو اس وقت؟''

استاد بھابھا نے فون پر کسی سے پوچھا تھا۔ پھر دوسری طرف سے وہ یہ سب سنتا رہا۔ اس کے بعد بولا۔ ''اچھا ٹھیک ہے، میں ان دونوں کو بھیج رہا ہوں، ایس پی صاحب سے ان کی رہائش گاہ میں ہی ملاقات ہوجائے تو یہ زیادہ بہتر ہوگا، کیونکہ معاملہ ذرا حساس نوعیت کا اور رازداری کا بھی ہے۔ چلو ٹھیک ہے، ابھی بھیج رہا ہوں میں۔''

یہ کہہ کر استاد نے سیل فون اپنے ہاتھ میں پکڑے رکھتے ہوئے ہی ایک نظر مجھ پر ڈالی اور پھر کالیا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم ضمیر شاہ کے ہاں چلے جاؤ، وہ تمہیں اے ایس پی خادم حسین کے پاس لے جائے گا۔''

''ضمیر شاہ؟'' کالیا نے سوالیہ نظروں سے استاد بھابھا کی طرف دیکھا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''ہاں! کیوں، کیا تم اسے نہیں جانتے؟ نہیں پتا تمہیں اس کا ٹھکانا؟'' استاد بھابھا نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''نن..... نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں استاد! بھلا ضمیر شاہ کو میں نہیں جانوں گا تو اور کون جانے گا۔'' کالیا نے عجیب سے انداز میں کہا۔ ''ٹھیک ہے استاد ہم ابھی نکل جاتے ہیں۔'' کالیا فوراً بولا۔

''ذرا ٹھہر جاؤ..... اس کا فون آنے دو..... پہلے وہ ان سے رابطہ کر کے بتائے گا۔''

میں نے کن انکھیوں سے کالیا کی طرف دیکھا تھا اس کا چہرہ مجھے کسی الجھن کا شکار نظر آرہا تھا۔ جسے شاید صرف میں ہی محسوس کر سکا تھا۔

تھوڑی دیر گزری تو ضمیر شاہ کا فون آگیا۔ جسے ریسیو کرنے کے بعد استاد بھابھا نے ہمیں جانے کی اجازت دے دی۔

میں اور کالیا روانہ ہو گئے۔ کار اس پار کالیا ہی چلا رہا تھا۔ اسے بائیک کے علاوہ کار بھی چلانا آتی تھی۔ میں اس کے برابر والی سیٹ پر براجمان تھا۔

میں ضمیر شاہ کو نہیں جانتا تھا لہٰذا کالیا سے بولا۔ ''یہ ضمیر شاہ تمہارا ہی ساتھی ہے؟''

''ساتھی نہیں ہے ہمارا یہ.....'' کالیا نے دونوں ہاتھوں سے اسٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے اور نظریں ونڈ اسکرین پر مرکوز رکھتے ہوئے جواب دیا۔

''وہ استاد بھابھا کا حلیف گروہ ہے۔ کبھی وہ ہمارے گروہ میں ہوتا تھا، گروہ میں استاد بھابھا کے بعد اس کی حیثیت نمبر دو کی تھی۔''

''اچھا!'' میں تھوڑا چونکے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ پھر اس سے بولا۔ ''میں نے محسوس کیا تھا کہ تم اس کے ذکر پر تھوڑا الجھ سے گئے تھے، کوئی خاص وجہ؟''

میری بات پر اس نے ایک لمحے کے لیے اپنی نظریں ونڈ اسکرین سے ہٹائیں تھیں اور میرے چہرے کی طرف عجیب مسکراتی نظروں سے دیکھا تھا پھر دوبارہ سامنے نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ''ابے لے..... جگری! تو بھی چھپا رستم ہے، بندے کو تو فوراً ایسے تاڑ لے گا کہ بس! تیری نظریں ہیں یا ایکسرے مشین؟''

میں غیر تاثراتی انداز میں ہلکے سے مسکرا کر رہ گیا۔ وہ بھی چپ رہا۔ میں نے پوچھا۔

''اس کا ٹھکانا کہاں ہے؟ میرا مطلب ہے ہم کس علاقے کا رخ کیے ہوئے ہیں؟''

''لانڈھی جا رہے ہیں، وہاں سے گودام چورنگی..... وہیں اس کا ٹھکانا ہے۔''

لگ بھگ ایک گھنٹے کے اندر ہم مذکورہ علاقے میں پہنچ گئے۔

کالیا نے ضمیر شاہ کے بارے میں صرف اسی قدر ہی بتایا تھا کہ اس کے کسی اے ایس پی خادم حسین سے اچھے تعلقات تھے۔ ہم وہاں پہنچے تو اس کے بڑے سے مکان سے ملحقہ ایک اوطاق نما کمرے کے دروازے کا ایک پٹ کھلا نظر آیا۔ اس کے باہر ایک کار اور دو موٹر سائکلیں سائیڈ اسٹینڈ کے ساتھ کھڑی تھیں۔

کالیا نے کار سیدھی وہیں لے جا کر روکی۔ جب تک ہم کار سے اترتے کہ ایک آدمی اس اوطاق سے باہر آگیا۔ اندر اور بھی چند لوگ مجھے بیٹھے نظر آئے۔ مذکورہ آدمی نے باری باری ہم سے ہاتھ ملایا اور کالیا نے اس سے ضمیر شاہ کا پوچھا۔ ''وہ اندر ہی ہیں۔ آپ کو استاد بھابھا نے ہی بھیجا ہے ناں؟''

''ہاں!'' کالیا نے مختصراً جواب دیا۔

''آجاؤ اندر۔'' اس نے کہا اور اوطاق کی طرف بڑھا۔ میں اور کالیا ایک دوسرے کے آگے پیچھے چلتے ہوئے اوطاق میں داخل ہوئے۔ اندر پانچ چھ افراد موجود تھے۔ وہ بھی رخصت ہونے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور ایک لمبے سے دبلے پتلے اور گندمی چہرے والے شخص سے بڑے ادب سے ہاتھ ملا کر نکل گئے۔

اب وہاں ہمارے اور اس شخص کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔

کالیا اس دبلے پتلے اور دبنگ سے نظر آنے والے آدمی سے ملا۔

''کیا حال ہیں شاہ صاحب؟ یہ میرا دوست ہے نعمان احمد۔'' مجھے ان دونوں کے ملنے کا انداز سرسری سا ہی لگا تھا۔ میں نے بھی ضمیر شاہ سے ہاتھ ملایا اور اس نے ہمیں بیٹھنے کا کہا۔

وہاں کرسیاں اور ایک لوہے کی پائپوں والا بیڈ بچھا ہوا تھا۔ ضمیر شاہ خود اس پر پاؤں جھلائے بیٹھ گیا جبکہ کالیا اور میں نے اس کے سامنے والی دو کرسیاں سنبھال لیں۔

''کچھ منگواؤں یا چلیں؟'' ضمیر شاہ نے کالیا کی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

طرف دیکھ کر کہا۔

''چلنا ہی بہتر رہے گا، رات بھی کافی ہونے والی ہے۔'' کالیا نے کہا اور پھر یوں ہم کوئی چند منٹوں بعد ہی روانہ ہوگئے۔

ضمیر شاہ کی رہائش گاہ قریب ہی تھی۔ کالیا کار چلا رہا تھا اور ضمیر شاہ اس کے برابر والی سیٹ پر تھا میں عقبی نشست پر بیٹھ گیا۔

اے ایس پی خادم حسین کی بنگلا نما رہائش گاہ پر ہم دس، پندرہ منٹ میں پہنچ گئے تھے اور وہ ہمارا ہی منتظر تھا کیونکہ ضمیر شاہ نے اس سے فون پر بات کر کے وقت مانگ لیا تھا۔

ہمیں کسی ملازم نے ایک شاہانہ سی نشست گاہ میں بیٹھا دیا تھا جو اعلیٰ درجے کے فرنیچر سے مزین تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک قد آور اور پختہ العمر کا صحت مند سا شخص برآمد ہوا، اس نے ہلکا پھلکا کھلا ڈلا شلوار سوٹ پہن رکھا تھا۔ ہم نے باری باری اس سے ہاتھ ملایا اور پھر ضمیر شاہ نے ہمارا مختصر تعارف کروایا۔ اس کے بعد کالیا کو اس نے اشارہ کیا کہ معاملے کی بات کرے۔

کالیا نے ہولے سے کھنکھار کر اپنا گلا صاف کیا اور پھر پہلے میرے بارے میں مختصراً بتانے کے بعد اس نے اصل حقیقت اے ایس پی خادم حسین کو بتا ڈالی۔ اس کے بعد اس نے مجھ سے کچھ سوالات پوچھے، جو روایتی طرز کے تھے۔ اس میں کچھ ایسے سوالات بھی تھے جنہیں بتاتے ہوئے مجھے شرم سی محسوس ہوئی تھی مگر معاملہ ہی یہ ایسی حساس نوعیت کا تھا کہ وہ بھی پوچھنے پر مجبور تھے اور میں بتانے پر۔

اس کے بعد انہوں نے مجھ سے ایک تحریری بیان لیا اور کچھ تفاصیل لکھوائیں، پھر دو روز بعد ہمیں اپنے بن قاسم والے تھانے آ کر ملاقات کرنے کا کہا۔

اس کے بعد ہم ان کا شکریہ ادا کر کے ضمیر شاہ کے ساتھ ہی اس کی رہائش گاہ کے سامنے اوطاق کے دروازے پر رکے، گاڑی سے اتر کر ہم نے اس کا بھی شکریہ ادا کیا اور پھر اس سے بھی رخصت چاہی تو ضمیر شاہ، کالیا کے کاندھے کو ہولے سے تھپتھپاتے ہوئے عجیب سے لہجے میں اس سے بولا۔ ''کالیا! میں تجھے اچھی طرح جانتا ہوں، تو یاروں کا یار ہے۔ استاد بھابھا کے ہی نہیں بلکہ تیرے بھی مجھ پر کافی احسانات ہیں۔ مجھے تمہارے اس دوست (اس کا اشارہ میری طرف تھا) کی مدد کر کے خوشی ہوگی۔''

میں نے دیکھا کالیا نے کچھ غور کرنے والے انداز میں ضمیر شاہ کے چہرے کی طرف دیکھ کر ہولے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی تھی مگر منہ سے کچھ بولا نہ تھا اس کے بعد وہ اسے سلام کر کے کار میں بیٹھ گیا۔ میں نے ضمیر شاہ سے آخر میں ممنون انداز میں رخصتی چاہی تھی اور کالیا کے برابر والی سیٹ پر براجمان ہوگیا۔

''کیا بات ہے کالیا! تو مجھے اس شخص سے کچھ کھنچا کھنچا سا نظر آیا تھا؟ خیریت تو ہے ناں؟'' گاڑی مین روڈ پر آئی تو میں نے اپنے اندر کی الجھن مٹانے کی غرض سے کالیا کو مخاطب کر کے پوچھ ہی لیا تو وہ مختصراً بولا۔

''میں اس آدمی سے کسی قسم کی مدد نہیں لینا چاہتا تھا۔''

''کیوں؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''بہ قول تمہارے یہ آدمی تمہارے استاد بھابھا کا حلیف گروہ ہے اور پھر ضمیر شاہ تو تمہارے احسانوں کو بھی یاد رکھے ہوئے تھا۔''

''اچھا جگری! چھوڑ اس بات کو یہ ہمارے اندر کے معاملات ہیں، تو نہیں سمجھے گا۔ اب اے ایس پی خادم حسین سے ملاقات کے بعد تو تیری کچھ تسلی تو ہوگئی ناں؟''

کالیا نے میری بات کا جواب گول کرتے ہوئے کہا تو میں بے اختیار ایک گہری سانس خارج کر کے بولا۔

''بس یار! کالیا، تسلی تو مجھے تب ہی ہوگی جب عاصمہ بہن میری آنکھوں کے سامنے ہوگی۔''

اڈے تک سفر خاموشی سے گزرا۔ کالیا نے مجھے اس تاکید کے ساتھ، تسلیوں تشفیوں کے بعد رخصت کر دیا کہ صبح ہونے تک یا بعد میں کسی بھی قسم کی کوئی غیر معمولی بات ہو، میں اسے آگاہ ضرور کروں اور خود سے کوئی عملی قدم اٹھانے کی غلطی بھی نہیں کروں گا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور گھر لوٹ آیا۔

گھر ایک بار پھر مجھے کاٹنے کو دوڑنے لگا۔ کچھ اُمید پیدا ہوئی تھی مگر یہ بس ایسی ہی اُمید تھی جیسے دریا میں تنکے کا سہارا۔ اب مجھے عاصمہ کے ساتھ ساتھ فہیم کی بھی فکر ستانے لگی تھی۔ وہ ناراض ہو کے گھر سے نجانے کہاں چلا گیا تھا۔ میں اس کے بس چند دوستوں سے ہی واقف تھا اور ان کے سیل نمبرز بھی چند ایک کے ہی تھے میرے پاس وہاں فون کر کے میں نے پوچھ لیا تھا مگر وہ وہاں نہیں تھا۔

اس نازک گھڑی میں مجھے فہیم کے رویے نے بہت افسردہ کر دیا۔ عاصمہ پہلے ہی غائب تھی اور اب فہیم بھی چلا گیا تھا۔ لوگوں کے ذہنوں میں ان کے غیاب سے متعلق

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

بہت سے سوالات ابھر سکتے تھے۔

فہیم ہوتا تو عاصمہ کا معاملہ ظاہر نہ ہوتا مگر اب فہیم نے اپنی خود ساختہ گمشدگی سے اس حساس معاملے کو اور بھی ابھار دیا تھا۔ لوگ اگر عاصمہ کے بارے میں نہیں تو اس کے بارے میں ضرور پوچھتے۔ عاصمہ سے متعلق ایک حد تک سو بہانے تھے مگر فہیم تو باہر آتا جاتا تھا۔ میں اس کے بارے میں محلے والوں کو کیا بتاتا؟ اور کب تک بات چھپاتا؟

میں خود کو بالکل اکیلا اور تنہا محسوس کرنے لگا۔ کھانے کا جی نہیں کیا اور بستر پر جا کر دراز ہو گیا۔

اس دوران چاچا انور شاہ کا بھی فون آیا تھا، میں نے انہیں اب تک کی صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ وہ بھی بہت پریشان تھے۔ انہوں نے مجھے عاصمہ کی برآمدگی تک لاری اڈے آنے سے منع کر دیا تھا۔ میں نے انہیں دھمکی آمیز فون اور بم پھینکیں جانے سے متعلق نہیں بتایا تھا۔

بہت سے معاملات تھے جنہیں مجھے ہی فیس کرنا تھا۔

نامساعد اور دگرگوں حالات کا ایک جھکھٹا سا تھا جو کسی تار عنکبوت کی طرح مجھے جکڑے ہوئے تھا۔ یہ کچھ میری اپنی ہمت تھی اور کالیا کا ساتھ تھا کہ میں انہیں فیس کر رہا تھا ورنہ تو کب کا ڈھے چکا ہوتا۔ ساتھ ہی مجھے محتاط رہنے کی بھی ضرورت تھی، کیونکہ میرے دشمن درپردہ ہی نہیں بلکہ منظرِ عام پر بھی مجھے گزند پہنچانے کے لیے میدان میں اتر آئے تھے۔

میں اپنی سکت کے مطابق ان سے دو چار ہاتھ کر رہا تھا۔ بخشا میں نے بھی نہیں تھا۔ تاہم مجھے اپنی کم مائیگی کا بھی احساس تھا۔ دشمن طاقت ور تھے اور میں اکیلا تھا۔ کیا حیثیت تھی میری ان ارضی خداؤں کے آگے۔

میں بستر پر پڑا، بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ بار بار یہی سوچے جا رہا تھا کہ آخر عاصمہ بہنا کو کن لوگوں نے گھر سے اغوا کیا اور ہم دونوں بھائیوں کو اس کی ہوا تک نہ لگی۔ فہیم تو خیر یہ ماننے کو ہی تیار نہ تھا کہ عاصمہ اغوا ہوئی تھی لیکن مجھے پورا یقین تھا کہ وہ اغوا ہوئی تھی۔

اچانک میرے سیل کی بیل گنگنائی۔ میں چونک پڑا۔ وقت رات کا تھا اور بارہ بجنے والے تھے۔

موبائل میرے سرہانے ہی تھا، میں نے اسے اٹھایا۔ اسکرین پر نمبر دیکھا۔ بالکل نیا نمبر تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکا۔ میں نے فون کان سے لگا کر 'ہیلو' کہا۔

''بھیا! بھائی جان..... مم..... مجھے بچالو..... ی ی ..... لوگ مجھے..... آہ.....''

دوسری جانب سے عاصمہ کی ہراساں اور سسکتی ہوئی آواز نے مجھے ایک دم بستر سے اچھلنے پر مجبور کر ڈالا۔

''عاصمہ! مم..... میری بہن! کہاں ہو؟ کیسی ہو اور ..... اور.....'' میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ دوسری جانب سے اس بار عاصمہ کی بجائے ایک کرخت سی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ''مسٹر نعمان! تمہاری بہن زندہ ہے اور باآبرو بھی..... تسلی ہو گئی ہے تو معاملات کی بات کرتے ہیں۔''

میرے اعصاب یک دم تن گئے۔ میں یہی تو چاہتا تھا کہ اغوا کنندگان کا فون آجائے تو صورتِ حال کچھ واضح ہو۔ لہٰذا میں اپنے مختل پڑتے حواسوں پر یکلخت قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''میں..... میں تیار ہوں، کتنا پیسا چاہیے؟''

''تمہارے جیسے نجانے کتنے پھٹیچر ہمارے پیروں کے نیچے رہتے ہیں، بھلا تم ہمیں کتنے پیسے دے سکتے ہو۔'' دوسری طرف سے وہی کرخت آواز، استہزائیہ انداز میں ابھری تھی۔

''کیا چاہتے ہو مجھ سے تم لوگ؟'' میں نے خشک پڑتے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا، ساتھ ہی میں اس آواز کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگا، جو ہنوز میرے لیے اجنبی ہی تھی۔

وہ زہرخند سے لہجے میں بولا۔ ''لاری اڈے سے دست بردار ہو جاؤ۔''

اس کا مطالبہ سنتے ہی میری کنپٹیوں میں دھڑکن گونجنے لگیں۔ لینڈ مافیا کے ان تمام ارضی خداؤں کے چہرے میری آنکھوں کے سامنے رقص ابلیس کرتے ہوئے نظر آنے لگے۔ ان میں سرفہرست چہرہ سیٹھ ستار اور حاجی مہران خان کا تھا لیکن چوں کہ ابھی تک حاجی مہران کا براہ راست مجھ سے ٹکراؤ نہیں ہو پایا تھا، جو خود سیٹھ ستار کی پشت پناہی کر رہا تھا۔ تاہم سیٹھ ستار کا مجھ سے اس معاملے میں کئی بار سامنا ہی نہیں ٹکراؤ بھی ہو چکا تھا۔ میرے بھائی اور بہن سے متعلق اس کی مکروہ دھمکیوں کی گونج بھی ہنوز میری سماعتوں میں کم نہیں ہوئی تھیں۔

''میں اس زمین کا مالک نہیں ہوں، میں تو خود ایک ادنیٰ ملازم ہوں۔''

''بکواس بند کرو، یہ بول بچن کسی اور کے ساتھ کرنا۔'' دوسری جانب سے غراتی ہوئی زہریلی آواز ابھری۔ ''ہم ہی نہیں تم بھی یہ حقیقت اچھی طرح جانتے ہو کہ ملیر کے اس لاری اڈے کو ہائی وے کی طرف منتقل

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کرانے کے سارے احکامات کو رد کرنے اور ان کے آگے سینہ سپر ہونے والا کون ہے، کس نے عوامی کارڈ کھیلتے ہوئے ہمارے منصوبوں کو خاک میں ملایا۔ اس لیے اب اور کوئی ہینکی پھینکی مارنے کی بجائے صرف کام کی بات کرو۔ ہاں، یا نہیں۔ ورنہ میں رابطہ منقطع کردوں گا۔

اس کی بات سن کر میں نے جلدی سے اپنے خشک پڑتے ہونٹوں کو زبان سے تر کیا اور بولا۔ ''مجھے منظور ہے مگر اس میں وقت لگے گا، چوں کہ یہ سب رازداری سے کرنا ہوگا تاکہ مجھ پر شبہ بھی نہ کیا جائے۔ میری نوکری کا بھی معاملہ ہے۔ تم میری بہن کو چھوڑ دو۔''

جواباً دوسری جانب سے ایک استہزائیہ ہنسی کی آواز ابھری تھی پھر اسی لہجے میں کوئی بولا۔ ''تم پر شبہ تمہاری نوکری، یہ سب گیا بھاڑ میں ہمیں اس کی کوئی پرواہ نہیں، بات صرف ہمارے کام کی ہوگی، تمہاری نہیں، ہماری طرف سے سارے انتظامات مکمل ہیں۔ کل ایک پارٹی آئے گی تمہارے پاس۔ جو ایجنڈا لائیں، اس سمیت سارے معاملات پر تم اپنی رضامندی دو گے، اس کے لوٹنے کے ٹھیک دو گھنٹوں بعد تمہاری پیاری، خوبصورت اور جوان کنواری بہن جیسے گھر سے اٹھائی گئی تھی اسی طرح وہاں بٹھا دی جائے گی، اب ہاں یا نہ... میں جواب سنیں گے ہم۔''

''ہاں..... ہاں! مم مجھے منظور ہے۔'' میں نے فوراً کہا۔

''گڈ.....'' دوسری جانب سے مختصراً کہا گیا اور اس کے ساتھ ہی رابطہ بھی منقطع ہوگیا۔

میرے اندر سائیں سائیں ہو رہی تھیں۔ اعصاب شکستہ اور حواس منتشر سے ہو رہے تھے۔

''سیٹھ ستار..... سیٹھ ستار.....'' اسی مردود کا نام بار بار میرے دل و دماغ میں گردش کرنے لگا۔

مجھے کالیا کی وہ بات یاد آنے لگی تھی اور بعد میں، اس پر میں نے بھی صاد کرتے ہوئے بالآخر ہامی بھر لی تھی کہ اب لوہے کو لوہے سے کاٹنا اور زہر کو زہر سے بجھانا ضروری ہوگیا ہے۔ ہم سیٹھ ستار کی املاک کو نقصان پہنچا کر اسے اسی زبان میں جواب دینے کا ارادہ باندھ چکے تھے کہ بعد میں دیگر معاملات میں الجھا دیئے گئے۔

میں نے کچھ سوچتے ہوئے وال کلاک پر نظر ڈالی۔ رات کے دو بجنے والے تھے۔ صبح ہونے اور زبردستی کی اس ''ڈیل'' کو پورا ہونے میں ابھی چند گھنٹے باقی تھے۔ اس سے پہلے مجھے اینٹ کا جواب پتھر سے دینا تھا، مگر کیسے؟ اب تو شاید اس کا بھی وقت نہیں رہا تھا۔ یہ کام تو مجھے بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا، بہ قول کالیا کہ ''جگری! قانون کا پہاڑا پڑھتے پڑھتے تم بوڑھے ہو جاؤ گے۔ دشمن اپنے سارے ہتھکنڈے استعمال کر رہا ہے اور ہم اپنے ہاتھ میں نازک سی چھڑی پکڑے ہوئے ہیں۔ ایسا نہیں چلے گا۔''

اس کی بات صحیح تو تھی۔ ہر طرف سے ناکامی کے بعد دشمن نے بالآخر اپنی دھمکی کے مطابق ترپ کا آخری پتا پھینک دیا تھا اور ایک ایسا ٹرمپ کارڈ کھیلا تھا، جس کے بعد مجھے سوائے بندگلی کے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ کٹھن راستوں کی اس بندگلی سے میں سر ٹکراتا رہتا اور دشمن اپنا کام کرتے رہتے۔

میرے پاس یوں بھی اب اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا کہ میں اینٹ کا جواب پتھر سے ہی دوں۔ پھر آر یا پار۔

لاری اڈے کا معاملہ اگر صرف میرے ذاتی مفادات تک محدود ہوتا تو ایسے ایک ہزار لاری اڈے میں اپنی بہن پر قربان کر دیتا، مگر میرا اللہ جانتا تھا کہ لاری اڈے کی اس زمین سے میرا رتی برابر بھی مفاد نہ تھا، بلکہ اس زمین کا تعلق مفاد عامہ سے تھا۔ ہزاروں لوگ اس لاری اڈے سے مستفید ہوتے تھے۔ محض ایک لینڈ مافیا کے ذاتی اور مالی مفادات کی خاطر اس زمین کا کسی دور دراز علاقے میں منتقل ہو جانے کا مطلب، غریب اور متوسط لوگوں سے ایک سہولت کا چھن جانا تھا۔

ہاں! اگر اس زمین پر اس کی جگہ عام لوگوں کے لیے اس سے زیادہ فائدے کی چیز بنائی جاتی تو بات تھی مگر میں جانتا تھا کہ یہ وسیع و عریض پلاٹ محض فرد واحد کے اپنے ذاتی اور مالی مفادات کے لیے چاٹنا کٹنگ کی صورت میں اس کی تجوری بھرنے کے سواء کچھ نہ ہوتا۔

رات کے دو بج رہے تھے۔ کالیا یقیناً سو گیا ہوگا۔ آج وہ بے چارہ یوں بھی سارا دن ہی میرے ساتھ خجل ہوتا رہا تھا مگر اس کی تاکید بھی مجھے یاد تھی جو اس نے رخصت ہوتے وقت مجھے کی تھی۔ شاید اسے بھی ایسی کسی بات کا شبہ تھا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ اسے تکلیف نہ دوں مگر مجھے ڈر تھا کہ وہ ناراض نہ ہو جائے۔ پہلے بھی ایک بار ایسا ہو چکا تھا۔ وہ بہت خفا ہوا تھا۔ شاید وہ جانتا تھا کہ میرے پاس وہ ہتھیار نہیں، جس سے دیدہ و نادیدہ دشمنوں کو اس طرح کا جواب

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

دیا جاتا ہے۔ دشمن کا پورا گروہ میرے خلاف سرگرم تھا اور میرے ساتھ کون تھا؟ صرف کالیا..... میں شریف تھا اور کالیا شریف بدمعاش! وہ بھی ویسا ہی ہتھیار رکھتا تھا جو دشمن رکھتے تھے۔

میں نے اسی وقت کالیا کے سیل پر رابطہ کرلیا۔

تیسری رنگ پر اس کی نیم غنودہ سی آواز ابھری تھی۔ میں نے اسے اس فون کے بارے میں بتایا تو وہ جیسے یک دم جاگ پڑا اور صرف اسی قدر بول کر رابطہ منقطع کردیا کہ وہ اسی وقت میرے ہاں پہنچ رہا ہے۔

کالیا میرا کیا لگتا تھا؟ دوست، بھائی، جاں نثار ساتھی۔ میرا اس سے خون کا کوئی رشتہ نہیں تھا مگر اس کی دوستی کے انمٹ رشتے نے سارے خونی رشتوں کو بھی مات دے دی تھی۔ فقط ایک بار ہی تو میں نے اس کی جان بچائی تھی، ملیر پندرہ کے علاقے میں، جب وہ اپنے مخالف گروہ کے اسلحہ بردار لڑکوں کے نرغے میں آگیا تھا۔

وقت گزرا کالیا دروازے پر تھا۔ اس کی پینٹ کی بیلٹ سے ایک بڑا سا چرمی پاؤچ اڑسا ہوا تھا۔ پشت پر ڈوریوں والا اسکولی تھیلا جھول رہا تھا۔ پاؤں میں جوگر اور حسبِ معمول چست پینٹ شرٹ۔

''مجھے پہلے ہی اس مردود پر شبہ تھا۔ اب یقین ہوگیا۔ چل اب اس کی رہائش گاہ پر شب خون مارنے کا وقت آپہنچا ہے۔''

وہ کیل کانٹوں سے لیس ہوکر آیا تھا۔ جوش میں تو میں بھی پورا بھرا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔ ''تو نے بتایا تھا شاید کہ یہ کلفٹن میں رہتا ہے؟''

''ہاں! میں نے تو اس کی ریکی کرلی تھی جب تو نے میری اس بات سے اتفاق کیا تھا کہ اب لوہے کو لوہے سے کاٹنے کا وقت آگیا ہے۔''

ہم دونوں باہر نکل آئے۔ میں نے گھر کو تالا لگایا۔

گلی میں سناٹا تھا۔ کالیا اپنی بائیک پر ہی آیا تھا۔ میں اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ اس کی ون ٹو فائیو جی پی او کاواساکی سیلف اسٹارٹ تھی۔ اس نے اسٹارٹ کرتے ہی بائیک آگے بڑھالی۔

ذرا ہی دیر میں بائیک مین روڈ پر آکر فراٹے بھرنے لگی۔ رات کے اس پہر سڑکیں سنسان تھیں۔ اسی سبب ہم جلد ہی اپنی منزل کے قریب جا پہنچے۔ مطلوبہ بلاک پہنچ کر بائیک ایک نسبتاً تاریک گوشے میں کھڑی کردی اور خود ہم پیدل چل پڑے۔

کراچی کے اس نمبرون پوش علاقے میں اس وقت گہرا سناٹا طاری تھا۔ سڑک کے دونوں جانب وسیع و عریض رقبہ اراضی پر محیط عالیشان کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں۔ ان کے اندر سے مدھم مدھم سی روشنیاں پھوٹتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ کبھی کسی کوٹھی کے احاطے سے کسی کتے کے بھونکنے کی آواز ابھرتی تو ہم محتاط ہوجاتے۔

ایسے علاقوں میں کسی چوکیدار کی نظروں میں آجانے کا بھی خطرہ ہوتا ہے۔ تاہم کالیا اس معاملے میں ہوشیار نکلا تھا وہ مجھے اپنے ساتھ لیے چھپتا چھپاتا ہوا بالآخر ایک ایسی کوٹھی کے نزدیک جا پہنچا جس کی باؤنڈری وال، پہاڑی پتھروں کا منظر پیش کرتی تھیں۔ یہ ڈیزائننگ تھی۔ بڑے سے آہنی گیٹ کے دونوں طرف سنگ مرمر کے پلرز تھے، جن پر دو دھیاں روشنی دیتے گلوب نصب تھے۔ باؤنڈری وال کے سرے پر رنگین شیشوں کے نوکیلے ٹکڑے لگے ہوئے تھے۔ اندر عمارت سفید اور نیلے رنگ کی تھی جو دو منزلہ تھی۔ اندر لان سے جھانکتے ہوئے درخت اس کے غیر معمولی رقبے کا پتا دیتے تھے۔

گیٹ پر نیون سائن کے انداز کی نیم پلیٹ روشن تھی جس پر سیٹھ ستار لکھا ہوا تھا۔ گیٹ کے اندر سیدھے ہاتھ پر اندرونی طرف ایک گارڈ کیبن کی جھلک نظر آتی تھی۔

میرے جیسا عام آدمی اتنی بڑی اور عالیشان رہائش گاہ کو دیکھتے ہی دنگ رہ گیا تھا۔ نجانے اس مردود نے کتنے غریبوں کا خون چوس کر یہ عمارت کھڑی کی تھی، اس کی دولت کمانے کی حرص پھر بھی کم نہیں ہوئی تھی۔ حرص کا نامرنا بھی ایک طرح کا عذاب ہے۔ اللہ جتنا بھی دے دے، ان کی حرص کم ہونے کا نام نہیں لیتی۔

''اندر شیر جتنی جسامت کے دو جرمن شیفرڈ کسی کو بھی چیر پھاڑ ڈالنے کے لیے موجود ہیں۔ ہمیں اس طرف سے نقب لگانی ہوگی۔'' کالیا نے عمدت کا جائزہ لیتے ہوئے سرگوشی میں ساتھ والی دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ کہا۔ وہ شاید پہلے بھی یہاں آکر اس عمارت کی ریکی کرچکا تھا۔ ہم اس طرف بڑھ گئے۔

ابھی ہم مذکورہ سمت آکر ٹھہرے ہی تھے کہ اچانک اندر سے کتے کے بھونکنے کی آواز ابھری۔

''دھت تیری کی۔'' کالیا نے کوسا۔ ''سالے بڑی تیز بو رکھتے ہیں۔'' کہہ کر وہ آگے بڑھا، میں نے اس کی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

تقلید چاہی۔ یوں ہم گھوم کر عقبی سمت میں آ گئے۔

''میں یہاں سے نقب نہیں لگانا چاہتا تھا مگر اب مجبوری ہے۔'' وہ ہولے سے بڑبڑانے کے انداز میں بولا۔ پھر دیوار سے کان لگا کر کچھ سنا۔

''وہ دونوں اس طرف آ گئے۔ اب کام آسان ہو جائے گا۔''

وہ خود کلامیہ بڑبڑاتے رہنے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔ اسے شاید اندر کسی کے کھسر پھسر کرنے سے مشابہ آوازیں آ گئی تھیں، اس نے اپنی پشت کا اسکولی تھیلا اتارا اور اس کے اندر ہاتھ ڈال کر پہلے دو دستانے نکالے ایک مجھے پہننے کو دیا... اور دوسرا خود اپنے ہاتھوں پر چڑھایا۔ کالیا فنگر پرنٹس سے بچنے کے لیے یہ دستانے لایا تھا، اس کے بعد اس نے تھیلے کے اندر سے اور بھی کچھ نکالا تو میں چونک گیا۔ وہ گوشت کے دو بڑے پارچے تھے جو اس نے ہاتھ بلند کر کے اندر اصل عمارت اور باؤنڈری وال کے درمیانی خلا میں اچھال دیئے۔

اس کے بعد وہ پھر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر دیوار سے کان لگائے رہا۔ چند ہی سیکنڈوں بعد وہ بولا۔ ''گئے کام سے دونوں، اب ہمارا کام شروع ہوتا ہے۔'' وہ عادتاً پھر بڑبڑایا۔ اب میں بھی اس کی خود کلامیہ بڑبڑاہٹوں کا مطلب سمجھنے لگا تھا۔

وہ شاید ان دونوں جرمن شیفرڈ کتوں کو بے ہوشی کی دوا والے گوشت کے پارچے کھلانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

کالیا جیسے ایک لگے بندھے معمول کے مطابق اپنا کام مرحلہ وار کیے جا رہا تھا۔ اس نے نقب زنی کا سامان نکالا۔ یہی وہ وقت تھا جب کہیں قریب ہی ایک تیز سٹی کی آواز ابھری اور میں بدک سا گیا۔

''شش..... کچھ نہیں ہوا جگری! یہ چوکیدار نے ماری ہے، محض اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے۔'' کالیا مجھے فکرمند سا دیکھ کر بولا تو میں پُرسکون ہو گیا۔

تھوڑی دیر مزید اطراف کی سن گن لینے کے بعد کالیا نے نقب لگانے کی تیاری کرتے ہوئے مجھے اپنی جگہ دبکے رہنے کا اشارہ کیا اور خود کھڑا ہو کر اس نے رسی اچھالی۔ تسلی کے بعد اس نے جھک کر مجھ سے کہا۔ ''ہوشیار رہنا اور میرے اندر ٹپتے ہی تم بھی اسی طرح آ جانا۔ بے شک یہ کام میرے لیے آسان اور تمہارے لیے تھوڑا مشکل ہو گا مگر مجھے دیکھتے رہو اسی طرح اوپر آ جانا، نو پرابلم!'' میں نے اس کی بات پر اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔

میں نے کالیا پر نظریں جما دیں۔ وہ کسی بندر کی طرح پھرتی سے اوپر چڑھ گیا۔ جسے دیکھتے ہی مجھے احساس ہوا کہ کم از کم میں ایسی پھرتی کا مظاہرہ کرنے سے قاصر ہی رہوں گا جبکہ تاخیر کسی مشکل یا مصیبت کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی تھی ہمارے لیے۔

بہرکیف! میرے دیکھتے ہی دیکھتے کالیا بندر کی طرح چڑھا اور باؤنڈری وال کے سرے پر پہنچ کر دوسری جانب غائب ہو گیا۔

میں چند ثانیے تو ہونق سا اپنا سر اٹھائے اوپر دیکھتا رہا اس کے بعد جھولتی رسی کو ایک نظر دیکھا، اس میں ذرا ذرا فاصلے سے گانٹھیں بنی ہوئی تھیں۔ پھر جس طرح کالیا نے رول پلے کیا تھا، میں نے بھی اس کی نقل کرتے ہوئے وہی کچھ کیا اور..... ابتداء میں سست روی کا شکار رہا مگر جلد ہی پراپر طریقے پر سیٹ ہو گیا اور میرے ہاتھوں پیروں میں غیر معمولی تیزی آ گئی۔

میں نے باؤنڈری وال چڑھنے میں کالیا سے دگنا وقت لگایا تھا مگر کامیاب رہا تھا۔

ہم دونوں اب ایک تنگ سی گلی نما راستے میں دبکے کھڑے تھے۔ یہاں ہلکی سی روشنی تھی، وجہ یہ تھی کہ یہاں سے لان قریب ہی نظر آتا تھا، جہاں فولادی پائپوں پر نصب گلوب روشن تھے۔ اسی روشنی میں مجھے سامنے ہی اپنے قدموں کے پاس دو موٹے تازے بکرے کے سائز جتنے کتے بے سدھ پڑے نظر آ گئے۔

کالیا کے بے ہوشی کی دوا والے پارچوں نے خوب کام دکھایا تھا۔

''ایے لے جگری! تو تو ایک دم سپر ڈپر جا رہا ہے۔'' اس نے سرگوشی میں میری تعریف کی۔ میں خاموش رہا۔ میں اندر سے کچھ ڈرا... ہوا تھا۔ اگرچہ دو ایک بار پہلے بھی میں ایسے حالات سے دوچار رہ... چکا تھا، تاہم وہ سب حالات کے سر پڑنے والی بات تھی جبکہ یہاں میں خود ایسے حالات کے سر ہو گیا تھا۔

کالیا نے تھوڑی گردن اونچی کر کے لان کی طرف دیکھا، پھر مجھے وہیں دبکے رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

تھوڑا آگے بڑھا اور چند قدم چلنے کے بعد رک کر وہ اس طرف کی سن گن لیتا رہا پھر میری طرف پلٹ آیا اور مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے آگے بڑھتا چلا گیا۔ تھیلا وہ اٹھا چکا تھا۔

اب ہم کوٹھی کی مرکزی عمارت کے عقبی گوشے میں آ گئے۔ یہاں زیادہ تر سیوریج کے موٹے موٹے پائپ نظر آ رہے تھے۔ ہم رکے نہیں اور بڑھتے رہے، یہاں تک کہ نصف چکر کے بعد دوسری سمت کی گلیارے میں آ گئے اور یہاں ہمیں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کھڑکیاں نظر آ رہی تھیں۔ کالیا، ان کھڑکیوں میں رک رک کر اندر جھانکنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ یوں ہم دوسری طرف سے گھوم کر عمارت کے اس طرف نکل آئے جہاں کار پورچ تھی اور دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اب یہاں سے سامنے کا گیٹ ہی نہیں، بلکہ اس کی اندرونی سمت میں بنا ہوا وہ گارڈ کیبن بھی صاف دکھائی دیتا تھا جس کے بغیر دروازے والے چوکھٹے کے اندر روشنی سی ہو رہی تھی۔

کوٹھی کا مرکزی بھاری بھرکم دروازہ جو خوب صورت محرابی شکل میں تھا، بند نظر آ رہا تھا۔

کالیا نے مجھے ایک اشارہ کیا اور بڑی احتیاط کے ساتھ اس کار کی چھت پر چڑھ گیا جو اوپری منزل کی بالکونی کے زیادہ قریب کھڑی تھی۔ میں بھی اس کے پیچھے کار کی چھت پر چڑھ گیا۔ کار پورچ کے قریب لگا ایک اونچا نیم اور مخروطی سیلونی درخت ہمیں خاطر خواہ آڑ فراہم کر رہا تھا۔ پہلے کالیا نے مجھے اپنی پشت کا سہارا دے کر بالکونی پر چڑھایا اس کے بعد میں نے ریلنگ سے ٹک کر اسے اوپر چڑھ آنے میں مدد دی۔

ہم اب اندر تھے مگر یہاں بھی ایک بند دروازہ نظر آیا۔ یہ ٹیرس سے اندر کی طرف کھلتا تھا۔ دائیں بائیں بڑے بڑے خوب صورت گملے رکھے ہوئے تھے۔ مصنوعی بیلوں کی جھالر سی بنائی گئی تھی۔ کالیا اور میں دبے پاؤں اس دروازے کی طرف بڑھے اور پھر اس نے اپنی بیلٹ سے جھولتے پاؤچ کی زپ کھول کر اس کے اندر سے کوئی ماسٹر کی ٹائپ کی چابی نکالی اور انٹرلاک میں پرآزمایا۔ چند سیکنڈوں تک وہ اس سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہا اس کے بعد پیتل کا موٹا سا لٹو گھمایا تو لاک کھل چکا تھا، کالیا نے اسے ہولے سے اندر کی طرف دھکیلا اور پھر ہم دونوں اندر داخل ہو گئے۔

سامنے لاؤنج تھا۔ یہاں زیرو پاور کا بلب روشن تھا۔ سجے سجائے اس لاؤنج سے متصل دو کمروں کے دروازے

راغب احسن

(1905ء - 1975) تحریک پاکستان کے ممتاز رہنما اور قائد کے معتمد خصوصی، وہ ضلع "گیا" میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے کلکتہ میں تعلیم حاصل کی، اپنی سیاسی زندگی کا آغاز خلافت کمیٹی میں شمولیت اختیار کر کے کیا اس پاداش میں جیل بھی کاٹی جیل سے رہائی کے بعد ایم، اے کیا اور اخبار "اسٹار آف انڈیا" کے ادارۂ تحریر میں شامل ہو گئے جب سر شفاعت احمد نے الٰہ آباد سے انگریزی ہفت روزہ اسٹار جاری کیا تو وہ اس کے ادارۂ تحریر میں شامل ہو گئے۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور انہیں اقوام عالم میں صحیح مقام دلانے میں صرف کی۔ تقسیم سے پہلے وہ ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کے رکن تھے، جہاں مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے ہمیشہ سینہ سپر رہے اور قائداعظمؒ کے ساتھ مل کر انہیں انگریز کی غلامی سے نجات دلانے کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔ 1931ء میں آل انڈیا یوتھ لیگ بنائی اور اسی اثنا میں میثاق فکر اسلامیت و استقلال ملت کے نام سے ایک فکر انگیز دستاویز مرتب کی۔ 1932ء میں کلکتہ میں مسلم لیگ کی بنیاد رکھی۔ علامہ شبیر احمد عثمانی نے ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں سیف الملت کا لقب دیا۔ 1964-1965ء میں مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح کے صدارتی انتخاب میں مشرقی پاکستان میں بہت کام کیا۔ لاء کمیشن کے رکن کے علاوہ سینٹرل اقبال کمیٹی کے نائب صدر اور سلیمان ندوی اکیڈیمی آف اسلام کے بنیادی رکن تھے۔

مرسلہ: نوید صدیقی، کراچی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اور سامنے کے رخ پر ایک راستہ دکھائی دیا جو کسی کوریڈور کا پتا دے رہا تھا۔ ان مذکورہ دو کمروں میں سے ایک کے دروازے کی نچلی درز سے روشنی نظر آرہی تھی۔ جس کا مطلب یہی ہوسکتا تھا کہ اندر جو کوئی بھی تھا وہ جاگ رہا تھا۔

ابھی ہم وہاں کھڑے کچھ سوچ ہی رہے تھے کہ اچانک ایک کھنکتی ہوئی ہنسی کی آواز ابھری۔ میں اور کالیا پھرتی کے ساتھ حرکت میں آئے۔ کالیا تو ایک بڑے سے ڈیوائیڈر کی آڑ میں چلا گیا جبکہ میں ایک فیملی سائز کے صوفے کے عقب میں جا چھپا۔

اسی وقت روشنی والے کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک بھاری بھرکم جسامت کا شخص بیش قیمت سلیپنگ گاؤن میں نمودار ہوا تو اس کے عقب سے مجھے وہی کھنکتی آواز سنائی دی۔ ''میرے لیے ریڈ اسکاچ بغیر سوڈا کے......''

برآمد ہونے والے شخص نے قدم بڑھاتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''او......ڈارلنگ! لگتا ہے دوبارہ موڈ بنانے کے چکروں میں ہو۔''

جواب میں کھنکتی ہنسی ابھری تھی۔ وہ شخص جو مجھے اپنے جیثے اور لب ولہجے سے بلاشبہ سیٹھ ستار ہی لگا تھا، اندر پتا نہیں اس کی بیوی تھی یا پھر کوئی اور تاہم وہ یہ کہتے ہوئے ڈیوائیڈر کی طرف بڑھا جس کی آڑ میں کالیا چھپا ہوا تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ سیٹھ ستار نے قریب پہنچ کر کوئی خفیہ بٹن پش کیا تو ڈیوائیڈر کا درمیانی حصہ شق ہوگیا۔ اب وہاں ایک مختصر سا کچن نما کوئی گوشہ نظر آرہا تھا، وہاں روشنی جل اٹھی تھی۔ غور کرنے پر پتا چلا وہ ایک بار کاؤنٹر تھا، جہاں شیلف میں بھانت بھانت کی فینسی شیپ کی بوتلیں رکھی نظر آرہی تھیں۔

سیٹھ ستار جیسے خون چوسنے والی جونکوں کی رہائش گاہوں میں یہ مختصر شراب خانہ کوئی اچھنبے کی بات نہیں تھی۔

میں صوفے کی آڑ سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک بوتل اٹھائے نکلا اور وہی بٹن دبا کر ڈیوائیڈر کا پٹ برابر کردیا اور پھر دائیں ہاتھ کی طرف رکھے لمبے چوڑے فریج کی طرف بڑھا ہی تھا کہ میں نے اس کے پیچھے سے کالیا کو نمودار ہوتے اور اس پر جھپٹتے دیکھا۔ یہ حملہ یقیناً سیٹھ ستار کے لیے اچانک اور غیر متوقع ہی تھا۔ بوتل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر بچھے دبیز قالین پر گر پڑی تھی۔ میں بھی صوفے کی آڑ سے برآمد ہوا۔ کالیا نے اپنا ٹی ٹی پستول نکال لیا تھا جس کی نال اس نے سیٹھ ستار کی کنپٹی سے لگادی تھی۔

''خبردار، سیٹھ! آواز نکالنے کی بے وقوفی مت کرنا، ورنہ گولی چل جائے گی۔''

سیٹھ ستار اسے تو نہیں، البتہ مجھے ضرور پہچان گیا تھا کیونکہ میں اس کے سامنے تھا۔ اسے ایک دم چپ سی لگ گئی تھی۔

کالیا نے مجھے اشارہ کیا اور پھر سیٹھ ستار کو اپنے ساتھ رگیدتا ہوا اندر کمرے میں آگیا۔

کمرے میں ائرکنڈیشن چل رہا تھا۔ کالیا نے عقب میں لات مار کر دروازہ بند کردیا تھا۔

سامنے ایک جہازی سائز کے آرام دہ اور ہلکورے لیتے بیڈ پر ایک گھنے ریشمی بالوں والی حسینہ سیاہ رنگ کے مہین سے باریک گاؤن میں ملبوس ہوشربا انداز میں بیڈ پر نیم دراز تھی۔ یہ واٹر بیڈ تھا۔ اس حسینہ کی عمر کا اندازہ بیس اکیس سال کے درمیان ہی ہوتا تھا۔ ہم پر اس کی نگاہ پڑتے ہی، پہلے تو اس کی کالی گہری آنکھیں خوف و دہشت سے پھیلتی چلی گئیں، اس کے بعد اس نے چیخنے کے لیے اپنے گداز لبوں کو وا کیا ہی تھا کہ کالیا نے اس کی طرف گن کا رخ کرتے ہوئے غراتی آواز میں دھمکایا۔ ''خبردار! اگر ذرا بھی آواز نکالی تو...... اسی وقت دونوں کی لاشیں گرادوں گا۔''

کالیا کے سرد وسفاک لہجے کا اس حسینہ پر خاطر خواہ اثر ہوا کہ اس کے ہونٹ دہشت ناک منظر دیکھنے والے انداز میں کھلے رہ گئے۔ کالیا نے ایک زہر خند غراہٹ کے ساتھ سیٹھ ستار کو بیڈ پر دھکا دیا، وہ حسینہ کے ساتھ جالگا۔ میرے دل میں اچانک ایک محتاط سا خیال ابھرا اور میں نے بہ سرعت حرکت کرتے ہوئے ان کے غلافی تکیے کے نیچے کچھ تلاش کرنا چاہا تو مجھے کچھ نہ ملا، کالیا شاید میری اس حرکت کا مطلب فوراً سمجھتے ہوئے مجھ سے بولا ''سائیڈ ٹیبل کی تلاشی لو، وہاں کوئی اسلحہ رکھا ہوگا۔''

لڑکی کی طرف والے سائیڈ ٹیبل سے تو کچھ نہیں ملا البتہ دائیں جانب والے بیڈ سائیڈ ٹیبل کی اوپری دراز سے ایک سیاہ رنگ کا پستول ملا، وہ میں نے اپنے قبضے میں کرلیا۔

حسینہ کی نیم برہنگی دیکھ کر میں نے اسے چادر اپنے اوپر لینے کا کہہ دیا تھا۔

''مم......میں کپڑے بدلنا چاہتی ہوں......'' وہ میری رعایت دیکھتے ہوئے بولی تو میں نے سانپ جیسی پھنکار سے اسے گھور کر کہا۔ ''شٹ اپ! زیادہ چالاک بننے کی کوشش

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

مت کرو۔''

''اس حرکت کا مطلب جانتے ہو تم مسٹر نعمان؟'' بالآخر سیٹھ ستار نے ہمت کی اور مجھے گھور کر بولا۔

''بہت اچھی طرح.....'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر بے خوفی اور اسے تاؤ دلانے والے انداز میں کہا۔ ''میں ایسی بہت سی باتوں کو جان گیا ہوں رزیل کتے! جواب تک محض تیری گیدڑ بھبکیاں ہی ثابت ہوتی رہی ہیں۔ میری بہن کہاں ہے؟''

کہتے ہوئے میں نے اپنی جلتی سلگتی آنکھیں اس کے مکروہ اور چربیلے چہرے پر جما دیں۔ اس کی چندی چندی آنکھوں میں میرے اس سوال پر کچھ ایسے تاثرات ابھرے تھے جیسے وہ کچھ بھانپنے کی کوشش چاہ رہا ہو.....

''تمہاری بہن؟'' وہ سوالیہ لہجے میں بولا۔ ''مجھے کیا پتا؟''

اس دوران کالیا کو جانے کیا سوجھی تھی وہ اپنے سیل فون پر ان دنوں کی ویڈیو اور تصاویر بنانے لگا۔

''یہ کیا کک..... کر رہے ہو تم؟'' سیٹھ ستار بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''پپ..... پلیز! یہ مت کرو.....'' وہ لڑکی بھی کالیا سے منت بھرے لہجے میں بولی۔ اس کا حسین چہرہ اب خوف سے زیادہ کسی اور ہی جذبے سے سرخ پڑنے لگا تھا۔

کالیا نے اپنا کام کرلیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''جگری! وقت کم ہے، اپنا کام نمٹاؤ پھر میں اپنا.....''

میں اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے پُرتپش انداز میں سیٹھ ستار کی طرف بڑھا اور اس کی موٹی گردن دبوچ کر اسے بیڈ سے نیچے قالین پر گھسیٹ کر الٹ دیا۔ اس کے منہ سے غراہٹیں برآمد ہونے لگیں۔ اس کے بعد میں اس کے سینے پر سوار ہوگیا اور اسی کے پستول کی نال اس کے منہ کے اندر ڈال کر وحشت ناک لہجے میں بولا۔ ''ذلیل کتے! میں تیرے جھانسے میں آنے والا نہیں ہوں، مجھ سے دو ٹوک بات کر، میری بہن کا پتا دے یا اپنی جان سے چلا جا۔'' مجھ پر اس وقت غیرت کی آگ کے سوائے اور کوئی سودا نہیں سمایا ہوا ''جلدی بول کمینے!''

کالیا بیڈ کے پائنتی کی طرف اپنی دونوں ٹانگیں پھیلائے اور ہاتھ سینے میں باندھے آرام سے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ٹی ٹی ہنوز دبا ہوا تھا۔ ''مم..... مجھے،

نن..... نہیں معلوم.....''

پستول کی نال نکالنے پر وہ ہکلاتے ہوئے بولا تو میں نے پستول کے ٹھوس آہنی دستہ اس کے جبڑے پر رسید کردیا۔ پھر اپنے بائیں۔ ہاتھ کے گھونسے سے اس کی ناک پر ضرب لگائی۔ کمرا ساؤنڈ پروف تھا، اس کا دروازہ اور کھڑکیاں ایئر ٹائیٹ تھے۔ اس کے چیخنے کی آوازیں باہر نہیں جاسکتی تھیں۔ تاہم سیٹھ ستار کو اس طرح پٹتا دیکھ کر لڑکی خوف سے کانپنے لگی تو کالیا نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کردیا۔

سیٹھ ستار جیسے آرام طلب لوگ جو ہر چھوٹا بڑا کام اپنے زرخرید کتوں سے کروانے کے عادی ہوتے ہیں اور جانے کتنوں کو جسمانی گزند پہنچاتے رہتے ہیں، خود ایک مار بھی برداشت کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ میرا جنونی انداز دیکھ کر سمجھ گیا کہ کہیں غیرت کی آگ سے مغلوب الغضب ہوکر میں اسے ختم ہی نہ کر ڈالوں۔ وہ خون تھوکتے ہوئے بولا۔ ''ٹھہ ٹھہرو..... ٹھہرو.....''

میں رک گیا۔ میری سانس بری طرح پھول رہی تھی۔ چہرہ غیض و غضب کے مارے سرخ ہو رہا تھا۔ میں نے سیٹھ ستار کو اسی حالت میں اٹھا کر دوبارہ بیڈ پر پٹخ دیا۔ میں نے پستول کو اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر اس کی نال کا رخ سیٹھ ستار کے سینے کی طرف کردیا اور غراتے ہوئے بولا۔ ''کتے! آخری موقع ہے یہ۔ سچ بول، ورنہ تیرا قصہ ادھر ہی ختم کردوں گا۔''

اسی وقت کالیا بولا۔ ''جگری! اس بار اگر تجھے جھوٹ کا ذرا بھی شبہ ہو تو اسے بلاخوف گولی مار دے۔ یہ چوری کی واردات ثابت ہوگی اور کوئی ہم پر شبہ نہیں کرے گا، ہاتھوں میں دستانے میں نے اسی لیے چڑھائے ہیں۔''

کالیا نے یہ بات دانستہ سیٹھ ستار کو سنانے اور اس پر نفسیاتی خوف ڈالنے کے لیے ہی مجھ سے کہی تھی۔ جس کا اس پر بھی خاطر خواہ اثر ہوا۔

''مم..... میں سچ ہی بولوں گا..... تت..... تمہاری بہن میرے ہی آدمیوں کے قبضے میں ہے۔'' بالآخر اس نے بتایا۔ یہ سن کر میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔

''کہاں رکھا ہوا ہے اسے تمہارے کتوں نے؟''

''مم..... مجھے موقع دو..... میں ان سے رابطہ کرتا ہوں، وہ تمہاری بہن کو ادھر ہی لے آئیں گے۔''

''یہ گیم بازی کر رہا ہے جگری! ایک اور ڈوز دے اسے، یہ وہ مقام بتانے سے کترا رہا ہے۔'' کالیا بولا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

میں نے خونخوار نظروں سے سیٹھ ستار کو گھورا تو وہ جلدی سے اپنے خون آلودہ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔ ''نن.....نہیں، میں کوئی گیم نہیں کھیل رہا ہوں۔''

''اس جگہ کا نام بتاؤ اور تم بھی ہمارے ساتھ چلو گے تاکہ تمہارا جھوٹ نہ چل سکے۔'' میں نے کہا۔ میری بات پر اس کے چہرے پر پریشان کن تاثرات ہویدا ہونے لگے۔ میں نے جھک کر اس کے موٹے پیٹ پر گھونسا رسید کردیا۔ وہ چلایا اور اپنا پیٹ پکڑے دوہرا ہوگیا۔ لڑکی خوف زدہ ہوکر ایک جانب سکڑ سمٹ گئی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی وہ اس معاملے سے الگ ہے۔ اس نے میری دی ہوئی چادر خود پر لپیٹ رکھی تھی۔

''گگ.....گلشن حدید کا علاقہ ہے.....وہ، گھر نمبر بارہ، اے، بلاک ٹو ہے۔'' اس نے پیٹ کی درد کو پیتے ہوئے بہ مشکل اگلا۔

اس بار کالیا نے مجھے اشارہ کیا اور خود اس کے قریب آکر بولا۔ ''وہاں تمہارے کتنے ساتھی موجود ہیں؟''

''دو، یا پھر تین.....''

''تمہارا سیل فون کہاں ہے؟''

''دد.....دراز کے اندر ہے، نیچے والی۔'' اس نے اپنی طرف کی سائیڈ ٹیبل کی طرف اشارہ کیا۔ میں حرکت میں آیا اور وہاں سے اس کا سیل فون نکال لیا۔ پھر کالیا کے اشارے پر وہ میں نے اسے تھمادیا۔

''اب میری بات غور سے سنو.....سیٹھ!'' کالیا فون سنبھالتے ہوئے اس سے بولا۔ ''تم مجھے اپنے اس کتے کا نمبر بتاؤ گے، جو وہاں اس مکان میں موجود ہے اور اسے فقط اتنا حکم دو گے کہ وہ عاصمہ کو جلد سے جلد ادھر لے کر پہنچ جائے۔''

''ٹھ ٹھ.....ٹھیک ہے.....'' وہ بولا۔

''مگر یاد رکھنا کوئی گولی دینے کی کوشش کی تو یہی گولی تمہارا مقدر بن جائے گی۔ پہلے اپنا لہجہ پُرسکون کرو اور کسی بھی قسم کی دانستہ یا غیر دانستہ طور پر اپنی آواز کو پریشان بنانے کی کوشش مت کرنا۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''نمبر بتاؤ؟''

اس نے نمبر بتایا۔ کالیا نے ملا دیا۔ فون پہلے اپنے کان سے لگا دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی شاید کسی کی دوسری جانب سے نیم غنودہ سی آواز ابھری تھی۔ کالیا نے اس کا وائیڈ اسپیکر آن کردیا تھا۔

فون اب کالیا نے سیٹھ ستار کے کان سے لگا دیا۔

''ہہ.....ہیلو، میں بول رہا ہوں، راجو! اس لڑکی کو ابھی اور اسی وقت میرے بنگلے میں لے آؤ۔''

''جج.....جی سیٹھ صاحب؟'' دوسری جانب سے راجو نامی شخص کی متحیرانہ سی آواز ابھری۔

''اُلو کے پٹھے! جو کہا ہے وہ کرو، جلدی.....'' سیٹھ ستار نے غصے سے کہا تو دوسری جانب سے بوکھلاہٹ بھری آواز ابھری۔

''او.....او کے سیٹھ صاحب! ابھی لے کر پہنچتا ہوں۔''

''سنو، تم اکیلے ہی اس لڑکی کو لے کر میرے کلفٹن والے بنگلے پر پہنچو گے۔'' کالیا کی پہلے سے ہدایت کے مطابق اس نے تحکمانہ کہا اور پھر رابطہ منقطع کردیا۔

''میرا خیال ہے اسے یہاں تک پہنچنے میں پونا گھنٹا لگ جائے گا؟'' کالیا نے فون آف کرتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر کے لیے کمرے میں خاموشی چھا گئی تبھی وہ لڑکی ہکلاتے ہوئے کالیا سے بولی۔

''پپ.....پلیز! میں گھر جانا چاہتی ہوں..... مجھے جانے دو۔''

''اپنا منہ بند رکھو تم! تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔'' کالیا نے اسے جھڑکا۔ سیٹھ ستار لڑکی کو غصے سے گھورنے لگا۔ کالیا کسی سوچ میں ڈوبا رہا۔ بیس، تیس منٹ اسی طرح بیت گئے تو کالیا نے سیٹھ ستار سے تحکمانہ کہا۔

''میں دوبارہ تمہارے اس راجو نامی آدمی کا نمبر ملا رہا ہوں، اس سے پوچھو گے تم کہ وہ ابھی کہاں پہنچا ہے؟''

سیٹھ ستار کے اثبات میں سر ہلاتے ہی کالیا نے ایک بار پھر راجو کا نمبر ملا کر فون اس کے کان کے قریب کردیا۔ اس کے پوچھنے پر راجو نے بتایا کہ وہ شاہراہ فیصل پر ہے اور اگلے دس پندرہ منٹ میں پہنچ جائے گا۔''

سیٹھ ستار کے ''او کے'' کہنے کے بعد کالیا نے رابطہ منقطع کرکے فون کھینچ لیا۔

''اس نے تم سے جھوٹ بولا ہے۔'' اچانک ہی جیسے اس ڈری سہمی لڑکی نے ہمارے سامنے ایک دھماکا خیز انکشاف کیا، جس پر میں اور کالیا بری طرح چونکے تھے۔

(جاری ہے)

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

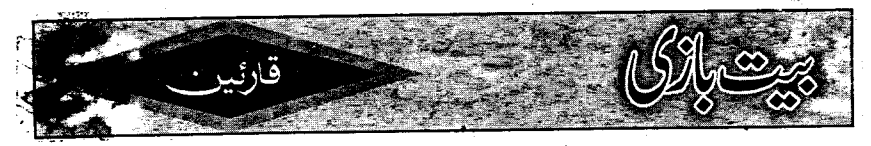

(سعید احمد چاند کراچی کا جواب)

عبدالستار.....ساہیوال

مرے پاس سے گزر کر مرا حال تک نہ پوچھا
میں یہ کیسے مان جاؤں کہ وہ دور جا کے روئے

(قمر جہاں کراچی کا جواب)

مریم بنتِ کاشف.....حیدرآباد

وقت اچھا بھی آئے گا ناصرؔ
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی

(رعنا رضوی مانچسٹر یو کے کا جواب)

سدرہ بانو ناگوری.....کراچی

وحشت کا یہ عالم کہ پسِ چاک گریباں
لڑتے ہیں بہاروں سے الجھتے ہیں خزاں سے

ادریس مسیح.....کراچی

وہ آج میری شکل بھی پہچانتا نہیں
وہ شخص جس نے کل ہی کہا تھا خدا مجھے

(نیلوفر شاہین اسلام آباد کا جواب)

اختر شاہ عارف.....جہلم

میں بنا تو لوں نشیمن کسی شاخِ گل پہ اپنا
لیکن ساتھ آشیاں کے یہ چمن بھی جل نہ جائے

ناہید ایوب.....کامرہ

موسموں کے اداس چہرے میں
تیری صورت اثر دکھانے لگی

سیف اللہ.....ملک وال

میں نے بلبل سے جو پوچھا دردِ جدائی کا علاج
شاخِ گل سے گر پڑی، تڑپی اور تڑپ کے مر گئی

ناصر حسن.....چنیوٹ

میں ترا کچھ بھی نہیں ہوں مگر اتنا تو بتا
دیکھ کر مجھ کو تیرے ذہن میں آتا کیا ہے

عفت کریم.....راولپنڈی

مثالِ شاخ جھکے جب تو ہم پھلے پھولے
نہال عجز لگا کر عجب ثمر دیکھا

انور سجاد ملک.....لاہور

مری جگہ پہ کوئی اور ہو تو چیخ اٹھے
میں اپنے آپ سے اتنے سوال کرتا ہوں

(نزابت افشال مہورہ کا جواب)

اظہر علی.....کراچی

ان کو بھی اپنے حسن کا احساس ہو گیا
آنکھوں میں میری پیار کا اظہار دیکھ کر

نصرت افروز.....جہلم

اپنے حواس میں شبِ غم کب حیات ہے
اے دردِ ہجر تو ہی بتا کتنی رات ہے

(طٰہٰ یاسین حیدرآباد کا جواب)

ہادیہ ایمان ماہا ایمان.....فورٹ عباس

رنج اور رنج بھی تنہائی کا
وقت پہنچا میری رسوائی کا

نائمہ تحریم.....کراچی

روز کھا لیتے ہیں ہنستے ہوئے چہروں سے فریب
کیا کریں اپنی آنکھوں میں مروت ہے ابھی

مرزا جہان بیگ.....لطیف آباد

رقابتوں کے شہر میں عداوتوں کا دور ہے
دھواں دھواں ہے بدن، قیامتوں کا دور ہے

(عبدالستار ساہیوال کا جواب)

ہادیہ ایمان ماہا ایمان.....فورٹ عباس

دوست دار دشمن ہے اعتماد دل معلوم
آہ بے اثر دیکھیں نالۂ نارسا پایا

(ظفر اقبال ظفر کا مراہ مشرقی کا جواب)

اختر علی.....لاہور

بجلی چمکی بادل گرجا سبزہ لہکا پھول کھلے
کتنے عالم بیت چکے ہیں زلف تیری لہرانے تک

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

(سعید احمد جھنگ کا جواب)

نزابت افشال مہورہ.....فتح جنگ۔

ہائے صدقے میں کہاں رکھوں
اس نے بھیجی ہے اوقات میری

امجد احساس.....لاہور

ہجر کا کرب میرے سینے میں
آگ بن کر بہر نفس گیا ہے

(ماہ نور تبسم ملتان کا جواب)

اختر شاہ عارف.....جہلم

اک مٹی کا دیا لو کو سنبھالے کب تک
تیل بھی ختم ہے طوفاں بھی اُمڈ آیا ہے

اشرف مجاہد.....حیدر آباد

ایسے بدلے ہیں زمانے کے سبھی طور کہ اب
لوگ کرتے ہیں محبت بھی ارادہ کر کے

نیاز ملکھانی.....لاڑکانہ

اک دن میں نے اپنی خوب تواضع کی
اک دن میں بھی اپنے گھر مہمان ہوا

انیس پراچہ.....کراچی

ایک دن مثبت نتائج بھی ملیں گے دیکھنا
دشمنوں کی انجمن میں دوستانہ بات کر

(عبدالجبار رومی لاہور کا جواب)

عبدالحکیم شر.....کراچی

وقت رخصت آگیا دل پھر بھی گھبرایا نہیں
اس کو ہم کیا کھوئیں گے جس کو کبھی پایا نہیں

نادیہ فیضان.....علی پور

وفورِ شوق میں ہم بھی کرامت
گزر جاتے ہیں مشکل رہ گزر سے

نائلہ منصور.....کوئٹہ

آرزو کے کنول کھلے ہی نہ تھے
فرض کر لو کہ ہم ملے ہی نہ تھے

(نیلوفر شاہین اسلام آباد کا جواب)

ارشد خان.....پنڈی

تو بدلتا ہے تو بے ساختہ میری آنکھیں
میرے ہاتھوں کی لکیروں سے الجھ جاتی ہیں

زین مجتبیٰ.....کراچی

تم دعا دے رہے ہو جینے کی
ہم اسے بددعا سمجھتے ہیں

(عارف شیخ چنیوٹ کا جواب)

زاہد توفیق.....لاڑکانہ

مشورہ ہے مری وحشت کا کہیں بھاگ چلو
چل کے اس شہر سے اس گھر سے کہیں دور بسو

احمد جاوید.....ملتان

منافقت کی سیاست ڈبو کے چھوڑے گی
یہ بے حسی کی قیادت ڈبو کے چھوڑے گی

(ہادیہ ایمان ماہا ایمان فورٹ عباس کا جواب)

سعید احمد چاند.....کراچی

اٹھتی ہے کبھی دل سے غموں کی جو گھٹائیں
احساس کا دریا بھی بہا دیتی ہیں آنکھیں

رفیق احمد ناز.....ڈیرہ غازی خان

آیا جو ان کی معصوم اداؤں کا خیال
بے اختیار آنکھ سے آنسو نکل پڑے

نیلوفر شاہین.....اسلام آباد

ایک گھڑی کا سکھ جو تم سے ہم کو ملا تھا یاد رہا
دکھ میں سارا جیون بیتا کچھ بھی لیکن یاد نہ آئے

نیاز احمد.....رحیم یار خان

آبلہ پا بھی چلاتی رہی ہے خواہشِ وصل
ہجر کی آگ میں چلتے رہے پیکر کتنے

ذیشان علی.....جہلم

آنکھوں کا ہے قصور کہ عکسِ جمال ہے
آئی ہے کیوں نظر تیری صورت جگہ جگہ

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

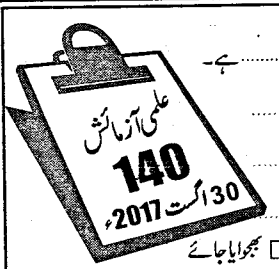

میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام .... ہے۔

نام: ....

پتا: ....

....

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی ☐ سسپنس ☐ پاکیزہ ☐ سرگزشت ☐ بھجوایا جائے

کسی ایک پر ☑ کیجیے۔

کوپن کے ہمراہ اپنے جوابات مورخہ 30 اگست 2017 تک علمی آزمائش 140 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں

مقابلہ
بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ "بیت بازی" شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کر سکتے ہیں۔

نام ....

پتا ....

....

محترم / محترمہ .... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کر رہا ہوں اسے شاملِ اشاعت کر لیں

(شعر الگ کاغذ پر ہے)

101

مقابلہ بیت بازی

پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی، 74200

اگر آپ کو

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ، ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

کے حصول میں دقت پیش آرہی ہے یا آپ کو اپنے علاقے کے بک اسٹال سے کوئی شکایت ہے اور آپ کے علاقے میں بروقت پرچہ نہیں پہنچ رہا تو

شکایت فیکس کریں

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

ثمر عباس 0301-2454188

سرکولیشن منیجر 35802552-35386783-35804200

فیکس نمبر 35802551

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35895313 فیکس: 35802551

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

علمی آزمائش۔ 140

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ''یک صحفی سرگزشت'' کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 اگست 2017ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

نام تو ان کا مرزا دلاور تھا اور اردو ادب میں ایک قدآور ادیب کے طور پر پہچانے گئے لیکن ادبی نام کچھ اور پسند کیا۔ پیدائش لاہور کی ہے۔ 4 اپریل 1914ء میں پیدا ہوئے اور 31 جولائی 1999ء کو اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچ گئے۔

علمی آزمائش 138 کا جواب

عمران خان کے رشتے داروں میں خالد جہانگیر خان نے انڈین ٹیم کے رکن کی حیثیت سے 1932ء میں انگلستان کے خلاف ٹیسٹ میچ کھیلا۔ دو خالہ زاد جاوید برکی اور ماجد خان نے ٹیسٹ میچوں میں پاکستانی ٹیم کی قیادت کی۔ بچپن ولڑکپن لاہور میں گزرا۔ وہیں ایک قریبی عزیز جاوید زمان خان نے اسے ابتدائی سطح پر کرکٹ کی تربیت دی۔ 1974ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی کی کرکٹ ٹیم کی قیادت کی۔ پہلی ٹیسٹ سیریز 81-1980ء میں ویسٹ انڈیز کے خلاف لاہور میں بنائی۔ 1982ء میں انگلینڈ کے دورے کے لیے پاکستانی ٹیم کی قیادت کی اور لارڈز کے مقام پر انگلینڈ کو تاریخی شکست دی، محسن حسن خان کا ان کے بارے میں کہنا تھا۔ ''وہ بہت اچھا کھلاڑی اور اچھا کپتان ہے۔ آج تک وہ بلاوجہ کسی سیاست میں نہیں الجھا۔'' مگر آج کل وہ سیاست میں اعلیٰ مقام رکھتا ہے۔

انعام یافتگان

1- افروز جہاں۔ کراچی　　2- نسیم اختر۔ کوئٹہ　　3- زاہد شیخ۔ چنیوٹ

4- عباس علی خان۔ لاہور　　5- امداد اللہ۔ حیدر آباد

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے حسن افضال، رضیہ مسعود، بلقیس فرخ، عطاء الرحمن شاہد اثناد جاہت مہر خورشید، عثمان خان، محمد خواجہ، نصیر احمد، سعید احمد چاند، سید عزیز الدین، یاسین نوید، ناصر بیگ، خاقان علی سید، نظام الدین، ذیشان احمد، ارباب خان، مظہر

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

علی سید، تعظیم عباس زیدی، خادم خان، غالب علی، محمد اسلم، مشفع احمد، خادم حسین، کمال وارچی، عثمان خان، سندس حیات، ارباب حسن، خادم حسین، نیاز حسن، ایم ناصر، اکبر حیات، سید عباس، صالحہ محمود، منیبہ حبیب، ذیشان احمد، سید فرح محمود، عباس خان، اشفاق محمد، فیض محمد، محمد یامین، خالدہ یوسف، اکبر خان، شجاع رضوی، دانش قریشی، مرزا سلیم، توقیر ناصر، طیب خان، محمد اختر، علیم ذکائی، یاسین خان، خالد مصطفٰی دانش قریشی، سلطان خان، طیب الحسن، راغب الحسن، ناصر بیگ، منیر الحسن، توقیر عباس اچکزئی، فرحین سلطان۔ لاہور سے عدنان سعید اشفاق، عبدالجبار رومی انصاری، افتخار احمد تارا، ارسلان شاہد، ماڈل ٹاؤن۔ عبدالخالق، عباس علی، نگین بھٹ، شیخ محمد سرور جاوید، ناصر علی، نوید اصغر، فہد اللہ، زرینہ ایوب، نواب احسن، یاسین محمد، انیس قائم خانی، ظفر چنیوٹی، آصف خان، چودھری فضل اللہ، محمد اکرام، فرحت مصطفٰی، برکات اللہ، ظفر قاسم، فاضل اختر، خادم علی، ذیشان علی، کائنات علی، فرحت بٹ۔ ملتان سے محمد سرفراز مغل، امام بخش (گلگشت) محمد منیب چشتی، معین چشتی، خواجہ محمد حسنین، محمد منیب، نازش فاروقی، خضر حیات بھٹی، اقبال انصاری، توقیر عباس، بابر سعید، لبنیٰ ارشاد، اویس سلمان، سلطان فتح علی، شیر علی سید، نوید اصغر بخاری، محمد آصف، اقبال حسن خان، انعام حسن خان، امام بخش ملک، محمد معین، ناصر گواچہ، حنیف محمد، برکات اللہ بخش، اسماعیل آفاق، شیخ نہال احمد، ارشاد حسن کاظمی۔ پشاور سے نصیر من اللہ، شیر نواز گل، شاہ نواز گل، وحیدہ خان، شاہ زرولی، غلام عباس طوری۔ سرگودھا سے خدیجہ دلاور، ماریہ چودھری، قدرت خان، اشفاق حسن، داؤد عثمانی، فرحت اللہ، رمضان حسن، ظفر مینگل، ہاشم رضا، عمیر علی۔ اسلام آباد سے فریدہ افتخار، محمد ریاض راحیل، عبدالاحد، نیلوفر شاہین، انور یوسف زئی، ادریس پاشا، یوسف حمید گل خان، ڈاکٹر فرخندہ لودھی، خرم علی، شیخ فتح یاب، جنید ملک، جہانزیب خان، ملائکہ احسن۔ راولپنڈی سے ڈاکٹر سعادت علی خان۔ ڈی جی خان سے رفیق احمد ناز۔ میرپورخاص سے معتبر علی خان، غلام شبیر، مرزا طاہر الدین بیگ، حافظ محمد محسن، عابد علی شیخ، ثانیہ عطاری، رخسانہ اکمل، لبنیٰ اکرام، فرحت اعجاز بھٹو، شیخ یاسین، ذوفشاں فاطمہ، محمد منیب، محمد بخش، زویا اعجاز بھٹو، فرحین ثمرہ۔ تلہ گنگ سے ملک طارق رشید، عباس علی۔ بدین سے سید ایس ڈی ساغر۔ کھاناں سے سلیم کامریڈ، ڈسکہ سے طاہر سلیم۔ صوابی کے پی کے سے کوثر اسلام۔ اٹک سے رضوان ارشد، سید محمد حسین شاہ، حیا علی۔ واہ کینٹ سے نور افضل خان خٹک۔ میانوالی سے نصر اللہ خان، عمر حیات، حکیم سید محمد رضا شاہ نقوی، کمال حسن، شاہ مراد۔ بہاولپور سے: ساجدہ عندلیب‘ فاخر حسین‘ مصباح الرضا۔ ننکانہ صاحب سے: جمیل چیمہ۔ کمالیہ سے: سعدیہ گل‘ محمد اکبر۔ کوٹری سے: مدیحہ ناز‘ شمسہ اصغر‘ ساجد علی۔ میرپورخاص سے: عابد علی‘ رخسانہ اکمل‘ اقرا سلطان‘ شمائلہ قادری عطاری‘ مظہر حسین قائم خانی‘ مرزا طاہر بیگ۔ تلہ گنگ سے: محمد تنویر۔ نوگراں‘ جہلم سے۔ کمال اللہ خان چوکیدار۔ کوہاٹ سے: صفدر عباس اشرفی۔ واہ کینٹ سے: نور افضل خان خٹک‘ مجید الرحمٰن‘ ثانیہ فرید‘ مسز سمین نصیر۔ تونسہ شریف سے: میاں محمد نوید۔ حب سے: شاہینہ رضوان۔ پاک پتن شریف سے: علی محمد۔ خیرپور سے: گل باز خان‘ خالد آفریدی‘ ذکیہ ممتاز‘ عامر جمیل قریشی‘ محمد علی‘ صنوبر جوکھیو‘ صفیہ بلوچ‘ ملک سرفراز۔ راولپنڈی سے: جویریہ حلیم‘ محمد سلیم‘ حافظ محمد اقبال‘ مرزا الطاف حسین‘ نفیسہ جمال‘ صغراں بیگم‘ نواز علی‘ مہوش خان‘ اطہر احمد قریشی۔ لالہ موسیٰ سے: رخسانہ یاسین‘ فوزیہ وہاب۔ اوکاڑہ سے: سید احسن محمود‘ جعفر افتخار‘ افضل بیڑو۔ سیالکوٹ سے اقرار حسن، دین محمد، تاثیر زیدی۔ خوشاب سے ملک نوید اصغر۔ حیدرآباد سے محمد یاسین اندوری، ماہ رخ، ساجد فاروق، حکیم اللہ جان، سلطان علی، سید کاظم علی، نصیر بوترابی، راغب الحسن، رونی انصاری، طیب علی، حسن کاظمی، اختر ہاشمی، نعمان فاروق، منیر حسین، فرحت عثمان، عزیز شیخ، فرخ مرزا بیگ، دانش فتح محمد، اشفاق شیخ، کاظم علی کاظمی۔ لیہ سے ماہین انور، نوید حسن خان، لطیف اللہ۔ حسن ابدال سے خرم حسن۔ ہری پور ہزارہ سے کاظم علی کاظمی، اشرف الماس۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے باسط، سلمان نیازی، ملک دین محمد، ڈیرہ غازی خان سے عباس خان، اشرف حسن، رفیق احمد ناز، زرین مجید، قبلائی خان۔ خوشاب سے ممتاز حسن۔ بہاولنگر میں ناصر عباس۔ جہلم سے اختر شاہ عارف، فتح یاب خان، زعیم شریف، انصر عباسی۔ جونیاں سے ملک شاہین۔ کمالیہ سے فرحت خان۔ بھکر سے محمد عارف قریشی۔ فتح جنگ سے نزابت افشاں۔ مظفر گڑھ سے ڈاکٹر نادیہ اظہر۔ بورے والا سے رانا محمد شاہد۔ سانگھڑ جام نواز علی سے عاشق حسین مغل۔ ساہیوال سے عبدالستار۔

بیرونِ ملک سے: مکرم نیاز، عمان سعودیہ۔ ناصر احمد، العین یو اے ای۔ عباس بٹ، مانچسٹر یو کے۔ نورعین طاہرہ، ٹورنٹو کینیڈا۔ برجیس قدر، دبئی یو اے ای۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

نقب

جناب ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم
زندگی کی راہ میں ایسے ایسے لوگ ملتے ہیں جو حیران کردیتے ہیں۔ میری دوست شمائلہ کا شوہر بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ اس نے مجھے اس قدر حیران کیا کہ میں اسے بھلا نہیں سکتی۔ گو کہ اب وہ میری دوست کا شوہر نہیں رہا، پھر بھی اسے میں بھلا نہیں پائی ہوں۔
انیلہ
(کراچی)

میں نے دروازہ کھولا تو شائلہ کو اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس کی اچانک آمد میرے لیے غیر متوقع تھی۔ گو کہ اس سے دو دن پہلے فون پر بات ہوئی تھی اور اس نے بتایا تھا کہ وہ اپنے شوہر کے ہمراہ کراچی آرہی ہے۔ اس نے مجھ سے میرا پتا بھی پوچھا تھا جو میں نے اسے موبائل پر سینڈ کردیا تھا لیکن یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی نازل ہو جائے گی۔ میں نے حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اسے دیکھا اور اس سے لپٹتے ہوئے بولی۔ ''کم از کم اپنے آنے کی اطلاع تو دی ہوتی۔ میں تمہیں لینے ائرپورٹ آجاتی۔''

''تم میرے میاں کو نہیں جانتیں۔ انہیں سرپرائز دینے کا بہت شوق ہے۔ یہ انہی کا آئیڈیا تھا کہ ہم اچانک کراچی پہنچ کر سب کو حیران کردیں گے۔''

''اچھا۔'' میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا سامان کہاں ہے؟ میرا مطلب ہے کہ تم کہاں ٹھہری ہوئی ہو؟''

''ظاہر ہے کہ میکے میں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''چند روز میں کوئی بندوبست ہوجائے گا تو ہم وہاں شفٹ ہوجائیں گے۔''

''اچھا! اندر تو چلو۔ کیا یہیں کھڑے کھڑے ساری باتیں کرلوگی؟'' میں نے کہا۔

''میں تو سیدھی اندر ہی جارہی تھی۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''تم نے ہی یہاں روک کر باتیں شروع کردیں۔''

شائلہ میری بچپن کی سہیلی تھی۔ اسکول سے کالج اور پھر یونیورسٹی ہم ساتھ ساتھ رہے پھر اس کی شادی ہوگئی اور وہ بیاہ کر اپنے میاں کے ساتھ اسلام آباد چلی گئی جب کہ میں کراچی میں ہی مقیم رہی۔ میرے شوہر کو دبئی میں جاب مل گئی لیکن ان کے کام کی نوعیت ایسی تھی کہ وہ زیادہ تر مختلف شہروں اور ملکوں کے دورے پر رہتے تھے۔ اس لیے مجھے اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے تھے۔ میں کراچی میں ہی اپنی ساس اور دیور کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ میرا دیور سلیم بھی برسرروزگار تھا اور صبح کا گیا شام کو واپس آتا تھا۔ کبھی کبھی کام کی زیادتی کی وجہ سے آٹھ نو بھی بج جاتے۔ ساس صاحبہ گھٹنوں کی تکلیف میں مبتلا تھیں اور ان سے گھر میں بھی بمشکل چلا جاتا تھا۔ وہ زیادہ وقت اپنے کمرے میں گزارتیں۔ ان کا واحد علاج آپریشن تھا جس کے لیے وہ تیار نہیں ہوتی تھیں۔

اس دوران میں شائلہ کے حالات سے بالکل بے خبر رہی۔ کبھی کبھی ہمارا فون پر رابطہ ہوتا تو اِدھر اُدھر کی باتوں میں وقت گزر جاتا۔ نہ میں نے کبھی اس سے کچھ پوچھا اور نہ ہی اس نے خود کچھ بتایا لیکن کبھی کبھی اس کے لہجے سے محسوس ہوتا کہ وہ خوش نہیں ہے اور اس نے اپنے دکھ کو ہنسی کے پردے میں چھپا رکھا ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہی ہنس مکھ اور شوخ و شریر واقع ہوئی تھی۔ ہنسنا ہنسانا، لطیفے سنانا اور نت نئی شرارتیں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کرنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ کالج اور یونیورسٹی میں سب دوست اس کی حرکتوں سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔ اس نے ہنسی علاج غم ہے، کو اپنا موٹو بنا رکھا تھا۔ وہ کہا کرتی تھی کہ ہنسنے والے کے ساتھ سب ہنستے ہیں لیکن رونے والے کے ساتھ کوئی نہیں روتا۔ اس لیے اگر رونا آرہا ہے تب بھی ہنسو کیونکہ اسی میں تمہاری بقا ہے۔

میں اسے لاؤنج میں لے کر آئی اور بولی۔ ''تم بیٹھو میں تمہارے لیے چائے لے کر آتی ہوں۔''

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔ ''میں چائے پینے نہیں، تم سے ملنے آئی ہوں۔ یہاں بیٹھو میرے پاس۔''

''ارے تو چائے بنانے میں کتنی دیر لگتی ہے۔ بس پانچ منٹ دے دو۔ اس کے بعد ہم دل کھول کر باتیں کریں گے۔''

''اچھا تو جب تک میں تمہاری ساس سے مل لوں۔ کہاں ہے ان کا کمرا؟''

''ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔ چلو میں تمہیں ان کے پاس لے چلتی ہوں۔''

شائلہ کو ساس کے پاس چھوڑ کر میں کچن میں آئی۔ چائے کا پانی کیتلی میں ڈال کر چولہے پر رکھا اور جلدی جلدی شامی کباب تلنے لگی۔ اسے شامی کباب بہت پسند تھے۔ گھر کے نیچے ہی بیکری تھی۔ میں نے فون کر کے کچھ چیزوں کا آرڈر دیا۔ پانچ منٹ میں ان کا لڑکا سب سامان لے کر آگیا۔ میں نے تقریباً سب لوگوں کے فون نمبر لے رکھے تھے اور انہیں فون کر کے بلا لیا کرتی تھی۔ ان میں قسائی، دودھ والا، سبزی فروش، جنرل اسٹور، ٹیلر ماسٹر، کارپینٹر، الیکٹریشن اور پلمبر وغیرہ سبھی شامل تھے۔ اس طرح مجھے کہیں نہیں جانا پڑتا تھا اور میرے سارے کام گھر بیٹھے ہو جاتے تھے۔

شائلہ نے جو یہ اہتمام دیکھا تو بولی۔ ''تم تو میری اس طرح خاطر مدارات کر رہی ہو جیسے پہلی بار تمہارے گھر آئی ہوں۔''

''ارے میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ شامی کباب تمہیں پسند ہیں۔ اس لیے بنا لیے۔ باقی چیزیں تو لوگ چلتے پھرتے کھا لیتے ہیں۔''

''تمہیں اب تک یاد ہے؟'' اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں گھماتے ہوئے کہا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''کیسے بھول سکتی ہوں۔ تمہاری ایک ایک بات میرے دل پر نقش ہے۔''

''واہ محبت ہو تو ایسی۔'' اس نے میرے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم لڑکا ہوتیں تو میں تم سے ہی شادی کرتی۔''

''چلو اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ تمہیں مجھ سے بہتر بندہ مل گیا۔ تم خوش تو ہو نا؟''

''ہاں کہہ سکتے ہیں۔'' اس نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ اس کے باوجود وہ مسکرا رہی تھی۔

''تمہاری بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ کھل کر کہو۔''

''دیکھو بھئی مرد کی اصلیت کا پتا شادی کے بعد ہی چلتا ہے۔ ویسے تو ہر انسان میں خوبیاں اور خامیاں ہوتی ہیں لیکن بعض اوقات اس کی ایک خامی ہزار خوبیوں کو نگل لیتی ہے۔''

''ذرا میں بھی تو سنوں کہ تمہارے شوہر میں ایسی کیا خامی ہے جس نے تم جیسی زندہ دل لڑکی کو آہیں بھرنے پر مجبور کر دیا۔''

''رہنے دو۔ تمہیں دکھ ہوگا اور میں تمہیں دکھی کرنا نہیں چاہتی۔''

''تمہارا دکھ میرا دکھ ہے۔ تبھی تو کہا کرتی تھیں کہ دکھ بانٹنے سے ہلکا ہو جاتا ہے۔ مجھے بتاؤ شاید میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں۔''

''مانا کہ تم ایک کامیاب سوشل ورکر ہو اور تم نے کئی کیس چٹکی بجاتے حل کیے ہیں لیکن تم کسی انسان کی فطرت نہیں بدل سکتیں۔ یہ بھی ایسا ہی ایک کیس ہے۔''

''پھر بھی پتا تو چلے کہ تمہارا مسئلہ کیا ہے؟ میرے خیال میں ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ضرور ہوتا ہے۔ چاہے وہ کتنا ہی پیچیدہ کیوں نہ ہو۔''

بولی۔ ''تو سنو، میرا میاں ٹھرکی ہے۔'' وہ سپاٹ لہجے میں

''ٹھرکی؟ وہ کیا ہوتا ہے؟''

''عورتوں کا رسیا۔ انگریزی میں اسے wonanizer کہتے ہیں۔ ہر خوب صورت عورت کو دیکھ کر اس کی رال ٹپکنے لگتی ہے اور وہ اس کے پیچھے لگ جاتا ہے۔''

''اوہو، یہ تو بڑی تشویش ناک بات ہے۔'' میں نے فکرمندی سے کہا۔ ''کبھی اسے کامیابی بھی ہوئی؟''

''میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ چوبیس گھنٹے تو اس کے ساتھ نہیں رہتی۔ مجھے کیا معلوم کہ وہ کہاں کہاں منہ مارتا پھرتا ہے۔''

''پھر بھی بندے کی حرکات و سکنات سے کچھ نہ کچھ اندازہ تو ہو ہی جاتا ہے۔''

''اوہو بھئی! تم تو تفتیش کرنے بیٹھ گئیں۔'' وہ زچ ہوتے ہوئے بولی۔ ''بس اتنا کہہ سکتی ہوں کہ فون پر تو وہ کافی دیر تک باتیں کرتا رہتا ہے لیکن اس نے گھر سے باہر کبھی رات نہیں گزاری۔ دن میں کوئی کارنامہ انجام دیا ہو تو کہہ نہیں سکتی۔''

''اس کے علاوہ کوئی اور شکایت؟'' میں نے اپنی تفتیش سمیٹتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں اگر اس کی شخصیت سے یہ پہلو نکال دیا جائے تو اس سے اچھا انسان کوئی نہیں۔ میرا بہت خیال رکھتا ہے۔ خرچ کی بھی کوئی تنگی نہیں۔ مجھ پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ آج تک ہمارے درمیان کوئی بڑا جھگڑا نہیں ہوا۔ بس اس کی اس عادت نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔ ڈرتی ہوں کہ کھیل کھیل میں کوئی مصیبت گلے نہ پڑ جائے۔''

''کیا مطلب؟''

''دیکھو نا، بہت سی عورتیں ایسے مردوں کی تاک میں رہتی ہیں۔ مثلاً کوئی ایسی لڑکی جس کی عمر زیادہ ہو جائے اور اس کی شادی نہ ہو پا رہی ہو۔ کوئی بیوہ، مطلقہ یا ایسی عورت جو اپنے شوہر سے مطمئن نہ ہو ایسی کوئی بھی عورت اس کے گلے پڑ سکتی ہے۔ اگر ایسا ہو گیا تو مجھے اس گھر سے نکلنا ہوگا بلکہ میں خود بھی اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہوں گی۔''

''تم بلاوجہ پریشان ہو رہی ہو۔'' میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''ایسا کچھ نہیں ہوگا۔''

''تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو؟''

''اس لیے کہ جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں اگر اس نے آج تک رات باہر نہیں گزاری تو اس کا مطلب ہے کہ وہ عیاش نہیں ہے بلکہ اپنی زندگی میں کوئی کمی محسوس کرتا ہے یا پھر وہ کسی قسم کے احساس محرومی میں مبتلا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہاری طرف سے کوئی کوتاہی ہو رہی ہو۔''

''کیا مطلب؟'' وہ تنک کر بولی۔

''مطلب بالکل واضح ہے۔ لگتا یہی ہے کہ تم اسے وہ توجہ اور محبت نہیں دے پا رہی ہو جس کی وہ توقع کرتی ہے اور اسی لیے وہ دوسری عورتوں میں پناہ ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔''

''بالکل نہیں۔'' وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''اس کی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ذمے داری مجھ پر عائد نہیں ہوتی۔ وہ شروع سے ہی ایسا ہے۔ کالج میں بھی لڑکیوں سے دوستی کرنے کے چکر میں رہتا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی کزنز کو بھی نہیں بخشا۔ ان سے بھی افیئر چلانے کی کوشش کی۔ ان میں سے ایک تو اس کے دام میں آ گئی تھی لیکن اس کی شادی کہیں اور ہو گئی۔ یہ بات مجھے اس کی بہن نے بتائی۔''

''اوہو! یہ تو بہت دلچسپ کیس ہے لیکن تم فکر نہ کرو۔ میں کچھ سوچتی ہوں۔ بس تم اس پر کڑی نظر رکھو اور اگر کہیں کوئی گڑبڑ نظر آئے تو مجھے فوراً بتانا۔''

''کوئی فائدہ نہیں۔ تم اپنے ذہن پر بوجھ مت ڈالو۔ میرے خیال میں یہ مرض ناقابلِ علاج ہے۔''

''دیکھو بی بی! ڈاکٹر کو پتا ہوتا ہے کہ مریض موت کے منہ میں جا رہا ہے۔ اس کے باوجود وہ اسے آخر وقت تک بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ میں بھی ناامید نہیں ہوں۔ اللہ نے چاہا تو اچھا نتیجہ سامنے آئے گا۔''

اس کے جانے کے بعد میں نے اپنے ذہن میں ایک منصوبہ ترتیب دیا اور اس پر عمل کرنے کے بارے میں سوچنے لگی۔ پہلے خیال آیا کہ شائلہ کو بھی اس منصوبے میں شامل کرلوں لیکن پھر اسے ترک کر دیا۔ بے شک وہ میری عزیز ترین دوست ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ عورت بھی ہے۔ وہ بھی نہیں چاہے گی کہ میں اس کے شوہر سے قریب ہو جاؤں۔ ویسے بھی میرے شوہر پردیس میں تھے اور کبھی کبھی مجھے شدت سے تنہائی کا احساس ہونے لگتا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ شائلہ کا شوہر میری اس محرومی سے فائدہ اٹھانے میں کامیاب ہو جائے اور میں سہیلی سے سوتن بن جاؤں۔ اس لیے میں نے اپنے طور پر اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کرلیا۔

دوسرے دن میں نے شائلہ کو فون کر کے اسے شوہر سمیت اپنے گھر کھانے پر بلایا۔ پہلے تو اس نے رسماً انکار کیا لیکن میرے اصرار پر مان گئی۔ تاہم اس نے کہا۔ ''انیلہ ایک شرط پر تمہاری دعوت قبول کر سکتی ہوں۔''

''وہ کیا؟'' میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

''تم بہت خوب صورت ہو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہیں دیکھتے ہی پاگل ہو جائے گا۔ اگر وہ کوئی ایسی ویسی حرکت کرے تو پلیز مائنڈ مت کرنا۔ تم تو جانتی ہو یہ اس کی عادت میں شامل ہے۔''

''نو پرابلم۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''بلکہ مجھے خوشی ہوگی کہ میرے حسن کا ایک قدردان تو ملا۔''

''کیوں تمہارے میاں.....؟'' وہ کچھ حیران ہوتے ہوئے بولی۔

''بہت اچھے ہیں لیکن انتہائی غیر رومانی، محبت بھی اپنا فرض سمجھ کر کرتے ہیں۔''

''چلو اچھی بات ہے۔ کم از کم محبت میں خیانت تو نہیں کرتے۔''

''ہاں ان کی یہی کمزوری میرے لیے باعث اطمینان ہے جب وہ مجھ سے رومانی مکالمے نہیں بول سکتے تو کسی اور سے کیا بولیں گے۔''

شائلہ کے شوہر ماجد کو میں نے اس کی شادی کے موقع پر دیکھا تھا اور اب مجھے اس کی شکل بھی یاد نہیں رہی تھی۔ شادی کے فوراً بعد وہ اسلام آباد چلی گئی اور ایک طویل عرصے بعد اس کا کراچی آنا ہوا تھا۔ میں تو اسے ویسے بھی کھانے پر بلاتی لیکن یہ دعوت میرے منصوبے کا حصہ تھی۔ اس لیے میں نے خاص طور سے اہتمام کیا تھا۔ صبح سے ہی کھانے کی تیاری شروع کر دی تھی۔ میں نے تین چار ڈشیں بنائیں اور مہمانوں کے آنے سے پہلے خود تیار ہونے لگی۔ اس روز میں نے ماجد کی خاطر تواضع کرنے کے لیے اپنے بناؤ سنگھار پر خصوصی توجہ دی کیونکہ یہ بھی میرے منصوبے کا حصہ تھا۔ میں نے فننگ والی فیس پینسل چہرے پر ہلکا میک اپ کیا۔ ہونٹوں پر گہرے سرخ رنگ کی لپ اسٹک لگائی۔ بالوں کو برش کر کے انہیں کھلا چھوڑ دیا اور اپنے جسم کو خوشبوؤں میں بسا کر مہمانوں کے استقبال کے لیے تیار ہو گئی۔

مجھے یقین تھا کہ ماجد مجھے دیکھتے ہی گھائل ہو جائے گا اور اس کے بعد میں اپنے منصوبے کے دوسرے حصے پر عمل شروع کر دوں گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ بھی ایک کائیاں شخص تھا۔ بیوی کی موجودگی میں وہ بھیگی بلی بن کر بیٹھا رہا اور اس نے ایک دفعہ بھی میری طرف نظر بھر کر نہیں دیکھا اور نہ ہی مجھ سے زیادہ بات کی۔ رسمی ہائے ہیلو کے بعد وہ میرے دیور سے باتوں میں لگ گیا لیکن میں محسوس کر رہی تھی کہ وہ چوری چوری میری جانب دیکھ رہا ہے اور اس کی گستاخ نظریں تیر کی مانند چبھ رہی تھیں۔

کھانے کے دوران اس کا کردار کھل کر سامنے آ گیا۔ وہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا شائلہ نے بتایا۔ میں جب بھی کوئی ڈش یا پلیٹ اٹھانے کے لیے جھکتی تو اس کی نظریں فوراً میرا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

طواف کرنے لگتیں۔ میں نے تنگ آکر دوپٹا سر اور سینے پر اچھی طرح لپیٹ لیا تاکہ اس کی آتش شوق مزید بھڑک اٹھے۔ میں اسے دریا کے کنارے لاکر پیاسا رکھنا چاہ رہی تھی۔ شائلہ اور میرا دیور کھانے میں مصروف تھے۔ انہیں پتا بھی نہیں چلا کہ میں کیا کھیل، کھیل رہی ہوں۔ کھانا ختم ہونے تک میں جان چکی تھی کہ وہ پوری طرح مجھ پر مرمٹا ہے۔

کھانا ختم ہونے کے بعد میرا دیور تو اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اسے جلدی سونے کی عادت تھی۔ ہم لوگ لاؤنج میں بیٹھ گئے۔ میں نے سب کے لیے چائے بنائی۔ اب تک اس نے سلام دعا کے علاوہ مجھ سے براہ راست کوئی بات نہیں کی تھی لیکن اس سے زیادہ دیر ضبط نہ ہو سکا اور بولا۔ ''واقعی آپ کھانا بہت اچھا بناتی ہیں۔ سب چیزیں مزے کی تھیں۔ میں تو ضرورت سے زیادہ ہی کھا گیا۔''

''شکریہ!'' میں نے ایک قاتل مسکراہٹ اپنے چہرے پر سجاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے بھی آپ لوگوں کے ساتھ کھانا اچھا لگا۔ ایسے مواقع کبھی کبھار ہی ملتے ہیں۔''

میرے جواب سے اس کا حوصلہ بڑھ گیا اور وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ''اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو ایک بات پوچھوں۔''

''ضرور پوچھیں۔ میں دوستوں کی بات کا برا نہیں مناتی۔''

میں نے اسے ایک دم ہی دوست کا درجہ دے دیا تو وہ خوشی سے پھول کر کپا ہو گیا اور بولا۔ ''بڑی نوازش کہ آپ نے مجھے دوست سمجھا۔ دراصل میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ آپ کے شوہر ملک سے باہر ہیں اور آپ یہاں اکیلی رہتی ہیں۔ آپ کو تنہائی نہیں ستاتی؟''

اس کی بات سن کر شائلہ نے اسے بری طرح گھورا۔ شاید اسے ماجد سے اس بے تکلفی کی توقع نہیں تھی لیکن وہ پوری طرح میرے حسن کے سحر میں گرفتار ہو چکا تھا۔ اس نے شائلہ کے گھورنے پر کوئی توجہ نہیں دی اور میری طرف جواب طلب نظروں سے دیکھنے لگا۔

''پہلی بات تو یہ کہ میں تنہا نہیں ہوں۔ میرے ساتھ ساس اور دیور بھی رہتے ہیں۔'' میں نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہا حالانکہ میں سمجھ چکی تھی کہ اس نے یہ سوال کیوں کیا ہے۔ ''جہاں تک شوہر سے دور رہنے کا تعلق ہے تو یہ ہماری مجبوری ہے۔ ان کے کام کی نوعیت ایسی ہے کہ وہ مجھے اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے۔''

''یہ تو بڑی زیادتی ہے۔ آپ کب تک ان کے بغیر رہتی رہیں گی۔'' اس نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی نظریں مسلسل میرے سراپے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ مجھے کوفت ہونے لگی۔ میں نے زندگی میں ایسا نظر باز شخص کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میرا دل چاہا کہ اسی مرحلے پر اپنا منصوبہ ترک کردوں اور دوبارہ کبھی اس بدمعاش کی شکل نہ دیکھوں لیکن پھر مجھے اپنی عزیز سہیلی کا خیال آیا جس کی خاطر میں نے یہ کھڑاگ پھیلایا تھا۔ میں ماجد کو سبق سکھانا چاہ رہی تھی تاکہ وہ زندگی بھر کسی غیر عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے۔ اس لیے اپنے آپ پر جبر کرلیا لیکن شائلہ میری بے چینی بھانپ چکی تھی۔ اس نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''مجھے باتھ روم کا راستہ دکھادو۔''

میں سمجھ گئی کہ وہ مجھ سے اکیلے میں کچھ کہنا چاہ رہی ہے۔ میں ماجد سے معذرت کر کے شائلہ کو اپنے بیڈروم میں لے گئی جس کے ساتھ اٹیچڈ باتھ بھی تھا۔ اس نے کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

''اسے زیادہ منہ لگانے کی ضرورت نہیں۔ تمہاری جان کو آجائے گا۔''

''بے فکر رہو۔ میں ایسے لوگوں سے نمٹنا خوب جانتی ہوں۔'' پھر اپنی آواز نیچی کر کے کہا۔ ''میں نے تمہارے شوہر کو راہ راست پر لانے کے لیے ایک منصوبہ بنایا ہے۔ آج کی دعوت اسی کا حصہ ہے۔ اس کی تفصیل بعد میں بتاؤں گی۔''

''ہوشیار رہنا، وہ شکار نہیں شکاری ہے۔''

''یہ تو اسے آنے والا وقت بتائے گا کہ کون شکار ہے اور کون شکاری۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا اور کمرے سے باہر آگئی۔

ماجد شدت سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔ ''کہاں رہ گئی تھیں آپ۔ میرے لیے تو ایک ایک سیکنڈ گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔''

''اتنے بے تاب کیوں ہو رہے ہیں۔'' میں نے ایک ادا سے بالوں کو پیچھے کی طرف جھٹکتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں آئندہ بھی ملنے کے مواقع میسر آئیں گے۔''

''اوہ۔'' وہ خوشی سے کھل اٹھا۔ ''گویا آپ کی طرف سے اجازت ہے۔ میں آپ سے ملنے کے لیے آسکتا ہوں۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''بالکل اس میں اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ جب چاہیں آسکتے ہیں بلکہ شائلہ کو بھی ساتھ لے کر آئیں تو مجھے خوشی ہوگی۔ آپ لوگوں کے ساتھ اچھا وقت گزرے گا۔''

وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''شائلہ کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اسے گھر کے کاموں سے ہی فرصت نہیں ویسے بھی اسے میرے ساتھ کہیں آنا جانا پسند نہیں۔ البتہ میں آپ کی تنہائی دور کرنے آسکتا ہوں۔''

''جیسے آپ کی مرضی۔'' میں نے شرماتے ہوئے کہا۔ ظاہر ہے کہ میں ایکٹنگ کررہی تھی۔ ورنہ دل چاہ رہا تھا کہ اس کا منہ نوچ لوں۔

میری بات ختم ہی ہوئی تھی کہ شائلہ آگئی۔ اس نے تیکھا لہجہ اختیار کرتے ہوئے ماجد سے کہا۔ ''اگر آپ کی باتیں ختم ہوگئی ہوں تو گھر چلا جائے۔''

''ہاں ہاں چلو۔'' وہ گڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ''میں تو تمہارا ہی انتظار کررہا تھا۔''

ہم دونوں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے میں نے شائلہ سے کہا۔ ''اب کب آؤ گی؟''

''دیکھو، کچھ نہیں کہہ سکتی۔'' وہ بے رخی سے بولی۔ ''اب تمہاری باری ہے ہم لوگ اپنے مکان میں شفٹ ہو جائیں۔ پھر میں تمہاری دعوت کروں گی۔''

''دعوت کی کیا ضرورت ہے۔ میں ویسے ہی تم سے ملنے آجاؤں گی۔''

''تم دس مرتبہ آؤ لیکن دعوت تو ہوگی۔ مجھے یہ ادھار بھی تو چکانا ہے۔''

مجھے اس کا لہجہ بدلا ہوا محسوس ہوا۔ جب آئی تھی تو اس کا موڈ کچھ اور تھا لیکن جاتے وقت وہ کافی اکھڑی ہوئی لگ رہی تھی۔ میں سمجھ گئی کہ وہ عدم تحفظ میں مبتلا ہوگئی ہے۔ وہ اپنے شوہر کے کرتوتوں سے واقف تھی اور اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ میری طرف بڑھنے کی کوشش کررہا ہے۔ ایسے میں اس کی ناراضی بجا تھی لہٰذا میں نے سوچ لیا کہ اگلے روز فون کرکے اس کے خدشات دور کردوں گی۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد میں نے سوچا کہ کیوں نہ اپنے آپ کو اس بکھیڑے سے الگ کرلوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میری عزیز ترین سہیلی بھی مجھ سے بدگمان ہو جائے۔ ویسے بھی میں نے جو منصوبہ بنایا تھا اس کے خدوخال پوری طرح واضح نہیں تھے۔ میرے ذہن میں صرف ایک ہی بات تھی کہ شائلہ کے شوہر کے ساتھ ایسا سلوک کیا جائے کہ وہ ہمیشہ کے لیے دوسری عورتوں کا پیچھا کرنا چھوڑ دے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ پہلے اسے اپنے قریب لاؤں اور جب وہ سر سے پاؤں تک میرے عشق میں ڈوب جائے تو اس کے نیچے سے سیڑھی گھسیٹ لوں تاکہ وہ منہ کے بل زمین پر گرے اور اس کے ہوش ٹھکانے آجائیں لیکن اس کے لیے ایک ایسی سچویشن کا ہونا ضروری تھا جس کے ذریعے اسے اپنی غلطی کا احساس ہو جائے لیکن وہ سچویشن میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

بہت سوچ بچار کے بعد میں نے اس منصوبے کو لپیٹنے کا فیصلہ کرلیا اور دوسرے دن میں نے شائلہ کو فون کرکے بتا دیا کہ اس کے شوہر کا مرض ناقابلِ علاج ہے اور صرف وہی اسے قابو کرسکتی ہے۔

وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ''میں نے تو تم سے پہلے ہی کہا تھا لیکن تمہیں ہی شرلاک ہومز بننے کا شوق ہورہا تھا۔ اب ذرا یہ بھی بتا دو کہ میں اسے کیسے قابو کرسکتی ہوں۔''

''اس کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ تم اس کے ساتھ مستقل نتھی ہو جاؤ۔ دفتر کے علاوہ اسے کہیں اکیلا نہ جانے دو۔ اسے کسی محفل میں عورتوں سے قریب ہونے یا بات کرنے کا موقع نہ دو۔ ہر جگہ اس کے ساتھ جاؤ۔ اس کا دم چھلا بن کر رہو۔ اس طرح اسے کوئی ایسی ویسی حرکت کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔''

''میں یہ سب کرکے دیکھ چکی ہوں۔'' اس نے بے زار کن لہجے میں کہا۔ ''وہ ہمیشہ رسی تڑا کر بھاگ جاتا ہے۔''

''ایک ترکیب اور بھی ہے۔'' میں نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ ''لیکن شاید تم اس پر عمل نہ کرسکو۔''

''وہ بھی بتا دو۔'' اس نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

''جس طرح لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ اسی طرح تم بھی ماجد کے ساتھ وہی کرو جو وہ تمہارے ساتھ کررہا ہے۔''

''یعنی؟''

''یعنی یہ کہ وہ غیر عورتوں کے پیچھے بھاگتا ہے تم غیر مردوں سے پینگیں بڑھانا شروع کردو۔''

''کیا؟'' وہ تقریباً دہاڑتے ہوئے بولی۔ ''تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا جو مجھے ایسا فضول مشورہ دے رہی ہو۔''

''یہ میں نے کب کہا کہ تم سچ مچ ایسا کرو۔ یہ محض دکھاوا ہوگا تاکہ ماجد کو احساس ہو جائے کہ جس طرح وہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

دوسروں کے گھر میں تاک جھانک کرسکتا ہے اسی طرح کوئی اور اس کے گھر میں بھی.....''

''بس بس رہنے دو اپنی منطق میں ایسے کسی کھیل کا حصہ نہیں بن سکتی جس میں میری عزت پر حرف آئے۔ تم ان مردوں کو جانتی ہو نا۔ خود چاہے جو کرتے پھریں لیکن عورت اگر کسی غیر مرد سے ہنس کر بات کرلے تو ان کے ماتھے پر شکنیں پڑ جاتی ہیں۔''

اس گفتگو کے بعد میرا خیال تھا کہ شائلہ کا قصہ ختم ہو گیا۔ اب وہ جانے اور اس کا کام۔ اس کے بعد وہ میرے گھر آئی اور نہ ہی میرا جانا ہوا۔ البتہ فون پر بات ہو جاتی تھی۔ اس نے بتایا کہ ماجد نے سرکاری مکان کی الاٹمنٹ کے لیے درخواست دے رکھی ہے۔ جب تک سرکاری مکان نہیں ملتا۔ وہ میکے میں ہی رہے گی کیونکہ وہ لوگ کرایہ کا مکان افورڈ نہیں کرسکتے۔

ایک دن وہ میرے گھر آئی تو بہت پریشان تھی۔ اس نے بتایا کہ ماجد کی بے راہ روی دن بہ دن بڑھتی جارہی ہے۔ ان دنوں بھی وہ کسی عورت کے چکر میں ہے۔ ہر وقت اسی کے تصور میں گم رہتا ہے اور بار بار اپنے موبائل پر کوئی نمبر ڈائل کرتا رہتا ہے۔ میں اسے کیا بتاتی کہ وہ نمبر میرا ہی ہے۔ پہلی بار جب اس نے مجھے فون کیا تو میں نے اس کی آواز پہچان کر سلسلہ منقطع کردیا تھا۔ اس کے بعد وہ روزانہ مجھے صبح شام فون کرتا رہتا لیکن میں کوئی جواب نہیں دیتی۔ کئی بار سوچا کہ سم تبدیل کرلوں لیکن اس میں یہ مسئلہ ہے کہ میرا یہ نمبر کئی لوگوں کے پاس ہے اور میں اسے تبدیل نہیں کرسکتی۔ اس کا مجھے صرف یہی حل نظر آیا کہ اس کی کوئی کال نہ سنوں۔ تھک ہار کر خود ہی خاموش ہو جائے گا۔

میں نے شائلہ کو تسلی دی اور کہا کہ وہ اپنے شوہر سے دو ٹوک بات کیوں نہیں کرتی۔ آخر یہ سلسلہ کب تک چلے گا۔ اسے کم از کم اپنی عمر اور مرتبہ کا خیال رکھنا چاہیے۔ وہ گریڈ اٹھارہ کا سرکاری افسر ہے اور اب تو اس کی کنپٹیوں کے پاس کے بال بھی سفید ہونے لگے تھے۔ اگر اس کی شادی کم عمری میں ہو جاتی تو اس کے بچے نوجوانی کی حدود میں قدم رکھ چکے ہوتے۔ ایسے شخص کی یہ روش ناقابل فہم تھی اور اسے محض ذہنی عیاشی ہی کہا جاسکتا تھا۔

شائلہ نے بتایا کہ وہ اسے ان حرکتوں پر کئی مرتبہ ٹوک چکی ہے اور اس پر آئے دن جھگڑے بھی ہوتے رہتے ہیں لیکن وہ اپنی غلطی ماننے پر تیار نہیں۔ وہ جب بھی اس سے باز پرس کرتی ہے تو وہ صاف مکر جاتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ کسی عورت کے پیچھے نہیں جاتا اور نہ ہی کسی سے اس کا کوئی افیئر ہے۔

''جو شخص اتنی ڈھٹائی سے جھوٹ بولتا ہو۔ اس سے یہ توقع کیسے کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنا جرم قبول کرلے گا۔'' شائلہ نے دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

اس وقت مجھے اپنی عزیز سہیلی پر بہت ترس آیا۔ مجھے لگا کہ اس پر ہونے والے ظلم میں کچھ حصہ میرا بھی ہے کیونکہ وہ عورت میں ہی تھی جس کا وہ ان دنوں پیچھا کررہا تھا۔ اب مجھے رہ رہ کر پچھتاوا ہو رہا تھا۔ کاش میں اس روز ان دونوں کو دعوت پر نہ بلاتی۔ اگر بلایا تھا تو ماجد کے سامنے بن سنور کر نہ آتی۔ لیکن اس وقت میرا منصوبہ کچھ اور تھا۔ میں شائلہ کی مدد کرنا چاہ رہی تھی لیکن ماجد کی حرکتیں دیکھ کر خوفزدہ ہوگئی اور میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔

میں نے شائلہ سے کہا کہ وہ ماجد کو اس کے حال پر چھوڑ دے۔ اس کی یہ عادت اتنی پختہ ہو چکی ہے کہ کسی کے کہنے سننے کا بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ وہ صبر کرے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ راہ راست پر آجائے یا اسے کسی جگہ سے اتنے جوتے پڑیں کہ اس کا دماغ ٹھکانے آجائے۔ میں نے شائلہ کو تو سمجھا بجھا کر بھیج دیا لیکن خود انجانے وسوسوں میں گھر گئی۔ میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے یا کوئی طوفان میری جانب بڑھ رہا ہے جو میرا سب کچھ بہا کرلے جائے گا پھر ایک روز میرے اندیشے حقیقت میں بدل گئے۔

اس روز گرمی بہت شدید تھی۔ میں نے جلدی جلدی کچن کا کام نمٹایا۔ ساس کو کھانا دیا اور خود نہانے چلی گئی۔ کافی دیر تک شاور کے نیچے کھڑی ٹھنڈے پانی میں بھیگتی رہی۔ اس روز میں نے موسم کی مناسبت سے لون کا سوٹ نکالا تھا۔ میں نے لباس تبدیل کیا اور لاؤنج میں آکر بیٹھ گئی۔ گو کہ میں نے بالوں کو اچھی طرح تولیہ سے خشک کرلیا تھا لیکن اس کے باوجود پانی کی بوندیں میرے کپڑوں پر گر رہی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ کچھ دیر بعد کے نیچے بیٹھوں گی تو کپڑے خشک ہو جائیں گے۔ اتنے میں دروازے کی گھنٹی بجی۔ میں بے دھیانی میں دوپٹا لیے بغیر ہی دروازے تک گئی۔ وہاں ماجد کھڑا ہوا تھا۔

''آپ!'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا پھر میں الٹے قدموں واپس آگئی۔ صوفے پر سے دوپٹا اٹھا کر گلے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

عیدالفطر کے حسین رنگوں سے سجا جولائی 2017ء کا خوشیاں بکھیرتا پاکیزہ

رفعت سراج و شیریں حیدر کے دلکش ناول، نت نئے روپ لیے.....

سحر ساجد کے خوب صورت اندازِ بیان کا مرقع **من جاں بازم**

سیما رضا ردا کا منی ناول، تیزی سے اگلی منزل کی جانب گامزن

اختر شجاعت، اخلاص کے موثر بیان کے ساتھ

عید کے رنگ **عقیلہ حق، رضوانہ پرنس، منشا محسن علی،**
غزالہ عزیز کے ساتھ ساتھ دیگر مایہ ناز رائٹرز کی تحریروں کے سنگ۔

پاکیزہ کی دیرینہ ساتھی و
معروف فلم کار **فریدہ اشفاق**
نے بڑھائی ہماری بزم کی رونق

شائستہ زریں
کے دلچسپ و خصوصی عید **سروے** میں
شرکاء کے خوب صورت جوابات

اس کے علاوہ

نادیہ احمد، فریدہ سیفی، فوزیہ احسان رانا، فصیحہ آصف خان،
فریدہ لاکھانی، فوزیہ اشرف و ریما نور رضوان کے پُرمسرت افسانے

عید کی مناسبت سے دل خوش کن سلسلے، مزیدار پکوان، مہندی کے حسین ڈیزائن اور جدید فیشن کے انداز صرف آپ کی خوش ذوقی کی خاطر

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

میں ڈالا۔ اتنی دیر میں وہ بھی میرے پیچھے پیچھے چلتا ہوا لاؤنج تک آ گیا۔

''آپ اس وقت کیسے؟'' میں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

''بتاتا ہوں۔'' وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''پہلے ایک گلاس پانی پلا دیں۔''

میں پانی لے کر آئی۔ اس نے دو گھونٹ لیے اور گلاس میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''دراصل میری گاڑی کا ٹائر پنکچر ہو گیا ہے۔ جیسے تیسے کر کے گاڑی پنکچر شاپ تک گیا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ لائٹ گئی ہوئی ہے۔ دو گھنٹے میں آئے گی۔ میرے پاس فالتو ٹائر بھی نہیں ہے اس لیے پنکچر لگنے کا انتظار کرنا ہوگا۔ وہاں گرمی بہت تھی اور بیٹھنے کا بھی کوئی انتظام نہیں تھا۔ اس لیے یہاں چلا آیا۔ میں نے آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا۔''

یہ سن کر میری تو جان ہی نکل گئی۔ گویا اب اسے دو گھنٹے برداشت کرنا ہوگا۔ میں دل ہی دل میں اسے چلتا کرنے کے لیے کوئی بہانہ سوچنے لگی لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ اس نے میرے سراپے پر نظر ڈالی اور بولا۔ ''اس لباس میں آپ بہت اچھی لگ رہی ہیں۔''

میں نے جل کر کہا۔ ''میں ہر لباس میں اچھی لگتی ہوں۔''

یہ کہہ کر میں نے ایک میگزین اٹھایا اور اسے پکڑاتے ہوئے بولی۔ ''آپ ڈرائنگ روم میں چل کر بیٹھیں مجھے ایک دو کام نمٹانے ہیں۔''

''میں میگزین پڑھنے نہیں، آپ سے باتیں کرنے آیا ہوں۔ اگر آپ کے پاس میرے لیے وقت نہیں تو چلا جاتا ہوں۔''

''جیسے آپ کی مرضی۔''

''آپ میرا فون بھی نہیں اٹھا رہی ہیں۔''

''اچھا! آپ نے فون کیا تھا، کب؟'' میں انجان بنتے ہوئے بولی۔

''میں تو روزانہ چار پانچ مرتبہ فون کرتا ہوں لیکن آپ جواب ہی نہیں دیتیں۔''

''اچھا! وہ آپ کا نمبر ہے میں بھی سوچ رہی تھی کہ کس کے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہے ہیں دراصل میں اجنبی لوگوں کے فون نہیں سنتی۔''

''گویا میں آپ کے لیے اجنبی ہوں۔''

''اجنبی نہیں تو غیر ضرور ہیں۔ کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ مجھے فون کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟''

''بس یونہی، میں نے سوچا کہ آپ تنہا ہیں۔ بور ہو رہی ہوں گی۔ کچھ باتیں بھی ہو جائیں۔''

''آپ کو میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میری تنہائی بانٹنے والے بہت لوگ ہیں۔''

''حیرت ہے۔ آج تو آپ کا رویہ اس روز کے مقابلے میں بالکل مختلف ہے۔ کیا میں اس تبدیلی کی وجہ جان سکتا ہوں۔''

''اس روز آپ میرے مہمان تھے۔ آج بن بلائے مہمان ہیں۔ اس لیے رویہ میں کچھ فرق تو ہوگا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ آپ کو میرا آنا اچھا نہیں لگا۔''

''اگر آپ شمائلہ کے ساتھ آتے تو خوشی ہوتی۔''

اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا۔ اس کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ دوسری طرف سے غالباً پنکچر والا بول رہا تھا۔ ماجد نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''اچھا آ رہا ہوں۔''

''مہمان نوازی کا شکریہ۔'' وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ ''امید ہے کہ اگلی بار آپ کا رویہ بہتر ہوگا۔''

میں نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔ ''اگر شمائلہ کے بغیر آئے تو شاید میں آپ کو گھر میں بھی داخل نہ ہونے دوں۔''

''یہ تو وقت ہی بتائے گا۔'' اس نے کہا اور ہنستا ہوا چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں سوچنے لگی کہ اس مصیبت سے کیسے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ اس کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ دوبارہ بھی آئے گا بلکہ مجھے بار بار تنگ کرتا رہے گا۔ بہت سوچنے کے بعد بھی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو میں نے اپنے میاں کو فون کیا اور بولی۔ ''آپ مجھے بہت یاد آ رہے ہیں۔ خود آ جائیں یا چند روز کے لیے مجھے اپنے پاس بلا لیں۔''

انہوں نے صاف جواب دے دیا اور کہا کہ اس وقت وہ ایک اہم پروجیکٹ پر کام کر رہے ہیں اس لیے دو ڈھائی مہینے تک نہ خود آ سکتے ہیں اور نہ ہی مجھے اپنے پاس بلا سکتے ہیں۔ اس پروجیکٹ کے ختم ہونے کے بعد ہی یہ ممکن ہوگا۔

مجھے ان کی بات سن کر مزید گھبراہٹ ہونے لگی کیونکہ میری نند کے یہاں ڈلیوری ہونے والی تھی اور میری ساس تین چار مہینے کے لیے اس کے یہاں چلی جاتیں۔ ان کے جانے کے بعد میں گھر میں تنہا ہوتی کیونکہ میرا دیور تو صبح کا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

گیا شام کو گھر واپس آتا تھا۔ اگر ان کی غیر موجودگی میں ماجد آ گیا اور اس نے مجھ سے چھیڑ چھاڑ کی تو میں کیا کروں گی۔ میں نے ایک بار پھر اپنے میاں کو فون کر کے کہا کہ امی کے جانے کے بعد میں گھر میں اکیلی رہ جاؤں گی۔ اس لیے وہ کچھ دنوں کے لیے مجھے اپنے پاس بلا لیں۔ میرے بہت زیادہ اصرار کرنے پر وہ مان گئے اور کہا کہ رہائش کا بندوبست ہوتے ہی وہ مجھے بلا لیں گے لیکن اس میں دس پندرہ دن یا مہینا لگ سکتا ہے۔

یہ سن کر میں نے اطمینان کا سانس لیا اور جانے کی تیاری شروع کر دی۔ میرا پاسپورٹ تو بنا ہوا تھا۔ ویزا وہ بھیجتے۔ میں نے اپنا سامان پیک کر لیا تھا اور جانے کے انتظار میں ایک ایک دن گن رہی تھی لیکن اسی دوران ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا جس نے میرے ہوش اڑا کر رکھ دیے۔ وہ دوپہر کا وقت تھا۔ میری ساس اپنی بیٹی کے گھر جا چکی تھیں اور میں گھر میں اکیلی تھی۔ میں نے ٹیلی فون کر کے فوڈ شاپ کو اپنے لیے کھانے کا آرڈر دیا اور ایک میگزین کی ورق گردانی میں مصروف ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد دروازے کی گھنٹی بجی۔ میں سمجھی کہ ڈیلیوری بوائے ہوگا لیکن اس کی بجائے دروازے پر ماجد کھڑا ہوا تھا۔ میں دروازہ بند کرنا چاہ رہی تھی کہ عین اسی وقت ڈیلیوری بوائے بھی کھانا لے کر آ گیا۔ میں اس کی طرف متوجہ ہوئی تو ماجد بلا تکلف گھر میں داخل ہو گیا۔ جب میں ڈیلیوری بوائے کو پیسے دے کر واپس آئی تو وہ بڑے اطمینان سے ٹانگ پر ٹانگ رکھے صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے بولا۔

''کیسی ہیں آپ؟''

''ٹھیک ہوں۔'' میں نے جل کر کہا۔ ''معاف کیجیے۔ مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ آپ کو وقت نہیں دے سکوں گی۔''

''کوئی بات نہیں۔ تھوڑی دیر بعد چلی جائیں۔ میں بھی تو اپنے کئی کام چھوڑ کر آیا ہوں۔''

''بڑی نوازش آپ کی۔ لیکن میں نے تو آپ کو نہیں بلایا تھا۔ پھر یہ احسان کیوں جتا رہے ہیں۔''

''بے شک آپ نہ بلائیں لیکن مجھے تو آپ کی تنہائی کا احساس ہے۔ اسی لیے آ جاتا ہوں۔''

''بہتر ہوگا کہ آپ میرے بارے میں سوچنے کی بجائے اپنی بیوی کو وقت دیں۔ مجھے آپ کی کمپنی کی ضرورت نہیں۔''

''لیکن مجھے تو ہے۔'' وہ عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''کیا مطلب؟''

''میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔'' وہ ایک دم آپ سے تم پر آ گیا۔ ''تم بھی تنہا ہو اور میں بھی پیاسا۔ کیوں نہ دونوں اپنی طلب پوری کر لیں۔''

یہ کہہ کر اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی جانب کھینچا۔ اس کی اس جسارت پر میں حیران رہ گئی لیکن میرے پاس سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کوئی حرکت کرتا۔ میں نے پوری قوت سے اسے دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا صوفے پر جا گرا۔ میں دوڑتی ہوئی کمرے میں گئی۔ دراز سے ریوالور نکالا اور اس پر تان لیا۔ میرے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا اور وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ..... یہ کیا کر رہی ہو؟''

میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''اگر تم میری سہیلی کے شوہر نہ ہوتے تو چھ کی چھ گولیاں تمہارے سینے میں اتار دیتی لیکن میں تمہارے خون سے ہاتھ رنگ کر پھانسی چڑھنا نہیں چاہتی۔ تم ابھی اور اسی وقت اپنی منحوس شکل لے کر یہاں سے چلے جاؤ اور آئندہ کسی غیر عورت کو ورغلانے سے پہلے یہ سوچ لینا کہ جس طرح تم دوسرے کے گھر میں تاک جھانک کر سکتے ہو اسی طرح کوئی تمہارے گھر میں بھی نقب لگا سکتا ہے۔''

اس کے حلق سے کوئی آواز نہ نکلی اور وہ گرتا پڑتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے فون کر کے الیکٹریشن کو بلوایا اور اس سے کہا کہ وہ بیرونی دروازے پر انٹر کام اور سیکیورٹی کیمرا لگا دے تاکہ آئندہ میں کسی غیر متعلقہ شخص کے لیے دروازہ کھولنے سے پہلے اپنا اطمینان کر لوں۔ یہ دونوں کام اسی روز ہو گئے تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ ویسے مجھے یقین ہے کہ اب وہ کبھی دوبارہ ادھر کا رخ نہیں کرے گا۔

اس واقعے کے چند روز بعد ہی میرا ویزا آ گیا اور میں میاں جی کے پاس دبئی چلی گئی۔ جانے سے پہلے میں نے شائلہ کو اپنی روانگی کے بارے میں بتایا لیکن اس سے ماجد کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ تین مہینے بعد واپس آئی تو کافی پُرسکون تھی۔ میرے شوہر کو ایک دوسری ملازمت مل گئی تھی اور اب انہیں دبئی میں ہی رہنا تھا۔ انہوں نے مجھ سے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

وعدہ کیا تھا کہ بہت جلد مستقل طور پر مجھے اپنے پاس بلالیں گے۔

میں نے واپس آنے کے بعد ایک بار پھر شائلہ کو فون کیا لیکن بات نہ ہوسکی۔ گھنٹی بج رہی تھی لیکن اس نے فون نہیں اٹھایا۔ اس کے بعد میں نے اسے کئی مرتبہ فون کیا لیکن رابطہ نہ ہوسکا تو مجھے فکر ہونے لگی۔ میرے پاس اس کے میکے کا نمبر نہیں تھا اور نہ ہی میں کبھی وہاں گئی تھی۔ اس سے رابطے کا واحد ذریعہ سیل فون تھا۔ جس پر بات نہیں ہو پا رہی تھی۔ مجھے فکر ہونے لگی۔

کئی ماہ گزر گئے۔ اس دوران میں دو مرتبہ دبئی کا چکر لگا چکی تھی۔ پھر ایک دن اچانک ہی شائلہ مجھ سے ملنے آ گئی۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ میں نے اس سے فون پر رابطہ نہ ہونے کی شکایت کی تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''حالات ہی ایسے ہو گئے تھے کہ میں چاہنے کے باوجود تم سے رابطہ نہ کرسکی۔''

''خیریت تو ہے۔ کیا ہوا؟'' میں گھبراتے ہوئے بولی۔

''ہاں خیریت ہی ہے۔ دراصل میں سعودی عرب چلی گئی تھی۔''

''واہ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ کیا ماجد کو وہاں جاب مل گئی ہے؟''

''ماجد نہیں راشد۔''

''ہیں۔'' میں چونکتے ہوئے بولی۔ ''یہ راشد کون ہے؟''

''میرا ماموں زاد ہے۔ میں نے ماجد سے طلاق لے کر راشد سے شادی کرلی ہے اور اس کے ساتھ سعودی عرب چلی گئی ہوں۔''

''میں بھی نہیں، تفصیل سے بتاؤ یہ کیا قصہ ہے؟''

''ماجد کی بے راہ روی حد سے زیادہ بڑھتی جا رہی تھی۔ اب وہ راتوں کو بھی گھر سے باہر رہنے لگا تھا۔ میں اگر کچھ بولتی تو مارنے پیٹنے پر اتر آتا۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اپنی روش نہیں بدل سکتا۔ بہتر یہی ہے کہ میں اپنی زبان بند رکھوں ورنہ وہ مجھے طلاق دے دے گا۔ میں اس کی دھمکی سے ڈر گئی اور چپ چاپ یہ ظلم سہتی رہی۔ اتفاق سے انہی دنوں راشد چھٹیوں پر آیا ہوا تھا۔ وہ سعودی عرب میں ملازمت کرتا ہے۔ ہم ایک دوسرے کو شروع سے چاہتے ہیں اور مجھے پورا یقین تھا کہ ہماری شادی میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی لیکن میرے خواب اس وقت چکنا چور ہو گئے جب ابو نے اس رشتے سے انکار کردیا۔ دراصل ماموں بہت غریب تھے اور انہوں نے بڑے مشکل حالات میں اپنے بچوں کی پرورش کی۔ راشد نے ٹیکنیکل کالج سے ڈپلوما کیا لیکن اسے کوشش کے باوجود ملازمت نہیں مل رہی تھی۔ ابو نے میرے بہتر مستقبل کی خاطر ماجد سے میری شادی کردی۔ راشد دل برداشتہ ہوکر سعودی عرب چلا گیا اور اسے وہاں جاب مل گئی۔ وہ پورے پانچ سال بعد واپس آیا تو اس کے حالات کافی بہتر ہو چکے تھے۔ وہ مجھ سے ملنے آیا تو میرے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے اور میں نے اپنا دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ وہ بھی میری یاد کو سینے سے لگائے بیٹھا تھا اور اس نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ میرے حالات سن کر اسے بہت افسوس ہوا اور اس نے پیشکش کی کہ اگر میں ماجد سے طلاق لے لوں تو وہ مجھ سے شادی کرنے کے لیے تیار ہے۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ میرے لیے اس سے اچھی بات کیا ہوسکتی تھی۔ میں نے سوچنے میں وقت ضائع نہیں کیا اور ماجد سے طلاق کا مطالبہ کردیا۔ اسے مجھ سے یہ توقع نہیں تھی۔ پہلے تو وہ حیران ہوا۔ پھر اس نے صاف انکار کردیا۔ اس پر میں نے اسے دھمکی دی کہ اگر اس نے مجھے طلاق نہ دی تو میں عدالت کے ذریعے خلع لے لوں گی۔ اس پر وہ ڈر گیا اور اس نے مجھے طلاق دے دی میرے گھر والے بہت ناراض ہوئے لیکن میں نے کسی کی پروا نہیں کی اور عدت پوری کرنے کے بعد راشد سے نکاح کرلیا اور اس کے ساتھ سعودی عرب چلی گئی۔ اللہ نے میری سن لی۔ میرا صبر رنگ لایا اور اب میں راشد کے ساتھ بہت خوش ہوں۔

''اور ماجد اب وہ کہاں ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم۔ طلاق دینے کے بعد وہ گھر سے چلا گیا تھا۔ میں نے سنا ہے کہ اس نے اپنا تبادلہ اسلام آباد کروالیا تھا۔''

میں نے اسے نئی زندگی کی مبارک باد دی اور سوچنے لگی کہ میرے منہ سے نکلی ہوئی بات کتنی جلدی پوری ہوگئی۔ ماجد یہ بھول گیا تھا کہ دوسرے کے گھر میں جھانکنے والے کے اپنے گھر میں بھی نقب لگ سکتی ہے۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

مقتول ساتھی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

محترم مدیر اعلیٰ
سلام تہنیت
ایک اور سرگزشت کے ساتھ حاضر ہوں۔ یہ سرگزشت ایک قیدی کی ہے اور اتنی الجھی ہوئی ہے کہ اسے عدالت سزا سنانے والی تھی لیکن میری وجہ سے ایک بے گناہ بالآخر سزائے موت سے بچ گیا۔

زرین قمر
(کراچی)

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب میں کراچی یونیورسٹی سے سوشیالوجی میں ماسٹرز کررہی تھی میری ساری توجہ اپنی تعلیم کی طرف تھی اور میں چاہتی تھی کہ اچھے گریڈ سے ماسٹرز کرنے کے بعد کسی بڑی اور مستحکم این جی او کو جوائن کرلوں۔ مجھے انسانوں کی نفسیات، ان کے ذہن کے اتار چڑھاؤ، ان کی سوچ کے انداز اور معاشرے میں ان کے کردار کا مطالعہ کرنے میں لطف آتا تھا۔ میں کسی بھی شخص کے ساتھ ہونے والے غیر معمولی حادثے کی تہہ تک پہنچنا چاہتی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded from Paksociety.com

سوشیالوجی کے فائنل ایئر میں مجھے ایک ایسا تھیسسز تیار کرنا تھا جو میری دلچسپی کا حاصل تھا۔ میں نے اس پر اپنی سالانہ رپورٹ تیار کرنے کی ہامی بھر لی تھیسسز کا عنوان پروفیسر شمس الدین نے خود ہی منتخب کر کے دیا تھا۔

''دیکھو میں چاہتا ہوں کہ تم اس موضوع پر اپنی سالانہ رپورٹ بناؤ۔'' انہوں نے ایک کاغذ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''انسان کو مجرم بنانے میں معاشرے کا کردار۔'' میں نے پیپر ان کے ہاتھ سے لے کر پڑھا۔ اس پیپر پر میرے دوسرے کلاس فیلوز کے نام بھی درج تھے اور ان کے ناموں کے ساتھ مختلف موضوع لکھے ہوئے تھے۔ مجھے کچھ دوسرے ساتھیوں کو دیئے گئے موضوعات زیادہ دلچسپ لگے۔

''سر! کیا میں یہ ٹاپک بدل سکتی ہوں؟'' میں نے پروفیسر شمس سے پوچھا۔

''بدل تو سکتی ہو لیکن اگر نہ بدلو تو زیادہ اچھا ہے۔''

''لیکن میں اس موضوع پر کن کتابوں سے مدد لوں گی؟ اس پر تو اتنا زیادہ لکھا بھی نہیں گیا کہ میں معلومات جمع کر کے تحقیقی رپورٹ بنا سکوں۔'' میں نے بے دلی سے کہا۔

''ایسا نہیں ہے۔ جب تم اس پر کام شروع کرو گی تو تمہیں اس میں دلچسپی محسوس ہو گی اور لطف بھی آئے گا۔ تم کتابوں، جرنلز، اخبارات کے علاوہ انٹرنیٹ سے بھی مدد لے سکتی ہو لیکن میں تمہیں ایک اور مشورہ دوں گا، اگر تم جیل جا کر ان قیدیوں سے ملو جو مختلف جرائم میں سزائیں کاٹ رہے ہیں تو تمہیں ہر قیدی ایک نئی کہانی سنائے گا کہ وہ مجرم کیسے بنا یوں تمہیں کتابوں میں سر نہیں کھپانا پڑے گا اور اپنے موضوع کے لیے فرسٹ ہینڈ نالج ملے گی یعنی وہ لوگ جو زمانے کی ستم ظریفیوں کی وجہ سے مجرم بنے، اپنے ذاتی تجربات وہ تمہیں خود بتا رہے ہوں گے۔'' پروفیسر نے مجھے سمجھایا اور یہ بات میرے دل کو لگی۔

''ٹھیک ہے سر میں اس موضوع پر کام کروں گی۔'' میں نے وعدہ کر لیا۔

''پھر تم سینٹرل جیل کب جا رہی ہو؟'' انہوں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''بس ایک دو دن میں۔'' میں نے جواب دیا۔

دو دن بعد میں نے سینٹرل جیل فون کر کے وہاں کے جیلر سے ملاقات کا ٹائم مانگا۔ انہوں نے چند سوالات پوچھنے کے بعد مجھے سینٹرل جیل آنے کی اجازت دے دی لیکن ساتھ ہی ہدایت کی تھی کہ میں اپنے یونیورسٹی ڈیپارٹمنٹ سے اپنے ڈین کا اجازت نامہ لے کر آؤں۔ میں نے ایسا ہی کیا تھا اور اجازت نامے کے ساتھ مقررہ وقت پر سینٹرل جیل پہنچ گئی تھی جہاں استقبالیہ پر میرے بیگ کی تلاشی کے بعد ایک باوردی ملازم کے ساتھ جیلر سے ملنے ان کے آفس میں بھیج دیا گیا۔

''مس زرین؟'' جیلر نے مجھ سے پوچھا۔

''جی، میں نے کل آپ سے فون پر ملاقات کا وقت مانگا تھا۔'' میں نے یونیورسٹی ڈیپارٹمنٹ کا تصدیق نامہ اور شناختی کارڈ کی کاپی جیلر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''میں آپ ہی کا منتظر تھا۔ تشریف رکھیے۔'' جیلر نے اخلاق کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہوئے کہا اور میں اس کے سامنے رکھی دو کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی۔

''آپ نے بتایا تو تھا کہ کس سلسلے میں ملنا چاہتی ہیں شاید کسی قیدی سے ملنا ہے آپ کو۔'' جیلر نے پوچھا۔

جی میں نے بتایا تھا کہ میں یونیورسٹی کے سوشیالوجی ڈیپارٹمنٹ میں زیرِ تعلیم ہوں اور فائنل ایئر میں مجھے ایک سالانہ رپورٹ بنانا ہے جس کا عنوان ہے ''انسانوں کو مجرم بنانے میں معاشرے کا کردار'' میں نے جواب دیا۔

''اس سلسلے میں آپ کسی خاص قیدی سے ملنا چاہتی ہیں؟''

''خاص قیدی تو نہیں اگر آپ مجھے مختلف نوعیت کے جرم کرنے والے چند الگ الگ قیدیوں سے ملوا سکیں تو بہتر ہو گا۔'' میں نے جواب دیا۔

''کس قسم کا جرم کرنے والے؟ قتل، چوری، ڈکیتی، زنا، جعل سازی کرنے والے یا جیب کترے کن سے ملنا چاہیں گی؟'' جیلر اپنی طرف سے ذہانت کا مظاہرہ کر کے بات کو طول دے رہا تھا۔

''ہر طرح کے لوگوں سے دیکھیں جرم کوئی بھی ہو اس کا مرتکب مجرم ہوتا ہے آپ مجھے کسی بھی مجرم سے ملوا سکتے ہیں لیکن اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے مجھے کئی مجرموں سے ملنا ہو گا۔'' میں نے سمجھایا تو جیلر نے بڑی بڑی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا جیسے بات اس کی سمجھ میں آ گئی ہو۔

''تو یوں کرتے ہیں کہ میں آپ کو اپنا رجسٹرڈ دکھاتا ہوں جس میں مجرموں کے ساتھ ان کے جرم اور ان کی قید کی مدت وغیرہ درج ہے، آپ اس میں سے اپنے مطلب کے مجرم چن لیں۔'' جیلر نے یوں کہا جیسے میں اس کے پاس

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اپنی پسند کے سوٹ خریدنے آئی ہوں اور وہ کپڑے بیچنے والا کوئی دکاندار ہے۔

''کیا مطلب؟''

''اوہو! مطلب یہ کہ میں آپ کو جن قیدیوں سے ملواؤں گا ہوسکتا ہے کہ وہ آپ کو پسند نہ آئے تو آپ اپنی مرضی سے رجسٹر میں سے چن لیں۔ ویسے میں کسی کو اتنی سہولت دیتا نہیں ہوں لیکن آپ چونکہ اسٹوڈنٹ ہیں تو آپ کی مدد کرنا میرا فرض ہے۔'' اس نے کہا۔ مجھے اندازے سے لگا کہ وہ اسٹوڈنٹ ہونے کے ناطے نہیں بلکہ لڑکی ہونے کے ناطے میری مدد کررہا ہے۔

''چلیں ٹھیک ہے آپ مجھے رجسٹر دکھا دیں۔'' میں نے بے دلی سے کہا۔

''نبیل.....او نبیل۔'' جیلر نے دوسرے کونے میں لگی میز پر بیٹھے لڑکے کو آواز دی جو رجسٹر پر کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔

''جی سر۔'' اس نے الرٹ ہوتے ہوئے کہا۔

''دیکھو یہ صاحبہ کچھ قیدیوں سے ملنا چاہتی ہیں، انہیں قیدیوں والا بڑا رجسٹر دکھادو اور جن لوگوں کو یہ بتائیں ان کے ناموں کی فہرست بنا کر مجھے دے دو۔'' جیلر نے کہا۔

''جی سر! ٹھیک ہے۔'' نبیل نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''میں ابھی رجسٹر لاتا ہوں، وہ شاید ریکارڈ روم میں ہے۔'' نبیل نے کہا اور کمرے سے چلا گیا۔ جیلر نے میز پر رکھی گھنٹی بجائی، ایک گارڈ کمرے میں داخل ہوا۔

''باہر سے دو اسپیشل چائے اور کچھ بسکٹ منگواؤ، بھئی ہمارے مہمان آئے ہیں۔'' جیلر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''او کے سر۔'' گارڈ نے کہا اور واپس مڑ گیا۔

''اس تکلف کی کیا ضرورت تھی جناب۔'' میں نے انکساری سے کہا۔

''نہیں ضرورت کیوں نہیں تھی، بھئی آپ کو بھی تو پتا چلے کہ ہم لوگ اتنے بداخلاق نہیں ہوتے جیسا کہ لوگوں نے مشہور کیا ہوا ہے۔'' اس نے کہا۔

''نہیں صاحب! ایسا کچھ نہیں ہے۔'' میں نے سمجھایا۔ ''آپ ایک اہم عہدے پر فائز ہیں اور اپنی ذمہ داری بخوبی نباہ رہے ہیں۔ اگر کسی کے ساتھ سختی کرتے ہیں تو وہ آپ کے کام کا حصہ ہے۔'' میں نے یہ سوچ کر اس کی تعریف کی کہ وہ میرے ساتھ مزید تعاون کرے اور میری یہ تعریف کام کرگئی۔

''آپ کے ذہن میں کیا ہے؟ اگر آپ مجھے بتا سکیں تو شاید میں آپ کی زیادہ اچھے طریقے سے مدد کرسکوں۔'' اس نے اپنائیت سے کہا۔

''ابھی تو میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ چند قیدیوں سے ملنے کے بعد ہی کوئی فیصلہ کرسکوں گی۔''

''ٹھیک ہے۔'' جیلر نے کہا۔ اتنی دیر میں چائے آگئی۔ چائے سے فارغ ہونے کے بعد میں نے قیدیوں کے رجسٹر سے چند قیدیوں کے نام منتخب کیے اور فہرست جیلر کی طرف بڑھا دی جسے دیکھنے کے بعد جیلر نے وہ فہرست اپنی ٹیبل کے شیشے کے نیچے لگالی۔

''ٹھیک ہے، میں آپ کو ایک، ان میں ایک قیدی سے ملواؤں گا۔ اس فہرست میں پانچ قیدی ہیں جنہوں نے مختلف جرم کیے ہیں۔ ایک دن میں آپ صرف ایک گھنٹے کے لیے ایک قیدی سے مل سکیں گی۔'' جیلر نے اپنا فیصلہ سنایا۔

''لیکن اس طرح تو مجھے پانچ دن لگ جائیں گے۔'' میں نے کہا۔

''میں اس سے زیادہ آپ کے ساتھ تعاون نہیں کرسکتا۔ قیدیوں کا معاملہ ہے آپ کو ان کے ساتھ اکیلا بھی چھوڑ نہیں جاسکتا اور دوسرے معاملات بھی دیکھنا ہیں۔''

''اچھا ٹھیک ہے تو پھر آج؟''

''آج نہیں.....دراصل ملاقات کا وقت ختم ہوگیا۔ اب کل آپ دس بجے آئیں۔'' جیلر نے خاصی خوش اخلاقی سے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ اب وہ مزید میری کوئی بات نہیں سنے گا چنانچہ میں اگلے دن آنے کا وعدہ کرکے واپس آگئی۔ پھر میں لگاتار تین دن تک مقررہ وقت میں تین قیدیوں سے ملی لیکن مجھے بات بنتی محسوس نہیں ہورہی تھی۔ کوئی قیدی بے انتہا بددماغ اور غصیلا ہوتا اور کسی بات کا جواب دینے کو تیار نہ ہوتا۔ کوئی اپنی کہانی سنانے کی بجائے اپنے بے گناہ ہونے کا رونا رونے بیٹھ جاتا اور کسی کو اپنے گھر والوں سے ملنے کی اتنی فکر ہوتی کہ وہ میرے سوالوں کے جوابات دینے کی بجائے مجھ ہی سے اپنی سفارش کرنے کی فرمائش کرنے لگتا۔ میں اس صورتِ حال سے تنگ آگئی تھی کہ چوتھے دن میری نگاہِ انتخاب ایک قیدی پر پڑی۔ اس کا نام میری فہرست میں شامل نہیں تھا۔ دراصل اس کی کوٹھڑی اس قیدی کی کوٹھڑی کے سامنے تھی جس

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

سے مجھے ملنا تھا۔ اس سے گفتگو کے دوران میری ساری توجہ سامنے والی کوٹھڑی کے قیدی کی طرف تھی۔ اس کوٹھڑی میں دو قیدی تھے لیکن دونوں خاموش بیٹھے تھے ایک دوسرے سے بھی باتیں نہیں کر رہے تھے۔ میری توجہ کا مرکز جو قیدی تھا اس کی عمر پینتیس سال رہی ہوگی۔ سر کے بال بھورے اور بکھرے ہوئے تھے۔ وہ اپنے اطراف سے بے خبر بیٹھا مسلسل اپنی کوٹھڑی کی دیوار کو گھور رہا تھا۔

''یہ..... یہ کون ہے؟'' میں نے اپنے ساتھ موجود جیلر سے پوچھا۔ ہر روز وہ مجھے ایک قیدی سے ملوانے میرے ساتھ قیدی کی کوٹھڑی تک آتا تھا۔

''یہ مقبول ہے مالا پور کا رہنے والا، اس نے ڈاکا ڈالا تھا۔ پکڑا گیا اور اب سزا کاٹ رہا ہے۔'' جیلر نے بتایا۔

''کیا میں اس سے مل سکتی ہوں؟'' میں نے پوچھا۔

''مل تو سکتی ہیں لیکن اس کا نام تو اس فہرست میں نہیں ہے۔ دراصل ہمیں بھی اپنے افسران کو ... جواب دینا ہوتا ہے۔''

''تو یہ کون سی بڑی بات ہے اس کا نام بھی اس فہرست میں ڈال دیں۔'' میں نے کہا۔

''چلیں ٹھیک ہے ڈال دوں گا۔'' جیلر نے دانت نکالتے ہوئے کہا اور میں اٹھ کر مقبول کی کوٹھڑی کی طرف بڑھ گئی۔

''یہ کیا غضب کر رہی ہیں؟ بھئی ایک دن میں ایک قیدی..... یہ بات تو طے ہو چکی ہے نا۔'' جیلر نے اعتراض کیا۔

''بس ٹھیک ہے جیلر صاحب میں نے اس قیدی سے آج زیادہ بات نہیں کرنا۔ کل تفصیل سے بات کروں گی۔ آج تو بس تھوڑا سا تعارف کرانا چاہتی ہوں۔'' میری بات پر جیلر برا سا منہ بنا کر چپ ہو گیا۔ لیکن اسے میری یہ بات پسند نہیں آئی تھی۔

''اے سنو! میں تم سے کہہ رہی ہوں مقبول۔'' میں نے قیدی کو نام لے کر مخاطب کیا تو اس نے میری طرف دیکھا لیکن وہ کچھ بولا نہیں تھا۔

''تمہارا نام مقبول ہے؟'' میں نے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''یہاں کیوں لائے گئے ہو؟''

''چوری کا الزام ہے۔''

''الزام؟ کیا چوری نہیں کی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''ارے سب یہی کہتے ہیں چوری کا الزام ہے۔ قتل کا الزام ہے، یعنی ہم الزام لگا کر قید کر دیتے ہیں۔'' جیلر نے غصے سے کہا تو مقبول سہم کر اسے دیکھنے لگا۔

''جیلر صاحب کیا میں اکیلے میں اس سے بات کر سکتی ہوں؟'' میں نے پوچھا۔ میرا خیال تھا کہ اگر ہمارے درمیان جیلر موجود نہ ہو تو شاید مقبول کچھ کھل کر بات کر سکے گا۔

''اکیلے میں؟'' جیلر نے حیرت سے کہا۔

''ہاں! میرا خیال ہے کہ اکیلے میں وہ زیادہ کھل کر بات کر سکے گا۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''دراصل ہم قیدیوں سے اکیلے میں لوگوں کو کم ہی ملواتے ہیں، ہم نہیں چاہتے کہ سیکورٹی کا کوئی مسئلہ کھڑا ہو۔ ہم سے بھی سخت پوچھ گچھ ہوتی ہے۔'' جیلر نے جواب دیا۔

''اچھا آپ مجھے دس منٹ کے لیے اس کے ساتھ اکیلا چھوڑ دیں یہ تو کوٹھڑی میں بند ہے اور سامنے گارڈ کھڑا ہے۔ میں چند سوال پوچھ کر آپ کے آفس میں آجاؤں گی شاید یہ آپ کے ڈر سے کچھ بتانے سے گریز کر رہا ہے۔'' میں نے جیلر کو سمجھایا۔

''اچھا ٹھیک ہے، دیکھیں آپ اصول توڑ رہی ہیں۔ پہلے تو فہرست کے علاوہ آپ کسی سے مل رہی ہیں اور اب اکیلے بات کرنا چاہتی ہیں۔ میرے لیے کوئی مشکل کھڑی نہ کر دیجیے گا۔ ٹھیک دس منٹ بعد آپ واپس آجایئے گا۔''

''ہاں..... ہاں..... ٹھیک دس منٹ بعد میں واپس آجاؤں گی۔'' میں نے ہامی بھری تو وہ واپس ہو گیا۔ پھر جاتے جاتے گارڈ کے پاس رک کر اس نے اسے کوئی ہدایت دی تھی۔ میں مقبول کی طرف مڑ گئی۔

''مقبول! تم نے چوری کیوں کی تھی؟'' میں نے پوچھا تو اس نے نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں۔

''بتاؤ مقبول..... میں جاننا چاہتی ہوں کہ تم نے چوری کیوں کی تھی؟'' میں نے پھر پوچھا۔

''آپ کیوں جاننا چاہتی ہیں؟''

''کیونکہ میرا ماننا ہے کہ ہر بچہ معصوم پیدا ہوتا ہے، برے کام اسے حالات یا مجبوریاں سکھاتی ہیں۔ تمہارے ساتھ ایسی کیا مجبوری تھی کہ تم نے چوری کی اور اب جیل کاٹ رہے ہو؟''

''میرے ساتھ مجبوری نہیں تھی۔ شاید میری بدقسمتی تھی یا میرا دماغ خراب ہو گیا تھا۔'' مقبول نے کہا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''کیوں آخر کیا وجہ تھی؟''

''جب میں نے چوری کی تھی تب یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن اب جب میں جیل میں ہوں اور پہروں بیٹھا سوچتا رہتا ہوں تو مجھے سمجھ آئی کہ قصوروار میں ہی ہوں۔''

''کھل کر بات کرو مقبول، میں حقیقت جاننا چاہتی ہوں۔ دراصل میں ایک تحقیقی مضمون لکھ رہی ہوں جس میں ان وجوہات کا ذکر کرنا چاہتی ہوں کہ لوگ مجرم کیوں بنتے ہیں۔''

''سب سے بڑی وجہ تو یہ تھی کہ میرا دل کبھی پڑھنے میں نہیں لگا۔ باپ کے ہزار سمجھانے کے باوجود میں نے کبھی دل لگا کر نہیں پڑھا۔ جب ماں باپ کا سایہ سر سے اٹھا تو میں پانچویں کلاس میں تھا اور عمر میں کلاس کے بچوں سے دگنا تھا۔ استاد بھی میری نالائقی کی وجہ سے ہر وقت لعن طعن کرتے رہتے تھے۔ باپ کی زندگی میں اکلوتا بیٹا ہونے کی وجہ سے ہر طرح کی خواہش پوری ہوتی رہی لیکن باپ کے مرنے کے بعد میں پائی پائی کو محتاج ہو گیا اور تب ہی میں نے چوری چکاری شروع کر دی جس سے کسی نہ کسی طرح دن بھر میں ایک بار مجھے پیٹ بھر کر کچھ کھانے کو مل جاتا تھا۔ میں ہر بار یہ سوچتا کہ اب چوری نہیں کروں گا لیکن پھر جب بھوک ستاتی تو میں پھر سے چوری کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ یہی سلسلہ کافی عرصے تک چلتا رہا۔'' مقبول بولتے بولتے رک گیا۔

''پھر..... پھر کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے آپ کے دس منٹ پورے ہو گئے ہیں وہ گارڈ ادھر ہی آ رہا ہے۔'' اس نے سامنے کی طرف اشارہ کیا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ میں کل پھر آؤں گی اور تم سے مزید باتیں پوچھوں گی۔'' میں نے کہا اور گارڈ کے ساتھ واپس جیلر کے آفس میں چلی گئی۔

''کچھ کام بنا میڈم۔'' جیلر نے مجھ سے پوچھا۔

''آپ نے صرف دس منٹ دیئے تھے۔ دس منٹ میں زیادہ سے زیادہ میں کتنے سوالات کر سکتی تھی۔ مشکل سے دو تین باتیں ہی کی ہیں، میں کل پھر آؤں گی۔'' میں نے کہا۔

''ضرور۔ پھر کل مقبول ہی سے ملنا ہے یا اگلے قیدی سے؟'' جیلر نے پوچھا۔

''نہیں ابھی میں مقبول ہی سے ملوں گی بعد میں اگر ضرورت ہوئی تو دیکھا جائے گا۔'' میں نے کہا اور واپس آ گئی۔

رات کو جب میں سونے کے لیے لیٹی تو میں مقبول کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس کی کہی ہوئی بات دل کو تو لگی تھی، حقیقت ہے جو شخص تعلیم کو اہمیت نہیں دیتا وہ زندگی میں ناکامیوں کا سامنا کرتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا اور وہ بہترین یا مناسب پیشہ اختیار نہ کر سکا اور چوریاں کرنے لگا۔ میں نے اگلے دن مقبول سے کیے جانے والے چند سوالات نوٹ کیے اور سو گئی۔

دوسرے دن میں مقررہ وقت پر سینٹرل جیل پہنچ گئی تھی مقبول اپنی کوٹھڑی میں تنہا تھا۔

''ہاں تو مقبول تم بتا رہے تھے کہ تم بھوک پیاس سے تنگ آ کر چوریاں کرتے تھے پھر اس کے بعد کیا ہوا؟'' میں نے اس کے پاس پہنچتے ہی سوالات شروع کر دیے۔

ایک بار میں کئی روز کا بھوکا تھا تو اپنے علاقے کے واحد ہوٹل میں جا بیٹھا۔ ہوٹل کے مالک نے مجھے دیکھ کر برا سا منہ بنایا کیونکہ میرے اوپر پہلے بھی اس کا ادھار چڑھا ہوا تھا۔ میرے ہوٹل میں داخل ہوتے ہی ہوٹل کے مالک نے اپنے ملازم کو تنبیہ کی تھی۔

''چھوٹے! دھیان سے بھئی۔'' ہوٹل کے مالک نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جس کا مطلب تھا کہ چھوٹا مجھ پر نظر رکھے کہ کسی چیز پر ہاتھ صاف نہ کر جاؤں۔ اب علاقے کے لوگ جان گئے تھے کہ میں عادی چور بن چکا ہوں۔ ابھی مجھے وہاں بیٹھے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ میرا دوست بشیر ہوٹل میں داخل ہوا اور مجھ پر نظریں پڑتے ہی اس کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا آیا اور میرے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''مقبول میں ساری بستی میں تجھے ڈھونڈتا پھر رہا ہوں اور تو یہاں بیٹھا ہے۔'' اس نے کہا۔

''کیوں؟ کیوں ڈھونڈ رہا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''ایک جگہ کام نکلا ہے۔'' اس نے رازداری سے کہا۔

''دیکھ بھئی بشیر اس بار مال آدھا آدھا ہو گا۔'' میں نے اس کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا۔ ''ہر بار ساری محنت میں کرتا ہوں اور مال تو لے اڑتا ہے اور مجھے ذرا سی اُجرت پر ٹرخا دیتا ہے۔'' میں نے ناراضگی سے کہا۔

''ارے تو ناراض کیوں ہوتا ہے کر لینا آدھا آدھا۔'' بشیر نے فراخ دلی سے کہا۔

''اچھا یہ بتا کام کہاں کرنا ہے؟'' میں نے پوچھا تو بشیرے نے چپکے چپکے تفصیلات مجھے سمجھائیں پھر وہ سیدھا ہو

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کر بیٹھ گیا تھا۔

''اچھا! اب یہ بتا کہ تو نے کچھ کھایا بھی ہے؟'' اس نے ہمدرد بن کر پوچھا۔

''ہاں! اب تیرا کام ہے تو پوچھے گا ہی ورنہ پچھلے تین دن سے مجھ پر کیا گزر رہی ہے تو نے پوچھا؟'' میں نے مصنوعی غصے سے کہا تو وہ ہنسنے لگا۔

''او چھوئے!'' بشیرے نے ہوٹل کے ملازم کو آواز دی، وہ دوڑ کر قریب آ کھڑا ہوا۔

''جی صاب۔''

''جا جلدی سے میرے یار کے لیے گرما گرم کھانا لے آ.....اور ہاں بعد میں چائے کی دو گرم اور کڑک پیالیاں بھی لے آنا۔'' بشیرے نے گردن اکڑا کر آرڈر دیا۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میں پُرسکون ہو گیا تھا۔ کئی دن کے بعد کھانا نصیب ہوا تھا اور دل چاہ رہا تھا کہ لمبی تان کر سو جاؤں۔

''اچھا کل پہنچ جائے گا ٹھکانے پر۔'' چائے پینے کے بعد بشیرے نے مجھ سے پوچھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''ہاں ہاں پہنچ جاؤں گا۔ میں نے بے پروائی سے کہا۔ پھر میں نے چائے ختم کی اور سگریٹ سلگا لی۔ میں ہوٹل سے نکلنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ میری نظر احمد پر پڑی جو ابھی ابھی ہوٹل میں داخل ہوا تھا۔ سلمان احمد قصبے کی تھوک کی دکانوں پر مال سپلائی کرتا تھا اور ہر مہینے کی دس تاریخ کو ان دکانداروں سے پیسے وصول کر کے لے جاتا تھا۔ اس روز بھی دس تاریخ تھی اور سلمان احمد کی پتلون کی جیبیں بتا رہی تھیں کہ ان میں موجود رقم میرے نصیب کی ہے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ آج نصیب نے مجھے بڑی رقم پر ہاتھ صاف کرنے کا موقع دیا ہے۔ میں جانتا تھا کہ شہر جانے کے لیے سلمان احمد اسٹیشن ضرور جائے گا اور اسٹیشن تک جانے والا راستہ سنسان ہی رہتا تھا۔ راستے کے دونوں طرف گھنی جھاڑیاں تھیں اور سلمان احمد جانے کیوں اسٹیشن جانے کے لیے اسی راستے کو منتخب کرتا تھا جب کہ کچھ فاصلے پر سڑک بھی تھی جہاں سے اِکّا دُکّا تانگے اور رکشے بھی گزرتے تھے اور وہ راستہ نسبتاً محفوظ بھی تھا۔'' مقبول اتنی بات کر کے خاموش ہو گیا تھا۔

''پھر..... پھر کیا ہوا؟'' میں نے اس سے پوچھا تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور سلسلہ کلام دوبارہ جوڑا۔

''مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔ وہ جیسے ہی کاؤنٹر سے ہٹ کر ہوٹل سے باہر نکلا میں بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔ اس نے نیلی پتلون اور نیلی دھاری دار قمیص پہنی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا کالا بیگ تھا جس میں وہ اپنا چشمہ اور ضرورت کے کچھ کاغذات رکھتا تھا۔ وہ مکانوں کی قطاروں اور گلیوں سے گزرتا ہوا اس سنسان راستے کی طرف بڑھ رہا تھا جو جھاڑی دار تھا۔ میں بہت ہوشیاری سے خود کو چھپاتے ہوئے جھاڑیوں کی اوٹ میں اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ جب وہ آبادی کو چھوڑ کر اس سنسان راستے پر آگے بڑھا تو میں نے اپنے اور اس کے درمیان کے فاصلے کو کم کرنا شروع کر دیا پھر ایک موقع مل گیا۔ راستے میں ایک موٹی سی ڈالی مل گئی تھی اسے اٹھائے ہوئے میں اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ جیسے ہی مجھے موقع ملا میں نے اس کے سر پر دے ماری۔ سلمان احمد کے سر پر شدید چوٹ آئی تھی اور وہ لڑکھڑا کر گر گیا تھا۔ میں نے جلدی جلدی اس کی جیبوں کو خالی کرنا شروع کر دیا۔ ایک جیب میں سے تو صرف رسیدیں ہی نکلیں جو مختلف اشیا کے سودے کے بارے میں تھیں لیکن دوسری جیب سے نوٹوں کی جو گڈی برآمد ہوئی وہ پچیس ہزار کی تھی۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ پہلی بار میں اس رقم کا بلاشرکت غیرے مالک تھا۔ میں نے رقم اپنی جیبوں میں ٹھونسی اور واپس مڑ گیا۔ پھر واپسی کے لیے میں نے جو راستہ منتخب کیا وہ گنے کے کھیتوں سے گزرتا تھا۔ میں زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ ایک شدید دھکا لگا اس کے ساتھ ساتھ میرے سر پر بھی ضرب لگی تھی۔ میں ایک گڑھے میں جا گرا اور مجھے دنیا و مافیہا کی کوئی خبر نہ رہی۔'' مقبول ایک بار پھر خاموش ہو گیا تھا۔ وہ گفتگو کے دوران بار بار چپ ہو کر جیسے کچھ سوچ میں پڑ جاتا تھا۔

''پھر؟ آگے بتاؤ۔'' میں نے اسے ٹوکا۔

''بس پھر جب مجھے ہوش آیا تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ میں نے اپنی جیبوں کی تلاشی لی تو وہ خالی تھیں۔ سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ جب میں نے درد کی جگہ پر ہاتھ رکھا تو وہاں بڑا سا گومڑا بنا ہوا تھا جس سے خون رس رہا تھا اور ایک پتلی سی دھار نکل کر نیچے ٹپک رہی تھی۔ میرے کپڑے ریت میں اَٹ گئے تھے۔ میں اٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ میری بدقسمتی میرا مذاق اڑا رہی تھی۔ اچھی خاصی لوٹی ہوئی رقم میرے ہاتھ سے نکل گئی تھی جس کی میں کسی تھانے میں رپورٹ نہیں لکھوا سکتا تھا کیونکہ مجھے بتانا پڑتا کہ میں نے کہاں سے رقم حاصل کی تھی۔'' مقبول کی بات ختم ہوتے ہی گارڈ میرے پاس آ کھڑا ہوا تھا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

"میڈم! جیلر صاب بلا رہے ہیں آپ کا ملاقات کا ٹائم ختم ہو گیا۔" اس نے کہا تو میں نے مقبول سے اگلے روز آنے کا وعدہ کر کے رخصت چاہی۔

اگلے روز میں پھر مقبول سے ملنے پہنچ گئی تھی۔

"ہاں تو مقبول پھر کیا ہوا تم زخمی ہو کر لوٹی ہوئی رقم گنوا کر اپنے گھر چلے گئے اس کے بعد؟" میں نے پوچھا۔

"بس پھر دو سال تک سلسلہ یونہی چلتا رہا چھوٹی موٹی کامیابی ملتی رہی۔ ایک بار میں نے قصبے کے سب سے امیر شخص کے گھر چوری کا پروگرام بنایا۔ میں نے کامیابی سے چوری بھی کر لی تھی لیکن جب بھاگنے کے لیے باہر سڑک پر چھلانگ لگائی تو قسمت نے دغا دے دی۔ علاقے میں پہرے پر موجود پولیس والا مجھ سے صرف چار فٹ کے فاصلے پر کھڑا تھا گویا میں ایک بار پھر اپنی قسمت کے ہاتھوں شکست کھا گیا تھا۔" مقبول نے اداسی سے کہا اس کا ساتھی قیدی خاموشی سے اس کی بات سن رہا تھا اب تک اس نے ہماری باتوں میں دخل اندازی نہیں کی تھی۔

"پھر؟"

"پھر کیا؟ میں گرفتار ہو گیا میرے قبضے سے چوری کی رقم اور زیورات برآمد ہوئے جنہیں شناخت کر لیا گیا مجھے پولیس کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد کورٹ میں پیش کر دیا گیا اور چھ سال قید کی سزا سنائی گئی۔ تب سے میں اس کوٹھڑی میں قید ہوں۔ میرا دنیا میں کوئی نہیں ہے کوئی مجھ سے ملنے بھی نہیں آتا ہے۔" مقبول نے اپنی کہانی ختم کرتے ہوئے کہا۔

مجھے خاصی مایوسی ہوئی تھی کیونکہ اس کی کہانی میں مجھے ایسا کچھ خاص ملا نہیں تھا۔

"اور تمہارا یہ قیدی ساتھی؟" میں نے پوچھا۔

"یہ بھی میری طرح چوری کی وارداتیں کرتا تھا اس پر ایک قتل کا الزام بھی ہے۔" مقبول نے کہا۔

"اب الزام نہیں قتل ثابت ہو گیا تھا اور میں پندرہ سال کی سزا بھگت رہا ہوں۔" ساتھی قیدی نے مداخلت کی جس کا نام اکرم تھا۔ میں خاموشی سے وہاں سے اٹھ گئی تھی اور جیلر کے کمرے میں چلی گئی تھی۔

"آج آپ کو کئی دن ہو گئے ہیں کچھ کام بنا؟" جیلر نے مجھ سے پوچھا تو میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کل آخری کوشش اور کروں گی پھر کسی اور قیدی سے سوالات کروں گی۔" میں نے کہا۔

دوسرے روز جب میں مقبول سے ملنے پہنچی تو کوٹھڑی میں اچھا خاصا ہنگامہ تھا۔ دونوں آپس میں لڑ رہے تھے۔

"میں کہہ رہا ہوں کہ نیچے والا بستر میرا ہے۔" مقبول نے اکڑ کر اکرم سے کہا۔

"ہونہہ! میں تم سے پہلے سے یہاں رہ رہا ہوں اور اس بستر پر سوتا ہوں تم بعد میں آئے ہو چنانچہ اوپر والی برتھ تمہاری ہے۔" اکرم نے ناگواری سے کہا۔

"دیکھو اکرم فضول بحث مت کرو۔" مقبول کے لہجے میں نفرت تھی۔

"ورنہ کیا کر لو گے؟" اکرم نے بھی اکڑ کر کہا۔

"میں تمہیں اٹھا کر باہر پھینک دوں گا۔" مقبول نے غصے سے جواب دیا۔ اس کے جواب پر اکرم اس سے لڑنے مرنے پر آمادہ ہو گیا۔ میں دونوں کو آوازیں دے کر منع

کراچی
ماہنامہ پاکیزہ

میں، قاری بہنوں کی دلچسپی کے لیے ایک نیا اور منفرد سلسلہ باتیں بہار و خزاں کی.... پیش کیا جا رہا ہے جس میں ہر قاری بہن دیے گئے سوالوں کے جوابات دے کر شمولیت اختیار کر سکتی ہے۔ آپ کے خیالات و احساسات ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

تو قارئین آج ہی
ماہنامہ پاکیزہ
اپنے ہاکر سے بک کروالیں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کررہی تھی لیکن دونوں میں سے کوئی بھی میری آواز پر توجہ نہیں دے رہا تھا۔ آخر کار گارڈ اپنی جگہ سے آیا اور اس نے دونوں کو ڈانٹ کر خاموش کیا۔

''ان دونوں نے پریشان کردیا ہے۔ جب لڑتے ہیں تو ایسے جیسے ایک دوسرے کی جان کے دشمن ہیں اور جب دوستی ہوتی ہے تو دونوں گھنٹوں باتوں میں مگن رہتے ہیں۔'' گارڈ نے مجھ سے کہا گارڈ کے جانے کے بعد میں نے پھر مقبول کو مخاطب کیا۔

''مقبول تم نے اب تک مجھے جو کچھ بتایا اس میں تم نے اپنی ناکامی کا سبب ہمیشہ اپنی بدقسمتی کو ٹھہرایا ہے ایسا کیوں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ارے اگر قسمت اچھی ہوتی تو میں اپنے باپ کی ہدایت پر عمل کر کے تعلیم حاصل کرتا اور کوئی اچھا آدمی بن جاتا، عزت کی زندگی بسر کرتا، میرے بھی بیوی بچے ہوتے، پرسکون زندگی ہوتی۔''

''بس بس..... بس کر یار تو تو شیخ چلی جیسی باتیں کرنے لگا۔'' اکرم نے اسے ٹوکا۔

''نہیں اکرم میں سچ کہتا ہوں میری زندگی صرف میری بدنصیبی کی وجہ سے برباد ہوئی ہے۔'' مقبول نے کہا۔

''مگر تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟'' اکرم نے کہا۔ میں خاموش بیٹھی سن رہی تھی۔

''دیکھو میں نے جب بھی سوچا کہ کوئی بڑا ہاتھ ماروں، ساری عمر کے لیے کچھ کمالوں اور باقی زندگی گناہوں سے توبہ کرلوں تو میری بدنصیبی میرے آڑے آجاتی رہے، میں ناکام رہا۔ اب تم میری آخری چوری کی مثال لے لو۔ میں نے قصبے کے سب سے امیر آدمی کے گھر اس لیے چوری کی تھی کہ مجھے اتنی رقم حاصل ہو جائے گی کہ باقی زندگی چوری نہیں کرنا پڑے گی۔

چوری میں نے بہت کامیابی سے کی تھی اور رقم لے کر فرار ہونے میں کامیاب بھی ہوگیا تھا۔ کوئی آہٹ نہیں ہوئی تھی کوئی فرد نہیں جاگا تھا لیکن جب میں نے چھت سے چھلانگ لگائی تو ایک پولیس والا نظر آیا جو مجھ سے چار فٹ کے فاصلے پر کھڑا تھا اس نے مجھے پکڑ لیا، تھانے لے گیا جہاں چوری کا مال برآمد ہوا اور مجھے اس جرم میں چھ سال کی قید ہو گئی۔'' مقبول نے اکرم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب تم ہی بتاؤ کہ یہ میری بدنصیبی نہیں تو اور کیا ہے؟''

''میں اب بھی یہ نہیں مانتا کہ اس میں تمہاری بدنصیبی کا قصور ہے، بھئی یہ تو اتفاق تھا کہ وہاں پر اس وقت سپاہی موجود تھا یا پھر تم اسے اپنی غلطی کہہ سکتے ہو کہ تم نے بغیر دیکھے چھت سے چھلانگ لگا دی۔ میرے تو خیال میں یہ بدنصیبی سے زیادہ تمہاری غلطی نظر آتی ہے۔'' اکرم نے کہا۔

''ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔'' میں نے بھی اکرم کی تائید کی۔

''تم نہیں مانو گے لیکن مجھ سے پوچھو میں کئی بار اپنی بدنصیبی کا شکار ہو چکا ہوں۔'' مقبول نے کہا۔

''چلو چھوڑو کوئی اور بات کرو۔'' اکرم نے بے دلی سے کہا۔

''اچھا کہا، تم اس کو بھی میری غلطی کہہ سکتے ہو کہ اب سے تین سال پہلے میں نے ایک شخص کی جیب سے پچیس ہزار روپے چرائے تھے لیکن اسی وقت ذرا سی دیر میں کسی نے میری جیب سے وہ رقم واپس نکال لی، میں گنے کے کھیت میں کئی گھنٹے بے ہوش پڑا رہا۔'' مقبول کی اس بات پر اکرم اسے چونک کر دیکھنے لگا۔

''تم کہاں کے رہنے والے ہو؟'' اکرم نے اس سے وہ سوال کیا جو پچھلے ایک سال سے نہیں کیا تھا۔

''میں مالا پور کا رہنے والا ہوں۔'' مقبول نے اپنے قصبے کا نام بتایا۔

''مالا پور۔'' اکرم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔'' مقبول نے جواب دیا۔

''تم نے یہی کہا نا کہ جس وقت کسی نے تمہاری جیب سے پچیس ہزار کی رقم نکالی تم گنے کے کھیت میں تھے؟'' اکرم نے پوچھا۔

''ہاں۔'' مقبول نے جواب دیا۔

''تم نے یہ بھی کہا کہ تم وہاں کئی گھنٹے بے ہوش پڑے رہے تھے؟'' اکرم نے پوچھا۔

''ہاں..... ہاں! میں نے یہی کہا ہے۔'' مقبول نے کہا۔

''تم نے یہ بھی کہا نا کہ وہ رقم تم نے کسی اور شخص کی جیب سے اڑائی تھی؟'' اکرم نے پھر پوچھا۔

''بھئی میں نے کہا تھا لیکن تم اس طرح کیوں سوالات کررہے ہو؟'' مقبول نے پوچھا۔ میں حیرت سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ آخر اکرم اس سے یہ سب کیوں پوچھ رہا ہے سوالات تو مجھے مقبول سے کرنا تھے۔

''کیا کرو گے سب پوچھ کر اب تو اس بات کو بہت

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

عرصہ ہوگیا۔'' مقبول نے کہا۔

''میں جاننا چاہتا ہوں مجھے بتاؤ۔'' اکرم نے اصرار کیا۔

''تین سال پہلے کی بات ہے میں اپنی بدنصیبی ہی کے ہاتھوں کئی دن کی بھوک برداشت کیے ہوئے تھا کہ میرے ایک دوست نے مجھے ایک جگہ واردات کرنے کے بارے میں بتایا اس نے مجھے مالاپور کے ہوٹل میں کھانا بھی کھلایا تھا پھر میں وہاں سے نکلنے ہی والا تھا کہ میری نظر اس علاقے کے ایک آدمی پر پڑی جو وہاں کی تھوک کی دکانوں پر مختلف اشیاء فروخت کرتا تھا اس دن وہ دکانوں سے رقم جمع کر کے لے جارہا تھا۔ میری توجہ بھی اس کی طرف اس کی پھولی ہوئی جیبوں ہی نے کرائی تھی جب وہ شخص ہوٹل سے نکلا میں بھی اس کے پیچھے ہولیا اور سنسان راستے تک پہنچتے ہی میں نے ایک موٹی سی لکڑی اس کے سر پر ماری۔''

''پھر..... پھر کیا ہوا؟'' اکرم نے بے چینی سے پوچھا۔

''پھر وہ زمین پر گر گیا اور میں نے اس کی جیب سے رقم نکال لی پوری پچیس ہزار کی رقم تھی پھر میں راستہ بدل کر گنے کے کھیتوں کی طرف گیا تھا لیکن تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ کسی نے میرے سر پر کوئی بھاری چیز ماری اور مجھے دھکا دے کر گڑھے میں پھینک دیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو رقم میری جیب سے غائب تھی۔ بتاؤ یہ میری بدنصیبی نہیں تو اور کیا تھا؟'' مقبول نے پھر قسمت کا رونا رویا۔

''جس شخص کی جیب سے تم نے رقم نکالی تھی اس نے نیلی پتلون اور نیلی دھاری دار قمیص پہنی ہوئی تھی؟'' اکرم نے پوچھا۔

''ہاں! مجھے اچھی طرح یاد ہے اس نے نیلی پتلون اور نیلی دھاری دار قمیص ہی پہنی ہوئی تھی۔'' مقبول نے حیرت سے اکرم کو دیکھتے ہوئے کہا میں بھی ساری گفتگو حیرت سے سن رہی تھی۔

''اس شخص کا نام سلمان احمد تھا نا؟'' اکرم نے پوچھا تو مقبول نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اور اس دن دس تاریخ تھی نا؟'' اکرم نے پوچھا۔

''ہاں وہ دس تاریخ کو ہی دکانداروں سے رقم وصول کرنے آتا تھا۔'' مقبول نے حیران ہو کر جواب دیا۔ ''لیکن یہ سب کیا ہے؟ تم اتنا کچھ کیسے جانتے ہو؟''

''دوست جس شخص نے تمہاری جیب سے پچیس ہزار کی رقم نکالی کیا تم اسے معاف کر سکتے ہو؟'' اکرم نے مقبول کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''میں تو اس شخص پر کبھی بھی ناراض نہیں ہوا اور میرے دل میں کبھی اس شخص کے لیے برائی نہیں آئی۔'' مقبول نے کہا۔ ''بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ انسان کسی دوسرے کو اس کا ذمہ دار نہیں ٹھہرا سکتا۔''

''مقبول میں تم سے معافی چاہتا ہوں کیونکہ میں ہی وہ شخص ہوں جس نے تمہیں قتل کیا تھا۔'' اکرم نے کہا اور مقبول کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اس کی سمجھ میں اکرم کی بات نہیں آرہی تھی۔

''تم نے مجھے قتل کیا تھا؟'' مقبول نے حیرت سے پوچھا۔ ''لیکن میں تو زندہ ہوں۔''

''لیکن قانون کی نظروں میں تم مردہ ہو۔'' اکرم نے کہا۔ ''میں جو سزا بھگت رہا ہوں یہ تمہارے ہی قتل کے نتیجے میں ملی ہے۔''

''خدا کے لیے پوری بات بتاؤ اکرم میری بھی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔'' میں نے کہا مقبول بھی پریشان نظر آرہا تھا اور حقیقت جاننا چاہتا تھا۔

''جب میں تمہاری جیب سے پچیس ہزار کی رقم لے کر جارہا تھا تو عین اسی وقت بستی کے دو افراد بھی اُدھر سے گزر رہے تھے۔'' اکرم نے کہنا شروع کیا۔ ''میرے کپڑوں پر خون لگا ہوا تھا اور میرے قبضے سے ان لوگوں نے پچیس ہزار کی رقم برآمد کی تھی۔ انہوں نے مجھے بھاگتے ہوئے دیکھ کر مشکوک سمجھا تھا اور روک کر میری تلاشی لی تھی اور مجھے تھانے لے گئے تھے۔ جس جگہ سے مجھے پکڑا گیا تھا اس سے تھوڑے فاصلے پر سلمان احمد کی لاش ملی تھی پھر پولیس کی تحقیقات سے یہ بات سامنے آئی کہ وہ رقم سلمان احمد کی تھی جو وہ دکانداروں سے وصول کر کے لے جارہا تھا اور پولیس والوں کی نظر میں، میں نے اسے ہلاک کر کے وہ رقم حاصل کی تھی۔ میں بہت چیخا میں نے بہت کہا کہ میں نے سلمان احمد کو ہلاک نہیں کیا بلکہ میں نے یہ رقم کسی اور کی جیب سے چرائی ہے۔ میں نے تمہارا حلیہ بھی بتایا لیکن تلاش کے باوجود گنے کے کھیت میں تم نہ مل سکے۔ میری بات پر کسی نے یقین نہیں کیا۔ سب یہی سمجھتے رہے کہ میں سزا کے ڈر سے جھوٹ بول رہا ہوں۔ مجھے عدالت میں پیش کر دیا گیا جہاں سے مجھے پندرہ سال کی قید کی سزا سنا دی گئی۔ آہستہ آہستہ میں بھی یہی سمجھنے لگا کہ شاید میں نشے میں تھا اسی وجہ سے مرنے والے کا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

حلیہ غلط یاد رہ گیا میں نے ہی اسے قتل کیا ہو لیکن اب تو مجھے یقین ہے کہ میں بے قصور ہوں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تم نے جو جرم نہیں کیا تم اس کی سزا بھگت رہے ہو؟ اور میں جس نے وہ قتل کیا تھا آج تک یہ نہیں جانتا کہ جس شخص کے سر پر لکڑی مار کر میں نے رقم چھینی تھی میرے ہی ہاتھوں موت کے منہ میں پہنچ گیا تھا اور میں اس کا قاتل ہوں۔'' مقبول حیرت سے بول رہا تھا۔

''اوہ..... میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یوں اچانک کبھی میرے سر سے ایک قتل کا بوجھ اتر جائے گا۔'' اکرم نے خوشی سے کہا۔

''سنو مقبول..... میرے دوست..... کیا تم میرے بے گناہ ہونے کی گواہی دو گے۔ کیا تم جیلر صاحب کو بتاؤ گے کہ سلمان احمد کے سر پر تم نے لکڑی ماری تھی جس سے وہ ہلاک ہوا اور تم نے اس کی جیب سے پچیس ہزار کی رقم نکالی جو بعد میں، میں نے تمہاری جیب سے اڑالی اور جس کی وجہ سے مجھے سلمان احمد کا قاتل سمجھا گیا کیونکہ اس کی رقم میرے پاس سے نکلی۔'' اکرم خوشی اور تذبذب کے عالم میں مقبول سے پوچھ رہا تھا اور میں حیرت سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

''تم دونوں ٹھہرو.....! میں جیلر سے بات کرتی ہوں۔'' میں نے کہا اور تیزی سے اٹھ کر جیلر کے کمرے میں پہنچ گئی۔

''خیریت..... آپ کا کام ہو گیا؟'' جیلر نے مجھے دیکھ کر کہا۔

''جی..... ہو گیا..... لیکن آپ کے لیے بھی ایک نئی خبر ہے۔'' میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب؟'' جیلر نے چونکتے ہوئے کہا۔

''مطلب یہ جیلر صاحب کہ اکرم بے قصور قید ہے۔'' میں نے کہا۔

''اکرم؟ بھئی آپ تو مقبول سے سوالات کر رہی تھیں یہ اکرم کہاں سے بیچ میں آ گیا؟''

''جب خدا کسی پر مہربان ہو جائے اور اس کی مدد کرنا چاہے جب کہ وہ بے قصور بھی ہو تو پھر ایسے ہی بیچ میں کوئی ٹیک پڑتا ہے اور بے قصور کے لیے نجات کا راستہ بن جاتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''ذرا وضاحت کریں گی اس بات کی۔'' جیلر نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا تو میں نے مقبول اور اکرم کی ساری گفتگو اس کے سامنے دہرا دی۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے اکرم پر باقاعدہ مقدمہ چلا اور جرم ثابت ہونے پر سزا سنائی گئی ہے۔'' جیلر نے کہا۔

''لیکن اب صورتِ حال بدل چکی ہے۔ مقبول اپنا بیان دینے کے لیے تیار ہے۔ میری درخواست ہے کہ آپ ضروری کارروائی کریں۔'' میں نے کہا۔

''پہلے میں خود ان دونوں سے ملوں گا۔'' جیلر نے کہا۔

پھر جیلر اکرم اور مقبول سے ملا تھا۔ ان سے ملنے کے بعد ساری بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی اور پھر ضابطے کی کارروائی کی گئی تھی جس کے نتیجے میں اکرم رہا ہو گیا تھا اور مقبول کی سزا میں اضافہ کر دیا گیا تھا۔ اب اسے سلمان احمد کے قتل کی سزا بھی بھگتنا تھی جس روز اکرم رہا ہوا میں آخری بار سینٹرل جیل گئی تا کہ اکرم اور مقبول سے مل سکوں۔

''میں آپ سے کہتا تھا نا کہ میری بدنصیبی نے ہر قدم پر مجھے ناکامیوں کا منہ دکھایا ہے۔ اب تو آپ بھی گواہ ہیں کہ یہاں بھی میری بدنصیبی نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔'' مقبول نے ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔'' میں نے کہا۔

''میں بڑے صبر و تحمل سے تمہارا انتظار کروں گا۔'' اکرم نے رخصت ہوتے وقت مقبول سے کہا۔ ''میرے دوست جب تم اپنی سزا کاٹ کر واپس آؤ گے تو میں تمہارا منتظر ہوں گا۔ میں تمہاری دعوت کروں گا تمہارے ساتھ گھوموں گا۔ تمہیں اپنے ساتھ رکھوں گا تم نے مجھے رہائی دلائی ہے۔ یہ سب کتنا اچھا لگے گا کیونکہ کبھی کسی قاتل نے اپنے مقتول کے ساتھ بیٹھ کر کھانا نہیں کھایا ہو گا۔ اپنے مقتول کے ساتھ سیر و تفریح نہیں کی ہو گی۔ یہ خوشی میں کبھی بھول نہیں سکوں گا۔'' اکرم بولے جا رہا تھا اور مقبول اداس نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ میں بوجھل قدموں سے آہستہ آہستہ چلتی سینٹرل جیل کے گیٹ سے باہر آ گئی تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ میں..... وہاں اپنی سالانہ رپورٹ مکمل کرنے گئی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک بے گناہ کو آزاد کروانے کا ذریعہ بنا دیا تھا۔ میں اس ذاتِ باری تعالیٰ کی شکر گزار تھی کہ اس نے مجھے اس نیک کام کے لیے منتخب کیا تھا اور میں مقبول کے لیے دعا گو تھی کہ اللہ اس کی خطائیں بخش کر اسے اچھا انسان بننے کا موقع فراہم کرے، آمین۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

رانگ نمبر

محترم
السلام علیکم
گزشتہ دنوں میں نے ایک فلم دیکھی تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ ہر غلط آدمی رانگ نمبر ہوتا ہے۔ میرا دوست بھی موبائل کے رانگ نمبر سے ایک رانگ نمبر تک جا پہنچا۔ اس پر کیا بیتی یہی کچھ میں نے اس کہانی میں تحریر کیا ہے۔

ڈاکٹر ظفر احمد خان
(کراچی)

میں ایک باعزت اور تعلیم یافتہ گھرانے کا چشم و چراغ ہوں لیکن میرا ماضی مکمل طور پر داغدار ہے جس کے سبب میں گمنامی کی زندگی بسر کررہا ہوں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کے اصرار پر میں اپنے روز و شب کا احوال بیان کررہا ہوں تاکہ لوگ سبق حاصل کرسکیں لیکن اپنی سرگزشت بیان کرنے سے قبل میں نوجوانوں سے استدعا کرنا چاہتا ہوں کہ خدارا اپنے والدین اور اہل خانہ کی عزت اور ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے کی کوشش نہ کریں۔ اپنے اندر اچھے اوصاف پیدا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کریں۔ اپنی تعلیم پر توجہ رکھیں۔ جب آپ اچھی تعلیم و تربیت سے آراستہ ہو جائیں گے تو یقیناً آپ کا مستقبل بھی تابناک ہوگا۔ آپ کسی اچھی پوسٹ پر کام کریں گے۔ کسی اچھے گھرانے میں آپ کی شادی ہو جائے گی اور یوں آپ اپنے شجرۂ نصب کو نیک نامی کی طرف لے جائیں گے۔

انسان ٹھوکر کھا کر سبق حاصل کرتا ہے لیکن میں ایسا کند ذہن ہوں کہ ٹھوکر کھا کر بھی سنبھل نہ سکا۔ میں نے کہاں کہاں اور کس کس طرح ٹھوکر کھائی یہ آپ بھی سنیں۔

میرا نام کاشف ہے۔ میں ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ میرے والد ایک تعلیم یافتہ اور دینی رجحان والے انسان تھے اور ایک سرکاری ادارے میں کلرک کی جاب کرتے تھے۔ میری تین بہنیں تھیں۔ میں سب سے چھوٹا تھا۔ میرا کوئی بھائی نہیں تھا۔ ہمارے گھر کا ماحول بہت مذہبی تھا۔ والد صاحب قاعدے قوانین کے پابند تھے۔ بہت سخت ہدایات تھیں۔ گھر کا کوئی فرد بھی والد صاحب کے قوانین کی خلاف ورزی کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

☆.....☆

میں ان دنوں میٹرک میں تھا۔ گویا میں سنہری دور سے گزر رہا تھا جو بچپن سے جوانی کی راہ گزر تھی۔ جس سے ہر انسان کو گزرنا ہوتا ہے اور یہ بڑا مسحور کن دور ہوتا ہے۔ جب نئی نئی خواہشات اور امنگیں اور جذبے سر اٹھاتے ہیں جہاں اس کی سحر انگیزیاں ہیں وہیں اس کی خطرناکیاں بھی ہیں۔ بس یہیں سے انسان عروج پاتا ہے یا پھر زوال۔

میں بھی سنِ بلوغت کی لذتیں محسوس کر رہا تھا۔ میرے اندر عصبی جذبات و احساسات کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ عشق و محبت کے خود ساختہ جذبے عود کر آ رہے تھے۔ میرے ہم عمر دوست ان کا دں میں طاق تھے۔ ان کی سرگرمیاں سن کر میں بھی بے قرار رہنے لگا تھا لیکن میرے گھر کا سخت قوانین پر مبنی ماحول مجھے ان کے رنگ میں رنگنے سے روک رہا تھا۔ فجر سے پہلے بستر چھوڑ دو اور محلے کی مسجد میں جا کر باجماعت نماز ادا کرو، سر پر ہمہ وقت ٹوپی اوڑھے رہو۔

گھر کا ماحول ایسا تھا لیکن کالج کا ماحول بالکل الگ تھا۔ جتنے بھی دوست تھے ان سب کی گرل فرینڈز تھیں۔ اس لیے میں اندر ہی اندر بے چین رہنے لگا۔ میرا بھی دل چاہنے لگا کہ میری بھی کوئی گرل فرینڈ ہو جسے میں پیار کروں اسے گفٹ دوں۔ اسے ڈیٹ پر لے جاؤں۔

میرے ہم عمر دوستوں میں ارباز مجھ سے زیادہ کلوز تھا۔ اس کی دو گرل فرینڈز تھیں۔ جن کے قصے وہ اکثر سنایا کرتا تھا۔

☆.....☆

ایک دن فری پیریڈ تھا۔ اتفاق سے کلاس روم میں، میں اور ارباز ہی تھے۔ باقی لڑکے کینٹین گئے ہوئے تھے۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور ارباز سے پوچھ لیا۔ ''یار! لڑکی کیسے پھنساتے ہیں۔''

''ہاہاہا.....!'' ارباز کا قہقہہ کلاس روم میں گونج اٹھا۔ ''تو تجھے بھی گرل فرینڈ کی ضرورت پڑ گئی۔''

''بتا ناں یار۔ میں سنجیدہ ہوں۔'' میں نے خفت مٹاتے ہوئے کہا۔

''محبت کرے گا میرا بھائی۔'' ارباز نے میرے کندھے پر ہاتھ مارا۔ ''ابے یہ بھی کوئی کام ہے..... یوں..... یوں پھنستی ہے لڑکی۔'' ارباز نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔

''تو تو ایسے کہہ رہا ہے جیسے یہ ریاضی کا کوئی سوال ہو جسے یوں..... یوں..... حل کر لے گا۔'' میں نے ارباز کی نقل اتاری۔

''ابے..... یہ ریاضی سے بھی آسان سبجیکٹ ہے۔'' ارباز بڑی خوش دلی سے بولا۔ جیسے میں نے اس کا پسندیدہ موضوع چھیڑ دیا ہو۔

''مجھے کیا کرنا ہوگا۔ گائیڈ کر۔'' میں نے کہا۔

''کچھ خاص نہیں۔ بس اپنے گرد و نواح میں نظر دوڑاؤ۔ محلے پڑوس میں دیکھو۔ سب سے پہلے اپنا شکار تلاش کرو۔ پھر اس پر کام کرو۔ دھیرے دھیرے اس کے سامنے آؤ۔ اس کا موبائل نمبر حاصل کرو۔ پھر اس کو اپنے جال میں لاؤ۔ کیوں کہ ہر لڑکی کسی سرکش گھوڑے کی مانند ہوتی ہے۔ پہلے اسے رام کرو۔ پھر بیٹھ کر حلوا کھاؤ۔'' ارباز نے اپنی ماہرانہ رائے دی۔

''اچھا!'' میں نے چھت کو گھورتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ محبت کے کوچنگ سینٹر سے یہ میرا پہلا سبق تھا۔

☆.....☆

اب میں ہر وقت محلے بازار اور گرد و نواح میں اپنی مطلوبہ خوبرو لڑکی کی تلاش کرنے لگا لیکن کافی تلاش و بسیار کے بعد بھی کوئی ایسی لڑکی نظر نہیں آ رہی تھی جسے میں اپنی محبوبہ بناؤں۔ میں اپنی تلاش میں سرگرداں تھا کہ وہ نظر آ گئی۔

ہوا یہ کہ میں ایک موبائل شاپ سے ایزی لوڈ کروا کر

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ہٹا۔ اسی وقت ایک لڑکی وہاں آئی۔ اس نے دوپٹے سے آدھا چہرہ چھپا رکھا تھا لیکن اس کی بڑی بڑی جھیل جیسی آنکھیں دیوانہ بنانے کو کافی تھیں۔ اس کی آنکھوں نے مجھے اسیر کرلیا تھا۔ میں ایک ہی نظر میں اس کا دیوانہ ہوگیا۔ اس نے اپنا موبائل نمبر ایک پرچی پر لکھ کر ایزی لوڈ والے کو دیا جس پر اس نے ایزی لوڈ کروایا۔ اس نے وہاں سے فارغ ہوکر ایک اچٹتی نگاہ مجھ پر ڈالی۔ میں چونکہ اسے پہلے سے دیکھ رہا تھا لہٰذا میں گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا لیکن پھر میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اس نے وہ موبائل نمبر والی پرچی موڑ کر میرے سامنے گرادی۔ میں مخمصے میں گھرا پرچی کو دیکھتا رہ گیا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب میں کیا کروں۔ وہ ادائے بے نیازی سے چلتی ہوئی میرے سامنے سے گزر کر باہر چلی گئی جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو میں نے لپک کر وہ پرچی اٹھالی۔ مجھے بہت گھبراہٹ ہورہی تھی۔ میرے دل میں انجانا خوف پیدا ہوگیا تھا۔ بہرحال میں نے وہ پرچی جیب میں رکھی اور تیز تیز چلتا ہوا گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔

☆.....☆

گھر آکر میں نے پرچی دیکھی تو اس پر موبائل نمبر لکھا تھا۔ میں نے اپنے موبائل سے ارباز کا نمبر چیک کیا اور اسے ساری صورتِ حال بتادی۔

''ارے کاشف بھائی.....لاٹری نکل آئی تمہاری تو۔'' ارباز نے خوشی کا اظہار کیا۔

''اب تم مجھے بتاؤ آگے کیا کرنا ہے۔'' میں نے موبائل فون ہونٹوں کے قریب کر کے قدرے سرگوشی میں پوچھا۔

''ارے کرنا کیا ہے۔ پہلے میسج پر ہائے لکھ کر بھیجو۔ دیکھو دوسری طرف سے کیا رسپانس آتا ہے، اگر مثبت ہو تو بات چیت کا سلسلہ شروع کردینا لیکن پہلے یہ کنفرم کرلینا کہ یہ اس کا ذاتی نمبر ہے۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ پھر میں نے ارباز کو خدا حافظ کہہ کر لائن کاٹ دی اور وہ نمبر اپنے موبائل میں فرضی نام سے سیو کرلیا۔ کیوں کہ میں اس حسینہ کا نام نہیں جانتا تھا۔ میں نے اسی وقت اس کے نمبر پر ''ہائے'' لکھ کر میسج بھیجا اور انتظار کرنے لگا۔ میرا دل گھبرا رہا تھا۔ بے چینی بڑھ گئی تھی۔ تبھی میرے موبائل پر میسج کی رنگ ٹون بجی۔ میں نے جلدی سے موبائل نکالا اور میسج دیکھنے لگا۔

میسج اسی نمبر سے آیا تھا۔ اس نے رومن اردو میں لکھا تھا۔ ''آپ کون؟''

میں نے جوابی میسج لکھا۔ موبائل شاپ کا حوالہ دیا۔ وہ مجھے پہچان گئی اور اس نے میرے میسج کرنے پر برا بھی نہیں مانا اور پھر میسج کا سلسلہ چل نکلا۔ میں بڑے باادب انداز میں اسے میسج کرتا تاکہ وہ میرے اخلاق اور ادب سے متاثر ہوجائے۔ لیکن اس کے میسجز سے اندازہ ہوا کہ وہ ایسی مچھلی ہے جو خود میرے کانٹے میں پھنسنا چاہتی ہے۔ میں نے تھوڑے کو بہت جانا اور اسی پر اکتفا کیا کہ اب میں بھی صاحب گرل فرینڈ ہوگیا ہوں۔

میرا دل خوشی سے جھومنے لگا۔ میں تصور میں ثمینہ کے ساتھ خود کو ساحل سمندر پر دیکھتا کہ ہم دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے سمندر کی آتی جاتی لہروں سے محظوظ ہورہے ہیں۔ کبھی میں تصور کی آنکھ سے دیکھتا کہ میں اس کو بائیک پر بٹھا کر کہیں جارہا ہوں۔ غرض ثمینہ میرے تخیل کا حصہ بن گئی۔ میں نے ارباز سے مشورہ کیا کہ اب کیا کروں۔ تو اس نے مجھے مزید گائیڈ کیا۔

''یار کاشف! اب وقت آگیا ہے کہ اسے بل سے باہر نکالو۔'' ارباز نے کہا۔

''لیکن کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس سے کہو اپنی کسی سہیلی سے ملنے کے بہانے کسی ہوٹل یا پارک میں آجائے۔'' ارباز بولا۔

''کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہوجائے۔'' میں نے خدشہ ظاہر کیا۔

''ارے کچھ نہیں ہوگا۔'' ارباز نے ہنستے ہوئے کہا۔

''یار تجھے تو پتا ہی ہے، میرے والد کتنے سخت آدمی ہیں۔ اگر انہیں پتا چل گیا تو قیامت ہی آجائے گی۔'' میں نے سہمے ہوئے لہجے میں دل کی بات کہی۔

''انہیں پتا چلے گا تب نا۔'' ارباز نے میری ڈھارس بندھائی۔

''ٹھیک ہے پھر میں دیکھتا ہوں کہ چوہے کو بل سے کیسے نکالا جائے۔'' میں نے مصنوعی ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے لائن کاٹ دی۔

لیکن میں اندر سے بہت خوفزدہ تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں یہ سب کیسے کروں گا۔

اس نے اپنا نام ثمینہ بتایا تھا اور وہ بڑی آسانی سے میرے چکر میں آگئی تھی۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ایک دن ثمینہ کا میسج آیا کہ وہ شاپنگ کے لیے فیملی کے ساتھ جارہی ہے۔ طارق روڈ پر پیراڈائز شاپنگ ہال ہے اگر ملنا ہے تو آجاؤ۔ میں نے جوابی میسج میں پوچھا کہ فیملی کے ساتھ ہوگی تو ملاقات کیسے ممکن ہے۔ تب اس نے میسج کیا کہ ملاقات نہ سہی ایک دوسرے کو دیکھ تو لیں گے۔ میں رضا مند ہوگیا کہ اگر موقع مل گیا تو مل بھی لیں گے۔ دو چار باتیں بھی کرلیں گے۔ ثمینہ نے بتایا کہ وہ سرخ رنگ کے پھولدار پرنٹ والے سوٹ میں ہوگی اور بلیک اینڈ وہائٹ چیک والا اسکارف پہنے ہوئے ہوگی اور ٹھیک تین بجے وہ شاپنگ سینٹر میں پہنچے گی۔

میں نے فوراً ارباز کو فون کیا۔ ''ہیلو ارباز! وہ شاپنگ سینٹر میں بلا رہی ہے۔''

''ارے تو گھبراتا کیوں ہے۔ چلا جا۔'' ارباز نے اطمینان سے کہا۔

''یار کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ تو میرے ساتھ چلے۔ میری ہمت بندھی رہے گی۔'' میں نے التجائی لہجے میں کہا۔

''ہونہہ..... چل ٹھیک ہے۔ کب جانا ہے۔'' ارباز نے پوچھا۔

''آج سہ پہر تین بجے۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے میں اپنی بائیک پر آرہا ہوں۔ تو فٹافٹ تیار ہوجا۔'' ارباز نے کہا اور لائن کاٹ دی۔

☆.....☆

پونے تین بجے ارباز میرے گھر پہنچ گیا۔ میں ارباز کے ساتھ طارق روڈ روانہ ہوگیا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد ہم پیراڈائز شاپنگ سینٹر کے قریب تھے۔

''چلو ڈیئر! اپنا فون نکالو اور لوکیشن پوچھو۔'' ارباز نے کہا۔

میں نے موبائل فون نکالا اور ثمینہ کو میسج کیا کہ میں پہنچ گیا ہوں تم کہاں ہو۔ چند منٹ بعد ہی جواب آگیا۔ اس نے میسج میں بتایا کہ وہ تیسرے کوریڈور میں مونا فیئر کس پر موجود ہے تب میں نے جواب طلب نظروں سے ارباز کو دیکھا۔

''تو مل کر آ..... میں یہیں تیرا انتظار کرتا ہوں۔'' ارباز نے کہا۔

''نن..... نہیں، میں اکیلا نہیں جاؤں گا تو بھی ساتھ چل۔'' میں ہکلایا۔

''تو تو بالکل ہی بونگا ہے۔ عاشقی ایسے سکھانی پڑ رہی ہے جیسے کسی نونہال کو تین پہیوں کی سائیکل۔'' ارباز نے مضحکہ خیز لہجے میں کہا۔

''یونہی سہی..... اب چل بھی۔'' میں نے ملتجی لہجے میں کہا۔

میرے اصرار پر ارباز میرے ساتھ چلنے پر راضی ہو گیا۔ ہم دونوں تیسرے کوریڈور کی طرف بڑھے۔ یہاں دونوں جانب گارمنٹس کی دکانیں تھیں۔ میری نظریں مونا فیئر کس تلاش کررہی تھیں اور پھر میں نے دور سے مونا فیئر کس کا سائن بورڈ دیکھ لیا۔

''ارباز وہ رہا..... مونا فیئر کس۔'' میں نے ارباز کا کندھا دبایا۔

''ہاں گڈ چل آجا دیکھتے ہیں۔'' ارباز نے پیش قدمی کی اور میں اس کے ساتھ مونا فیئر کس کی جانب بڑھنے لگا۔ میرے قدموں کی چال سے تیز میرے دل کی چال تھی۔ میری گھبراہٹ عروج پر تھی۔ مگر اتنے اطمینان سے جارہا تھا جیسے اس کی پھپھو کی بیٹی ہو۔

چند ساعت کے بعد ہم مونا فیئر کس کے باہر موجود تھے۔ فرنٹ شیشے کا بنا تھا۔ جس میں سے ہم اندر کا منظر دیکھ سکتے تھے۔ اندر دو فیملیز شاپنگ کررہی تھیں۔ ہم نے متلاشی نظروں سے ثمینہ کو تلاش کیا تو وہ اپنے بتائے ہوئے حلیے میں نظر آگئی۔ سرخ پھولدار کپڑے اور بلیک اینڈ وہائٹ چیک والا اسکارف، ہم بھی دکان کے داخلی دروازے سے اندر داخل ہوگئے اور کسی گاہک کی طرح سوٹ دیکھنے لگے۔

ارباز نے مجھے کہنی ماری اور اشارہ کیا کہ میں بہانے سے ٹہلتا ہوا ان کے پاس جاؤں۔ ثمینہ کے علاوہ ایک بڑی عمر کی عورت، ایک انکل اور ایک بارہ تیرہ سال کا لڑکا سوٹ پیس دیکھ رہے تھے۔

میں سوٹ دیکھنے کے بہانے ٹہلتا ہوا ثمینہ کے پاس جا پہنچا۔ وہ ہینگر میں لٹکے ہوئے سوٹ کا کپڑا چیک کررہی تھی۔ میں اس کے برابر والا سوٹ چیک کرنے لگا اور آہستہ سے کھنکارا۔ میرے کھنکارنے پر اس نے مڑکر دیکھا۔ وہ حسب معمول آدھا چہرہ چھپائے ہوئے تھی لیکن اس کی جھیل جیسی مسحور کن آنکھیں میرا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ ثمینہ ہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شناسائی کے سائے لہرا رہے تھے۔ میں نے سوٹ چیک کرتے کرتے آہستہ سے اس کا ہاتھ دبا دیا۔ اس نے جھینپ کر اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔ میں نے بھی زیادہ فری ہونے کی کوشش نہیں کی۔ کیونکہ اس کی فیملی موجود تھی۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

میں دو چار سوٹ ایسے ہی چیک کر کے دکان سے باہر آ گیا۔ ارباز بھی میرے ساتھ باہر آ گیا۔

''کیا ہوا دوست۔ کوئی کارنامہ کیا۔'' ارباز بولا۔

''یہاں کیا کارنامہ کروں گا۔ یہ پبلک پلیس ہے۔'' میں نے برجستہ کہا۔

''کچھ تو کیا ہوگا۔'' ارباز متجسس انداز میں بولا۔

''ہاں آنکھیں چار ہوئی تھیں اور میں نے بہانے سے اس کا ہاتھ دبا دیا تھا۔'' میں شرما کے بولا۔

''پھر اس کا کیا رسپانس تھا۔'' ارباز نے پوچھا۔

''اس نے میری حرکت کا برا نہیں مانا۔ صرف جھینپ کر رہ گئی تھی۔'' میں نے کہا۔

''چل اس کو میسج لگا۔ شاید ایک آدھ موقع اور مل جائے۔'' ارباز نے کہا۔

میں نے میسج کیا کہ کیفے ٹیریا میں ملو اس کا جواب آیا کہ میں اکیلی نہیں آ سکتی کیونکہ میرے والد بہت سخت اور شکی مزاج کے ہیں۔ آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔

میں نے ارباز کو میسج سنایا تو وہ بولا۔ ''چل ٹھیک ہے۔ دل چھوٹا نہ کر۔ کوئی دوسرا پلان بناتے ہیں۔ جس میں تم دونوں تنہا مل سکو۔'' ارباز نے حوصلہ افزائی کی۔

☆.....☆

دن بہ دن ثمینہ میرے حواسوں پر چھا رہی تھی۔ خیالوں میں خوابوں میں آ رہی تھی۔ پھر ایک دن ثمینہ کا میسج آیا۔ ''کال می۔'' اور میں خوشی سے نہال ہو گیا۔ میں نے جلدی سے اس کا نمبر پنچ کیا۔

''ہیلو۔'' اس کی دھیمی سی سُر بکھیرتی آواز سنائی دی۔

''ثمینہ۔'' میں نے آہستہ سے پکارا۔

''ہاں۔'' اس نے کہا۔

''کیسی ہو، کیا کر رہی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں۔ میں اگیزام کی تیاری کر رہی ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''ہاں اگیزام تو میرے بھی سر پر سوار ہے۔ اب بتاؤ کب مل رہی ہو مجھ سے۔'' میں نے بے تابی سے کہا۔

''دیکھو کاشف میرا تم سے ملنا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ میرے والد بہت سخت مزاج کے ہیں۔ پھر بھی میں کوشش کروں گی۔'' ثمینہ نے کہا۔

''اپنی کسی سہیلی سے ملنے کے بہانے آ جاؤ۔'' میں نے کہا۔

گسماؤ سانانا
(Gusmao Xanana)

مشرقی تیمور کے رہنما اور صدر انہوں نے قبل ازیں صحافی اور استاد کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ 1978ء میں مشرقی تیمور کے مزاحمتی رہنما لو باٹو کو قتل کر دیا گیا تو انہیں ان کی جگہ .... مزاحمتی رہنما بنا دیا گیا۔ 1992ء میں ان کو گوریلا سرگرمیوں کے نتیجے میں گرفتار کر لیا گیا۔ 1993ء میں عدالت نے انہیں عمر قید کی سزا سنائی جسے بعد ازاں صدر سہارتو نے کم کر کے بیس سال کر دی۔ عالمی برادری کے دباؤ پر انڈونیشیا کی حکومت نے 1999ء میں انہیں جیل سے گھر میں نظر بند کر دیا، تاہم بعد ازاں رہا کر دیے گئے۔ رہائی کے بعد 20 ستمبر 1999ء کو جکارتا سے شمالی آسٹریلیا... چلے گئے، جہاں انہوں نے مشرقی تیمور کی جلاوطن حکومت قائم کی، مشرقی تیمور میں استصواب رائے کے بعد وہ وطن واپس آ گئے اور 2002ء کو جب مشرقی تیمور کی آزادی کا اعلان ہوا تو انہوں نے اس کے پہلے صدر کی حیثیت سے اپنا عہدہ سنبھالا۔

مرسلہ: نسیم حسن، جھنگ

''ہاں کوشش کروں گی۔ اچھا تم یہ بتاؤ کہ تم میرے لیے کیا جذبات رکھتے ہو۔'' ثمینہ نے استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔

''میں..... میں تم سے..... م..... م..... محبت کرنے لگا ہوں۔'' میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''محبت کا مطلب جانتے ہو۔'' ثمینہ نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''ہاں جانتا ہوں۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔''

''اور ہمارے ملن میں سماج کی دیواریں جو بیچ میں آئیں گی ان کا کیا کرو گے۔'' ثمینہ نے فکر انگیز لہجے میں سوال کیا۔

''میں سماج کی دیواروں سے ٹکرا جاؤں گا۔'' میں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

نے کہا۔

''یہ تو تم جذبات میں کہہ رہے ہو جبکہ وہ ایسی رکاوٹیں ہوں گی جنہیں تم عبور نہیں کر پاؤ گے۔'' وہ قدرے سنجیدگی سے بولی۔

''میں نے جب پہلی بار تمہیں دیکھا تھا تبھی میں تمہیں دل دے بیٹھا تھا۔ یقین کرو میں تمہیں بہت چاہتا ہوں اور تمہارے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میں وقت آنے پر تمہیں دکھا دوں گا کہ میں تمہیں کتنا چاہتا ہوں۔''

''اچھا تو پھر دیکھتے ہیں۔ تم کتنے پانی میں ہو۔''

''تم دیکھ لینا۔ مجھے کسی مقام پر بھی پیچھے نہیں پاؤ گی۔'' میں نے کہا۔

''کیا شادی کرو گے مجھ سے۔'' ثمینہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''ہاں بھئی۔ کیوں نہیں کروں گا۔'' میں نے کہا۔

''اگر تمہارے گھر والے نہ مانے تو۔''

''نہیں مانیں تو میں تم سے کورٹ میرج کر لوں گا۔'' میں نے پُرجوش لہجے میں جواب دیا۔

''اچھا اتنا پیار کرتے ہو مجھ سے۔'' ثمینہ نے متحیر لہجے میں کہا۔ پھر گھبرا کر بولی۔ ''اچھا میں فون رکھتی ہوں۔ کوئی آ رہا ہے۔''

میں موبائل فون کو دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔ ''بڑی آئی لیلیٰ کی گرہی۔ میں تو سماج کی دیواروں سے نہیں ٹکرا سکتا کیونکہ سماج کی سب سے بڑی دیوار میرے والد ہیں۔ میں ان کی مخالفت کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ سوری ثمینہ۔'' یہ کہہ کر میں نے موبائل جیب میں رکھ لیا۔

☆.....☆

میں اور ارباز اسکول کینٹین میں موجود تھے۔ میں نے ارباز کو ثمینہ سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا جسے سن کر اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔ ''تو پھر کیا ارادے ہیں مجنوں صاحب۔''

''یار وہ سر پھری تو مجھے چوڑے میں مروائے گی۔ وہ تو مستقبل کے سہانے خواب اپنی آنکھوں میں سجائے بیٹھی ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہو سکتا ہے وہ بھی تجھے اُلّو بنا رہی ہو۔ وہ بھی تو آج ہی کے دور کی لڑکی ہے۔'' ارباز نے کہا۔

''کچھ بھی ہو سکتا ہے لیکن میرا مقصد یہ نہیں کہ میں اس سے زندگی بھر ساتھ نبھانے کے عہد و پیماں کروں۔''

''بس تو پھر ہوشیار رہنا۔'' ارباز بولا۔

''ہونہہ۔'' میں نے فضا میں گھورتے ہوئے کہا۔

☆.....☆

ایک شام جب میں اور ارباز ساتھ ہی تھے کہ ثمینہ کی کال آ گئی۔ میں نے ارباز کو بتایا۔ اس نے اشارے سے اٹینڈ کرنے کو کہا۔

''ہیلو۔'' میں نے کال اٹینڈ کی۔

''ہیلو جانو..... کیسے ہو۔'' ثمینہ کی مترنم آواز میرے کانوں میں رس گھولنے لگی۔

''ہاں جان میں ٹھیک ہوں تم سناؤ آج فون کیسے کر لیا۔'' میں نے خوش دلی سے پوچھا۔

''بس تمہاری بہت یاد آ رہی تھی۔'' اس کی آواز میں پیار امڈ رہا تھا۔

''اچھا ایسا ہے۔ یعنی دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ہاں آتشِ عشق ہے۔ بجھاؤں کیسے۔'' ثمینہ معنی خیز لہجے میں بولی۔

''ویر تو تمہاری طرف سے ہے۔ میں تو کب سے تیار بیٹھا ہوں۔''

''میں بھی تم سے ملنا چاہتی ہوں لیکن مجھ پر بہت سخت پابندیاں ہیں۔ میرے بابا جان ہر وقت کڑی نگاہ رکھتے ہیں۔'' ثمینہ نے کہا۔

''کوئی تو راستہ ہو گا تم سے ملنے کا۔''

''ایک راستہ ہے۔''

''کیا۔'' میں نے جلدی سے پوچھا۔

''اگر تم ہمت کرو تو رات 12 بجے کے بعد میرے گھر آ سکتے ہو۔ پچھلی جانب جو گیلری ہے اسے بہ آسانی عبور کر سکتے ہو، گیلری کے ساتھ والا کمرا میرا ہی ہے۔ وہاں ہم مل سکتے ہیں۔ اس وقت سب سو رہے ہوتے ہیں۔ کسی کو خبر بھی نہیں ہو گی۔''

''مگر یہ بڑا رسکی ہے اگر میں پکڑا گیا تو بڑی بدنامی ہو گی۔'' میں نے سہمے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''کچھ بھی نہیں ہو گا۔ تم آؤ تو سہی۔'' ثمینہ نے کہا۔

''اچھا میں کوشش کرتا ہوں۔'' میں نے بے چارگی سے جواب دیا۔ پھر کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کیں اور لائن کاٹ دی۔

☆.....☆

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

مین نے فوراً ارباز کو فون لگایا اور ثمینہ سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا۔ ارباز ایک لمحے کو سوچ میں گم ہو گیا۔ پھر بولا۔ ''ڈونٹ وری ڈیئر! یہ موقع اچھا ہے تو اس سے مل لے اور اپنے سارے ارمان پورے کرلے۔ اس سے اچھا موقع تجھے نہیں ملے گا۔ جب وہ خود تجھے آفر کررہی ہے تو اس سے اچھی کیا بات ہے۔'' ارباز نے کہا۔

''دیکھ لے۔ میں تو تیرے مشورے پر چلتا ہوں۔ مروامت دینا۔''

''کچھ نہیں ہوگا۔ تو تو خوامخواہ ڈر رہا ہے۔''

''میں اور کسی بات سے نہیں بس اپنے والد سے ڈرتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''ان کو پتا چلے گا تب کی بات ہے ناں۔'' ارباز نے ہمت بندھائی۔

''ٹھیک ہے میں آج رات ٹرائی کرتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

☆.....☆

میں نے میسج پر ثمینہ سے ایڈریس مانگا تو اس نے علاقہ گلی محلہ مکان نمبر حوالہ سب لکھ کر بھیج دیا۔ تاکہ میں آسانی سے پہنچ جاؤں۔ میں نے میسج پر اسے بتا دیا کہ میں آج آرہا ہوں۔ پھر میں رات بارہ بجے گھر سے نکلا اور ثمینہ کے بتائے ہوئے علاقے میں پہنچ گیا۔ یہ علاقہ میرے علاقے سے متصل تھا۔ لہٰذا میں وہاں پیدل ہی پہنچ گیا۔ گلیاں سنسان پڑی تھیں ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔

میں اپنی مطلوبہ گلی تلاش کرنے لگا۔ تلاش بسیار کے بعد مجھے وہ گلی مل گئی۔ اب مکان نمبر کا مسئلہ تھا اگر مکان نمبر لکھا ہوا نہیں ہوا تو مسئلہ ہو جائے گا۔ میں مکان نمبر تلاش کرنے لگا لیکن مکان نمبر مجھے نہیں مل رہا تھا۔ تب میں نے ایک مناسب جگہ رک کر ثمینہ کو میسج کیا کہ میں یہاں پہنچ چکا ہوں اپنے مکان کی کوئی نشانی بتاؤ تاکہ میں پہنچ سکوں۔

اگلے ہی منٹ جواب آگیا۔ اس نے لکھا کہ پیلے رنگ کا مکان ہے جس پر ملک عبدالرحمٰن کے نام کی پلیٹ لگی ہوئی ہے۔ اس تختی پر مکان نمبر بھی لکھا ہوا ہے۔ بس اس مکان کے عقب میں آجاؤ وہاں ایک گیلری ہے۔ اس کی دیوار زیادہ اونچی نہیں ہے تم آسانی سے آجاؤ گے۔

میں نے مکانات کا جائزہ لیا اور کچھ ہی دیر میں مجھے وہ پیلے رنگ کا مکان مل گیا جس پر ملک عبدالرحمٰن لکھا ہوا تھا۔ یہ گلی میں تیسرا مکان تھا۔ میں گھوم کر عقب میں گیا۔ تیسرے مکان پر گیلری بنی ہوئی تھی۔ میں نے اطراف کا جائزہ لیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے گیلری کی دیوار کے پاس جا کر اندازہ کیا۔ وہ زیادہ اونچی نہیں تھی۔ میں نے اچھل کر دیوار کا سرا پکڑ لیا۔ پھر اپنی ٹانگ اوپر لے جا کر دیوار پر چڑھنے میں کامیاب ہوگیا۔ وہاں کوئی نظر نہ آیا۔ میں آہستہ سے اندر کود گیا۔ ہلکی سی دھمک پیدا ہوئی۔ اسی وقت اندر کسی کمرے سے مردانہ کھانسی کی آواز آئی اور پھر سناٹا چھا گیا۔ میں کچھ دیر جہاں تھا وہیں بیٹھا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ کھڑا ہوا۔ وہاں ایک دروازہ نظر آیا۔ یہ یقیناً ثمینہ کا کمرا ہوگا جیسا اس نے بتایا تھا۔ میں نے ثمینہ کو میسج کیا کہ میں آگیا ہوں اور تمہارے کمرے کے باہر کھڑا ہوں۔ اسی وقت دروازے کی کنڈی کھلنے کی دھیمی سی آواز آئی اور دروازہ نیم وا ہوگیا۔ اس کا مطلب تھا اس نے دروازہ کھول دیا تھا تاکہ میں اندر آجاؤں۔ میں اندازے سے کمرے میں داخل ہوگیا۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔ چند لمحوں بعد میری آنکھیں اندھیرے کی عادی ہوئیں تو مجھے ہلکا ہلکا منظر نظر آنے لگا۔ وہاں ایک پلنگ پر کوئی بیٹھا ہوا تھا۔

''ثمینہ۔'' میں نے آہستہ سے پکارا۔

''ہاں میں اِدھر ہوں۔'' اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

میں چلتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔ وہ ثمینہ ہی تھی۔ میں اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔

''میں جان جوکھوں میں ڈال کر آیا ہوں۔'' میں نے سرگوشی میں کہا۔

''اسی لیے تو کہتے ہیں محبت کی راہوں میں دشواریاں بہت ہیں۔'' ثمینہ بولی۔

''تمہارے باقی گھر والے کہاں ہیں۔'' میں نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

''میرے بابا جان پہلے کمرے میں اور میری امی اور بھائی ساتھ والے کمرے میں سو رہے ہیں۔'' ثمینہ نے بتایا۔

ابھی میں ثمینہ سے سرگوشی کر ہی رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے میرا کالر پکڑ لیا۔ میں گھبرا گیا لیکن خود کو اس مضبوط ہاتھ سے چھڑا نہیں پایا۔ اس نے مجھے زور سے پیچھے گھسیٹا اور میں پلنگ سے زمین پر گر پڑا۔ ثمینہ سہم کر کھڑی ہوگئی۔

''کون ہے تو اور اتنی رات گئے میری بیٹی کے کمرے میں کیا کر رہا ہے۔'' ایک غراتی ہوئی آواز سنائی دی۔ اسی وقت ایک کھٹکے کی آواز کے ساتھ کمرا روشن ہوگیا۔ میں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

نے دیکھا ایک پہلوان نما شخص میرے پیچھے موجود ہے۔ جس کے آہنی شکنجے میں میرا کالر پھنسا ہوا تھا۔

''مم.....میں چور نہیں ہوں۔'' میں نے ہکلا کر کہا۔

''چور نہیں تو پھر کون ہے اور کیا کرنے آیا ہے۔'' وہ شاید ثمینہ کے بابا جان تھے ملک عبدالرحمن۔

''وہ.....وہ.....میں.....تو.....'' میرے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔

''وہ میں کے بچے.....سیدھی طرح بتا کس ارادے سے آیا ہے۔ ورنہ میں مار مار کر تیرا کچومر بنا دوں گا۔''

میں خوشامدی نظروں سے ثمینہ کی طرف دیکھنے لگا لیکن وہ تو پہلے ہی تھر تھر کانپ رہی تھی۔

''میں ثمینہ سے پیار کرتا ہوں اور اس سے ملنے آیا تھا۔'' میں نے بمشکل اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''ابے ناہنجار تجھے شرم نہیں آئی۔ ہم غیرت مند لوگ ہیں اور اپنی عزت کے لیے جان دے دیتے ہیں اور لے بھی لیتے ہیں۔'' ملک عبدالرحمن نے غراتے ہوئے کہا۔

''مجھے معاف کر دیں۔ مجھے جانے دیں۔ میرے والد بھی بہت سخت ہیں۔ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔'' میں پتلی لہجے میں بولا۔

''ایسے کیسے جانے دوں۔ بکرے اب تو تیری پوری قربانی ہوگی۔'' عبدالرحمن بولا۔

''ثمینہ تم ہی سمجھاؤ اپنے بابا جان کو۔'' میں نے رو دینے کے انداز میں کہا۔

''نن.....نہیں.....مجھے کچھ نہیں پتا۔'' ثمینہ دونوں ہاتھ نفی میں ہلانے لگی۔

''تیرا باپ غیرت مند ہے تو اس نے تیرے جیسی بے غیرت اولاد کو کیسے جنم دے دیا۔'' ملک عبدالرحمن غرایا۔

''خدا کے واسطے مجھے جانے دیں۔ میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔'' میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

''ارے عارف! ذرا رسی لے کر آؤ۔'' عبدالرحمن نے غالباً اپنے بیٹے کو آواز لگائی۔ چند ہی لمحوں میں عارف رسی لے کر پہنچ گیا۔

''دونوں باپ بیٹے نے میرے ہاتھ اور پاؤں باندھ دیئے اور منہ میں کپڑا ٹھونس دیا تاکہ میں شور نہ مچا سکوں۔ پھر ملک عبدالرحمن نے میری جامہ تلاشی لی اور میرا موبائل اپنے قبضے میں کر لیا۔

''بابا جان! ایسا مت کریں۔ اس کو جانے دیں۔''

ثمینہ نے پہلی بار زبان کھولی۔

''جانے دوں؟ ہرگز نہیں.....اری کم بخت.....اس کیم کے لیے ایسے ہی شریف زادے کی ضرورت تھی۔ تو سارا کھیل خراب کرائے گی۔'' ملک عبدالرحمن بولا۔

میں حیرت سے دونوں باپ بیٹی کو دیکھ رہا تھا۔ میں بول نہیں سکتا تھا کیوں کہ میرے منہ پر کپڑا بندھا ہوا تھا مگر سوچ تو سکتا تھا اس لیے سوچ جا رہا تھا کہ یہ لوگ کون سے کیم کا ذکر کر رہے ہیں۔

''اب اس کے موبائل میں سے اس کے باپ کا نمبر تلاش کر کے مجھے دے تاکہ میں یہ کھیل مکمل کروں۔'' ملک عبدالرحمن نے میرا موبائل ثمینہ کی طرف بڑھایا۔

میرے پیروں سے زمین نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ ملک عبدالرحمن نہ جانے کیا کرنے والا تھا۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرے چھانے لگے۔ میں بری طرح پھنس چکا تھا۔ مجھے ارباز کی شدت سے یاد آ رہی تھی مگر اسے فون بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اپنی بے بسی پر میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

ثمینہ وہیں کھڑی میرے موبائل میں میرے والد کا نمبر تلاش کر رہی تھی۔

''بابا جان! اس کے والد کا نمبر نہیں مل رہا۔ آپ اس کا منہ کھول کر خود ہی معلوم کر لیں۔'' ثمینہ نے موبائل ملک عبدالرحمن کو دیتے ہوئے کہا۔ تب انہوں نے میرے منہ پر بندھا کپڑا کھول دیا۔

''چل اپنے باپ کا نمبر بتا تاکہ میں اسے تیرے کرتوت بتاؤں۔'' ملک عبدالرحمن نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ میں نے بے چارگی کے عالم میں موبائل میں سے والد کا نمبر نکال کر دیا۔ ملک نے میرا موبائل جھپٹ کر والد کا نمبر پنچ کر دیا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

ثمینہ اب تک وہیں کھڑی تھی۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ یہ تمہارے بابا جان کس کھیل کی بات کر رہے ہیں؟'' میں نے ثمینہ سے پوچھا۔

''دراصل میرے بابا جان بہت سخت انسان ہیں۔ ہم سب کو احکامات پر چلانے کے پابند ہیں۔''

اسی وقت ملک کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں میرا فون تھا۔

''تیرے باپ پر بجلی گرا دی میں نے۔ وہ آ رہا ہے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

یہاں۔'' ملک نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

''یہ آپ نے ٹھیک نہیں کیا۔'' میں نے دھیرے سے کہا۔

''چپ کر..... خبیث! جب کسی عزت دار کے گھر کی دیوار کود کر اندر آیا تھا وہ ٹھیک تھا؟ اب بھگت۔''

ملک ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ثمینہ وہیں کھڑی تھی اور میں اپنے آپ کو کوس رہا تھا۔ وہ سب میرے والد کی آمد کے منتظر تھے۔

تقریباً پچیس منٹ انتظار کے بعد باہر دروازے پر دستک ہوئی۔

''آ گیا اس کا باپ۔'' یہ کہہ کر ملک دروازے کی طرف بھاگا اور تھوڑی دیر میں میرے والد سمیت کمرے میں داخل ہوا۔

''یہ ہے تمہارا لاڈلا..... دیکھ لو..... جسے ہم نے رنگے ہاتھوں پکڑا ہے۔ یہ آدھی رات کو دیوار کود کر اندر آیا تھا اگر میں جھوٹ بول رہا ہوں تو یہ سامنے بیٹھا ہے۔ خود ہی پوچھ لو۔'' ملک نے کہا، والد صاحب مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگے۔

''کیا یہ سچ ہے؟'' والد صاحب نے خاموشی کو توڑا۔

''جی۔'' میں نے دھیرے سے کہا۔ پھر تو گویا قیامت ہی آ گئی۔ ''بے غیرت..... ناہنجار..... خبیث.....'' گالیوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے لاتوں گھونسوں کی بھی بوچھاڑ کر دی۔ وہ مجھے بری طرح مارتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ تھک کر رک گئے۔ ان کا سانس پھول گیا تھا۔ مجھے والد صاحب کی مار کی بالکل پروا نہیں تھی۔ بلکہ جواب ہونے والا تھا اس کی فکر کھائے جا رہی تھی۔

''دیکھیں صاحب! ایسا نہیں کہ آپ کا بیٹا کسی کی چاکلیٹ چھین کر بھاگ گیا اور آپ اسے مار پیٹ کر معاملہ رفع دفع کر دیں گے، یہ ہماری عزت کا سوال ہے۔'' ملک نے کہا۔

''جناب مجھے اس بات کا پورا احساس ہے۔ آپ کی عزت میری عزت ہے۔ آپ ہی بتائیے میں کیا کروں۔'' والد صاحب بے چارگی سے بولے۔

''آپ کا بیٹا میری بیٹی سے نہ جانے کب سے مل رہا ہے اور نہ جانے کتنی بار داغدار کر چکا ہوگا۔ ہم تو کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ یہ مسئلہ ایسا ہے کہ پولیس میں بھی رپورٹ درج نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اس میں بھی ہماری بدنامی ہوگی۔'' ملک بولا۔

''نہیں یہ غلط ہے۔ میں ثمینہ سے پہلی بار ہی ملنے آیا تھا اور میں نے اسے اب تک ہاتھ بھی نہیں لگایا۔'' میں نے ملک کی مبالغہ آرائی سن کر کہا۔

''چپ کر مکار..... ایک تو چوری اوپر سے سینہ زوری۔'' ملک غرایا۔

''ایسی بے غیرت اولاد سے تو میں بے اولاد بہتر تھا۔'' والد صاحب نے روہانسے لہجے میں کہا۔

''اب اس کا ایک ہی حل ہے۔ کل کا دن نکلتے ہی ان دونوں کا نکاح کرا دو۔ کیونکہ اب میری بیٹی کو کون اپنائے گا۔'' ملک مکاری سے بولا۔

''ٹھیک ہے مجھے منظور ہے لیکن میں اس کو اپنے گھر سے نکال رہا ہوں۔ کیونکہ میرے گھر میں ایسی اولاد کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ یہ کہیں بھی رہے۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔'' والد صاحب نے کہا۔

''لیکن اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ کل تم دونوں باپ بیٹے مکر گئے تو میں کیا کروں گا۔'' ملک نے تشویش سے کہا۔

''نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ میں جو زبان دیتا ہوں تو اس

لسانی مسئلہ

ایک ہندو جسے گٹار بجانے کا بہت شوق تھا۔ ایک سکھ کا ہمسایہ تھا۔ سکھ کو اس کے وقت بے وقت گٹار بجانے سے بہت چڑ تھی۔ ایک صبح سکھ نے ہندو کو گٹار بجاتے ہوئے جا پکڑا اور غصے سے کہا۔'' کی گل اے باؤ جی؟ سویرے سویرے وجان لگ پینڈے او۔'' (کیا بات ہے جناب! صبح صبح آپ بجانے لگتے ہیں؟) ''سکھنی جو ہوئی۔'' (سیکھنی جو ہوئی) ہندو نے سکھ کو شرمندہ کر دینے والا جواب دیا۔ سردار جی کہاں شرمندہ ہونے والے تھے۔ ہندو کے لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔'' ایہہ وی سکھ دا اے؟'' (یہ بھی سیکھتا ہے؟) ''نہیں، پر ایہنوں سکھنی چاہیدی اے'' (نہیں، لیکن اسے سیکھنی چاہیے) ہندو نے اطمینان سے جواب دیا۔

(خشونت سنگھ کے لطیفے)

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

سے کبھی نہیں مکرتا۔'' والد صاحب نے کہا۔

''لیکن میں کیسے یقین کروں۔'' ملک نے کہا۔

''جو آپ کو ٹھیک لگے وہ بتا دیں۔'' والد صاحب نے کہا۔

''ابھی ایک کاغذ پر لکھ کر دے دو۔'' ملک نے برجستہ کہا۔

''ٹھیک ہے لاؤ کاغذ۔'' والد صاحب نے کہا۔ ملک فوراً اندر گیا اور ایک کاغذ قلم اور اسٹیمپ پیپر لے آیا۔ والد صاحب نے اپنا حلفیہ بیان لکھا اور دستخط کر کے انگوٹھا لگا دیا۔

☆.....☆

اگلے دن میرے والد صاحب نے آخری بار مجھے ماں اور بہنوں سے ملوایا اور سب کو بتا دیا کہ آج کے بعد وہ میرا چہرہ بھی نہیں دیکھیں گے۔ سب کی آنکھیں نم تھیں لیکن کوئی بھی والد صاحب کے فیصلے کے آگے سر نہیں اٹھا سکتا تھا۔

پھر مجھے ملک کے گھر لے گئے جہاں انتہائی سادگی سے میرا نکاح ثمینہ سے کرا دیا گیا اور اسی علاقے میں ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر دلوا دیا گیا۔ نکاح سے فارغ ہو کر والد صاحب مجھے نئے گھر میں منتقل کر کے وہاں سے رخصت ہو گئے ہمیشہ کے لیے۔

میرے چہرے کی ہنسی ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکی تھی۔ تعلیم کا سلسلہ بھی موقوف ہو چکا تھا۔ مجھے ایک دفتر میں جاب کرنی پڑی۔ میں نے تو ابھی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا ہی تھا کہ شادی کے حادثاتی بندھن میں بندھ گیا۔ میں ملک کی چال کا شکار ہو چکا تھا اور اس میں قصور میرا بھی تھا جو میں نے انجانے میں اپنے بڑوں کی نافرمانی اور غلط راستے کو اپنایا۔ اسی دوران ایک دن ثمینہ نے بتایا کہ اس دن میرے ابو نے جو ڈراما کیا تھا اس کی ایک وجہ تھی کہ میں موبائل پر جانے انجانے کو دوست بنا لیتی۔ دل بھر کر چیٹ کرتی۔ انہی میں شکیل بھی تھا۔ اس نے موبائل کی دوستی کے بعد ملنے کی آفر کی۔ پہلی بار ہم ایک پارک میں ملے پھر اِدھر اُدھر ملنے لگے۔ اس نے اپنے گھر بلایا۔ میں چلی گئی۔ اس دن اس کے گھر میں کوئی نہیں تھا۔ اس اکیلے پن کا فائدہ اٹھا کر اس نے من مانی کر لی۔ میری یہ لغزش خطرناک ثابت ہوئی تب ابو نے ایک راہ بتائی اور میں نے تمہیں اپنے گھر بلا لیا۔ ابو نے ڈرامے کو تکمیل تک پہنچا دیا۔

میں نے اس کی بات پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔

وقت گزرتا رہا۔

ایک دن میں ڈیوٹی پر جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو ایک عورت گود میں ایک شیر خوار بچے کو لیے کھڑی تھی۔

''میں ثمینہ کی خالہ ہوں، سکھر سے آئی ہوں۔'' اس نے تعارف کروایا۔ میں نے اسے اندر بلایا اور کمرے میں بٹھایا۔ ثمینہ نے خالہ سے سلام دعا کی۔ پھر خالہ کھڑی ہوئی اور اس شیر خوار بچے کو ثمینہ کی گود میں دے دیا۔

''لو بیٹی اپنی امانت۔'' خالہ نے کہا۔ تو میں حیرت سے ان دونوں کو دیکھنے لگا۔

''امانت..... کیا مطلب.....!'' میں نے پوچھا۔

''یہ ثمینہ کی بچی ہے۔ اسی نے اسے جنم دیا ہے۔ اس کے باپ ملک عبدالرحمن نے کہا تھا کہ جب تک اس کا نکاح نہ ہو جائے تب تک بچی میرے پاس رہے گی۔ اب چونکہ نکاح ہو چکا ہے لہٰذا میں اس کی امانت لوٹا رہی ہوں۔'' خالہ نے کہا تو مجھ پر بجلیاں گر پڑیں۔

''اب یہ بچی کی کیا کہانی ہے؟'' میں نے غصے سے ثمینہ کو دیکھا۔

''دراصل میں نے تمہیں پوری بات نہیں بتائی تھی۔ اس لغزش کے نتیجے میں میں حاملہ ہو گئی تھی۔ اس کے بعد میری خالہ مجھے اپنے ساتھ سکھر لے گئیں۔ بچی کی پیدائش تک میں وہیں رہی۔ بچی کی پیدائش کے بعد میں بچی کو خالہ کے پاس چھوڑ کر کراچی آ گئی۔ بابا جان نے کہا کہ میری شادی کے بعد وہ بچی لے لیں گے۔'' ثمینہ کہتی چلی گئی۔

''اوہ خدایا!'' میں اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

☆.....☆

آج مجھے گمنامی کی زندگی گزارتے کئی برس بیت چکے ہیں۔ ثمینہ سے میری کوئی اولاد نہیں ہے۔ کیوں کہ اس نے بتایا کہ بچی کی پیدائش کے وقت کوئی پیچیدگی ہو گئی تھی جس کی وجہ سے مجھ میں ماں بننے کی صلاحیت ختم ہو گئی ہے۔ ثمینہ بھی موبائل کے ذریعے محبت کے جھانسے میں آ کر اس مصیبت کا شکار ہوئی اور میں بھی۔ آج کئی برس بیت گئے۔ میں نے بیچ میں کئی بار اپنے گھر والوں سے ملنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے مجھے دھتکار دیا۔ میری دنیا الٹ چکی تھی۔

میری نوجوان نسل سے گزارش ہے کہ موبائل فون پر محبت نہ کریں۔ یہ بہت بڑا عفریت ہے۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

بدگمان

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم
انسان کتنا کند ذہن ہے، کیسا شکی ہوتا ہے یہ ہر ایک کے علم میں ہو گا۔ ایسی باتیں وہ لوگ کچھ زیادہ ہی کرتے ہیں جو خود بھی شکی مزاج ہوں۔ میں نے بھی اپنے ذہن میں شک کا ناگ پالا تھا جس نے مجھے بارہا ڈسا۔ میرے گھر کے ٹوٹنے کا سبب بن گیا تھا لیکن عین وقت پر اصل بات سامنے آگئی۔

وردہ خان
(کراچی)

ارسلان نے جب گلاس میں پانی لا کر میرے سامنے رکھا تو میں حیران رہ گئی۔ میں نے اس سے پانی نہیں مانگا تھا۔ پھر بھی اس نے جان لیا تھا کہ میں بازار سے واپس آئی ہوں تو مجھے پیاس لگی ہوگی۔ اسی لیے وہ پانی کا گلاس لے آیا تھا۔

مجھے اس کی یہ حرکت بہت اچھی لگی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے پاس بیٹھا لیا۔ ”بیٹے تمہیں کیسے اندازہ ہوا کہ مجھے پیاس لگی ہوگی؟“ میں نے پوچھا۔

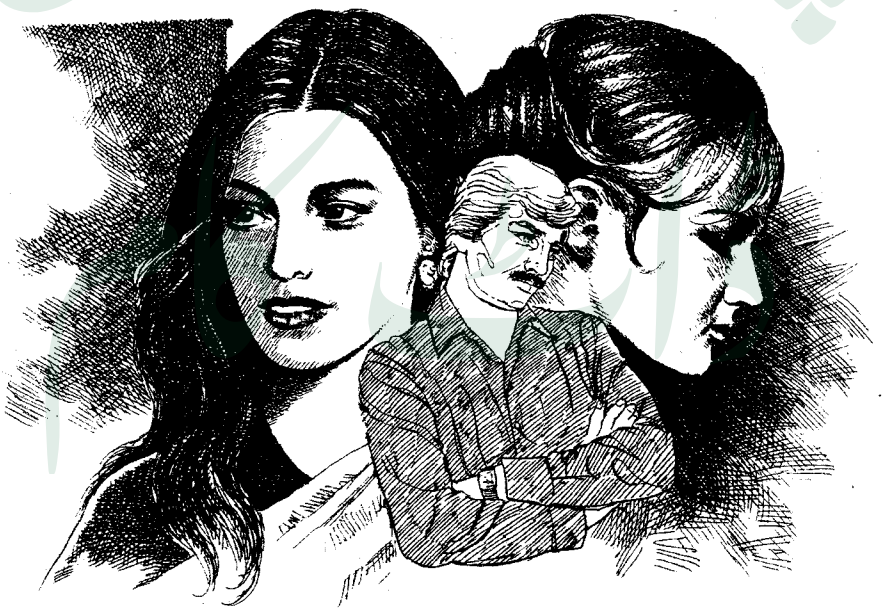

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''مما۔ جب میری مما دھوپ سے واپس آتی تھیں نا تو ان کو بھی پیاس لگتی تھی۔'' اس نے بتایا۔ میں نے اسے پیار کرلیا تھا۔

ارسلان میرا بیٹا نہیں تھا۔ یعنی اس نے میری کوکھ سے جنم نہیں لیا تھا۔ اس کی امی کا انتقال ہو چکا تھا۔

میں نہیں جان سکتی کہ اماں نے ارمغان سے میرا رشتہ کس طرح قبول کرلیا تھا۔ میں ان دنوں بی اے کے امتحان سے فارغ ہوئی تھی۔ خیال یہ تھا کہ کچھ دنوں تک خوب آرام کروں گی۔ دوستوں کے ساتھ سیر کروں گی۔ لیکن اماں نے رشتے کی خبر سنادی اور وہ بھی کس سے ارمغان سے۔

ارمغان میرے ہی محلے کا تھا۔ اس کی ساکھ اچھی تھی۔ محلے والے اس کی عزت کرتے تھے۔ وہ کسی اچھی پوسٹ پر تھا لیکن شادی شدہ تھا۔ اس کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس کی ایک بیٹا تھا۔ ارسلان۔ جو چھ یا سات سال کا ہو چکا تھا۔

میں یہ سن کر حیران رہ گئی تھی۔ ''اماں۔ کیا ہوا ہے تم کو؟ کس سے میرا رشتہ کروا رہی ہو۔ اس کا ایک بیٹا ہے اور تم یہ چاہتی ہو کہ میں اس سے شادی کرلوں؟''

''بیٹا ذرا ٹھنڈے دل سے سوچ۔'' اماں نے کہا۔

''کیا ارمغان اچھا آدمی نہیں ہے؟ کیا شریف نہیں ہے۔ کیا پڑھا لکھا نہیں ہے؟ اب خدا کی مرضی تھی کہ اس کی بیوی اس کا ساتھ چھوڑ گئی تو اس میں اس کا کیا قصور؟ رہا اس کا بیٹا ارسلان۔ تم خود جانتی ہو کہ وہ کتنا پیارا بچہ ہے۔ تم بھی اس سے پیار کرتی ہو۔''

''اماں۔ اس سے پیار کرنے کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں اس کی ماں بن جاؤں۔'' میں نے کہا۔ ''اور ارمغان کو سوجھی کیا کہ اس نے ہمارے ہاں اپنا رشتہ بھیج دیا۔ کیا اس کو کوئی اور نہیں ملا تھا؟''

مختصر یہ کہ میرے لاکھ انکار کے باوجود ارمغان سے میرا رشتہ طے پا گیا۔ میں تلملا رہی تھی کہ اچانک ارمغان کا فون آ گیا۔ وہ مجھ سے بات کرنا چاہتا تھا۔ ''فائزہ۔ میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ بہت ضروری ہے؟''

''اب کیا ضرورت رہ گئی ہے؟'' میں تلخ ہو کر بولی۔

''آپ کا جو مقصد تھا وہ تو پورا ہونے والا ہے؟

''نہیں۔ تم مجھے غلط مت سمجھو۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ بس ایک بار مجھ سے مل لو۔''

''چلیں ٹھیک ہے۔ کہاں ملنا ہے؟''

اس نے ایک ریسٹورنٹ کا نام بتا دیا۔ وہ میرا دیکھا ہوا تھا۔ کئی بار اپنے دوستوں کے ساتھ جا چکی تھی۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر میں چاہوں تو اماں کو بتا سکتی ہوں۔

اس کے بعد مجھے کوئی ایسا خدشہ نہیں تھا۔ میں نے اماں کو بھی بتا دیا۔ انہوں نے بھی کچھ سوچنے کے بعد اجازت دے دی تھی۔

میں وقت پر پہنچ گئی۔ ارمغان پہلے سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ میری زندگی کا یہ پہلا واقعہ تھا کہ میں کسی مرد سے ملنے کہیں آئی تھی۔ اور وہ بھی اس سے جس سے میرا رشتہ طے ہو رہا تھا۔

ارمغان نے بہت مہذب انداز میں مجھے ویلکم کہا۔ پہلی بار میں انہیں قریب سے دیکھ رہی تھی۔ ویسے تو دور سے دیکھا ہی کرتی تھی۔

''اب یہ بتاؤ۔ کیا کھاؤ گی؟'' انہوں نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' میں نے بتایا۔ ''میں گھر سے کھا کر چلی ہوں۔''

''ظاہر ہے آنٹی تمہیں بھوکی تو نہیں رکھتی ہوں گی۔'' ارمغان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا خود انہوں نے اپنی مرضی سے بہت سی چیزیں منگوالی تھیں۔

کچھ دیر بعد میری جھجک ختم ہو گئی تھی۔ احساس ہوا کہ وہ بہت معقول انسان ہیں۔

''دیکھو۔ فائزہ۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارے دل میں ہزار قسم کے ارمان ہوں گے۔ تم نے کبھی یہ سوچا بھی نہیں ہوگا کہ تمہاری شادی کسی ایسے شخص سے ہو جس کی پہلے شادی ہو چکی ہو اور جس کی ایک اولاد بھی ہو۔ ایک غیر شادی شدہ لڑکی کے لیے یہ تسلیم کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں نے ہمت کر کے تمہارے گھر اپنا رشتہ بھجوا دیا اور آنٹی نے قبول بھی کرلیا۔ لیکن مسئلہ آنٹی کا نہیں تمہارا ہے۔ زندگی تمہیں گزارنی ہے۔ اسی لیے میں نے تم کو بلوایا ہے۔ تاکہ تم سے کھل کر بات ہو سکے۔ تمہارے دل میں کوئی خلش نہ رہے۔''

''ارمغان صاحب۔ آپ مجھے ایک معقول انسان لگے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''حالانکہ میرے لیے یہ ایک مشکل مرحلہ ہے کہ میں ایسے شخص کو اپنا جیون ساتھی بنالوں کہ جو ایک بچے کا باپ ہے۔ لیکن شاید تقدیر اسی کا نام ہے۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''فائزہ۔اس سلسلے میں تم پر کوئی دباؤ نہیں ہے۔'' ارمغان نے کہا۔''ابھی بھی کچھ نہیں ہوا ہے۔بات آگے نہیں بڑھی ہے۔تم چاہو تو انکار کرسکتی ہو۔اور یہ تمہارا حق ہے۔''

لیکن میں انکار نہیں کرسکی۔ارمغان آج کل کے ناپختہ ذہن کے نوجوانوں سے کہیں بہتر تھا۔اس میں ایک ایسا دھیما پن تھا جس نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔میں نے گھر آکر اماں سے ہاں کہہ دی۔اماں اسی دن سے شادی کی تیاریوں میں مصروف ہوگئی تھیں۔

مختصر یہ کہ شادی کی تاریخ طے ہوگئی۔اور ہماری شادی بھی ہوگئی۔میں اس کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتی۔بس اتنا ہوا کہ میں اپنے گھر سے اٹھ کر ارمغان کے گھر آگئی۔

ارمغان بہت اچھے انسان ثابت ہورہے تھے۔مہذب اور خیال کرنے والے۔بہت خوبیاں تھیں ان میں۔ارسلان نے ابتدا میں مجھے قبول نہیں کیا تھا۔میں سمجھتی تھی کہ یہ ایک نیچرل سی بات ہے۔کوئی بچہ یہ کیسے برداشت کرسکتا ہے کہ کوئی اور عورت اس کی ماں کی جگہ آجائے۔اسی لیے شروع شروع میں وہ مجھ سے اکھڑا اکھڑا سا رہا۔لیکن میں اس کو درگزر کرتی چلی گئی۔بچہ ہی تو تھا۔میں نے اسے پیار دیا۔توجہ دی۔اس کا پورا پورا خیال رکھا۔

ارمغان کو اس بات کا اعتراف تھا۔وہ کہا کرتے تھے کہ تم نے ارسلان سے ماں کی کمی دور کردی ہے۔میں تمہارا احسان مند ہوں۔میں ان سے کہا کرتی کہ میں جو بھی کررہی ہوں۔یہ میرا فرض ہے۔دوسری طرف خود ارسلان تھا۔اس نے بھی ثابت کردیا تھا کہ وہ ایک فرماں بردار قسم کا بچہ ہے۔

ایک دن عروسہ ہمارے گھر آگئی۔عروسہ ایک ایسی لڑکی تھی جس نے زندگی میں بہت دشواریاں برداشت کی تھیں۔میں اس کو بہت اچھی طرح جانتی تھی۔اس کی اماں محلے کے بچوں کو ٹیوشن پڑھایا کرتی تھی۔وہ خود بھی کئی بچوں کو پڑھایا کرتی تھی۔صورت شکل کی بہت پیاری سی تھی۔اس کو دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی تھی۔میں نے اس کو ایک آفر کردی۔''عروسہ۔کیا تم ارسلان کو ٹیوشن دے سکتی ہو؟''

''کیوں نہیں؟ آپ کہہ رہی ہیں تو ضرور دوں گی۔''

''تو پھر کل شام سے آجایا کرو۔'' میں نے کہا۔

''وہ تنگ کرنے والا بچہ تو نہیں ہے نا؟''

''نہیں وہ بہت سمجھدار اور فرمانبردار قسم کا بچہ ہے۔'' میں نے بتایا۔''تم خود ہی دیکھ لو۔میں اس گھر میں اس کی ماں بن کر آئی ہوں۔ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ مجھ سے اکھڑا رہتا۔اس کے برعکس وہ مجھ سے بہت پیار کرتا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔میں کل سے آجایا کروں گی۔''

عروسہ نے ارسلان کو پڑھانا شروع کردیا۔میں نے جب ارمغان کو یہ بتایا کہ میں نے ارسلان کے لیے ٹیوشن کا بندوبست کردیا ہے۔تو وہ بھی خوش ہوگئے تھے۔

''فائزہ۔تم ارسلان کے لیے جو بھی کررہی ہو۔وہ تمہارا احسان ہے۔''

''کیسی بات کررہے ہیں۔کیا وہ میرا بیٹا نہیں ہے؟''

عروسہ نے باقاعدگی سے آنا شروع کردیا۔ارمغان سے بھی اس کی ملاقات ہوئی۔ارسلان بھی اس سے بہت خوش تھا۔اس کی تعریف کیا کرتا۔کچھ دن گزر گئے۔اس کے بعد میں ارسلان کی طرف سے بے فکر ہوگئی۔عروسہ کی شکل میں اسے ایک اچھی ٹیوٹر مل گئی تھی۔

عروسہ آتی رہی اور ارسلان کی پروگریس اچھی ہوتی چلی گئی۔ایک دن ارسلان نے مجھ سے ایک عجیب بات کی۔''مما۔یہ بتائیں۔کوئی دوسری دنیا سے واپس آسکتا ہے؟''

''نہیں بیٹے۔جس کو اللہ میاں اپنے پاس بلا لیتے ہیں وہ واپس نہیں آتا۔وہیں رہتا ہے۔''

''اس کے پاس تو ایک اچھا سا گھر بھی ہوتا ہوگا؟''

''ہاں۔بیٹا۔بہت پیارا گھر ہوتا ہے۔''

''مما۔کیا میں اپنی مما کے گھر میں رہنے کے لیے ان کے پاس جاسکتا ہوں؟'' اس نے پوچھا۔

''ارسلان۔آئندہ سے ایسی بات مت کرنا۔میں بھی تمہاری مما ہوں۔اب تم میرے پاس ہو تو میرے ہی پاس رہو گے۔''

اس نے پھر کچھ نہیں کہا۔نہ جانے کیا ہوا تھا اس کو۔اس کے بعد اس نے پھر ایسی کوئی بات نہیں کی۔

پھر ایک دن میری ایک دوست مجھ سے ملنے گھر آگئی۔وہ بہت دنوں کے بعد آئی تھی۔شادی کے بعد پہلی بار میرے گھر آئی تھی۔میں نے جب اس سے شکایت کی تو اس نے بتایا۔''یار کیا بتاؤں۔فرصت ہی نہیں ملتی۔اور آج بھی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ایک بہت ضروری بات کرنے آئی ہوں۔''

''کون سی بات؟''

''یہ بتاؤ۔ ارمغان بھائی کا تمہارے ساتھ کیسا رویہ ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''اب تک تو بہت اچھا ہے۔ بہت خیال رکھنے والے انسان ہیں۔'' میں نے بتایا۔ ''لیکن تم نے یہ کیوں پوچھا ہے؟''

''کوئی خاص بات نہیں ہے۔'' اس نے ٹالنے کی کوشش کی۔

میں اس سے کرید کرید کر پوچھتی رہی۔ تب اس نے بتایا کہ اس نے ارمغان کو کسی لڑکی کے ساتھ دیکھا ہے۔ ایک بار ایک ہوٹل میں اور ایک بار ایک شاپنگ سینٹر میں۔ وہ اسے کپڑے دلوا رہے تھے اور کئی شوز بھی دلوائے۔ ارمغان چونکہ انعم کو نہیں جانتے تھے۔ اسی لیے وہ اسے پہچان نہیں سکے۔ جبکہ انعم ارمغان کو اچھی طرح پہچانتی تھی۔ میں ارمغان کی کئی تصویریں اسے بھیج چکی تھی۔ اس کے علاوہ شادی میں بھی اس نے ارمغان کو دیکھا تھا۔ ارمغان نے بھی اسے دیکھا ہوگا۔ لیکن وہ پہچان نہیں سکے تھے۔

انعم کے جانے کے بعد میں اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکی۔ میں نے کتنی محبت کی تھی اس شخص سے۔ کتنا ساتھ دیا تھا اس کا۔ انتہا تو یہ ہے کہ میں نے یہ جان لینے کے بعد بھی اس کو قبول کر لیا تھا کہ وہ شادی شدہ تھا۔ اور ایک بچے کا باپ تھا۔ ایک جوان اور کنواری لڑکی اس سے زیادہ اور کیا قربانی دے سکتی ہے۔

میں نے سوچا کہ میں ارمغان سے معلوم کروں۔ ان سے پوچھوں کہ مجھ میں ایسی کون سی کمی ہے کہ انہوں نے کسی اور کے ساتھ گھومنا پھرنا شروع کر دیا ہے۔ کسی اور کے چکر میں آگئے ہیں۔ کیوں؟ شاید ہر مرد ایسا ہی ہوتا ہے۔ لیکن ارمغان ایسے تو نہیں تھے۔

ارمغان شام کو واپس آئے تو میں نے ان سے بات نہیں کی۔ یعنی اس موضوع پر بات نہیں کی۔ ویسے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔ میرے لیے اب ارسلان کے معاملے سے کہیں زیادہ اہمیت ارمغان کے معاملے کی تھی۔

ارمغان اور ارسلان آپس میں کھیلتے رہے۔ جبکہ میں کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گئی تھی۔ میرے ذہن میں ایک آندھی سی اٹھ رہی تھی۔ کیا تھا یہ سب۔ اگر انعم کو دھوکا نہیں ہوا تھا تو ارمغان ایسا کیوں کر رہے تھے۔

بہرحال کئی دن اسی طرح گزر گئے۔ ارمغان کی وہی محبت تھی۔ ویسی ہی توجہ تھی۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی جس سے مجھے کوئی شبہ ہوتا۔

پھر ایک دن ایک اور قیامت آگئی۔ انعم مجھ سے ملنے آئی ہوئی تھی۔ اس نے شاید کچھ اور دیکھ لیا تھا۔ کوئی اور خبر لے کر آئی تھی۔ اس نے فون پر اشارہ تو دے دیا تھا۔ لیکن میں یہ نہیں جانتی تھی کہ معاملہ اتنا سیریس بھی ہو سکتا ہے۔

''فائزہ۔ میں ایک بار پھر بتا رہی ہوں کہ اپنے شوہر کی طرف سے آنکھیں بند کر کے مت بیٹھ جاؤ۔'' اس نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ معاملہ بہت آگے جا چکا ہے۔''

''اب کیا نئی بات ہوگئی؟''

''تم تو جانتی ہو کہ میری نند کی شادی ہونے والی ہے۔ میں مارکیٹس کی خاک چھانتی پھر رہی ہوں۔ کل میں اپنی ساس کے ساتھ جیولری لینے گئی تھی کہ میں نے تمہارے ارمغان صاحب کو اسی لڑکی کے ساتھ دیکھا۔ وہ اسے اس کی پسند سے جیولری دلوا رہے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق کم از کم ایک لاکھ کی جیولری دلوا دی ہوگی۔''

اب میں پاگل سی ہوگئی۔ کیا ہو رہا ہے یہ سب۔ انعم کی انفارمیشن غلط نہیں ہو سکتی تھیں۔ ارمغان ضرور ایسا کر رہے ہوں گے۔ اور مجھے اندازہ بھی نہیں تھا کہ وہ ایسا بھی کر سکتے ہوں گے۔

''میں نے تم کو خبردار کر دیا ہے۔'' انعم نے کہا۔

اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی تھی۔ عروسہ کے آنے کا یہی وقت تھا۔ ارسلان دروازہ کھولنے چلا گیا تھا۔ میں انعم کو کمرے میں لے آئی۔ جس وقت میں انعم کو کمرے میں لے جا رہی تھی۔ اسی وقت عروسہ داخل ہو رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ انعم اس کو دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ اس نے میرا ہاتھ تھام کر جھنجھوڑ دیا۔ ''فائزہ۔ میرے ساتھ آؤ۔'' اس نے کہا۔ وہ مجھے دوسرے کمرے میں لے آئی تھی۔

''فائزہ۔ یہی لڑکی تو ارمغان کے ساتھ ہوتی ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''تمہارے ارمغان اسی کو تو شاپنگ کراتے ہیں۔''

میرے تو پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی تھی۔ یہ عروسہ ایسی ثابت ہو رہی تھی۔ میں نے اس کے ساتھ ہمدردی کی تھی اور یہ میرے ہی گھر کو تباہ کرنے کا منصوبہ بنا رہی تھی۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اوہ خدایا۔ ایک غریب گھر کی لڑکی جو جگہ جگہ ٹیوشن پڑھاتی پھر رہی تھی۔ اس کی ایسی حرکت۔ اور کمال یہ ہے کہ اس نے اور ارمغان نے شبہ بھی نہیں ہونے دیا کہ ان دونوں کے درمیان اتنی راہ رسم ہو چکی ہے کہ وہ اس کے اخراجات برداشت کررہے ہیں۔ اس کو شاپنگ کرا رہے ہیں۔ وہ بھی جیولریز جیسا مہنگا آئٹم۔

انسان کے کتنے چہرے ہوتے ہیں۔ کتنے بھید ہوتے ہیں۔ اوپر سے کچھ اور ہوتا ہے۔ اندر سے کچھ اور۔ اور یہ عروسہ، کتنی گھنی لڑکی نکلی تھی۔ اس نے اپنی کسی بات سے ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی۔

''انعم۔ ایک بات بتاؤ۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ یہی وہ لڑکی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میری آنکھیں اتنی کمزور نہیں ہیں کہ اسے پہچان نہ سکوں۔'' انعم نے کہا۔

''اب تم بتاؤ۔ کیا کروں میں؟'' میں نے پوچھا۔

''سب سے پہلا کام یہ کرو کہ کسی بہانے اسے بچے کی ٹیوشن سے ہٹادو۔'' انعم نے کہا۔ ''اس کے بعد تم خود اپنی آنکھوں سے جاکر دیکھ لو۔''

''کیسے دیکھ لوں؟''

''اس کا طریقہ یہ ہے کہ میرے ساتھ چلو۔ سنار سے ساری گفتگو میرے سامنے ہوئی تھی۔ تمہارے شوہر نے آرڈر بھی دیا تھا اور ایڈوانس پیسے بھی دے دیے تھے۔ تیرہ تاریخ کو سنار نے بلایا ہے۔ تیرہ تاریخ پرسوں ہے۔ پرسوں میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ لیکن میں ابھی اس سے کچھ نہیں کہہ رہی۔ پرسوں دیکھ لوں پھر کوئی بہانہ کرکے اسے ہٹا دوں گی۔ اس کے بعد ارمغان سے بات کروں گی۔ پورے ثبوت کے ساتھ۔''

''چلو ایسا کرلو۔''

اس دن میں نے انعم کو دوسرے دروازے سے گھر سے باہر نکال دیا تاکہ عروسہ اسے دیکھ نہ پائے ورنہ وہ کوئی کہانی بھی سنا سکتی تھی۔ یا ارمغان کو خبردار کردیتی۔

اس دن عروسہ نے بچے کو پڑھانے کے بعد مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن میں اس سے اکھڑی اکھڑی رہی تھی۔ ورنہ عام طور پر ہم دیر تک باتیں کرتے تھے۔ وہ حیران سی بھی تھی۔ لیکن اب مجھے اس کی کیا پرواہ ہوسکتی تھی۔ بلکہ اس سے نفرت سی ہوگئی تھی۔

پھر انعم کا فون آگیا۔ ''جلدی آجاؤ۔ میں جیولرز کی شاپ پر ہوں اور تمہارے شوہر اور عروسہ آئے ہوئے ہیں۔'' اس نے مجھے جیولرز کی دکان کا پتا بھی بتا دیا جو میرے گھر سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ میں دس منٹ میں وہاں پہنچ گئی تھی۔ میں براہِ راست دکان میں داخل نہیں ہوئی بلکہ ایک طرف کھڑی ہوکر دیکھتی رہی۔

انعم بھی دکان میں تھی۔ اور وہ دونوں بھی تھے۔ دکاندار انہیں جیولری دکھا رہا تھا۔ شاید اس نے ساری جیولری تیار کرلی تھی۔ اتنی دیر میں انعم دکان سے نکل کر میرے پاس آگئی۔ ''دیکھ لیا تم نے؟'' اس نے پوچھا۔

''میں نے صحیح پہچانا تھا نا؟''

''ہاں۔ بالکل صحیح۔ اب میں چلتی ہوں۔ مجھے جو دیکھنا تھا۔ وہ دیکھ چکی ہوں۔''

''اب کیا کروگی؟''

''کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہے۔ تم سے بعد میں بات کروں گی۔''

میں گھر واپس آگئی۔ بدن میں ایک آگ سی لگی ہوئی تھی۔ میں نے ارمغان کو کیا سمجھا تھا۔ اور وہ کیا نکلے اور وہ گھنی لڑکی عروسہ۔ اس نے میری ہمدردی اور توجہ کا کیسا غلط فائدہ اٹھایا تھا۔

میں نے سوچا کہ دوسرے دن جب وہ ارسلان کو پڑھانے آئے گی تو میں اس کی دھجیاں بکھیر دوں گی۔ پہلے اس مکار لڑکی کا فیصلہ کرنا تھا۔ اس کے بعد ارمغان سے نمٹ لیتی۔ اس نے میری محبت کا یہ کیسا صلہ دیا تھا۔

اس رات میں نے ارمغان سے کوئی بات نہیں کی۔ سر درد کا بہانہ کرکے اپنے بستر پر آکر لیٹ گئی۔ ایک دو بار ارمغان نے آواز بھی دی تو میں نے آنکھیں اس طرح بند رکھیں جیسے سوگئی ہوں۔

دوسری صبح بھی دیر سے بیدار ہوئی۔ ارمغان میرے جاگنے کے انتظار میں تھے۔ جبکہ ارسلان جا چکا تھا۔ اسے ارمغان نے اسکول کے لیے تیار کیا ہوگا۔

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' ارمغان نے تشویش سے پوچھا۔

''ہاں۔ ٹھیک ہوں۔'' میں نے مختصر سا جواب دیا۔

''مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔'' ارمغان نے کہا۔

میرا دل دھڑکنے لگا تھا۔ عروسہ کے علاوہ اور کیا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

بات ہوسکتی تھی۔ ارمغان نے پھر کہا۔ ''میں دفتر سے آکر تفصیل سے بات کروں گا۔''

''مجھے بھی تفصیل سے بات کرنی ہے۔'' میں روکھے لہجے میں بولی۔ ''آپ دفتر سے واپس آجائیں۔ پھر بات ہوگی۔''

ارمغان مجھے الجھی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے چلے گئے۔

لیکن ارمغان سے بات کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی اور بات ہوئی بھی تو اس کی نوعیت ہی کچھ اور تھی۔

گیارہ بجے کے قریب عروسہ اپنی ماں کے ساتھ آگئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس کی ماں اس کے ساتھ آئی تھی۔ وہ ایک اچھی عورت تھی۔ میں برسوں سے جانتی تھی۔ ایک ہی محلہ تھا۔ وہ چونکہ پہلی بار میرے گھر آئی تھی۔ اسی لیے میں نے اسے اندر بلا کر بیٹھالیا۔

''بیٹی۔ میں تم سے ایک ضروری بات کرنے آئی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''حالانکہ دل میں طرح طرح کے خیال آرہے ہیں کہ تم پتا نہیں کیا سمجھو۔ لیکن میں نے سوچا کہ تم سے چھپانا اچھا نہیں ہے۔ تم کو سب بتادیا جائے۔''

''ہاں۔ بتائیں۔ کیا بات ہے؟ میں نے پوچھا۔

عروسہ اس دوران ایک طرف جا کر بیٹھ گئی تھی۔

''بیٹا۔ کئی دنوں سے ایک خلش میرے ذہن میں تھی۔'' اس نے کہا۔ ''میری عروسہ کا رشتہ طے ہوگیا ہے۔ لڑکے والے شادی کی ضد کررہے ہیں کہ جلدی ہوجائے۔ میں ایک غریب عورت ہوں۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ کم از کم اتنا تو ہونا چاہیئے نا کہ دو چار جوڑے کپڑے اور تھوڑے سے زیورات اپنی عروسہ کو دے کر رخصت کرسکوں۔''

میں نے سوچا کتنی چالاک عورت ہے۔ کہاں سے گھما پھرا کر بات کررہی ہے۔

اس دوران عروسہ بھی پاس آکر بیٹھ گئی تھی۔ اس کی ماں نے اپنی بات دوبارہ شروع کی۔ ''پھر یہ ہوا کہ مجھے کسی نے شہر کے ایک مخیر شخص کے بارے میں بتایا کہ ان کا کوئی ادارہ ہے۔ ایک درخواست دینی پڑتی ہے۔ پھر وہ اللہ کا بندہ خاموشی سے مدد کردیتا ہے۔ میں اور عروسہ ایک دن اس آدمی کے پاس چلے گئے۔ اتفاق سے وہ آدمی تمہارے شوہر ارمغان کا دوست نکلا۔ ہم جس وقت وہاں پہنچے تو ارمغان بھی وہیں موجود تھے۔ وہ ہم دونوں کو پہچان گئے۔ انہوں نے ہمیں الگ لے جا کر ہماری خیریت دریافت کی۔ میں نے بتادیا کہ ہم اس لیے آئے ہیں۔

اس پر انہوں نے اپنے دوست سے کہا کہ اس بار تھوڑا سا ثواب ان کے حصے میں دے دو۔ اس کے بعد انہوں نے ہماری مدد کی۔ عروسہ کو اس کی پسند کے کپڑے اور جیولری دلوادی۔ ہم ایک دو بار ان کے ساتھ ہی گئے تھے۔ خدا خوش رکھے۔ کیا آدمی ہیں تمہارے شوہر۔ ایسا فرشتہ اس دور میں کہاں ملتا ہے۔ تو آج ہم نے یہ سوچا کہ کیوں نہ تم کو بھی اس بات میں شامل کرلیں۔ دل پر ایک بوجھ تھا کہ اگر تم کو معلوم ہوگیا تو نہ جانے تم کیا سمجھو۔ کیا خیال کرو۔ اسی لیے ہم تمہارے پاس سب کچھ بتانے کے لیے آئے ہیں۔ جبکہ اس اللہ کے بندے نے کہا تھا کہ کسی کو بھی خبر نہ ہو۔ ورنہ اس کی نیکی برباد ہوجائے گی۔ لیکن یہ ہمارا تو فرض بنتا تھا نا۔ اسی لیے ہم آئے ہیں اور تم کو سچی بات بتادی ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی کہتی ہوں کہ جیسے بھی ہو۔ میں یہ قرض ادا کردوں گی۔ ابھی ہم مجبور ہیں۔ لیکن تھوڑا تھوڑا کرکے یہ پیسے واپس کریں گے۔ میں نے ایک ایک پائی کا حساب رکھا ہے۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ عروسہ نے بھی اپنا سر جھکا رکھا تھا۔

مجھے ایسا لگا جیسے ایک دم سے اندھیرے دور ہو گئے ہوں۔ ارمغان کی عزت اور محبت میرے لیے اور بھی زیادہ ہوگئی تھی۔ احترام کا جذبہ پیدا ہوگیا تھا۔ میں یہ سوچ رہی تھی کہ کانوں سنی پر کبھی نہیں جانا چاہیئے۔ بلکہ آنکھوں کا دیکھا بھی غلط نکلتا ہے۔ ہم سب دھند میں لپٹی ہوئی زندگی گزار رہے ہیں۔ نہ جانے کون کس حال میں ہو۔ کیا کسی کے ساتھ مجبوری ہو۔ کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہر مجبور شخص کسی اور کے پاس اپنی جوانی اور اپنے حسن کا سودا ہی کرنے گیا ہو۔ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ منافق کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ ہر سنی ہوئی بات کو بغیر تحقیق کے آگے بڑھادے۔ یا بدگمانی میں مبتلا ہوجائے۔

دو سال ہوگئے ہیں۔ عروسہ کی شادی ہوگئی ہے۔ اور میں نے ابھی تک ارمغان کو نہیں بتایا کہ میں اس راز سے واقف ہوں۔

اور ہاں معلوم ہے کہ خود مجھے اس نیکی کا کیا صلہ ملا ہے؟ وہ صلہ یہ ہے کہ ڈاکٹر نے مجھے خوش خبری سنادی ہے۔ اس کے علاوہ خود ارسلان اتنا فرماں بردار ثابت ہورہا ہے کہ ہر دم دل سے دعائیں نکلتی رہتی ہیں۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ناگن

محترم مدیر
سلامِ شوق
عورت کو سمجھنا آسان نہیں اسی لیے اسے ناگن بھی کہتے ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ عورت کا ڈسا پانی بھی نہیں مانگتا مگر میں کہوں گا کہ یہ بات بالکل غلط ہے۔ حوّا کی بیٹیاں سبھی بری نہیں ہوتیں۔ ہاں ایک دو فطرتاً غلط ہوتی ہیں، ایسی ہی ایک عورت میرے دوست کی زندگی میں آئی تھی۔ اس نے کیسا کھیل کھیلا آپ بھی ملاحظہ کرلیں۔

اختر شہاب
(کراچی)

لوگ کہانی پڑھتے ہیں، سنتے ہیں اور پھر بھول جاتے ہیں۔ لیکن میں جو کہانی سنانے جا رہا ہوں یہ ایک ایسی کہانی ہے جسے میں بھولنا بھی چاہوں تو بھول نہیں سکتا۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ اسے آپ بھی سن لیں پھر انصاف سے بتائیں کہ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔ شاید آپ بھی اسے سن کر کبھی بھول نہیں پائیں گے، تو جناب چلیے چلتے ہیں اس کہانی کی طرف جس کا آغاز بھوک سے ہوتا ہے۔

جی ہاں، وہ کل سے بھوکا تھا۔ بھوک اگرچہ بڑے بڑوں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کے حوصلے سلب کرلیتی ہے، شعور کو مات دے دیتی ہے، عقل پر غالب آجاتی ہے اور آدمی گناہ وثواب کی تمیز کھو بیٹھتا ہے مگر اس نے ابھی تک شعور کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا تھا۔ گو خالی پیٹ تین گلاس پانی پینے کی وجہ سے اس کے پیٹ میں درد ہو رہا تھا اور وہ کمزوری کی وجہ سے چلنے میں مشکل محسوس کررہا تھا مگر ابھی تک اس کا ضمیر گوارا نہیں کررہا تھا کہ وہ بھیک مانگے۔ ہاں، البتہ وہ یہ ضرور سوچ رہا تھا کہ کھانے کا انتظام کیسے ہو؟

''کیا کسی شادی ہال میں جایا جائے؟'' اس نے خود سے سوال کیا۔

مگر قباحت یہ تھی کہ اوّل تو شادی ہال میں کھانا رات کو ملتا اور اس وقت تک اس سے بھوک برداشت نہیں ہوتی۔ دوسرے یہ کہ تین دن سے بڑھی ہوئی شیو اور میلے ہوئے کپڑوں میں اگر وہ شادی ہال جاتا تو فوراً بن بلائے مہمان کی حیثیت سے پہچان لیا جاتا لہٰذا اس صورت میں ہونے والی بے عزتی اسے منظور نہ تھی۔ ''بہتر یہی ہے کہ میں کوئی مزدوری تلاش کروں۔'' اس نے سوچا مگر مزدوری کے سلسلے میں کل کا تجربہ اس کا حوصلہ پست کررہا تھا جب وہ کئی جگہ سے فقیر سمجھ کر دھتکارا گیا تھا اور کسی جگہ بغیر ضامن کے ملازمت بھی نہیں مل سکتی تھی اور جہاں اس کی ملازمت کا چانس تھا وہاں اس کا ہنرمند نہ ہونا آگے آیا تھا۔

''تو کیا میں اپنی خودداری اور انا بالائے طاق رکھتے ہوئے کسی کے آگے ہاتھ پھیلاؤں؟'' تنگ آکر اس نے سوچا۔

مگر اس میں بھی مصیبت یہ تھی کہ اوّل تو کسی کے آگے اس کا ہاتھ ہی نہ اٹھتا اور دوسرے اس برے حال میں بھی اس کے چہرے پر فقیروں والی پھٹکار کی بجائے شرافت موجود تھی لہٰذا وہ بھیک مانگنے میں بھی ناکام ہی رہتا۔

''اچھا چلو کوئی چیز ہی چرا کر بیچ دیتے ہیں یا پھر کچرے سے ہی نکال کر کچھ کھاتے ہیں۔'' اس نے سوچا لیکن پھر خود کو لعنت ملامت کرنے لگا۔

''مراد خان یہ تجھے کیا ہوتا جارہا ہے؟ لعنت ہے تجھ پر کیسی گھٹیا باتیں سوچ رہا ہے۔ کیا باپ دادا کے نام کو بٹہ لگائے گا۔ تیری عقل، تیری ذہانت کہاں مرگئی؟ کچھ لڑکپن کی شرارتیں یاد کر اور باعزت کھانا کھانے کی کوئی ترکیب سوچ لڑکپن کی شرارتوں کے نام پر اسے دو قصے یاد آگئے تھے۔ جب اس نے مانگا ہوا کھانا کھایا تھا۔

ایک دفعہ تب، جب وہ اپنے دوست کے گھر پڑھنے گیا تھا۔ وہ وہاں بیٹھ کر ہوم ورک کررہا تھا کہ دوپہر کا ایک بج گیا۔

''یار کھانا کھلانے کا پروگرام ہے یا بھوکا ہی رہنا پڑے گا؟'' اس نے اپنے دوست سے پوچھا۔ اس زمانے میں بھوک بھی شدت سے لگتی تھی۔

''ہاں! ہاں۔'' اس کا دوست بولا۔ ''میں دیکھتا ہوں۔'' وہ اندر چلا گیا۔ ''سوری بھئی!'' تھوڑی دیر بعد اس کا دوست واپس آکر بولا۔ ''باورچی خانے میں کھانے کے لیے کچھ نہیں ہے حالانکہ والدہ کو پتا بھی تھا مگر وہ پتا نہیں پکا کر کیوں نہیں گئیں؟''

''بھائی دیکھ کچھ تو ہوگا۔''

''میں کیا جھوٹ بول رہا ہوں؟'' اس کا دوست بگڑ گیا۔ ''چل خود چل کے دیکھ لے۔''

دونوں نے اندر جاکر تلاشی لی تو کل کی بچی ہوئی آدھی روٹی دستیاب ہوئی۔ ''چلو اسے آدھا آدھا کھاتے ہیں۔ کچھ تو آسرا ہو۔'' وہ بولا مگر اس سے بھوک بجائے کم ہونے کے دوآتشہ ہوگئی۔

''چلو یار کچھ ایکسرسائز کرتے ہیں۔ اس سے بھوک کم ہوگی۔'' دوست نے مشورہ دیا۔

ان بے وقوفوں کو کیا علم تھا کہ اس سے کھایا پیا اور ہضم ہوجائے گا اور بھوک کی شدت بھی بڑھ جائے گی۔

''اچھا چل یار! میرے گھر چلتے ہیں۔ وہاں کھانا کھائیں گے۔''

''نہیں تم بیٹھو۔ میں کھانے کا انتظام کرکے ابھی آتا ہوں۔'' دوست نے کہا۔

اور وہ ایک پلیٹ ہاتھ میں لے کر باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد لوٹا تو اس کے ہاتھ میں پلیٹ، پلاؤ سے بھری ہوئی تھی۔ دونوں نے خوب مزے سے پلاؤ اڑایا اور آخری دانے تک صاف کرڈالا۔

''یہ تو بتا تو کھانا کہاں سے لے آیا؟ کیا پڑوس سے؟'' کھانا کھانے کے بعد اس نے پانی پیتے ہوئے پوچھا۔

''بس یہی سمجھ لے۔''

''کیا مطلب؟''

''تجھے کھانے سے مطلب ہے یا پوچھنے سے؟'' وہ بولا۔ ''تیرا پیٹ تو بھر گیا؟''

''مگر بتا تو سہی یہ کھانا آیا کہاں سے؟''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''مانگ کے لایا ہوں۔''

''کس سے؟''

''ایک فقیر سے۔''

''یعنی؟''

''یعنی میں نے اسے کہا۔تم! روز ہم سے مانگ کر لے جاتے ہو، آج نکالو تمہارے پاس کیا ہے؟ اس کے پاس پلاؤ کے علاوہ دوسری چیزیں بھی تھیں، پلاؤ میں لے آیا۔''

''کم بخت!'' وہ اسے مارنے کو دوڑا۔''مجھے خیرات کھلادی۔'' وہ بولا۔

''تو کیا ہوا میں نے بھی تو کھایا ہے۔''

''مگر تھا بڑے مزیدار۔'' دونوں ہنسنے لگے۔

''بچو! آؤ میں تمہیں کھانا کھلادوں۔'' اس کے دوست کی پڑوسن اندر آتے ہوئے بولی۔''تمہاری امی مجھ سے کہہ گئی تھیں کہ مجھے آنے میں دیر ہوجائے گی لہٰذا میں تمہیں کھانا کھلادوں مگر میں بھول گئی۔اب یاد آیا تو دوڑی چلی آئی۔''

''مگر ماسی! کھانا تو ہم نے کھالیا۔''

''کہاں سے؟''

وہ دونوں اسے بتانے کے بجائے زور زور سے ہنسنے لگے۔

دوسری دفعہ اس کی کالج کے دوستوں سے شرط لگ گئی کہ اگر وہ مانگ کر کھانا کھائے تو دوست اسے باری باری فلم دکھائیں گے لہٰذا کالج سے واپسی پر وہ ایک گھر کے سامنے رک گئے۔''لو بھئی! اس گھر سے کھانا مانگ کر دکھاؤ۔''

''اچھا تم لوگ یہاں سے دور چلے جاؤ!'' اس نے دوستوں سے کہا اور جب وہ لوگ کافی دور چلے گئے تو اس نے دروازے پر دستک دی۔دستک کے جواب میں ایک لڑکی نے دروازہ کھولا۔

''مجھے آپ کے گھر کھانا کھانا ہے۔'' وہ سیدھا مطلب پر آ گیا۔

''جی؟'' وہ لڑکی حیران ہوگئی۔

''جی ہاں! میں آپ کے ہاں کھانا کھانا چاہتا ہوں۔''

''کیا مطلب؟'' لڑکی بولی۔''آپ کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں اور ہمارے گھر کھانا کیوں کھانا چاہتے ہیں؟''

''کیا بات ہے؟ کون ہے دروازے پر؟'' پیچھے سے اس کی ماں نے پوچھا۔

''امی پتا نہیں کون ہے؟ کہتا ہے تمہارے گھر کھانا کھانا ہے۔ پر فقیروں جیسا لگتا تو نہیں۔''

''کیا بات ہے بھئی!'' اس کی ماں دروازے پر آ گئی۔

''بات یہ ہے خالہ!'' وہ اس کی ماں کو دیکھ کر بولا۔''میں اپنے ماں باپ کا اکلوتا ہوں۔مجھ سے پہلے بھائی بہن پیدا ہوتے ہی مرجاتے تھے۔میرے پیدا ہونے سے میری ماں کو ایک فقیر نے کہا تھا اگر تو بیس سال تک اپنے بچے کی ہر سالگرہ پر مانگ کر کھانا کھلائے گی تو وہ بچ جائے گا لہٰذا آج میری سالگرہ ہے اور مجھے مانگ کر کھانا کھانا ضروری ہے۔اگر آپ چاہتی ہیں کہ میں اگلے سال بھی زندہ رہوں تو مجھے کھانا کھلادیں۔''

''وہ رک کر اس عورت کا چہرہ دیکھنے لگا پھر اپنی بات میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ویسے یہ دن میرے لیے بڑی تکلیف کا ہوتا ہے لیکن خیرات بھی کسی انجان گھر سے مانگنا ضروری ہے۔ ہر دفعہ جی چاہتا ہے کہ بس مرجاؤں۔ایسا نہ کروں مگر پھر اپنے ماں باپ کا خیال آجاتا ہے۔''

''آجا! آجا! اندر آجا بیٹا!'' اس کی ماں نے کہا۔''میں تجھے کھانا ضرور کھلاؤں گی۔''

''میں اندر نہیں آسکتا۔'' وہ بولا۔''اس میں یہ شرط بھی ہے کہ میں کھانا باہر بیٹھ کر کھاؤں۔'' تاکہ دوستوں کو بھی نظر آجائے۔اس نے سوچا۔

سو اس نے گھر کے باہر کرسی پر بیٹھ کر بڑے مزے سے مزیدار کھانا تناول کیا اور شرط جیت گیا۔یہ الگ بات ہے کہ کچھ دنوں کے بعد جب وہ اپنی والدہ کے ہمراہ خریداری کرنے بازار آیا ہوا تھا، جہاں اس عورت سے اس کی ماں کی ملاقات ہوئی۔اس وقت تو اس کی ماں نے اس کی عزت رکھ لی مگر بعد میں وہ دھنائی ہوئی کہ وہ کافی دن اپنی چوٹیں سہلاتا رہا۔

''اب ایسی ہی کوئی ترکیب ذہن میں کیوں نہیں آرہی؟'' اس نے سوچا۔''شاید اس لیے وہ دور اور تھا۔اس میں عزت، بے عزتی کا اتنا احساس نہیں ہوتا تھا۔شرارتوں پر طبیعت خود بھی مائل رہا کرتی تھی مگر اب معمولی بات بھی بری لگتی ہے۔''

چلتے چلتے وہ ایک گلی میں مڑا اس میں شامیانہ لگا ہوا تھا۔''شاید کوئی تقریب ہے۔'' اس نے سوچا۔وہ اس گلی سے واپس مڑجانا چاہتا تھا، اسے لوگوں کی خوشیوں سے نفرت تھی۔

''جب میں ہی خوش نہیں تو دنیا کو خوش رہنے کا کیا حق ہے؟'' اس نے سوچا اس کا جی چاہا کہ شامیانے میں آگ لگا دے مگر وہ ایسا کرنا بھی چاہتا تو نہیں کرسکتا تھا۔اس کی شرافت اس کی کمزوری تھی۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''میں اتنا تو کرسکتا ہوں کہ دنیا کی خوشیوں سے دور رہوں۔ ان میں شامل نہ ہوں۔ان کے بارے میں نہ سوچوں۔'' وہ یہی سوچ رہا تھا کیونکہ ان تقاریب کو دیکھ کر اسے اپنا ماضی یاد آجاتا تھا۔

☆.....☆

شادی پر اصرار تو اس کی ماں نے اس کی نوکری لگتے ہی شروع کردیا تھا کیونکہ وہ چاہتی تھی کہ اس کے بھائیوں کی طرح اس کی بھی جلد شادی ہوجائے مگر وہ چاہتا تھا کہ کچھ رقم پس انداز کرلے تاکہ کچھ دن تو سکون سے گزر جائیں مگر ماں کے اصرار سے مجبور ہوکر اس نے شادی کے لیے ہاں کردی تھی۔اسے اندازہ تھا کہ اس کی ہاں کے بعد بھی شادی میں دو تین سال تو لگ ہی جائیں گے کیونکہ اس کے دو بھائیوں اور ایک بہن کی شادی بھی اسی طرح ہوئی کہ رشتے دیکھے اور مسترد کر دیئے پھر کہیں جاکر بڑی مشکل سے لڑکا لڑکی پسند آئے تو شادی ہوئی۔

اس نے سوچا تھا کہ پہلے تو ایک شخص کو لڑکی پسند کرنا ہوتی تھی۔اب تو ماشاء اللہ چار چار خواتین ہیں لہٰذا اتفاقِ رائے بڑی مشکل سے ہوگا اور اسے اسٹیبلش ہونے کے لیے دو تین سال مل جائیں گے مگر حیرت انگیز طور پر ان لوگوں کو پہلی ہی لڑکی اس قدر پسند آئی تھی کہ فوراً ہی منگنی کرڈالی تھی اور منگنی ہوتے ہی لڑکی والوں کے ہزار اصرار پر انہیں جلد شادی کرنا پڑی تھی اور یوں چٹ منگنی پٹ بیاہ کے مصداق چھ ماہ کے اندر ہی وہ شادی شدہ ہوگیا تھا۔

کیونکہ اس بات پر اسے شدت سے یقین تھا کہ جہاں نصیب ہو شادی وہیں ہوتی ہے لہٰذا نہ تو خود اس نے لڑکی کو دیکھا تھا بلکہ اگر گھر والوں نے فوٹو وغیرہ کے ذریعے اسے دکھانے کی کوشش بھی کی تو انہیں منع کردیا۔وہ اس سسپنس کو سہاگ رات تک برقرار رکھنا چاہتا تھا۔

سہاگ رات کو گھونگٹ اٹھاتے ہی اسے احساس ہوا اس کی بیوی اس کے گھر والوں کے بیان سے زیادہ حسین ہے۔شادی کے دو تین ماہ میں ہی اس کے طور طریقوں' محبت اور سُگھڑاپے نے اس کے گھر والوں کو تو گرویدہ کیا ہی تھا مگر اسے تو جیسے دیوانہ بناڈالا تھا۔کبھی کبھی اسے احساس ہوتا کہ جیسے اس کی بیوی کی محبت میں بناوٹ ہے۔خلوص میں کچھ کمی ہے مگر وہ اسے وہم سمجھ کر اس احساس کو جھٹک دیتا۔اس کا خیال تھا کہ حد سے زیادہ محبت بھی شکوک وشبہات کو جنم دیتی ہے شاید اسی لیے ایسا خیال اس کے ذہن میں آتا ہے۔

ساری خرابی تو اس دن سے شروع ہوئی تھی جس دن وہ کسی کام سے بازار جارہا تھا۔ایک لڑکے نے اس کا راستہ روک لیا۔

''تمہیں استاد نے بلایا ہے۔'' وہ بولا۔

''کون استاد؟''

''چلے چلو! تمہیں خود ہی پتا لگ جائے گا۔''

''مجھے نہیں جانا۔'' وہ بولا۔''میرا کسی استاد سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''جانا تو تمہیں ہے۔'' وہ بولا۔''ایسے نہیں تو ایسے سہی۔ اس نے قمیص اٹھا کر شلوار میں اڑسا ہوا ریوالور دکھایا۔''

''چلو!'' اسلحہ دیکھتے ہی وہ نرم پڑ گیا تھا۔

''سارے راستے وہ اپنے اس اچانک بلاوے کی وجہ سوچتا رہا مگر اسے دور دور تک اپنا کوئی قصور یا کسی اشارے سے اپنا تعلق یاد نہیں آرہا تھا۔اس وقت تو اسے بڑی حیرانی ہوئی جب وہ اسے اس کی سسرال کے محلے کی طرف لے چلا۔''

''شاید میرے سالوں کا کوئی مسئلہ ہو؟'' اس نے سوچا۔

''استاد بندہ آگیا ہے۔'' اس کے ساتھ آنے والے نوجوان نے آواز لگائی۔

''آؤ مسٹر مرادخاں۔''

آواز پر سر اٹھا کر دیکھا تو اسے تعجب ہوا۔اس کا خیال تھا کہ استاد کوئی ادھیڑ عمر خرانٹ سا شخص ہوگا مگر اس کے سامنے پچیس تیس سال کا خوش شکل آدمی موجود تھا۔''مجھے مودا چکری کہتے ہیں۔'' اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

''اس طرح مجھے بلانے کا مقصد؟'' اس نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نظر انداز کردیا۔

''میں تو چاہتا تھا۔تم سے شریف آدمیوں کی طرح بات کروں۔'' وہ اپنے ہاتھ نظر انداز کرنے پر بھڑک اٹھا۔''مگر تم ایسا چاہتے ہو تو ایسا ہی سہی۔'' وہ خاموش ہوگیا۔

''بات دراصل یہ ہے۔'' وہ پھر بولا۔''کہ مرادخاں تمہاری مرادوں بھرے دن گزر گئے اور نامرادی کے دن شروع ہوگئے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' وہ حیران ہوکر بولا۔

''مطلب یہ کہ میں چاہتا ہوں...تم اپنی بیوی کو طلاق دے دو۔''

''کیا؟'' وہ اس اچانک دھچکے کے لیے تیار نہ تھا۔

''مگر کیوں؟'' وہ اپنے حواس مجتمع کرتے ہوئے بولا۔

''اس لئے کہ یہ میں چاہتا ہوں۔''

''تمہارے چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟'' اسے غصہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

آ رہا تھا۔

''ہاہاہا!'' وہ ہنسا اور مڑ کر اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا۔ ''بتاؤ اوئے اسے! یہ مجھ سے پوچھتا ہے۔ میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟ اوئے وہی ہوتا ہے جو میں چاہتا ہوں اور کچھ نہیں ہوتا۔''

''مگر اس دفعہ ایسا نہیں ہوگا۔'' وہ ضبط کرتے ہوئے بولا۔

''یہ تو تمہیں پتا لگ جائے گا کہ کیا ہوگا؟'' وہ بولا۔ ''مگر میں تمہیں تین دن کی مہلت دے رہا ہوں۔ اس عرصے میں سوچ کر طلاق دے دو ورنہ۔'' وہ خاموش ہوگیا۔

''اور سنو!'' وہ وہاں سے چلنے لگا تو مودا بولا۔ ''یہ وقت صرف تمہیں فیصلہ کرنے کے لیے دے رہا ہوں، کوئی چکر چلانے کو نہیں ورنہ میرا نام بھی مودا چکری ہے اور بڑے بڑوں کو چکر دے دیتا ہوں۔ پر بتاؤ میرے ساتھ ہی چکر ہوگیا۔ واہ بھئی واہ۔'' وہ آخر میں جیسے خود کلامی کرنے لگا۔

وہاں سے واپسی پر اس نے سارا معاملہ اپنے گھر والوں کے سامنے رکھا تو وہ بھی فکرمند ہوگئے اور انہوں نے اپنی واقفیت کے تار ہلائے تو علم ہوا کہ مودا چکری سیاست دانوں کا چہیتا بدمعاش ہے لہٰذا اس کے خلاف کوئی بھی کارروائی مشکل ہے۔ اس کے صرف دو ہی حل ہیں یا تو اسے مار دیا جائے یا خود بھاگ لیا جائے۔ اسے مارنا تو ویسے بھی جوکھم کا کام نظر آ رہا تھا اور بھاگنے کی کوشش بہت مشکل تھی کیونکہ ہر وقت دو آدمی ان کے گھر کی نگرانی پر مامور تھے۔

اس معاملے کی جب مزید کرید کی گئی تو انہیں علم ہوا کہ اس کی شادی سے پہلے ہی مودے کی اس کی بیوی پر نظر تھی اور وہ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا مگر جب اسے ایک قتل کے سلسلے میں روپوش ہونا پڑا تو اس کے سسرال والوں نے موقع غنیمت جان کر لڑکی کی فوراً شادی کردی اور یہاں جیسے ہی پھر حکومت بدلی اور نیا وزیراعلیٰ آیا تو مودا چکری بڑی شان سے واپس آ گیا۔ ویسے اڑتی اڑتی یہ خبر بھی سننے میں آئی تھی کہ اس کی بیوی بھی خود مودے کی طرف ملتفت تھی مگر اس نے اسے افواہ سے زیادہ اہمیت نہ دی۔ کیونکہ پچھلے تین ماہ میں اپنی بیوی کے رویے سے وہ پوری طرح مطمئن تھا۔

ان تین دنوں میں گھر کا ماحول بڑا ٹینس تھا۔ اس کے گھر والے متفکر اِدھر اُدھر رابطے کرتے رہے کہ کسی طرح یہ مسئلہ حل ہوجائے۔ اس کی بیوی شرمندہ، خوفزدہ اور نظریں جھکائے پھرتی رہی۔ یہ نہیں تھا کہ ان کے درمیان اس مسئلے پر بات ہی نہ ہوئی ہو۔ کیونکہ اس نے پہلے ہی دن اپنی بیوی سے پوچھا تھا۔

''یہ کیا چکر ہے؟''

''وہ کمینہ مجھے آتے جاتے روکتا تھا اور مجھ سے شادی کرنے کو کہتا تھا۔ میں تو سمجھی تھی کہ اس سے میری جان چھوٹ گئی مگر!'' وہ رونے لگی۔

''تم فکر نہ کرو ابھی میں جو ہوں۔''

''آپ کیا کریں گے مجھے طلاق دے دیں گے۔''

''میں کسی قیمت پر تمہیں طلاق نہیں دوں گا۔ ہاں اگر تم خود چاہو تو۔''

''میں ایسا ہرگز نہیں چاہتی۔'' اس کی بیوی نے اس کی بات کاٹ دی۔

''تو پھر ایسا ہرگز نہیں ہوگا چاہے وہ مجھے جان سے ہی کیوں نہ مار ڈالے۔''

''میرے لیے اپنی جان سے نہ جانا۔ تمہیں مجھ جیسی اور مل جائیں گی۔''

''مجھے بزدلی کا درس مت دو۔'' وہ اس کی بات پر چڑ گیا۔

پھر اس معاملے پر ان کے درمیان کوئی بات نہ ہوئی تھی۔

تیسرے دن وہ گھر والوں کے روکنے کے باوجود گھر سے نکلا تھا اور گھر والوں کو کہیں اور کا کہہ کر سیدھے مودی چکرے کے اڈے پر جا پہنچا تھا۔

''آؤ بھئی نامراد خان!'' وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ ''لگتا ہے تم نے فیصلہ کرلیا ہے جو اتنی جلدی آ گئے ہو ورنہ تمہارے پاس شام تک کی مہلت تھی۔''

''ہاں میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ میں طلاق نہیں دوں گا۔ میں تمہیں یہی بتانے آیا تھا۔''

''اب آ ہی گئے ہو تو پھر واپس جانا بھول جاؤ۔'' وہ بولا۔ ''مودا چکری زیادہ وقت نہیں دیا کرتا۔''

''اوئے باندھ لو اسے۔'' وہ اپنے ساتھیوں سے بولا۔

اس کے ساتھیوں نے اس کی مزاحمت کے باوجود اسے باندھ لیا۔

''سنو!'' مودا بولا۔ ''میں تمہیں سیدھے سادے قتل بھی کرسکتا تھا بلکہ تمہیں ایسا غائب کرتا کہ دنیا تمہیں ڈھونڈتی رہتی مگر میرے پاس سفارش آئی ہے تمہیں جان سے نہیں مارنا اس لیے تم زندہ ہو ورنہ تمہاری بیوہ سے شادی کرنا کیا مشکل ہوتا؟ چلو اب اچھے بچوں کی طرح بیوی کو طلاق دے دو اور گھر جاؤ۔'' وہ بولا۔

''تم جو مرضی کرلو میں طلاق نہیں دوں گا۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''استاد!'' ان میں سے ایک بولا۔''طلاق کی کیا ضرورت ہے ہم لڑکی کو بھی اٹھوا لیتے ہیں۔''

''اُلو کا پٹھا!'' مودے نے اسے جھڑک دیا۔''میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ آخر شرع بھی کوئی چیز ہے؟ چلو جلدی سے اس سے طلاق کے الفاظ نکلواؤ۔''

شام تک وہ اس پر تشدد کرتے کرتے تھک گئے۔ اس کے جسم کا جوڑ جوڑ زخمی تھا۔ ناک سے نکسیر بہہ رہی تھی۔ سر پر لگنے والی ضربوں نے اس کے حواس کو ڈگمگا دیا تھا۔ پسلی میں شدید درد تھا۔ شاید ٹوٹ گئی تھی۔ ٹانگیں تو اس کی اپنی نہیں رہی تھیں مگر وہ پھر بھی طلاق دینے پر راضی نہ تھا۔ اس نے سوچا تھا''مر جائے گا مگر طلاق نہیں دے گا۔''

شام کو مودا اس کے پاس آیا اور اپنے ساتھیوں سے کہا۔''اسے چھوڑو، یہ طلاق نہیں دے گا۔ اس کی بہن کو اٹھا لاؤ اور جب تک یہ طلاق نہ دے تم موج کرو۔ طلاق دے دے تو اس کی بہن کو واپس کر دینا۔''

''نہیں۔'' وہ چیخا۔''تم ایسا نہیں کر سکتے۔''

''ہم سب کچھ کر سکتے ہیں، کون ہے ہمیں روکنے والا۔'' مودا بولا اور اپنے ساتھیوں کی طرف مڑا۔''تم لوگ ابھی تک یہیں کھڑے ہو، جاتے کیوں نہیں؟''

''ٹھہرو۔'' وہ بولا۔''میں اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہوں۔ طلاق دیتا ہوں۔ طلاق دیتا ہوں۔'' اور چکرا کر گر پڑا۔ بے ہوش ہوتے وقت اسے ایسے محسوس ہوا جیسے وہ لوگ اس سے کسی کاغذ پر دستخط کروا رہے ہوں۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اسے سالوں بعد ہوش آیا ہو اور یہ صحیح تھا کیونکہ مار پیٹ اور طلاق کے صدمے نے اس کے ہوش و حواس چھین لیے تھے اور اس کے گھر والے دو سال تک اس کا علاج کرواتے رہے تھے۔ تب جا کر وہ صحیح الدماغ ہوا تھا۔

بالکل صحیح ہونے پر اسے تمام واقعات پتا چلے تھے۔ مودے کے آدمی اسے طلاق نامے کی فوٹو کاپی کے ساتھ اس کے گھر چھوڑ گئے تھے اور اس کے واپس آنے کے دوسرے دن اس کی بیوی اپنے گھر چلی گئی تھی۔ اس کے گھر والوں کا کہنا تھا کہ وہ خود چلی گئی تھی مگر وہ سمجھتا تھا کہ اس کے گھر والوں نے ہی نفرت سے اسے نکال دیا ہوگا۔

بہر حال عدت گزارنے کے بعد مودے نے اس سے شادی کر لی تھی۔ سال بھر وہ وہاں رہے مگر بعد میں مودے کی اس سیاسی پارٹی سے اختلافات ہو گئے اور مودا اپنی بیوی سمیت وہاں سے غائب ہو گیا تھا۔ اس نے سنا تھا کہ غائب ہونے سے پہلے مودے کے گھر پر فائرنگ کا تبادلہ ہوا تھا جس میں شاید مودا بھی زخمی ہو گیا تھا۔

''میں اس حرام زادے کو اس کے کیے کا بدلہ ضرور دوں گا۔'' اس نے سوچا۔''اور وہ قتل سے کم نہ ہوگا۔''

غصے اور نفرت کے جذبات کے نہ جانے کس لمحے میں اس نے اپنے عزم کا اظہار اپنے گھر والوں سے بھی کر دیا تھا۔ لہٰذا وہ لوگ محتاط ہو گئے تھے اور اس کی نگرانی کرنے لگے تھے مگر وہ بھی اپنے عزم کا پکا تھا اور اس نے مودے کی تلاش شروع کر دی تھی۔ اس تلاش میں اسے علم ہوا کہ مودا کراچی میں نظر آیا ہے لہٰذا وہ اپنے گھر والوں کو جھانسا دے کر کراچی آ گیا مگر یہاں آنے کے دوسرے دن ہی اس کی جیب کٹ گئی۔ یہ تو اچھا تھا کہ اس نے ہوٹل کا ہفتے بھر کا کرایہ ایڈوانس دے دیا تھا ورنہ آج وہ بھوکا ہونے کے ساتھ ساتھ بے گھر بھی ہوتا حالانکہ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ گھر والوں سے پیسے منگا لے مگر وہ یہ جانتا تھا کہ انہیں جیسے ہی اس کے ٹھکانے کا علم ہوگا وہ اسے واپس لینے آ جائیں گے لہٰذا وہ خود ہی گزارہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیونکہ وہ اپنے مقصد میں ناکام ہو جانا نہیں چاہتا تھا۔

وہ اپنے خیالات میں گم وہاں سے پلٹ جانا چاہتا تھا کہ آہ و بکا کی آوازیں اسے ہوش میں لے آئیں اور وہ پلٹ پر دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا کہ شامیانے سے چند افراد کندھوں پر جنازہ اٹھائے نکل رہے ہیں۔

''کھانا۔'' اس کے ذہن میں ایک ہی لفظ آیا۔''کھانا کھانے کا یہی باعزت ایک طریقہ ہے۔ اس نے سوچا۔ کہ وہ مرحوم کا دوست ساتھی یا رشتے دار کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

اور مرحوم کو دفنانے کے بعد کھانا تو ہوتا ہے لہٰذا اس کا حصہ بھی بن جائے گا۔ اس نے فوراً جنازے کی طرف قدم بڑھائے۔ اسے چہرے پر سوگواری یا حزن و ملال کی کیفیت طاری کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑی کیونکہ شکل سے وہ فاقہ زدہ کم اور غم زدہ زیادہ نظر آ رہا تھا۔

جنازے میں بمشکل پچیس افراد تھے۔ سوگواروں کے قافلے میں وہ بھی شامل ہو گیا۔''لاؤ جنازے کو کندھا ہی دے دوں۔'' اس نے سوچا۔''کھانا کھانا ہے مزدوری کر کے اسے حلال تو کر لوں۔''

وہ آگے بڑھا اور کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے جنازے کی چارپائی کا ایک پایا اپنے کندھے پر رکھ لیا۔ یا تو مرحوم بہت بھاری تھا یا اسے کمزوری کی وجہ سے وزن زیادہ لگ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

رہا تھا۔ ''خیر کوئی بات نہیں۔'' اس نے سوچا۔ ''ابھی کوئی اور کندھا بٹانے آجائے گا۔'' مگر جب کافی دیر ہوگئی اور کوئی اس کا بوجھ ہلکا کرنے نہیں آیا تو اسے کمزوری کی وجہ سے اس کا وزن اٹھانا مشکل تر ہوتا گیا۔ اس کا جی چاہا کہ اس جنازے کو نیچے رکھوائے اور لوگوں سے پوچھے۔ ''کیا اس کمبخت کو میں نے مارا ہے۔'' مگر وہ حوصلہ کر کے قدم بڑھاتا گیا۔ قبل اس کے کہ اس کے قدم لڑکھڑاتے اور وہ گر پڑتا ایک صاحب نے آگے بڑھ کر اس کا بوجھ ہلکا کر دیا۔

''میری توبہ۔'' اس نے سوچا۔ ''جواب اسے دوبارہ کندھا دوں۔''

جنازے کے ساتھ مسجد میں داخل ہوتے ہی وہ سیدھا وضو خانے چلا گیا۔ اس کی بھوک بڑھ گئی تھی چنانچہ وضو کے بعد اس نے اتنا پانی پیا جس سے بھوک کا احساس کافی کم ہوگیا۔

امام صاحب نے نماز عصر کے بعد نماز جنازہ پڑھائی مگر اس سے پہلے انہوں نے اعلان کیا نماز عصر کے بعد نماز جنازہ ہوگی اور ایک نکاح بھی پڑھایا جائے گا لہٰذا نمازیوں سے درخواست ہے' دونوں میں شرکت کریں بلکہ جو لوگ نکاح کے لیے رکنا چاہیں رک جائیں اور جو لوگ جنازے کے ساتھ جانا چاہیں وہ جائیں۔ دونوں ہی ثواب کے کام ہیں۔

''اللہ مغفرت کرے مرحوم بھی عجب فسادی شخص تھا۔ مرنے کے بعد بھی لوگوں کی زندگی میں بدشگونی کرنے سے باز نہ رہا۔'' اس نے سوچا۔ ''اب جس کا نکاح پڑھایا جائے گا اس کی ازدواجی زندگی اگر خوشگوار نہ گزری تو وہ یہ ضرور کہے گا کہ پہلے ہی بدشگونی ہوگئی تھی۔ ہم خوش کیسے رہتے۔''

ہوسکتا ہے وہ اس کا الزام بھی بیوی پر رکھ دے اور کہے۔ ''مجھے تو پہلے ہی دن اشارہ ملا تھا کہ میں یہ شادی نہ کروں۔ میں خوش نہیں رہوں گا مگر میں پھنس ہی گیا۔''

''تو کیوں کرلی۔'' بیوی کہے گی۔ ''میرے تو اور بھی بہت رشتے آئے تھے۔ تم سے شادی کر کے تو میری قسمت ہی پھوٹ گئی۔''

امام صاحب کی تکبیر سن کر اسے ہوش آیا۔ اور اس نے جلدی سے نیت کر کے تکبیر پڑھ کر ہاتھ باندھ لیے نماز پڑھنے میں اسے ذرا بھی مزہ نہیں آیا۔ اس کے خیالات روٹی کے گرد چکراتے رہے اور وہ سوچتا رہا کہ امام صاحب خوا مخواہ نماز لمبی کرتے جارہے ہیں۔ اسے اپنی زندگی کی یہ طویل ترین نماز لگی۔ بلکہ نماز جنازہ کے بعد امام صاحب کی لمبی دعا بھی اسے ناگوار گزر رہی تھی کیونکہ بھوک کے ساتھ اسے اب پیشاب کی حاجت بھی ہو رہی تھی۔ اتنا پانی جو پیا تھا اس نے آخر کام تو دکھانا ہی تھا۔

دعا ختم ہوتے ہی لوگ مرحوم کا چہرہ دیکھنے اور جنازہ اٹھانے کو چلے اور وہ پیشاب سے فراغت حاصل کرنے بھاگا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر دیر ہوئی تو لوگ جنازہ لے کر چلے جائیں گے اور وہ رہ جائے گا لہٰذا فوراً ہی واپس آگیا۔

قبرستان میں میت کو قبر میں اتارنے کے بعد جب لوگ مرحوم کا آخری دیدار کر رہے تھے تو اسے اس میں دلچسپی نہ تھی مگر پھر بھی اس نے سوچا۔ ''لاؤ میں بھی مرحوم کی شکل دیکھ لوں۔ آخر اس کی کمائی کھانا ہے۔''

وہ آگے بڑھا تو اس نے دیکھا کہ گورکن نے دو تازہ قبریں تیار کی ہیں اور وقت اور پیسا بچانے کی خاطر درمیان کی دیوار ساجھی رکھی ہے۔

''یہ دوسری کس کی ہے؟'' اس نے قریب کھڑے ہوئے فرد سے پوچھا۔

''کسی خاتون کی ہے ان کا جنازہ بھی ابھی آئے گا۔'' وہ بولا۔

''واہ بڑی موج ہے۔ کیا بات ہے اللہ میاں تمہاری۔'' اس نے جی سے سوچا۔ ''اسے مرنے کے بعد بھی پڑوسن دے دی اور مجھ سے دی ہوئی بھی چھین لی۔''

اس کے آگے کھڑے ہوئے شخص نے سائیڈ میں ہو کر اسے بھی مرحوم کا آخری دیدار کرنے کا موقع دیا تھا۔ وہ آگے بڑھا اور جیسے ہی اس کی نظر مرحوم کے چہرے پر پڑی اسے جیسے شاک لگ گیا۔

''یہ تو وہی موداچکری تھا۔ جاتے جاتے بھی چکر دے گیا!'' اسے جیسے اس کی سرگوشی سنائی دی۔ وہ چکرا کر بیٹھ گیا۔

''صبر کرو صبر کرو۔'' پیچھے سے آنے والے صاحب اسے تھامتے ہوئے بولے۔ ''اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

ایک اور صاحب نے اسے سہارا دے کر پیچھے ہٹالیا۔

وہ وہاں سے ہٹ تو آیا مگر اس کا دل و دماغ وہاں ٹھہرنے کو نہیں چاہ رہا تھا وہ تو بس چاہ رہا تھا کہ فوراً اسی وقت ''پالیا..... پالیا'' کی گردان کرتا ہوا واپس اسی گلی میں جائے اور اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑے۔ اسے بتائے کہ اب دونے دھونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مودا چکری اپنے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

چکروں کا نتیجہ بھگتنے اللہ میاں کے پاس چلا گیا ہے اور میں واپس آ گیا ہوں۔ اب ہمارے درمیان جدائیاں ڈالنے والا زبردستی طلاق دلوانے والا کوئی نہیں ہے۔ تم اب بھی میری بیوی ہو کیونکہ زبردستی کی طلاق، طلاق نہیں ہوتی اور اس کے بعد سیدھا اسے واپس اپنے گھر لے جائے۔

اسے لوگوں پر غصہ آ رہا تھا کہ وہ اس شخص کو دفن کرنے میں اتنی دیر کیوں لگا رہے ہیں۔ جلدی جلدی مٹی ڈال کر گڑھا کیوں نہیں بھر دیتے۔ یہ شخص تھا ہی قابل۔

''وہ تو برا تھا تو کیوں برا بن رہا ہے۔'' اس نے سوچا۔

قبرستان سے واپسی پر وہ سیدھے وہیں آئے تھے۔ وہ بھی لوگوں کے ہمراہ باہر بچھی ہوئی دریوں پر بیٹھ گیا تھا۔

وہاں بیٹھ کر اس نے سوچا۔ ''حیرت کی بات ہے کہ نہ تو مجھے جنازے میں اور نہ یہاں اپنی بیوی کا کوئی رشتے دار یا میرا کوئی جاننے والا نظر آیا۔ کیا ان لوگوں کو اطلاع نہیں ہوئی ہوگی؟''

''تو بھی پاگل ہے۔'' اس نے سوچا۔ ''یہ تو ویسے ہی حکومت بدلنے پر روپوش تھا۔ حکومت نے اس کے سر پر انعام مقرر کیا ہوا تھا تو پھر رشتے داروں کے آنے کا سوال کہاں سے پیدا ہوتا ہے۔ ایسے شخص کا یہی انجام ہوتا ہے۔''

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ لوگ کھانے کا انتظام کرنے میں مشغول تھے۔ نیچے فرشی دسترخوان لگا کر پلیٹیں لگا دی گئی تھیں اور درمیان میں قابوں میں چنے کا پلاؤ رکھا جا رہا تھا۔

''اس کے پڑوسی بڑے اچھے ہیں۔'' اس نے سوچا۔ ویسے اسے اب حیرت ہو رہی تھی کہ کھانا دیکھ کر اشتہا بڑھنے کی بجائے بھوک کا احساس جیسے یکدم ختم ہو گیا تھا۔ لوگ باگ پلیٹوں میں کھانا نکالنا شروع ہو گئے تھے اور وہ یونہی بیٹھا ہوا تھا کیونکہ اب کھانے کی بجائے اس کی توجہ اندر کی جانب تھی۔ رونے اور بین کرنے کی آوازیں جو شاید وہ عام حالات میں سنتا بھی نہیں اب اس کے دل کو تکلیف پہنچا رہی تھیں کیونکہ ان میں نمایاں آواز ایک ہی جسے وہ شناخت کر رہا تھا اور جو سیدھی اس کے دل میں چبھ رہی تھی۔ وہ روتے روتے کچھ کہہ بھی رہی تھی مگر دوری کی وجہ سے الفاظ اس کی سمجھ نہ آ رہے تھے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اٹھ کر اندر چلا جائے۔ اس تسلی دے۔ اسے خاموش کرائے۔ اسے سمجھائے اور کہے کہ یہ رونے کا نہیں خوشی کا مقام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک ظالم سے نجات دلا دی مگر وہ فی الحال ایسا نہیں کر سکتا تھا۔

''ارے صاحب! بسم اللہ کریں، کھانا کھالیں۔'' ایک صاحب نے اسے یوں گم صم بیٹھے دیکھ کر کہا۔ ان صاحب کے بلانے پر اسے ہوش آیا۔ اور اس نے بڑی بے دلی سے چند نوالے اپنی پلیٹ میں ڈال لیے۔

ابھی وہ کھانا شروع ہی کرنے والا تھا کہ ایک صاحب اس کے ساتھ کھانے میں شریک ہو گئے اور اس کا لقمہ اٹھانے سے پہلے ہی انہوں نے اس کی پلیٹ میں کھانا شروع کر دیا۔ اس کا بڑھا ہوا ہاتھ رک گیا اور اس نے پلیٹ ان کی طرف سرکا دی، اسے جھوٹن کھانے سے چڑ تھی۔ وہ اپنی پلیٹ میں کسی کو شریک کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ صاحب شرمندہ سے ہو گئے اور انہوں نے کہا۔ ''آپ ہی کھالیں میں اور لے لوں گا۔''

''نہیں۔'' وہ بولا۔ ''اب آپ لے لیں۔ میں جھوٹا نہیں کھاتا۔''

اس نے اپنے لیے ایک اور پلیٹ میں چاول نکال لیے ابھی اس نے پہلا لقمہ ہی اٹھایا تھا کہ اندر سے روتی ہوئی بین کرتی ہوئی اس کی بیوی اچانک باہر نکل آئی اس کے پیچھے چند عورتیں بھی آ گئیں۔

''ہائے مجھے اکیلا کیوں چھوڑ گیا۔ لوگو مجھے اس کے ساتھ ہی دفنا دو۔ اب میں اکیلی رہ کر کیا کروں گی۔ کیا فائدہ اس زندگی کا۔'' وہ بین کرتی ہوئی دیواروں سے سر ٹکرا رہی تھی اور پیچھے سے آنے والی عورتیں اسے پکڑنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اس کوشش میں ایک زوردار جھٹکا لگا تو وہ سیدھی ہونے کی کوشش میں بالکل اس کے نزدیک آ گری۔

اس کے تو دل کی خواہش پوری ہو گئی تھی۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا۔ اسے اٹھایا۔ اسے اٹھاتے وقت اس کی بیوی نے اسے دیکھا۔ جب دونوں کی نظریں ملیں تو وہ ایک لمحے کو ساکت سی ہو گئی۔ وہ یکدم پیچھے ہٹ گیا اور عورتیں اسے سنبھال کر اندر لے گئیں۔ وہی ایک لمحہ اس کے بھی ادراک کا تھا۔

''تو یہ بات تھی۔'' اس نے سوچا یہ خود ہی مجھ سے طلاق لینا چاہ رہی تھی۔

اب اس کی سمجھ میں آ گیا کہ کس کی خواہش پر مودے نے اسے زندہ رکھا تھا۔

''میں بھی کتنا پاگل ہوں۔ جھوٹن کھانے جا رہا تھا۔'' اس نے سوچا اور ہاتھ میں پکڑا ہوا لقمہ پلیٹ میں رکھ کر دھیمے قدموں سے واپس ہو گیا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

سوناڈبل

جناب مدیر
السلام علیکم
پنجاب کے دیہی علاقوں میں نوسر بازوں کی کمی نہیں ہے۔ یہ سرگزشت عذرا کی ہے۔ وہ کس طرح نوسر بازوں کے ہتھے چڑھی میں نے کھل کر بیان کیا ہے تاکہ کوئی دوسرا نوسر باز کسی اور کو بے وقوف نہ بنا دے۔

عاطر شاہین
(ملتان)

انعام اور عذرا کی شادی کو دو سال ہو گئے تھے۔ یہ ان کی پسند کی شادی تھی لیکن ابھی کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ انعام کے والدین وفات پا چکے تھے۔ اس لیے عذرا دن میں اکیلی ہوتی تھی۔

انعام ایک فیکٹری میں ملازمت کرتا تھا۔ وہ صبح آٹھ بجے جاتا تھا اور اس کی واپسی شام چھ بجے ہوتی تھی۔ اس نے بیوی کو سختی سے ہدایت کی ہوئی تھی کہ وہ اس کی غیر موجودگی میں سوائے اپنے گھر والوں کے اور کسی کو اندر نہ آنے دے۔ آج

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کل حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ وہ اس کی ہدایت پر عمل کرتی تھی۔ انعام فیکٹری جانے سے پہلے عذرا کو سبزی وغیرہ خرید کر دے جاتا تھا۔

ایک دن عذرا رات کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی۔ گرمیوں کے دن تھے اور شام کے پانچ بج رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی، وہ چونک اٹھی۔ اس نے سمجھا کہ انعام آ گیا ہے لہٰذا وہ کچن سے نکل کر دروازے کی طرف بڑھی۔

''کون ہے۔'' اس نے دروازے کے قریب جا کر پوچھا۔

''باجی۔ مجھے پیاس لگی ہے۔ کیا پانی مل سکتا ہے۔'' دوسری طرف سے کسی لڑکی کی آواز سنائی دی تو عذرا چونک پڑی اور وہ سوچنے لگی کہ وہ کیا کرے کیونکہ انعام نے اسے سختی سے منع کیا ہوا تھا کہ وہ اس کی غیر موجودگی میں کسی کو بھی گھر میں نہ آنے دے۔

''باجی۔ مجھے پیاس لگی ہے۔ مہربانی کر کے پانی پلا دیں۔ دعائیں دوں گی۔'' ایک بار پھر دروازے پر موجود لڑکی کی آواز سنائی دی۔ ''تمہارا احسان ہوگا باجی۔''

''تم کسی اور گھر میں جا کر پانی پی لو۔'' عذرا نے کہا۔

''باجی۔ میں نے اور گھروں کے دروازے بھی کھٹکھٹائے ہیں لیکن کوئی دروازہ نہیں کھول رہا۔'' لڑکی نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم اتنی سنگدل ہو کہ ایک گلاس پانی بھی نہیں پلا سکتیں۔ میرا حلق خشک ہو رہا ہے اور میں بے ہوش ہونے والی ہوں۔''

عذرا کو اس پر ترس آ گیا کیونکہ وہ سادہ لوح لڑکی تھی۔ اس نے سوچا کہ پانی پلانے میں کیا حرج ہے چنانچہ اس نے دروازہ کھول دیا۔ اس کے سامنے ایک نوجوان اور حسین لڑکی کھڑی تھی۔ اس نے گلابی رنگ کا سوٹ پہنا ہوا تھا اور سفید رنگ کی چادر اوڑھے ہوئی تھی۔ اس کی عمر بائیس تیئیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اس نے اپنا چہرہ ڈھانپا ہوا نہیں تھا۔

''آ جاؤ۔ اندر آ جاؤ۔'' عذرا نے اس لڑکی سے کہا تو وہ اندر داخل ہو گئی۔ عذرا نے دروازہ بند کیا اور اسے لیے ہوئے صحن میں آ گئی۔

''بیٹھو۔ میں تمہارے لیے پانی لے آتی ہوں۔'' عذرا نے لڑکی سے کہا تو لڑکی ایک کرسی پر بیٹھ گئی جبکہ عذرا کچن کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے فریج کھول کر ٹھنڈے پانی کی ایک بوتل نکالی اور گلاس اٹھا کر وہ صحن میں آ گئی۔ اس نے گلاس بھر کر لڑکی کو دیا تو لڑکی پانی غٹاغٹ پی گئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کئی دنوں سے پیاسی ہو۔

''باجی۔ ایک گلاس اور دے دو۔'' لڑکی نے کہا تو عذرا نے گلاس میں مزید پانی بھر دیا جسے وہ ایک ہی سانس میں پی گئی۔

''بہت بہت شکریہ باجی۔ اللہ تمہیں اس نیکی کی جزا دے گا۔'' لڑکی نے گلاس قریبی میز پر رکھتے ہوئے ممنون لہجے میں کہا۔

''تمہارا نام کیا ہے اور کہاں رہتی ہو؟'' عذرا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''باجی۔ میرا نام کرن ہے اور میں حیدر کالونی میں رہتی ہوں۔ میں اپنے بچے کے کپڑے خریدنے بازار گئی تھی اور اب میں گھر جا رہی تھی کہ مجھے شدید پیاس لگ گئی۔'' لڑکی نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''میں نے چند گھروں کے دروازے کھٹکھٹائے لیکن مجال ہے کسی نے دروازہ کھولا ہو۔ تم بہت اچھی ہو باجی کہ تم نے مجھے پانی پلا دیا ہے۔''

''آج کل حالات خراب ہیں اس لیے کوئی بھی اپنے گھر کا دروازہ نہیں کھولتا۔'' عذرا نے کہا۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو باجی۔'' کرن نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے گھر کا جائزہ لیا۔ ''ماشاء اللہ تمہارا گھر تو بہت خوبصورت ہے باجی۔ تمہارے میاں کیا کام کرتے ہیں۔''

''میرے میاں ایک فیکٹری میں ملازمت کرتے ہیں۔'' عذرا نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''اور تمہارے میاں کیا کرتے ہیں۔''

''میرا میاں کچھ بھی نہیں کرتا۔'' عذرا نے جواب دیا۔ ''وہ سارا دن گھر پر پڑا چارپائی توڑتا رہتا ہے۔ باجی، تمہاری شادی کو کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟''

''دو سال ہو گئے ہیں۔'' عذرا نے بتایا۔

''باجی۔ کیا تمہارے پاس سونا بھی ہے؟'' کرن نے کہا تو عذرا بے اختیار چونک پڑی اور اس کے دل میں طرح طرح کے خیالات آنے لگے۔

''ہاں ہے۔ لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو؟'' عذرا نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''باجی۔ پریشان نہ ہوں۔ میں نہ ٹھگی ہوں اور نہ ہی چور اچکی۔'' کرن نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''دراصل میرے پاس ایسا فن ہے کہ میں سونا ڈبل کر سکتی ہوں۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

عذرا حیرت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''کیا مطلب۔ تم سونا ڈبل کیسے کر سکتی ہو۔ کیا تمہیں جادو آتا ہے؟'' عذرا نے اس بار دلچسپی سے پوچھا۔ اب اس کے دل میں لالچ پیدا ہو گیا تھا۔

''نہیں۔ میں جادوگر نہیں ہوں۔'' کرن نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''مگر میرے پاس ایسا فن ہے کہ میں سونا ڈبل کر سکتی ہوں۔ مثلاً اگر تمہارے پاس پانچ تولے سونا ہے تو میں اسے دس تولے کر سکتی ہوں۔''

عذرا حیرت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر اس کا سونا ڈبل ہو جائے تو اس کے وارے نیارے ہو جائیں گے۔ وہ ضعیف الاعتقاد لڑکی تھی اور ایسی باتوں پر یقین رکھتی تھی۔ وہ یہ بھی سوچ رہی تھی کہ جب وہ انعام کو بتائے گی تو وہ بھی خوش ہو جائے گا۔

''کیا تم سچ کہہ رہی ہو؟'' عذرا نے یقین نہ آنے والے لہجے میں کہا۔ ''کہیں میرے ساتھ فراڈ تو نہیں کر رہی؟''

''باجی۔ اگر تمہیں یقین نہیں ہے تو بے شک سونا نہ لاؤ۔'' کرن نے اس بار ناراض لہجے میں کہا۔ ''اچھا، میں اب چلتی ہوں۔''

''ارے ارے ٹھہرو۔'' عذرا نے اسے اٹھتے دیکھ کر جلدی سے کہا۔ ''میں تو ویسے ہی پوچھ رہی تھی۔ تم تو ناراض ہی ہو گئی۔''

''باجی۔ میں اب تک کئی لوگوں کے سونے ڈبل کر چکی ہوں۔'' کرن نے کہا۔ ''اگر یقین نہ آئے تو تم میرے ساتھ چلو، میں تمہیں کئی ایسے لوگوں سے ملواتی ہوں جو اس وقت مالا مال ہو چکے ہیں۔ کئی تو ایسے ہیں جن کے پاس پچاس پچاس تولے سونا تھا اور میں نے ڈبل کر کے سو، سو تولے کر دیا ہے۔ آج وہ بڑی بڑی کوٹھیوں، بینک بیلنس اور کئی گاڑیوں کے مالک ہیں۔''

کرن کی باتیں سن کر عذرا کے دل میں بھی لالچ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چمک ابھر آئی تھی۔ اس کی بھی خواہش تھی کہ ان کے پاس ایک خوبصورت گاڑی ہو جس میں بیٹھ کر وہ روز شام کو سیر سپاٹے کرنے جائیں۔ انعام کے پاس ایک موٹر سائیکل تھی وہ بھی پرانی۔

''اب کیا سوچ رہی ہو باجی۔'' اچانک عذرا کی سماعت سے کرن کی آواز ٹکرائی تو وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''کچھ نہیں۔'' عذرا نے کہا۔ ''ٹھیک ہے میں تم پر یقین کر لیتی ہوں۔''

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ

(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 8,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: ثمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 021-35895313 فیکس: 021-35802551

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''باجی۔ میں تمہیں یہ بھی بتادوں کہ میں سونا ڈبل کرنے کی فیس بھی لیتی ہوں۔'' کرن نے کہا۔

''کتنی فیس لیتی ہو؟'' عذرا نے پوچھا۔

''فی تولہ دس ہزار روپے۔'' کرن نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''فی تولہ دس ہزار روپے۔'' عذرا نے کہا۔ ''لیکن میرے پاس تو اتنے پیسے نہیں ہیں۔ میں تو ایک تولے کا دو ہزار روپے دے سکتی ہوں۔'' عذرا نے کہا۔ ''میرے پاس صرف پانچ تولے سونا ہے۔ میں تمہیں دس ہزار روپے دے سکتی ہوں۔''

''باجی۔ دس ہزار تو تھوڑے ہیں۔ تم تو جانتی ہو کہ مہنگائی کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔'' کرن نے کہا۔ ''چونکہ تم نے مجھے پانی پلایا ہے اس لیے میں تمہاری بات مان لیتی ہوں۔ تم سونا اور پیسے لے آؤ، میں اپنا کام کروں اور یہاں سے جاؤں۔''

''شکریہ۔'' عذرا نے مسرت بھرے لہجے میں کہا۔ پھر وہ اٹھی اور تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک زیورات والا سرخ ڈبہ تھا۔ اس نے ڈبہ کرن کے سامنے رکھ کر کھول دیا تو اس میں زیورات موجود تھے۔

''یہ ہے میرا سونا۔'' عذرا نے کہا۔ ''اب تم اسے ڈبل کر دو۔ اور ہاں جلدی کرو۔ میرا شوہر بھی آنے ہی والا ہوگا۔''

''باجی۔ میرا اصول ہے کہ میں عمل کرنے سے پہلے پیسے لیتی ہوں۔'' کرن نے کہا۔ ''اس لیے تم پہلے پیسے دو۔''

''میں پیسے بھی لائی ہوں۔'' عذرا نے کہا اور پھر اس نے اپنی مٹھی میں دبے روپے اسے دے دیئے۔ کرن نے عذرا سے پیسے لیے اور گن کر اپنے پرس میں رکھ لیے۔

''باجی۔ تم اپنی آنکھیں بند کرلو۔'' کرن نے کہا تو عذرا بے اختیار چونک پڑی۔

''کیا مطلب۔ میں اپنی آنکھیں کیوں بند کرلوں؟'' عذرا کے لہجے میں حیرت تھی اور ایک بار پھر وہ شاکی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''باجی۔ میں تمہارے سامنے یہ عمل نہیں کرسکتی۔ یہ اصول ہے۔'' کرن نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم سونے کو دیکھتی رہی تو سونا کبھی ڈبل نہیں ہوگا۔''

''اوہ ٹھیک ہے۔ میں آنکھیں بند کرلیتی ہوں۔'' عذرا نے کہا اور پھر اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ جیسے ہی اس نے آنکھیں بند کیں تو کرن نے بجلی کی سی تیزی سے اپنے پرس میں سے پلاسٹک کی ایک چھوٹی سی بوتل نکالی اور اس کا رخ عذرا کے چہرے کی طرف کرکے اسپرے کیا تو عذرا نے بے اختیار آنکھیں کھولیں مگر دوسرے ہی لمحے اسے اپنا دماغ گھومتا ہوا محسوس ہوا پھر تاریکی چھا گئی۔ وہ لہرائی اور کرسی پر ڈھیر ہو گئی۔ اس کی گردن دائیں طرف ڈھلک گئی تھی۔ کرن نے بوتل واپس اپنے پرس میں رکھی اور پھر جلدی جلدی سے ڈبے سے سارا زیور نکال کر اپنے پرس میں ڈالا اور اٹھ کر گھر سے باہر چلی گئی۔

شام چھ بجے انعام فیکٹری سے گھر آیا تو وہ بیرونی دروازہ کھلا دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے موٹر سائیکل دروازے کے پاس کھڑی کرکے لاک کی اور گھر میں داخل ہو گیا۔ اس کی نظر جیسے ہی صحن میں کرسی پر بے ہوش پڑی عذرا اور میز پر رکھے زیورات والے ڈبے پر پڑی تو وہ بے اختیار چونک پڑا۔ وہ جلدی سے آگے بڑھا اور عذرا کو ہوش میں لانے لگا۔ جلد ہی عذرا ہوش میں آگئی۔ اس نے انعام کو دیکھا تو وہ ہذیانی انداز میں چیخنے لگی۔

''کیا ہو گیا ہے عذرا۔'' انعام نے اسے سنبھالتے ہوئے کہا۔

''میں لٹ گئی۔ میں لٹ گئی ہوں انعام۔'' عذرا نے روتے ہوئے کہا۔

''ہوا کیا۔ کچھ بتاؤ گی بھی۔'' انعام نے جھنجلا کر کہا تو عذرا نے ساری بات اسے بتادی۔ انعام اپنا سر پکڑ کر رہ گیا۔

''عذرا۔ تم کس دنیا میں رہتی ہو۔ تم پڑھی لکھی ہو کر ایسی باتوں پر یقین رکھتی ہو۔'' انعام نے کہا۔ ''کیا آج کے سائنسی دور میں ایسا ممکن ہے کہ سونا ڈبل کردیا جائے۔ میں نے تمہیں کہا بھی تھا کہ گھر میں اپنے گھر والوں کے سوا کسی کو مت آنے دینا۔ پورے ملک میں ایسے کئی گروہ متحرک ہیں جو سادہ لوح اور ضعیف الاعتقاد عورتوں کو بے وقوف بنا کر لوٹ لیتے ہیں۔ یہ لوگ پانی پینے کے بہانے گھروں میں داخل ہوتے ہیں اور اپنی چکنی چپڑی باتوں سے مکین کو پھانس لیتے ہیں۔ جو سمجھ دار ہوتے ہیں وہ ان کی باتوں میں نہیں آتے مگر تم جیسی لڑکیاں ان باتوں پر یقین رکھتی ہیں وہ ان کے جھانسے میں آجاتی ہیں۔''

عذرا نے انعام کی باتوں کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ تو اپنے کیے پر نادم تھی اور اس لڑکی کو کوس رہی تھی جس نے اسے بے وقوف بنا کر لوٹ لیا تھا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ادھورا رشتہ

جناب ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم
ایک دکھی عورت کی خود بیتی ارسالِ خدمت ہے۔ ایک ایسی عورت کی روداد جو ایک ادھورے رشتے کو نبھا رہی ہے۔

وسیم بن اشرف
(ملتان)

''تم میری کہانی کب لکھو گے۔'' متعدد بار اس نے مجھ سے پوچھا تھا، لیکن میں ہر بار ٹال جاتا لیکن وہ بھی ٹالے نہ ٹلتی تھی۔ منہ بناتی اور کبھی ماتھے پر تیوریاں ڈال کر چلی جاتی پھر جب ملتی تو وہی شکوہ ہوتا کہ میں اس کی بات کو اہمیت نہیں دے رہا، ایک دن تو اس نے میرے خوب لتے لیے اور بولی۔

''اگر لکھنی ہے تو لکھو میں بار بار نہیں کہوں گی۔ اس لیے کہ مجھے خبر ہے تم بہت جلد پاکستان جاؤ گے۔''

آج تو اس کے بیٹے کی سالگرہ تھی۔ جب میں اس کو

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

مبارک باد دے رہا تھا تو اس نے بھری محفل میں پھر اپنا سوال دہرا دیا۔ ''میری کہانی کب لکھو گے۔''

مجھے کوئی جواب نہ سوجھا، میں نے لمحہ بھر سوچا اور کہا ''شاہین مجھے نہیں پتا کہ تم پر کیا بیتی ہے، میں سب کچھ نہیں جانتا، تمہاری کہانی کا آغاز تو کرلوں گا مگر ختم کہاں کروں گا؟ اور مجھے.....''

اس نے مجھے ٹوکا اور آنکھیں مٹکاتے ہوئے بولی ''دیکھ بھائی! مجھ جیسی عورتوں کی کہانیاں کبھی ختم نہیں ہوتیں، شروع ہوتی ہیں اور پھر چلتی رہتی ہیں، اس جیسی لاتعداد آپ بیتیاں ہوں گی، ایسی آپ بیتیوں کا کوئی اختتام ہوتا ہے نہ انجام۔''

اس نے مجھے مخمصے میں ڈال دیا، ''پھر بھی جب تک تمام حالات کا علم نہ ہو تو خدشہ رہتا ہے کہ قلم سے کوئی ایسی ویسی بات نہ نکل جائے، شاید تمہیں میری یہ بات بری لگے لیکن حقیقت یہی ہے'' میں نے جواب دیا۔

''اس میں برا لگنے والی کون سی بات ہے اور میں کون سی نیک پروین ہوں، جو مجھ پر گزری، جو میں نے کیا وہی کچھ لکھ دو۔''

''لیکن مجھے تمہارا پورا سچ نہیں پتا۔''

''اچھا تو آج تم نہ جاؤ۔ یہیں رُک جاؤ، آج سب بتاؤں گی۔'' اس نے حکم صادر کیا اور پارٹی میں مصروف ہوگئی۔

''نصف شب تک خوب ہلا گلا رہا، 12 بجے کے بعد وہ فارغ ہو کر صوفہ پر پھیل کر لیٹ گئی اور اپنے خوبصورت کالے لمبے بال کھول لیے، میں نے دیکھا لال رنگ کی قمیص اور شلوار اس کے سرخ گالوں کے ساتھ کتنی میچ کر رہی تھی، لگتا تھا اس کے کپڑوں کا رنگ اس کے سرخ گلابی چہرے پر اتر آیا ہے یا پھر چہرے کے رنگ نے اس کے کپڑے رنگ دیئے ہیں، گلے میں مصنوعی موتیوں کی مالا اس کی صراحی دار گردن سے لپٹی سچے موتیوں کی مالا لگ رہی تھی، لمبے لمبے ہاتھ پاؤں، لمبا قد، یوں لگ رہا تھا جیسے میرے سامنے کوئی اپسرا بیٹھی ہے، میں مبہوت رہ گیا، کتنی خوبصورت تھی وہ، پتا نہیں کیوں اسے دیکھ کر مجھے تاج محل یاد آ گیا، شاید وہ مجھے تاج محل جتنی ہی خوبصورت اور اداس لگی تھی۔''

''کہاں گم ہو گئے ہو۔'' اس نے میرے خیالات کی مالا توڑ دی۔

''تمہارے حسن کا جلوہ دیکھ رہا تھا، آفتاب ہو، مہتاب ہو، کسی شاعر کا خواب ہو، تم کتنی لاجواب ہو، جی چاہتا ہے تمہیں دیکھتا رہوں، یہ حسن جہاں سوز، جی چاہتا ہے تمہیں تکتا رہوں۔'' میرا جواب سن کر وہ کھلکھلا اٹھی ہنسی تو اس کے دانت موتیوں کی طرح چمک اٹھے۔

''میری کہانی بھی سنو گے یا مجھے دیکھتے رہو گے۔'' وہ مسکرائی۔

''ہاں شروع کرو۔''

''معلوم نہیں کہ مجھ پر جو بیتی اس کا آغاز کہاں سے کروں، نہ ہی زندگی کا پہلا باب یاد ہے اور نہ ہی آغاز کا اتا پتا، ہاں اتنا یاد ہے کہ میں ایک ٹوٹے ہوئے گھر میں پیدا ہوئی تھی۔''

''ٹوٹے ہوئے گھر میں؟ میں نے استفسار کیا۔

اس نے نیم کھلی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ ''ہاں! امی اور ابو کی آپس میں بنتی نہیں تھی، شاید میری عمر اس وقت 10 برس ہوگی جب ہم اسلام آباد سے انگلینڈ چلے گئے، میں نے کچھ سال تو اسلام آباد کے ایک اچھے نجی سکول میں پڑھا تھا اور پھر گوروں کے دیس میں جا کر تعلیم مکمل کی، میں آج تک نہ جان پائی کہ پپا کو انگلینڈ جانے کی کیا سوجھی تھی! پپا اور مما دونوں ملازمت کرتے تھے، پپا فیکٹری سے جو بھی کما کر لاتے وہ شراب اور گوریوں پر اڑا دیتے، ممی ڈیڈی کی گالیاں بھی کھاتی اور گھر کا خرچا بھی چلاتیں، بہانے بہانے سے ڈیڈ مما کو روز ہی پیٹتے، اس کے باوجود مما ڈیڈی کو کسی طور پر بھی چھوڑنے پر تیار نہ تھیں جب کہ وہاں کا قانون بھی ان کا مددگار تھا۔''

''میں نے کئی بار ضد کی، چلو مما! پاکستان چلتے ہیں، لیکن ڈیڈ اور مما کو اب پاؤنڈز سے زیادہ شاید کوئی چیز پیاری نہیں تھی، پاکستان جانا تو دور کی بات وہ تو پاکستان کا نام سننا بھی پسند نہیں کرتے تھے، ہے نہ اچنبھے کی بات، لیکن یہ بھی کھرا سچ ہے کہ میں اپنے وطن کو ایک دن بھی نہیں بھولی تھی، میں اپنی سہیلیوں، رشتہ داروں، اپنے پنجاب اپنے اسلام آباد کو ہر رات خواب میں دیکھتی، ایسی شاید ہی کوئی رات گزری ہو جب مجھے ایسے خواب نہ آئے ہوں، گھر کا ماحول ہی ایسا تھا کہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکی۔ کالج کی پڑھائی کے دوران ہی ایئر پورٹ پر جاب مل گئی۔

مجھے لگا جیسے میں اس گھٹن زدہ گھر سے نکل کر رنگ برنگے میلے میں آ گئی ہوں، روزانہ ہزاروں مسافر جہازوں پر چڑھتے اور اترتے، گویا روز نئے پنچھی آتے اور اڈاری مار جاتے، میں طرح طرح کے لوگوں کو آتے جاتے دیکھتی، انہیں گلے ملتے دیکھتی تو میرے اندر توڑ پھوڑ سی شروع ہو جاتی، لوگ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کتنے خوش ہیں، ایک دوسرے کو کتنا چاہتے ہیں، جب کوئی میاں بیوی الگ ہوتے تو ایک دوسرے کی بانہوں میں سما جاتے، بیوی روتی تو شوہر اسے سینے سے لگا لیتا اور اس کی آنکھیں بھی نم ہو جاتیں، مجھے اچھی تنخواہ ملتی تھی لیکن جس روز تنخواہ ملنا ہوتی تھی میں اداس ہو جاتی، سوچوں کے جال میں جکڑ جاتی کہ پیسے مما کو دوں گی تو ڈیڈ شراب کے لیے پیسے مانگیں گے، مما کہیں گی بچی کے پیسے شراب پر نہ بہا، دونوں میں جھگڑا ہوگا یہ ایسے ہی تھا کہ جیسے پیسا ہمارے گھر کی لڑائی کی آگ میں پیٹرول کا کام دے رہا ہو، تم دھیان سے سن رہے ہو نا؟'' وہ بات کرتے کرتے پل بھر کے لیے رُکی۔

''رُکو مت' بولتی رہو، داستان کو بریکیں نہ لگاؤ، میں سب سن رہا ہوں، میری مکمل توجہ تمہاری باتوں پر ہے۔'' میں نے ایک ہی سانس میں جواب دیا۔

''ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ کانٹوں بھری زندگی کے تین برس گزر گئے، تن من میں جو چبھن تھی وہ دور نہ ہو سکی، ایک روز پاکستان جانے والی فلائٹ تاخیر کا شکار ہوگئی، سارا اسٹاف مسافروں کی خدمت میں لگا ہوا تھا، انہی مسافروں میں مجھے سکندر ملا۔ میں تھکی ہاری ایک کرسی پر تھوڑی دیر آرام کے لیے بیٹھی ہی تھی کہ وہ میرے ساتھ والی کرسی پر آ بیٹھا، میں نے سرسری نظروں سے اسے دیکھا اور پھر نظر نہ ہٹی، دل میں اُتھل پتھل سی ہونے لگی، ایسے لگا جیسے اس نے مجھے ہپناٹائز کر دیا ہو، میں جیسے نظر جھپکنا بھول چکی تھی، ایئرپورٹ پر خوبصورت لوگ تو میں روز دیکھتی تھی، لیکن سکندر کے لیے جیسے خوبصورت جیسا لفظ بھی چھوٹا تھا، گورا چٹا رنگ، گھنگریالے بال، ہونٹ گلابی اور درویشوں جیسی آنکھیں، مجھے اپنا وجود پگھلتا محسوس ہوا، میں اس کی آنکھوں میں کھو گئی، وہ مسکرایا تو مجھے اپنا خیال آیا اور تھوڑا سا سنبھلی کہ اٹھ کر چلی جاؤں لیکن میرے تو پاؤں میں جیسے جان ہی نہ رہی تھی۔

''کیا نام ہے آپ کا؟'' اس نے آہستہ سے پوچھا۔ چہرے مہرے کی طرح اس کی آواز بھی خوبصورت تھی۔

''شاہین۔'' میں نے جواب دیا۔

''بہت پیارا نام ہے لیکن اتنا نہیں جتنی پیاری تم خود ہو، تمہارا نام تو تصور ہونا چاہیے تھا یا تصویر، جان بہار۔ کسی مصور کا شاہکار دکھتی ہو تم۔'' وہ یکا یک آپ سے تم پر آ گیا۔

وہ بات کر رہا تھا اور مجھے لگ رہا تھا اس کی آنکھوں کا سحر مجھے دھیرے دھیرے جکڑ رہا ہے، اس سروقد کے منہ سے اپنی تعریف سن کر یوں لگا جیسے دل و دماغ پر خمار سا چھا رہا ہو، لیکن میں نے کوشش کی کہ اسے میرے اندر کی توڑ پھوڑ کا رتی بھر بھی احساس نہ ہو۔

''کہاں جا رہے ہیں آپ؟''

''پاکستان، ملتان کے قریب ہمارا گاؤں ہے، گھر بار ہے، والدین ہیں، زمین جایداد ہے، سارا گاؤں ہی ہمارا ہے، ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ سال میں چار چکر وطن کے لگا لیتا ہوں۔''

وہ ملتان کا بتا رہا تھا، وہ شہر جو اولیاء اللہ کی سرزمین کہلاتی ہے، جہاں حضرت بہاء الدین زکریا، حضرت شاہ رکن عالم، بی بی پاک دامن، حضرت شاہ شمس تبریز اور بڑی بڑی برگزیدہ ہستیوں کے مزار ہیں، دربار ہیں، خانقاہیں ہیں۔

''تم نے ملتان دیکھا ہے۔''

''نہیں! میں 10 سال کی تھی جب ہم گوروں کے دیس کے باسی بن گئے، نام سنا ہے، جان پہچان والوں سے سنا ہے۔ ملتان بزرگان دین کا شہر ہے، بڑا جی چاہتا ہے کہ وہاں جاؤں، اللہ کے نیک بندوں کے درباروں پر حاضری دوں۔'' میں اداس سے لہجے میں بولی۔

''چلو آج ہی لے چلتا ہوں۔'' اس نے مذاق میں کہا اور میں شرما کر رہ گئی۔

''میرا نام سکندر ہے، 7 تاریخ کو واپس آؤں گا، ملو گی مجھے یہیں ایئرپورٹ پر۔'' وہ ایک ماہ کے لیے جا رہا تھا۔

''پتا نہیں۔'' میں وہاں سے اُٹھ گئی، سکندر چلا گیا اور میرے لیے ایک ماہ جیسے ایک صدی بن گیا، ایسی ویسی کوئی بات بھی نہیں تھی لیکن لگ رہا تھا کہ وقت جیسے تھم گیا ہے، گھڑی کی سوئیاں جیسے گھومنا بھول گئی ہیں، وہ مجھے اپنے سحر میں جکڑ کر چلا گیا۔ جب بھی پاکستان کی فلائٹ آتی میں دائیں بائیں نظریں گھماتی کہ شاید وہ پہلے نہ آ جائے اور گزر نہ جائے، پھر میں خود کو سرزنش کرتی کہ یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ من اداس، میلے میں ویرانی، جگ سنسان لگنے لگا ہے، دن کو چین نہ رات کو سکون، سوتی تو خوابوں میں گھس آتا، جاگتی تو بے کل ہو جاتی، دھیرے دھیرے تین ہفتے گزر گئے اور پھر 7 تاریخ آ گئی، میں جان بوجھ کر ایک شاپ میں جا کر بیٹھ گئی کہ دیکھوں تو وہ مجھے تلاش بھی کرتا ہے یا صرف باتیں ہی کرتا ہے، سارے مسافر گزر گئے، سکندر آخر میں آیا۔

وہ دائیں بائیں آنکھیں گھماتا مجھے ہی تلاش کر رہا تھا، پندرہ منٹ تک وہ مجھے ڈھونڈتا رہا۔ میرے دل میں پھول کھل رہے تھے، میں اس صورتِ حال سے لطف اندوز ہو رہی تھی، پھر

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے رومال نکالا، شاید پریشانی سے اسے پسینا آ گیا تھا، اس نے پیشانی کو رومال سے صاف کیا اور بالآخر کسی ہارے ہوئے کھلاڑی کی طرح اس نے بیگ اٹھایا اور سر جھکائے چل پڑا، میں شاپ سے نکلی اور اسے عقب سے آواز دی۔ ''سکندر!''

وہ رک گیا۔

ایسے لگ رہا تھا جیسے بیک وقت ہزاروں گلاب اس کے چہرے پر کھل اٹھے ہیں۔

''مجھے پتا تھا تم ضرور آؤ گی۔'' اس نے مجھ سے معانقہ کیا، زندگی میں پہلا موقع تھا کہ کسی مرد نے مجھے اپنی باہوں میں لیا تھا، اس کے جسم سے مجھے عجیب طرح کی تپش سی نکلتی محسوس ہوئی، مجھے لگا اس تپش سے میں پگھل رہی ہوں، گم صم، بے خبری اور بے خودی کا سا عالم تھا، میں نے بھی اس کی بازوؤں کی گرفت سے نہ نکلنا چاہا۔ اس لیے بھی کہ یہ انگلستان کے ماحول.... کے موافق بات تھی۔

''چلو وہاں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ ریستوران کی طرف قدم بڑھانے لگا، مجھے لگا کہ میں گونگی بہری ہوگئی ہوں، کیفیت ایسی تھی جیسے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں، اپنے اندر کی کیفیت سے شکست کھا کر میں اس کی باتوں کا۔ ''ہوں، ہاں! اچھا'' جیسے الفاظ سے جواب دے رہی تھی، وہ میرے لیے پاکستان سے سونے کی ایک خوبصورت چین لے کر آیا تھا، اس نے اپنے ہاتھوں سے اسے میری گردن میں ڈالی، وہاں ہم کتنی دیر بیٹھے رہے، گزرتے وقت کا پتا ہی نہ چلا، بادل نخواستہ ہمیں اٹھنا ہی پڑا۔ اس نے ویک اینڈ پر ملاقات کا وعدہ کیا اور بائے بائے کرتا چلا گیا۔

میری بیابان دنیا میں جیسے جابجا رنگا رنگ پھول اُگ آئے تھے، بے مزہ زندگی میں بہار آ گئی تھی۔ سرور کی لہریں میرے انگ انگ میں سرایت کر رہی تھیں۔ میں بے خود ہوتی جا رہی تھی، میں محسوس کر رہی تھی جیسے عام دنیا سے نکل کر کسی اور ہی دنیا میں رہنے لگی ہوں، سکندر کا خیال ایک نشے کی طرح مجھے مخمور رکھتا، اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے وہی نگاہوں میں رہتا، گھر میں مما پپا کی چیخ چنگھاڑ، تو تو میں میں، کام کا دباؤ، جیسے سب بھول گئی، ہفتے کے روز میں نے اپنا سب سے خوبصورت سوٹ نکالا، زیب تن کیا، آئینہ میں خود کو دیکھا اور پھر سکندر سے ملنے چل دی۔

وہ جیسے پہلے سے میرا منتظر تھا، اس کی نگاہیں مجھ سے چار ہوئیں تو جیسے چراغ جل اٹھے۔ سفید رنگ کی مرسڈیز میں بڑے کروفر سے بیٹھا وہ کوئی راجکمار لگ رہا تھا۔ مجھے اپنی قسمت پر رشک آنے لگا، ہم نے باتیں شروع کیں تو پھر بات سے بات نکلتی گئی اور وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہوا، ہم بہت کم وقت میں ایک دوسرے کے بارے میں بہت زیادہ جان لینا چاہتے تھے۔ میں نے اسے بتایا کہ گھر بار ہوتے ہوئے بھی میں کس قدر تنہا ہوں، میرے ممی، پپا کیسے ایک دوسرے کی ضد اور دشمن ہیں۔

''شاہین! بات دشمنی کی نہیں ہوتی، دراصل ایک دوسرے کو سمجھنے اور سمجھوتا کرنے کی بات ہوتی ہے، لیکن اگر میاں بیوی کا میل ہی ٹھیک نہ ہو تو پھر زندگی کی گاڑی کو زبردستی نہیں کھینچا جا سکتا، اندر کی دوریوں کے پنکچر زندگی کی گاڑی کو رواں رکھنے میں بڑی رکاوٹ ہوتے ہیں، کیل کانٹے چبھتے بھی ہیں اور سوراخ بھی کر دیتے ہیں، زندگی کے ایسے گھاؤ بھرنے سے بھی نہیں بھرتے، بے مزہ زندگی کانٹوں کی سیج بن کر رہ جاتی ہے جس میں زخموں سے چور انسان کراہتے رہتے ہیں، بے جوڑ شادیوں کی سزا بچے بھگتے ہیں۔''

اس کی باتوں سے مجھے لگا جیسے وہ کہیں کھو گیا ہے۔

''کیوں سکندر! کیا تمہارے والدین بھی؟'' میں حیرت کے سمندر میں غوطے کھانے لگی۔

''نہیں! نہیں۔'' وہ جیسے خیالوں کے بھنور سے نکل آیا ہو۔ میرے امی، ابو تو شاہوں کی سی زندگی گزار رہے ہیں، وہ پرانے دور کے ہیں جب شادی ایک لاٹری کی طرح ہوا کرتی تھی اور ان کی لاٹری لگ گئی تھی، وہ بہت خوش و خرم زندگی جی رہے ہیں۔'' اس نے سوفٹ ڈرنک کا کین ٹیبل پر رکھا اور خاموش ہو گیا۔

''تو تم اس قدر اداس کیوں ہو گئے ہو؟''

''میں دراصل اپنی بپتا سنا رہا تھا۔ میری اور میری وائف کی کبھی نہیں بنی، ہر وقت ان بن رہتی ہے، وہ ایک امیر گھرانے کی لڑکی ہے لیکن سو فیصد انگریز ہے نہ میاں بیوی کے رشتے کے تقدس کو سمجھتی ہے نہ مشرقی روایات کو، مجال ہے جو اس کی اجازت کے بغیر گھر میں پتا بھی ہل جائے، اسی لیے وہ میرے دل میں گھر نہیں کر سکی، نہ جانے کیوں؟ میں نے بھی دل کی گہرائیوں سے اسے نہیں چاہا، صرف بچوں کی وجہ سے جیے جا رہے ہیں۔'' وہ بولتے بولتے خاموش ہو گیا۔

''سکندر آپ کے بچے بھی ہیں، دیکھنے میں تو بالکل کنوارے لگتے ہو۔'' میں نے حیرانی سے کہا۔

''نہیں شاہین! میرا بڑا بیٹا 15 سال کا ہے اور بیٹی 11

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

سال کی۔ میری شادی رشتہ داروں میں ہوئی تھی، شادی کر کے انگلینڈ آیا تھا، میں نے سوچا تھا کہ حدیقہ پڑھی لکھی ہے، میری اور میرے گھر والوں کی قدر کرے گی، لیکن اس نے مجھے ہمیشہ گھر کے سامان کی طرح سمجھا، جیسے میں اس کا نوکر ہوں، جب میں اپنے گھر تھا تو شہزادوں کی طرح زندگی کو بسر کیا لیکن یہاں آ کر جیسے کی کمین بن گیا ہوں، ڈارلنگ، ڈارلنگ، پلیز، پلیز کہتے منہ دکھنے لگ جاتا ہے۔ وہ یہی سمجھتی ہے جیسے میں اس کا غلام ہوں، لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ میں اس کی نکے جتنی بھی قدر نہیں کرتا، لوگ تو جانوروں کو بھی پیار سے اپنا بنا لیتے ہیں، اپنے بس میں کر لیتے ہیں، وہ بھی کیا بیوی ہوئی جو مرد کو نہ جیت سکے۔ زندگی میں اتنا بڑا خلا ہے کہ یہی لگتا ہے کہ میں زندگی کو نہیں بلکہ زندگی مجھے بسر کر رہی ہے، بڑی خشک اور صحرا کی طرح ویران زندگی جی رہا ہوں۔'' یہ بتا کر اس نے چپ سادھ لی۔

خاموشی طویل ہوگئی تو میں نے اسے متوجہ کیا۔

''آگے بھی تو کچھ بتائیں۔''

''وہ الگ کمرے میں ہوتی ہے اور میں الگ کمرے میں، جب دل ہی نہ ملتے ہوں تو جسمانی ملن کیا معنی رکھتا ہے؟'' وہ مجھے اپنے دکھڑے سناتا رہا۔ پھر مجھے خاموش دیکھ کر بولا۔ ''کیا بات ہے میری شادی کا سن کر تمہارا موڈ خراب ہوگیا ہے۔''

''میرا موڈ خراب نہیں ہوا، میں تو سوچ رہی تھی کہ ہر دوسرے گھر کا حال ایسا ہی ہے، یہاں لوگ ادھوری زندگی جی رہے ہیں۔'' مجھے اپنا گھر یاد آ گیا۔

''ہاں یہی سمجھ لو، نامکمل زندگی! پانی بھی برسے اور بندہ بھیگے بھی نہ، یہ ادھوری زندگی پوری بھی ہو سکتی ہے اگر کوئی اچھا جیون ساتھی مل جائے تو۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں اداسی کی پرچھائیں دیکھیں۔

''کیا مطلب آپ کا؟''

''مطلب یہ کہ بچوں کی وجہ سے میں بیوی سے علیحدگی اختیار نہیں کر سکتا' میری وجہ سے ان معصوموں کی زندگی کیوں خارزار بن جائے، ٹوٹے بکھرے گھروں کے بچے کس طرح کے ہوتے ہیں یہ تم سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے! پر ہاں! ان سب تلخ حقائق کے باوجود مجھے کوئی اپنے پیار کی گھنی چھاؤں میں رہنے کی بھیک دے دے تو میں آخری سانسوں تک اس کا ساتھ نبھانے کو تیار ہوں۔'' اس نے یہ کہتے ہوئے میرا ہاتھ تھام لیا۔

''زندگی بھر ساتھ نبھانے کا وعدہ، وہ کیسے؟ آپ شادی شدہ ہو، کیا آپ کی بیوی آپ سے علیحدگی اختیار کر لے گی؟ شادی کے بغیر زندگی بھر کا ساتھ کیسے نبھایا جا سکتا ہے؟'' یہ بات میرے گلے سے اتر نہیں رہی تھی۔

''پیار تو ایک لافانی جذبہ ہے شاہین! اس کا شادی سے کوئی تعلق نہیں، شادی سے پیار نہیں خریدا جا سکتا ہے۔'' وہ اپنے فلسفے سے مجھے رام کرنے کی کوشش کر رہا تھا، وہ مجھے لیلیٰ مجنوں، ہیر رانجھا، سیف الملوک اور نہ جانے کون کون سی عشق و محبت کی لوک کہانیاں سنا کر میرے دل میں اترنے کی جستجو کر رہا تھا۔

میں اس کی بات کا مفہوم سمجھ رہی تھی اور شش و پنج میں تھی کہ اسے کہوں تو کیا کہوں؟ میں تو خود اس پر عاشق ہوگئی تھی لیکن ہم دونوں کے ایک ہونے کا کوئی درمیانی راستہ سجھائی نہ دے رہا تھا۔

''نہ جانے کیوں تمہیں دیکھ کر مجھے لگتا ہے کہ ہماری جوڑی کتنی فٹ رہے گی، کتنی پیاری ہوتم، تمہیں دیکھ کر تو کسی کا بھی ایمان ڈانواں ڈول ہو سکتا ہے۔'' اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جب یہ کہا تو مجھے لگا وہ دروغ گوئی سے کام لے رہا ہے۔ مجھے پھانسنے کے لیے مکھن لگا رہا ہے، مجھے راہ چلتے دیکھ کر کئی بندے میرے حسن میں کھو جاتے تھے، یہ میں نے کئی بار محسوس کیا تھا، میں اپنی خوبصورتی کے قصیدے نہیں پڑھ رہی، مجھے رب نے بنایا ہی خوبصورت تھا۔

''میری محبوبہ بنو گی۔'' وہ جیسے میرے ترلے کر رہا ہو۔

''پتا نہیں۔''

یہ کہہ کر میں گھر چلی آئی اور پھر کئی روز میں سکندر سے نہ ملی لیکن اس کو بھول بھی نہ سکی، بے چین سی کیفیت تھی۔ میرا دل کہیں بھی نہ لگ رہا تھا، اس کی یاد کسی کل آرام نہ لینے دیتی تھی، جو اس نے کہا تھا وہ قابلِ قبول نہ تھا، لیکن دل اس کی طرف ہی کھنچا چلا جاتا تھا، میری زندگی جیسے کسی طوفان میں گھر چکی تھی۔

کبھی میں نقشِ دیوار ہو جاتی تو کبھی دل میں پیار کی ہلکی ہلکی ٹیس محسوس کرنے لگتی۔ مجھے رہ رہ کر اس کی نگاہ ناز کچوکے سے لگاتی تھی، نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن والا معاملہ تھا رات بھر میں سکندر کے بارے میں سوچتی رہی، اس کو بھولنا شاید میرے لیے مشکل ہوگیا تھا، مجھے دنیا کے کئی بڑے افراد یاد آئے جنہوں نے دو دو شادیاں کی تھیں، اور کئی شادی شدہ آدمی ذہن میں آئے جن پر کنواری لڑکیاں مرتی تھیں۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

دماغ دل کا ساتھ نہیں دے رہا تھا، کیا غلط ہے، کیا صحیح ہے کے چکر میں ایک ہفتہ گزر گیا، ایک روز میں ڈیوٹی ختم کر کے ایئرپورٹ سے نکلی تو سامنے سکندر کار میں موجود تھا، شیو بڑھی ہوئی تھی، سر کے بال الجھے الجھے اور اس کی درویشوں جیسی آنکھوں میں برسوں کی اداسی تھی، اس کو دیکھتے ہی میرے دل میں خوشی کی لہر اٹھی ابھری لیکن میں نے اس پر ظاہر نہ ہونے دیا۔

''تمہیں ایک بار بھی یاد نہیں آیا میں، کتنی بے مروت ہو تم۔'' اس نے نم آنکھوں سے شکوہ کیا۔

میں کچھ نہ بولی اس کی چشم تر دیکھ کر میرا دل اداسی سے بھر گیا، لیکن ساتھ ہی یہ احساس بھی جاگزیں ہوا کہ سکندر مجھے کتنا چاہتا ہے۔

''مجھے بھولے نہیں آپ۔'' میں اس کے من میں جھانکنا چاہتی تھی۔

''تم کوئی بھولنے والی چیز ہو؟'' اس نے سوال داغ دیا۔

پھر وہ رات ہم نے اکٹھے گزاری، وہ مجھے چھوتا تو میرے رگ و پے میں سرور کی لہریں اٹھنے لگتیں، امنگوں، ترنگوں کا تلاطم برپا ہو جاتا، جب میں اس کے کاندھے پر سر رکھتی تو بے حد سکون محسوس ہوتا، میں اس کی محبت کی حوالات میں قید ہو چکی تھی۔

لیکن میرے اندر کی پاکستانی عورت زندہ تھی۔ اب میں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ کم سے کم نکاح تو کر لو بھلے ہی نکاح رجسٹر نہ کراؤ۔ اس نے میرے شور شرابے سے تنگ آ کر ایک بنگالی مولوی کو پکڑ لایا۔ اس نے نکاح پڑھا دیا۔ اب پتا نہیں وہ حقیقت میں مولوی تھا بھی یا نہیں۔ لیکن میں مطمئن ہو گئی۔

پھر تو جیسے یہ معمول بن گیا، وہ بزنس کے بہانے اور میں کام کے بہانہ اکثر راتیں ہم باہر گزارنے لگے، صبح جب لمحۂ جدائی آتا تو لگتا جسم سے روح جدا ہو رہی ہے۔

''آپ اپنا فلیٹ لے لو'' ایک روز سکندر نے میرے دل کی بات کہہ دی، پے منٹ میں کروں گا، اپنی پسند کا گھر تم تلاش کرو گی۔''

میں نے سنگل بیڈ روم کا چھوٹا سا فلیٹ پسند کر لیا، سکندر اور میں نے مل کر خرچا کیا، مہینا بھر میں ہی میں لینڈ لیڈی بن چکی تھی۔ سکندر نے گھر کو سامان سے بھر دیا، گھر میں عیش و آرام کی ہر وہ چیز موجود تھی جس کا میں ارمان کر سکتی تھی، مما پپا کو جب پتا چلا تو انہوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا، دونوں مجھ سے جھگڑ بیٹھے۔

''آپ دونوں کی جھک جھک سے چھٹکارا پانے کے لیے ہی میں نے یہ قدم اٹھایا ہے۔'' مجھ سے رہا نہ گیا۔ یہ ہر وقت کی ٹرٹر نے میرا سکون برباد کر دیا ہے، میری اپنی بھی کوئی لائف ہے، گھر چھوڑ رہی ہوں دنیا نہیں، آتی جاتی رہوں گی اگر آپ کو پسند ہو تو.....'' یہ میرے آخری الفاظ تھے اس کے بعد میں نے وہ چار دیواری چھوڑ دی جہاں میں نے زندگی کی بہاریں کم اور خزاں جیسا عرصہ زیادہ بتایا تھا۔

سکندر کے پیار نے مجھے دنیا کے ہر رشتے سے جیسے بے نیاز کر دیا تھا، میں اس کی محبت میں ایسی گم ہوئی کہ سارے غم جیسے دفن ہو کر رہ گئے ہوں۔

وہ روزانہ شام کو گھر جانے سے قبل تین چار گھنٹے میرے ساتھ گزارتا، میں اس کے لیے کھانا بناتی، اس کے کپڑے دھوتی، استری کرتی، پوری عورت بن کر میں اس کی خدمت کرتی، اس کی سیوا میں کوئی کسر نہ چھوڑتی تھی، میں نہیں چاہتی تھی جو کمی اس نے بیوی میں محسوس کی تھی وہ کمی مجھ میں بھی ہو، میں اس کے جذبات و احساس کی قدر کرتی، اسے سر آنکھوں پر بٹھاتی، جب نصف شب کو وہ مجھے چھوڑ کر جاتا تھا تو میں اکثر رو پڑتی۔ ''اپنی کہانی روک کر سوال کیا تو میں ایسے چونک گیا۔

''سن رہے ہو ناں۔'' اس نے اچانک اپنی کہانی روک کر سوال کیا تو میں ایسے چونک گیا جیسے بم پھوڑ دیا ہو مجھے زبردست جھٹکا لگا۔

ہوں، ہاں، ہاں..... میں تو اس کی کہانی میں ایسا کھویا تھا کہ اس کی آواز پر چونکا تھا۔ ''رکو مت، جاری رکھو، میں ہمہ تن گوش ہوں۔'' میرے کہتے ہی اس نے سلسلہ وہیں سے جوڑا۔

''روتی کیوں ہو؟ جتنا پیار ہے، سارا تو تمہارا ہے، تمہیں دے کر جا رہا ہوں، اس کے لیے کیا بچا ہے؟'' وہ مجھے تسلی دیتا۔

''میں چاہتی ہوں کہ تم صرف میرے بن کے رہو، کب آئے گا وہ وقت۔'' میں شکوہ کرتی۔

''میں نے تو تمہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اپنی وائف کو نہیں چھوڑ سکتا۔'' جب وہ میری گود میں سر رکھ کر یہ کہتا تو میں برف کی طرح سرد پڑ جاتی۔

''میرا ایک دوست کہتا ہے، مانگی ہوئی سگریٹ، اخبار اور مانگی ہوئی بیوی کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے، میں نے کبھی اخبار اور سگریٹ تو مانگا نہیں پر بیوی.....'' جب وہ شرارت سے ایسا کہتا تو میں اس کا کان پکڑ کر مروڑ دیتی۔

''تو پھر مانگی ہوئی چیز کتنے دن چلتی ہے؟ آخر تمہاری مالکن تمہیں مجھ سے چھین کر لے جائے گی۔'' ایک ڈر میرے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اندر سے اٹھتا۔

''وہ میری مجبوری ہے شاہین، اور تم میرا عشق ہو، مجبوری کبھی بھی عشق سے جیت نہیں سکتی۔'' وہ میرا دل رکھنے کے لیے کہتا تو میں مجبوری اور عشق کی اس منطق میں سب کچھ بھول جاتی، یاد رہتا تھا تو صرف سکندر کا پیار اور ساتھ، جس کے لیے میں ہر قربانی دینے کو تیار تھی، وہ پھر دیر تک میرے لمبے بالوں سے کھیلتا رہتا، یا پھر میرے پاؤں اپنی گود میں رکھ کے بیٹھ جاتا، عورت کا چاہنے والا اس کے قدموں میں بیٹھا ہو تو وہ اپنے آپ کو نور جہاں سمجھنے لگتی ہے، اس حکومت کا نشہ بھی تخت طاؤس سے کم نہیں ہوتا، اس نشے میں، میں گناہ اور ثواب سب بھلا بیٹھی تھی۔

گرمیوں کی چھٹیاں تھیں، سکندر دو ہفتے کے لیے کاروباری دورے پر گیا ہوا تھا، اچانک ایک صبح میرا دل گھبرایا، مجھے لگا میں ماں بننے والی ہوں۔ میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، حواس باختہ سی ہو گئی، سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ خوشی سے جھوموں یا اداسی کی کالی چادر اوڑھوں، ہنسوں یا روؤں، میں اندھیروں، اجالوں میں گم صم سی کھو گئی، پھر جھٹ پٹ میں نے سکندر کے دفتر فون کیا، لیکن پتا چلا وہ ابھی واپس نہیں آیا، کئی روز گزر گئے، کچھ ایسا احساس تھا جو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ صرف محسوس کیا جا سکتا تھا۔ سکندر کو پتا چلے گا تو خوشی سے پاگل ہو جائے گا، میں فوراً اس کو یہ خوشخبری سنانا چاہتی تھی، مجھے اس لمحے کا بے چینی سے انتظار تھا لیکن اس کا کچھ معلوم نہیں پڑ رہا تھا کہ وہ کہاں گیا ہے، جب بھی فون کرتی تو جواب ملتا ضروری کام سے باہر گئے ہوئے ہیں، موبائل پر نمبر ملاتی تو نمبر بند ملتا تھا۔ اچانک ایک روز اس کا فون آیا، وہ ایئرپورٹ سے ہی بول رہا تھا، میں نے آن کی آن میں اسے خوشخبری سنا دی، کچھ لمحوں کے لیے اس نے چپ سادھ لی۔

''آج ڈاکٹر کے پاس چلی جانا، وہ سب ٹھیک کر دے گا۔'' اس کے الفاظ ہتھوڑے کی طرح میرے دماغ پر لگے۔

''کیا ٹھیک کر دے گا۔'' میں کچھ کچھ سمجھتے ہوئے بے چینی سے بولی۔

''اس ہفتے جا کر ابورشن کرا لو، پہلے ہی دیر ہو چکی ہے، مزید دیر مناسب نہیں۔'' اس نے جیسے حکم دیا ہو۔

''ابارشن! پر کیوں'' میں بوکھلا گئی۔

''کیوں کا کیا مطلب؟'' میں فارسی بول رہا ہوں جو تمہیں سمجھ نہیں آ رہی۔'' وہ پہلی بار مجھ سے تلخ اور اونچے لہجے میں مخاطب ہوا تھا۔

''لیکن میں اس بچے کو جنم دینا چاہتی ہوں، یہ تو ہمارے پیار کی نشانی ہے، سچے پیار کی نشانی۔'' میں نے اپنی وکالت خود ہی کرنا چاہی۔

''اوہ، شٹ اپ! میں پہلے ہی دکھی ہوں، ڈونٹ گو می دِس بَل شٹ' ایک عورت نے پہلے زندگی جہنم بنا رکھی ہے، اب دوسری آ گئی ہے۔'' وہ آپے سے باہر ہو گیا۔

''پر سکندر'' میں بولنے لگی تو اس نے دہاڑنے کے انداز میں مجھے ٹوکا اور بولا ''فضول باتیں سننے کے لیے میرے پاس وقت نہیں، میں اور بہت سے کاروباری معاملات میں الجھا ہوا ہوں، چپ چاپ ڈاکٹر کے پاس جاؤ، خرچا میں برداشت کروں گا۔'' اس نے یوں مشورہ دیا کہ جیسے میرے سر میں درد ہے اور جا کر گولی لے آؤں۔

''بات سنو سکندر، میں ماں بننا چاہتی ہوں، آپ کے بچے کی ماں، جب آپ میرے پاس نہیں ہوں گے تو آپ کی نشانی مجھے آپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دے گی، بلاوجہ غصہ نہ کرو۔''

''اُلو کی پٹھی، ماں بننا چاہتی ہے، ہزاروں عورتیں روز ماں بنتی ہیں، یہ کوئی نیا کام ہے؟ تیرے ماں بننے سے کون سے سرخاب کے پر لگ جائیں گے، بے وقوفی چھوڑ، عقل سے کام لے، مجھے تمہارا سہارا چاہیے، جب میں تمہارے پاس آتا ہوں تو غم بھاگ جاتے ہیں، دکھ بھول جاتا ہوں، میرے لیے دردِ سر نہ بنو، اور پھر تم کنواری ہو، ناجائز بچے کو معاشرہ بھی قبول نہیں کرتا، سبھی اسے حرام کا کہیں گے، تم کہیں منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہو گی۔'' وہ مسلسل بولے جا رہا تھا، مجھے لگ رہا تھا میرے سر میں کوئی کیل ٹھونک رہا ہے۔

''حرام کا کیوں، تم باپ ہو اس بچے کے، ہماری شادی نہیں ہوئی تو کیا ہوا، رب تو جانتا ہے کہ میں تمہارے بچے کی ماں ہوں۔'' میں نے بڑے یقین سے کہا۔

قانون کے مطابق نہ تم میری بیوی ہو نہ میں اس بچے کا باپ، مجھے جذباتی بلیک میلنگ پسند نہیں، اور نہ ہی میں نے کسی کورٹ کچہری میں جا کر کہنا ہے کہ میں تمہارے بچے کا باپ ہوں، تمہیں گھر لے دیا، سیٹل کر دیا، بس اس سے زیادہ مجھ سے کوئی اُمید نہ رکھنا، تمہارے ماں بننے کے شوق میں میں اپنا گھر اجاڑ لوں، لاکھوں کا بزنس ڈبو لوں، میرے بچوں پر اس کا کیا اثر پڑے گا، کبھی سوچا تم نے۔'' وہ مزید بھڑک گیا۔

اپنے ارمانوں کا یوں بے دردی سے خون ہوتا دیکھ کر میں نے حوصلہ مجتمع کیا اور بھیک مانگنے کے سے انداز میں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

بولی۔ ''پھر بھی آپ سوچ سمجھ کر بتاؤ، گرم ہونے کے بجائے نرم ہو کر احساس کرو کہ آپ کہہ کیا رہے ہو۔''

''فالتو باتیں سوچنے کا میرے پاس وقت نہیں، میں ان چھٹیوں میں بچوں کو لے کر امریکا جا رہا ہوں، مجھے فون نہ کرنا۔'' یہ کہتے ہی اس نے فون بند کر دیا، مجھے لگا جیسے میرے دل کی دھڑکن بند ہوتے ہوتے رہ گئی ہو۔

وہ ہو گیا تھا جو میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا، میرے کبھی وہم و خیال میں بھی نہیں آیا تھا کہ ایسا کچھ ہو جائے گا۔ میرے اوسان خطا ہو گئے، میں ''صم بکم'' کی عملی تصویر بن کر رہ گئی، بے حیائی کا جو برقع میں نے منہ پر لے لیا تھا، اس نے یہی چند چڑھانا تھا، مجھے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ سکندر مجھے یوں زندگی کے بھنور میں چھوڑ کر چلا جائے گا، وہ ایسے پیٹھ دکھائے گا، میری آنکھوں سے بے بسی کے آنسو نکلے اور میرے گال بھگوتے ہوئے گردن میں جذب ہو گئے۔ مجھے خود پر ترس آیا، میں کیا گل کھلا بیٹھی تھی، گھر سے باغی بن کر نکلی، پیار میں ایسی دیوانی ہوئی کہ سماج کی بھی پروانہ کی اور اپنی سونے جیسی جوانی سکندر کے سپرد کر دی، وہ مجھے استعمال کرتا رہا، اور موقع آنے پر چوروں کی طرح منہ چھپا کر بھاگ گیا، مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں گری میں رو رہی تھی نہ ہنس رہی تھی، لیکن آنکھیں نم ہو رہی تھیں، فلیٹ میں تنہا بیٹھی تھی، اسی فلیٹ میں جس میں میرے سکندر کی تصاویر آویزاں تھیں، یہ فلیٹ مجھے کسی عبادت گاہ کی طرح لگتا تھا، آج اسی فلیٹ میں، میں خود کو کسی کوٹھے والی کی طرح محسوس کر رہی تھی۔ میرے دل میں ٹیس سی اٹھی، میں اپنی ہی نظروں میں گری جا رہی تھی، مجھے خود سے بدبو آنے لگی، نفرت محسوس ہونے لگی، دل چاہا کسی گاڑی کے نیچے جا کر سر دے دوں یا بلڈنگ سے چھلانگ لگا کے اس نجاست والے جسم کو موت کے سپرد کر دوں اور ایک خط لکھ کر رکھ جاؤں کہ میری زندگی برباد کرنے والا سکندر ہے، میرا کلیجہ پھٹنے کو آیا تھا، لیکن مرنا اتنا آسان کہاں ہے۔ سوچوں میں گم میں قالین پر ہی لیٹ گئی کہ کروں تو کیا؟ اچانک دماغ میں خیال آیا، سکندر بھاگ گیا تو کون سا طوفان آ گیا، کل ڈاکٹر کے پاس جا کر ساری کہانی ختم کر ڈالتی ہوں، جیسے میرے سر سے کوئی بوجھ اتر گیا ہو، میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا اب اس بے وفا کی شکل نہیں دیکھوں گی، اپنے مما، پپا کے پاس واپس چلی جاؤں گی، دوسرے روز میں ڈاکٹر کے پاس گئی، ادھیڑ عمر لیڈی ڈاکٹر نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔

فکر کی کوئی بات نہیں، 10 منٹ لگیں گے، میں اگلے ہفتے کا وقت لے کر گھر آ گئی، صرف ایک ہفتے کی مصیبت، پھر میں فری ہو جاؤں گی، فلیٹ چھوڑنے کے لیے میں نے وہ سامان اکٹھا کرنا شروع کر دیا جو میں گھر سے لائی تھی، الماری میں پڑا اٹیچی کیس اٹھانے کے لیے میں کرسی پر چڑھ گئی، اٹیچی کیس بھاری تھا، مجھے کافی زور سرف کرنا پڑ رہا تھا۔

''کہیں بچے کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔'' جیسے میرے اندر سے آواز آئی۔

''پھر کیا ہے، تم نے کون سا اسے جنم دینا ہے، اچھا ہے جان چھوٹے گی'' یہ دماغ کی آواز تھی۔ دل سے آواز آئی ''نہیں وہ اور بات ہے لیکن اس طرح زور آزمائی سے بچے کو تکلیف پہنچے گی'' اندر کی اس کشمکش کے نتیجے میں، میں نے اٹیچی کیس پر لعنت بھیجی، نہ جانے ایسا کیا تھا کہ جو مصیبت میرے پیٹ میں تھی مجھے اس سے ہمدردی ہو گئی۔

کام سے میں نے دو ہفتے کی چھٹیاں لے لیں، دل بھر کر کھاتی کہ کہیں بچہ بھوکا نہ رہ جائے، خوب آرام کرتی کہ جتنی دیر وہ ماں کی کوکھ میں ہے آرام سے تو رہے پھر تو..... میری آنکھوں سے آنسو چھم چھم برسنے لگے، میرے اندر جیسے کوئی کھلونا وجود میں آ رہا تھا، اٹھتے، بیٹھتے، کھاتے، سوتے ہر وقت توجہ اس کی طرف رہتی، کہیں کوئی عضو نہ ٹوٹ جائے اس کھلونے کا، میں دھرتی کی طرح سرسبز و شاداب ہو گئی، آئینے میں اپنا ہی روپ نہ پہچان سکی، کتنی پیاری لگ رہی تھی میں خود کو۔

''تم ماں بننے والی ہو شاہین، تمہیں دنیا کا سب سے بڑا رتبہ مل رہا ہے، تمہارے حسن کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔'' شیشے میں سے میرے عکس نے کہا۔

''لیکن یہ بچہ ناجائز ہے، تم پاکستانی ہو اور پاکستانی معاشرہ کسی ناجائز بچے کو برداشت نہیں کرتا، یہاں انسان کی بنائی ہوئی روایات ہیں اور قانون کا پہرہ ہے۔'' میں نے عکس کو جواب دیا، عکس نے جیسے بحث شروع کر دی۔ ''رشتہ کوئی بھی ہو ناجائز نہیں ہوتا، مقصد یہ ہے کہ آپ کسی رشتے کا کتنا تقدس کرتے ہیں، کتنی ایمانداری سے اسے نبھاتے ہیں۔''

''پر..... پر میں اکیلی..... سماج..... بچہ..... ماں..... باپ..... رشتے..... نہیں نہیں، میں یہ بوجھ اکیلے کیسے برداشت کروں گی، بچے کے باپ کا ہونا بہت ضروری ہے، معاشرہ بچے کے باپ کا نام پوچھتا ہے، میرے تو بچے کے ماتھے پر لکھا ہو گا اس کا باپ چور ہے، نہیں میں اپنے سکون کے لیے اس بچے کو اتنی بڑی سزا کیوں دوں۔'' میں آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

مجھے احساس ہوا ان لمحات میں کہ بچے کے باپ کا پاس ہونا کتنا ضروری ہے، میں اکیلی عورت، مجھے رونا آ گیا، نہ سکندر کا فون آیا نہ میں فیصلہ بدل سکی۔

ڈاکٹر کے پاس جانے سے ایک رات قبل میں مسلم کمیونٹی ہال، اس عالمہ کے پاس گئی جہاں وہ دین و دنیا کا درس دیا کرتی تھی، دوسری خواتین کے ساتھ میں بھی چپکے سے دوپٹا اوڑھ کر بیٹھ گئی، معلمہ کا درس جانے کب سے جاری تھا۔ میری سماعت سے یہی جملے ٹکرائے ''اگر ہم زمین سے پودا بھی اکھاڑیں تو مٹی جڑوں کے ساتھ نکل آتی ہے، جو عمل ضائع کرانی ہیں وہ قتل کی مرتکب ہوتی ہیں، جو روح اللہ اس دنیا میں بھیجنا چاہتا ہے تم کون ہوتی ہو کہ اس کو آنے سے روک سکو۔'' رب کے بھید رب ہی جانتا ہے'' میں روتی روتی گھر آ گئی۔ گھر پہنچ کر میں ..... دوسرے روز ڈاکٹر کی طرف جانے کی تیاری کرنے لگی۔

رات کا آخری پہر ہوگا کہ میں جیسے سوتی جاگتی کیفیت میں تھی کہ میرے اندر سے آواز آئی۔ ''تمہاری کوکھ میں ''میں'' ہوں ماں!..... ماں..... جیسے میں یہ لفظ دوبارہ سنا، جیسے میرے ننگے پیٹ سے کوئی چھوٹا سا بلونگڑہ چمٹا ہوا ہو، اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں کی حرکت میں نے اپنے پیٹ پر محسوس کی، خود بخود ہی میرا ہاتھ پیٹ پر چلا گیا، اپنے اندر میں نے کوئی جیتی جاگتی چیز محسوس کی، جو حرکت کر رہی تھی، اندھیرے میں، میں نے اپنے اندر جھانکا، مجھے لگا جیسے دو چھوٹی چھوٹی آنکھیں مجھے گھور رہی ہیں، ان آنکھوں نے جیسے پکارا۔ ''ماں'' مجھے جھرجھری سے آ گئی، جسم میں سنسناہٹ سی محسوس ہوئی، میں جیسے ٹھنڈے پسینے میں بھیگ گئی، پھر میں نے بے خودی کے عالم میں اپنے ہی پیٹ کو زور سے تھپکی ڈالی۔

''میرے بچے..... میں تجھے جنم دوں گی، معاف کر دو، میں تمہیں اپنی خود غرضی کی بھینٹ چڑھانے لگی تھی، تمہارا باپ چور ہے، لیکن تمہاری ماں تمہاری ہے..... ہاں تمہاری ماں تو تمہاری ہے، میرا تکیہ آنسوؤں سے بھیگ گیا۔ مجھے بہت ہی سکون محسوس ہوا، ایک عجیب سی لذت میرے سراپے میں سرائیت کر گئی، جیسے کسی نے میرے جسم میں کوئی جادوئی طاقت داخل کر دی ہو۔ میں اسی وقت اٹھی، اپنا سامان سمیٹا، صبح ہی ڈاکٹر کو فون کیا کہ میں نے ارادہ بدل دیا ہے، اس کے بعد کبھی میں نے ماضی میں جھانکا، نہ پچھتائی اور نہ ہی زندگی سے کوئی شکوہ کیا کہ کیا ہو رہا ہے۔

فلیٹ چھوڑ کر میں نے کرائے پر ایک کمرا لے لیا، کام پر

آپ کیسے پڑھے لکھے؟
عقلمند انسان ہیں؟
آپ کو تو ہمارے خمیرہ مروارید عنبری صندل بادام والا معتدل بارد کے فوائد کا علم ہی نہیں
ہمارا خمیرہ مروارید سچے موتی والا مقوی قلب اور مقوی دماغ ہے۔ دل کی بند شریانیں کھولتا ہے دماغی میموری کی اصلاح کرتا ہے۔ جسمانی نشوونما گروتھ میں اضافہ کرتا ہے۔ فیملی کے تمام افراد کے لئے یکساں مفید ہے۔ دل کی گھبراہٹ دل کی تیز دھڑکن اور ہائی بلڈ پریشر کو کنٹرول کرتا ہے۔ خون کی کمی پوری کرتا ہے۔ گھریلو تمام پریشانیوں تفکرات سے نجات دلاتا ہے۔ تمام غم بھلا کر دل کو راحت، جگر کو ٹھنڈک اور دماغ کو سکون بخشتا ہے۔ انتہائی خوش ذائقہ مسحور کن، مہک والا خمیرہ مروارید عنبری معتدل صندل والا آج ہی فون کر کے بذریعہ ڈاک وی پی VP منگوالیں۔
المُسلم دارالحکمت رجسٹرڈ
ضلع حافظ آباد۔ پاکستان
0300-6526061
0301-6690383
فون اوقات
صبح 10 بجے سے شام 6 بجے تک

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

جانا شروع کر دیا، کچھ ہی روز گزرے ہوں گے کہ میرا راز افشا ہونا شروع ہو گیا۔ آخر کب تک میں چھپا سکتی تھی۔ مما کو پتا چلا تو اپنا سر پیٹ کر رہ گئی، لیکن میرے کانوں نے میرے اندر سے ''ماں'' کا جو لفظ سنا تھا، اس کے بعد تو دنیا کی ہر آواز میرے لیے چھوٹی ہو کر رہ گئی تھی، میری برداشت بہت بڑھ گئی، میں ''ماں'' کا لفظ سر عام سننا چاہتی تھی، گو کہ انگلینڈ کا معاشرہ اور تھا، وہاں ایسی باتوں پر لوگ زندگی تلخ نہیں کرتے پھر بھی کولیگ دبی دبی ہنسی کے ساتھ میری طرف دیکھتیں۔ 9 مہینے میں نے لوگوں کے طعنے سن کر، طنزیہ نظریں سہہ کر نکالے، میں نے ان عورتوں کی کتابیں بھی پڑھیں جنہوں نے میری طرح اکیلے میں بچوں کو جنم دیا تھا..... پھر وہ دن آ گیا جب میرے وارث نے روتے ہوئے دنیا میں اپنی آمد کا اعلان کیا، مجھے لگا جیسے میری ساری محنت کا ثمر مجھے آج مل گیا ہے، نہ دنیا سے کوئی گلا شکوہ رہا اور نہ ہی سکندر کی بیوفائی یاد رہی، وارث کو دیکھ کر جیسے میرے جسم میری روح کی ساری تھکاوٹ ختم ہو گئی تھی۔

عورت جب ماں بن جاتی ہے تو اس کے لیے دنیا کے سارے رشتے چھوٹے ہو جاتے ہیں، سکندر بے شک مجھے پیٹھ دکھا کر چلا گیا تھا لیکن اس تک جیسے ہی بچے کی خبر پہنچی، ایک روز وہ بھی آ پہنچا۔

''تمہیں سمجھایا تھا اس مصیبت میں مت پڑو، اب کتنی مشکل میں ہو۔'' اس نے ہمدردی جتانے کی سعی ناکام کی، میں نے اس کے بات کا جواب دینا گوارا نہ کیا۔

''چلو جو ہونا تھا وہ ہو گیا، فلیٹ میں واپس چلو، میرا بچہ کرائے کے گھروں میں پلے بڑھے مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوگا، ہم زمیندار، جاگیردار ہیں، راجوں مہاراجوں کی سی زندگی بسر کرتے ہیں، ایسی لائف تو ہمارے نوکر چاکر بھی نہیں گزارتے'' اس کے اندر کا باپ بول رہا تھا۔

''سکندر یہ بچہ وہی ہے جس کے پیدا ہونے کی خبر سن کر تم نے فون کرنا اور سننا بھی بند کر دیا تھا۔ وہ اکیلی ماں کا بچہ ہے..... مزدور ماں کا، میں نہیں چاہتی وہ کسی دھوکے میں رہے، میں اس کے من میں ان دیکھی ان چاہی خواہش پیدا نہیں ہونے دینا چاہتی، وہ منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا نہیں ہوا، اس لیے میں چاہتی ہوں وہ جس حال میں ہے اسی میں پلے بڑھے، میں اسے جھوٹے خوابوں کا اسیر نہیں بنانا چاہتی۔'' میری چبھتی باتیں سن کر سکندر چلا گیا۔

وارث پرورش پانے لگا، میں نے ایک ڈے کیئر سینٹر کا بندوبست کر لیا تھا، میری ڈیوٹی کے اوقات میں وہاں کی گورنس اس کو سنبھالتی، شام کو کام سے تھکی ہاری آتی تو وارث کو دیکھ کر جیسے میرے تن بدن میں نئی جان پڑ جاتی، کچھ پیسے ادھار لے کر میں نے چھوٹا سے اپنا گھر خرید لیا۔ سکندر نے کبھی جان نہ چھوڑی اور پھر میرا کھوج لگا لیا اور آ کر ایک دن میرے پاؤں پکڑ لیے ''نہیں رب کا واسطہ میرے گناہ کی سزا میرے بچے کو تو نہ دو، اسے باپ کے پیار کی ضرورت ہے۔''

وہ کبھی کبھی وارث سے ملنے آ جاتا تھا، میں نے نوٹ کیا کہ جب کبھی سکندر نہیں آتا تھا تو وارث آنے بہانے رونے لگتا، اسے بخار ہو جاتا، میں نے بچے کے لیے یہ سب برداشت کیا تھا، اپنی زندگی داؤ پر لگا دی تھی، سکندر کی اداسی مجھ سے سہی نہ گئی تو میں نے اسے گھر آنے جانے کی اجازت دے دی، گھر میں آنا جانا شروع ہوا تو ایک روز سکندر نے قدم آگے بڑھا دیئے۔ پہلے کی طرح اپنے قریب آنے کو کہا۔

''تمیز سے رہو اگر میں نے وارث کی وجہ سے تمہیں گھر آنے جانے کی اجازت دی ہے تو گھر والا بننے کی کوشش نہ کرو، تم کیا سمجھتے ہو میں ماضی کو دہراؤں گی، یہ مت سمجھنا میں کمزور پڑ گئی ہوں اور مجھے تمہارے سہارے کی ضرورت ہے، میں اپنے بچے کو اداس نہیں دیکھ سکتی، اور تمہارا اس کے ساتھ خون کا رشتہ ہے، تمہارے بغیر وہ روتا ہے تو مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔'' میرے لہجے کی تپش نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔

''میری غلطی معاف کر دو'' اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔

''فضول ڈسٹرب نہ کرو، مجھے کنجری سمجھ رکھا ہے؟ میں کسی عشرت کدے میں سجی بساط کا مہرہ نہیں ہوں کہ جہاں چاہا اٹھا کر رکھ دیا، اس عذر خواہی سے بہتر ہے کہ کہیں سے عشق کے عرفان کا درس حاصل کرو، محبت تجارت نہیں، نہ ہی کاروبار ہے۔ لگتا ہے اپنے سرور کے لیے اس طرح کی سرمایہ کاری کرنا تم جیسوں کی سرشت ہے۔'' میرے طنز کے تیروں، اندر کے غبار سے اٹے اور زہر میں بجھے الفاظ نے اس کے اوسان خطا کر دیئے۔ ''جب نبھانی نہیں تھی تو لگائی کیوں تھی، آج کے بعد مجھے چھوا بھی تو ہاتھ توڑ کے رکھ دوں گی۔'' بچے سے ملو اور جاؤ'' میرا غصہ ٹھنڈا ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ ''ورنہ میں پولیس بلا لوں گی۔'' میں نے اسے باہر کا رستہ دکھایا، اس نے چپ سادھ لی، بچہ اس کی کمزوری تھی پھر وہ چپ چاپ آتا وارث سے کھیلتا اور چلا جاتا۔

بالآخر بات سکندر کی بیوی تک پہنچ ہی گئی، وہ غصے میں جلی بھنی میرے گھر آ پہنچی۔ گھر میں گھستے ہی اس نے کہا۔

''بدذات تمہیں میرا ہی گھر ملا تھا اجاڑنے کو، تھوڑی دنیا ہے،

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کسی اور کے گھر ڈاکا ڈال لیتی، ایک بیہ پیدا کرلیا ہے، حصہ مانگنے کے لیے۔'' وہ وارث کی طرف بڑھی۔

''بہن جی!'' میں بھاگ کر بیچ میں آ گئی، مجھے جو مرضی کہہ لیں۔ ''میں آپ کی چور ہوں، پر بچہ.....''

''چپ کر کلموہی، زیادہ اچھا بننے کی کوشش نہ کر میرے سامنے، میں تم جیسی عورتوں کو اچھی طرح سے جانتی ہوں، دوسروں کے خاوند اپنے بس میں کرلینا تو تمہاری جیسی عورتوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے لیکن میں بھی کسی گئے گزرے خاندان سے نہیں ہوں، بڑی ڈاڈھی عورت ہوں میں، تم جیسی کئی آئیں اور گئیں پر سکندر کو مجھ سے نہیں چھین سکیں، میں ان عورتوں میں سے نہیں ہوں جو پریشان ہو کر دوسرے دن ہی خلع کا کیس کر دیتی ہیں یا طلاق مانگ لیتی ہیں۔ میں یہی سمجھتی ہوں کہ میرا آدمی دو گھنٹے خنجری کے کوٹھے پر جاتا ہے، پر رات کو میرے پاس میرے گھر ہی آتا ہے، تمہارے جیسی دس بھی آ جائیں تو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں، پرائی آگ پر کتنے روز خود کو سینک لو گی، آخر آدمی تو میرا ہی رہے گا۔'' وہ انگارے برساتی، دل پر چرکے لگاتی چلی گئی۔

مجھے اس پر ترس آیا، دھوکا تو اس کے ساتھ بھی ہوا تھا، میرے من میں تھا کہ حدیقہ بدصورت سی ہوگی لیکن وہ تو من موہنی صورت، پتلے پتلے نین نقش اور بھرے بھرے جسم والی خوبصورت خاتون تھی، میں خود کو کوسنے لگی، انجانے میں ایک شادی شدہ مرد سے پیار کر کے میں نے کتنی بھیانک غلطی کی تھی، شاید میں حالات کے دھارے میں بہہ گئی تھی، لیکن میرا قصور کیا تھا، سکندر نے ہی حدیقہ کا ایسا غلط نقشہ میرے سامنے کھینچا تھا، میں اس غلط فہمی کے راستے پر ایسے چلی کہ ہر رہگور سے بلاسوچے سمجھے گزرتی چلی گئی۔

حدیقہ نے پوری کمیونٹی میں ڈھنڈورا پیٹ دیا کہ میں اس کے شوہر کو لوٹ کر کھا رہی ہوں، ایک روز سکندر کہیں باہر گیا ہوا تھا کہ اس کا لڑکا آ گیا، میں نے دروازہ کھولا ''آنٹی میرے ڈیڈ آج باہر گئے ہوئے ہیں، اگر تمہارا گزارا نہیں ہوتا تو آج کی رات میں آ جاؤں آپ کے پاس۔'' وہ طنزیہ ہنسی ہنسا، اس نے مجھے اتنی بڑی گالی دی تھی کہ میرے ہوش اڑ گئے، لیکن میں اسے کیا کہتی، پر اس دن سے مجھے حدیقہ سے بھی شدید نفرت ہوگئی۔ جس نے انتقام کے لیے ایک معصوم بچے کا سہارا لیا تھا۔

میرے نزدیک تو پیسے کی پہلے ہی کوئی اہمیت نہیں تھی لیکن اب پیسے والے بری طرح میرے سامنے ننگے ہو گئے تھے، مجھے لگا ضروری نہیں اچھے پیرہن کے پیچھے شخصیت بھی اچھی ہو۔ امیروں سے میرا جی کھٹا ہو گیا اور میں نے پہلے سے بھی زیادہ محنت شروع کر دی، اوور ٹائم لگانا شروع کر دیا۔ میں وارث کو بہت اچھی تعلیم دلوانا چاہتی تھی، میرے دل کی خواہش تھی کہ وہ بہترین اسکول میں پڑھے اور ایک شاندار، سلجھی ہوئی شخصیت کا مالک بنے۔

'' مجھ سے ہر ایک نے نفرت کی ہر آدمی نے مجھے ہی غلط سمجھا، شاید میرا بیٹا بھی بڑا ہو کر مجھے ہی قصوروار سمجھے، لیکن اپنے خون پسینے سے اسے پال پوس رہی ہوں، اس میں ساری عادتیں اپنے باپ والی ہیں، وہی آنکھیں، وہی ہونٹ، وہی مسکان، جب یہ میرے ساتھ کھیلتا ہے میرے پاؤں پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے سکندر میرے سامنے بیٹھا ہے، سکندر کو تو معاف نہیں کر سکتی، معاف بھی کیا کروں میں کون سا اس سے نفرت کرتی ہوں، نفرت بھی تو اس سے کی جاتی ہے جس کی آپ کی نظروں میں کوئی اہمیت ہو، جو بندہ نظروں سے گر جائے وہ نفرت کے قابل بھی نہیں رہتا، کسی نے سچ ہی کہا کہ انسان پہاڑ سے گر کر تو شاید اٹھ جائے لیکن کسی کی نظروں سے گر جائے تو پھر زندگی کا آخر سمجھے، اب میں اور میرا بیٹا، بس یہی میری زندگی ہے..... اگر یہ نہ ہوتا تو پتا نہیں میں آج کہاں ہوتی۔'' شاہین نے اپنی کہانی کا اختتام کیا۔

''شاہین تمہارا بچہ بہت کیوٹ ہے کیا تجھے کبھی خیال نہیں آیا کہ وہ ایک دیندار شخص بنے اپنے رب کو اور اس کے دین کو سمجھے۔'' میں نے کہا۔

''ایک دفعہ جب وارث 6 سال کا تھا اسکول سے آیا، رات کو اسے سلانے کے لیے میں جب اسے کہانی سنانے لگی تو اس نے کہا ''مم ٹیل می سم تھنگ اباؤٹ اسلام اینڈ ہاؤس آف گاڈ آئی وانٹ تو سی دی ہاؤس آف گاڈ' وین وی گو ٹو دیئر۔''

جب اس نے میری گردن کو اپنی چھوٹی چھوٹی بانہوں میں لپیٹا تو مجھے تب لگا کہ جیسے میرا بھی کوئی گن میرے بیٹے میں ہے، مجھے اس پر بے تحاشہ پیار آیا۔ میں چاہتی تھی کہ اسے اللہ کا گھر (خانہ کعبہ) بھی دکھاؤں۔ میں پہلے پاکستان لے جا کر اسے وہاں کا ماحول، جگہ جگہ موجود اللہ کے گھر (مساجد) دکھانا چاہتی تھی، وارث کی پرورش کے ساتھ ساتھ میں نے باقاعدگی سے دین کی تعلیم بھی لینا شروع کر دی تھی، میرے اندر ایمان کا دیا روشن ہو چکا تھا، ایک روز عالمہ بیان کر رہی تھی ''بے پردہ عورتیں جنت کی خوشبو بھی نہیں سونگھ سکیں گی۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

1792ء میں لندن میں ایک عورت تھی جس کا نام میری دول سٹون کران تھا۔ اس نے سب سے پہلے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ عورت کو آزاد کیا جائے، اس سے قبل یورپ کی عورت بھی آزاد نہ تھی۔ اس عورت کے مطالبے پر یہاں عورتیں آزاد ہو گئیں یہ آزادی انہیں کہاں لے گئی ہے اس کا اندازہ لگانے کے لیے لندن میں 1998ء میں ایک سروے ہوا جس میں عورتوں سے پوچھا گیا کہ وہ گھریلو زندگی جینا چاہتی ہیں یا مادر پدر آزادی کی ہی خواہاں ہیں، تو 98 فیصد خواتین نے جواب دیا تھا ہم گھر لوٹنا چاہتی ہیں، لیکن ہمیں خاوند کوئی نہیں ملتا، بوائے فرینڈ ملتے ہیں، جو استعمال کرتے ہیں پھر ٹشو پیپر کی طرح پھینک دیتے ہیں۔''

میرے ساتھ بھی تو یہی ہوا تھا، لیکن میں نے توبہ کا دامن پکڑ لیا، دن میں کئی بار اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتی ہوں، اب میرے دل میں ایمان کی شمع جل اٹھی ہے، اندر کی ویرانیوں میں بہار آ رہی ہے تو ساتھ قرار بھی آ رہا ہے۔

بہرکیف! میں نے اپنے وارث کو پاکستان لے جانے کے لیے چند روز بعد کے ٹکٹ بک کرا لیے، سکندر کو معلوم ہوا تو اول فول بکتا رہا۔ ''بچے کو لے کر کہاں جاؤ گی، اس گرمی میں! بیمار ہو جائے گا۔'' لیکن میری ضد کے آگے اس کی ایک نہ چلی، وہ بھی ساتھ جانے کو تیار ہو گیا۔

وہ مجھے اپنے گاؤں لے گیا، میرے اندر جیسے کوئی دیا روشن ہو گیا ہو، شاید وہ مجھے اپنے والدین کے گھر لے جائے گا، شاید وہاں جا کر ہی وہ اس رشتے کو کوئی نام دے دے، میرا مان سمان رکھ لے، لیکن وہ مجھے ایک کھوہ والی حویلی میں لے گیا، کھیتوں میں کھوہ کے قریب ایک کچا پکا گھر تھا، وہیں شاید خاص مہمانوں کو ٹھہرانے کے لیے گیسٹ ہاؤس بنا ہوا تھا۔ مجھے پھر اپنی اوقات یاد آ گئی، دل میں روشن ہونے والا دیا نفرت کے جھونکے نے بجھا دیا، نہ تو اس کے گھر والوں سے کوئی مجھے ملنے آیا اور نہ ہی وہ مجھے گھر لے کر گیا، شاید لوگ کہتے ہوں گے انگلینڈ سے کوئی گرل فرینڈ آئی ہوگی۔

ہم نے سارا پنجاب دیکھا، ملتان میں اولیاء اللہ کے مزاروں پر گئے، لاہور میں بادشاہی مسجد دیکھی، داتا دربار جا کر دعا مانگی، اسلام آباد میں فیصل مسجد دیکھی، وارث یہ سب دیکھ کر مبہوت سا تھا۔ واپسی سے ایک روز قبل میں وارث کو لے کر ایک ولی اللہ کے دربار پر حاضری کے لیے گئی کہ اللہ سے دعا مانگوں میری کوتاہیاں معاف کر دے، میرے ساتھ ایک ماہ کے لیے رکھی گئی ماسی بھی تھی، وہ ہر جگہ وارث کو گود میں اٹھائے میرے ساتھ ہوتی تھی، میں قریب ہی ایک ایسی مسجد میں گئی جہاں خواتین کے جمعہ کی ادائیگی کا بھی انتظام تھا، مسجد کا اوپر والا حصہ خواتین کے لیے مخصوص تھا، وہ بھی جمعہ کا دن تھا، جمعہ کی ادائیگی کے بعد معلّمہ نے پوچھا ''یہ بچہ کون ہے؟''

''ولیت سے چھوٹی چودھرانی جی آئی ہیں، بی بی جی اپنے سکندر بابو کی گھر والی ہیں، یہ بچہ انہی کا ہے۔''

معلّمہ نے وارث کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا، ماسی اور مجھے بھی دعائیں دیں، مسجد کے صحن میں آ کر میرے دل کی جو حالت ہوئی وہ میں ہی جانتی تھی، ماسی نے مجھے وہ رتبہ دے دیا تھا جو کوئی بھی دینے کو تیار نہ تھا، میرے اندر پھر دیئے روشن ہو گئے۔ میں ماسی کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی، اور جی بھر کر روئی، وارث کی پیدائش کے بعد آج میں پہلی بار روئی تھی، ماسی نے مجھے آنکھوں پر جگہ دی تھی۔

''آفرین ہے ماسی تم پر، تم نے ماں کا منصب تو جانا۔''

میرے منہ پر شفق پھوٹ پڑی تھی لیکن آنسو رکنے کا نام نہ لے رہے تھے۔

''بس کرو چودھرانی جی، ہمیں کیا نہیں پتا، سب جانتے ہیں! پر کہہ نہیں سکتے، منہ کو قفل لگے ہوئے ہیں، بڑے لوگوں کی بڑی باتیں، ہم تو کمی کمین ہیں لیکن پتا ہر بات کا ہے، بھلا دائی سے پیٹ بھی کبھی چھپا ہے، میں کیوں جھوٹ بولوں، رب کے گھر میں کھڑی ہوں۔'' پتا نہیں وہ کیا کیا بولے جا رہی تھی، لیکن میرے کانوں میں ایک ہی آواز گونج رہی تھی۔

سکندر کے گھر والی ..... سکندر ..... کے ..... گھر ..... والی ..... چھوٹی چودھرانی ..... چودھرانی ..... سکندر کا کا کا ..... سکندر کا کا کا ..... سکندر ..... چودھرانی ..... کا کا ..... ماسی کے مقدس الفاظ نے جیسے میرے سارے دکھ، درد، غم، گلے، شکوے جڑ سے ختم کر دیئے تھے، تبھی میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اپنے ''وارث'' کو اس رب کا نیک بندہ بناؤں گی جس رب کے گھر میں پہلی بار کسی نے مجھے پہچانا تھا، عزت و توقیر کی چادر سے میرا گناہ گار سر ڈھانپا تھا، ماسی کا چہرہ مجھے بڑا ہی مقدس لگا، میں نے نم آنکھوں سے ماسی کو دیکھا اور بے خودی کے عالم میں آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا اور میں نے لوٹ کر انگلینڈ جانے کا فیصلہ برے خواب کی طرح ذہن سے جھٹک دیا۔ پھر بچے کو لیا اور نہایت خاموشی سے یہاں امریکا آ گئی کیونکہ یہاں مجھے بھرپور قانونی تحفظ ہے۔ اگر سکندر ڈھونڈ بھی لے گا تو میرا کچھ بگاڑ نہیں سکے گا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

شریکِ سفر

جنابِ من
مؤدبانہ سلام
ارسال کردہ سچ بیانی میرے ایک دوست کی ہے جس نے اپنے باپ کی دی ہوئی زبان کا پاس رکھتے ہوئے ایک ایسی لڑکی سے شادی کی جو مکمل طور پر بھٹک گئی تھی مگر وہ اسے راہِ راست پر لے آیا۔ سبق حاصل کرنے کے لیے اس تحریر کو ضرور شاملِ اشاعت کریں۔
غلام رضا جعفری
(کراچی)

گرم زمین پر پیر رکھتے ہی مجھے ایسا لگا کہ جیسے زمین پر انگارے پھیلا دیئے ہوں۔ تپش بہت ہی شدید تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے میں ننگے پاؤں آ گیا ہوں۔
بائیں ہاتھ میں بھاری کارٹن پکڑ کر اترنا آسان بھی تو نہ تھا۔ بیک فورس کے مخالف سمت میں اترنے کے لیے چہرہ آگے کرنا ضروری تھا پھر بھی میں لڑکھڑا گیا مگر فوراً ہی میں نے خود کو سنبھال تو لیا پھر بھی اسٹاپ پر کھڑی ایک لڑکی سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ ہماری ٹکر ہو جاتی اگر وہ لڑکی خود ہی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ایک طرف کو نہ ہو جاتی۔

''سوری.....'' میں نے اس لڑکی سے معذرت کی اور اسٹاپ پر کھڑے ہوئے لوگوں کے درمیان ٹھہر کر سستانے لگا۔ پسینا تھا کہ پرنالے کی طرح جسم سے ابل رہا تھا۔ دھار یں کیڑے کوڑوں کی طرح پیٹھ پر رینگتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ وزنی کارٹن ایک طرف رکھا اور پینٹ کی جیب سے رومال نکال کر اپنے چہرے کو صاف کرنے لگا تھا کہ وہ لڑکی میرے قریب آ گئی۔

''آپ دیکھ نہیں سکتے؟'' اس نے غصیلے لہجے میں کہا۔

اس کا لہجہ تلخ تھا۔ مجھے بہت برا لگا۔ میں نے کہا۔ ''کیوں نہیں دیکھ سکتا۔''

''اگر مجھ سے ٹکرا جاتے تو پھر.....؟'' اس نے کہا۔

''مگر میں آپ سے ٹکرایا تو نہیں ناں..... پھر آپ سے معذرت بھی کر لی ہے۔''

''ارے واہ بہت اچھا ڈھونگ ہے۔ اتنے لوگوں میں سے ایک میری طرف ہی آنا تھا۔''

''محترمہ! ہم کوئی ٹکرائے تو نہیں ناں؟'' میں نے دھیمے لہجے میں جواب دیا مگر وہ کچھ سننے پر تیار نہیں تھی۔ اونچی آواز میں بولے جا رہی تھی۔ لوگوں کی نظریں ہم پر جم گئی تھیں۔

''یہی تو میں پوچھ رہی ہوں کہ اگر مجھ سے ٹکرا جاتے تو پھر کیا ہوتا؟''

''تو پھر جو کچھ ہوتا وہ تو ٹکرانے کے بعد ہی ہوتا۔'' میں نے اس بار ذرا بلند آواز میں جواب دیا۔

''اگر ٹکرا جاتے ناں تو اس کا بہت برا نتیجہ نکلتا۔'' اس نے بھی بلند آواز میں کہا۔

''ارے واہ آپ خوامخواہ آ بیل مجھے مار والی بات کر رہی ہیں۔'' میں نے بھی تلخ لہجہ اپنا لیا تھا۔ اسی نے مجھے ایسا کرنے پر مجبور کیا تھا۔

اسی دوران بس آ گئی۔ اس سے ایک نوجوان اترا۔ وہ لڑکھڑایا اور اسی لڑکی سے ٹکرا گیا۔ وہ لڑکی اس کی طرف گھوم گئی۔

''تمہیں شرم نہیں آتی۔ دکھائی نہیں دیتا۔'' اس نے نوجوان کو جھڑکا۔

''تو ایک طرف ہو جاؤ ناں..... بیچ میں کھڑی ہو کر کیا کر رہی ہو۔ کوئی شکار نہیں ملا کیا۔'' اس نوجوان نے اس سے بھی تیز آواز میں جواب دیا۔ اس لڑکی نے جو اس نوجوان کے بدلے ہوئے تیور دیکھے تو ذرا آگے جا کر کھڑی ہو گئی۔

''چلو اچھا ہوا۔ میرے سر سے بلا ٹلی۔'' میں نے سوچا۔

وہ نوجوان بھی کوئی سر پھرا تھا۔ اس نے پہلی بار ہی میں ایسا منہ توڑ جواب دیا تھا کہ وہ خاموش ہو گئی تھی۔ یوں بھی اس نوجوان کا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ وہ اس لڑکی سے ٹکرا گیا تھا لیکن بس سے اترنے والے ہر ایک کی ایسی ہی حالت ہوتی ہے۔ میں نے لڑکی کی طرف دیکھا اور کارٹن کو کندھے پر اٹھا لیا۔

یہ پھر کالونی کا علاقہ تھا اور مجھے اپنا یہ بھاری کارٹن لے کر ریلوے پٹڑی کے اس پار جانا تھا۔ ریلوے پٹڑی کے ساتھ ساتھ بنے ہوئے بھینسوں کے باڑوں کو عبور کرنا ایک کٹھن مرحلہ تھا کیونکہ باڑے میں سوکھے اور تازہ گوبر میں سے گزر کر جانا بہت دشوار تھا۔

ان دنوں میں ایک لوکل جوس کمپنی میں آرڈر بکر کے طور پر کام کر رہا تھا اور چھوٹے موٹے آرڈرز کی سپلائی بھی میں خود ہی کر دیتا تھا۔ آج بھی چند ایک دکانوں پر سپلائی دینا تھی۔ اس لڑکی کی تکرار سے میرا وقت برباد ہوا تھا جو میرے لیے ٹینشن کا باعث تھا۔

میرے پاس بائیک نہ تھی اس وجہ سے مجھے بسوں پر سفر کرنا پڑتا تھا۔ کمپنی والوں نے مجھے موٹر بائیک کے بغیر جاب پر رکھنے سے منع کر دیا تھا مگر میرے ایک دوست عامر جو اسی کمپنی میں کام کرتا تھا اس کی سفارش نے یہ مشکل آسان کر دی اور کمپنی والے مان گئے۔ مختلف علاقوں سے آرڈر بک کر کے کمپنی میں نوٹ کرواتا تو کمپنی سپلائی دے دیتی لیکن چھوٹے آرڈر میں اپنے طور پر ہی سپلائی دے دیتا جس کا مجھے اضافی کمیشن ملتا تھا۔

اس دن کی سپلائی نہیں ہو سکی تھی۔ دو تین دکانوں کے آرڈرز ملے تھے اور اتفاق سے وہ دکانیں بند ملیں۔ موبائل فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی تو بھی ناکامی ہوئی۔ مجبوراً مجھے کارٹن ایک بار پھر کندھے پر اٹھا کر اسی راستے سے واپس بس اسٹاپ تک آنا پڑا۔

بس اسٹاپ پر وہ لڑکی ابھی تک کھڑی تھی۔ جب کہ میں تقریباً ایک گھنٹے بعد واپس آیا تھا۔ اتفاق سے وہ میری طرف ہی دیکھ رہی تھی مگر میں نے توجہ نہ دی اور قریب کھڑے لیموں پانی والے ٹھیلے کی طرف بڑھ گیا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

میں نے ابھی لیموں پانی کا گلاس اپنے منہ سے لگایا ہی تھا کہ اس کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

''ایک گلاس مجھے بھی دینا۔'' اس نے کہا اور ٹھیلے پر سے بھرا ہوا گلاس اٹھا کر پینے لگی۔ وہ بالکل میرے قریب کھڑی تھی۔ اس کی نظریں مجھ پر تھیں اور نہ جانے کیوں میں اس لڑکی سے نظریں چرا رہا تھا۔

اس نے خالی گلاس ٹھیلے پر رکھا اور واپس مڑی تو ٹھیلے والے نے اس سے کہا۔ ''پیسے تو دے کر جاؤ۔''

''ان سے لے لو۔'' اس لڑکی نے میری طرف اشارہ کر کے کہا تو میں حیرت زدہ رہ گیا۔

''واہ بھئی واہ، مان نہ مان میں تیرا مہمان۔'' میں نے یہ کہا نہیں صرف سوچا تھا اگر میں کچھ کہتا تو وہ ضرور بحث کرنے لگتی اس لیے میں نے خاموش رہنے میں ہی عافیت سمجھی۔ دیکھنے میں تو وہ ٹھیک ٹھاک لگتی تھی مگر میرے خیال میں وہ نفسیاتی تھی۔ اس کے ساتھ کوئی ایسا واقعہ یا حادثہ ضرور پیش آیا ہوگا جس نے اسے اکھڑ مزاج بنا دیا تھا۔

''یہ اسی علاقے کی ہے؟'' میں نے شربت والے سے پوچھا۔

''میں ابھی پوچھ کر آتا ہوں۔'' ٹھیلے والے نے ہنس کر کہا۔

''نہیں نہیں..... رہنے دیں۔'' میں نے اسے منع کر دیا۔

''کیا بات ہے؟ پہلی ہی نظر میں لٹو ہو گئے۔'' شربت والے نے شوخ انداز میں کہا۔

میں نے اسے دو گلاس شربت کے پیسے دیئے اور بس کی طرف بڑھا تبھی شربت والے نے بلند آواز میں کہا۔ ''ذرا سنبھل کے رہنا پیارے یہ پھر ٹکرائے گی۔''

میں نے اس کی بات کو سنی ان سنی کر دی اور بس میں سوار ہو گیا۔

اس لڑکی کی اس حرکت نے مجھے الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔ سارے راستے میرے دماغ میں اسی کا خیال آتا رہا۔ دفتر پہنچا تو بھی الجھن گھیرے ہوئے تھی۔ جلدی جلدی آرڈر نوٹ کرایا اور مال واپس کر کے گھر لوٹ آیا۔

گھر آ کر میں نے اپنے جسم کو بیڈ پر گرا دیا۔ اس وقت بھی میں ایسی سوچ میں مبتلا تھا۔ برابر والے بیڈ پر عامر لیٹا تھا۔ اس کی نظریں مجھ پر لگی ہوئی تھیں۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا ہوا بھئی کس کے سپنے جگا رہے ہیں۔ نیند نہیں آ رہی تو مووی وغیرہ دیکھ کر ٹائم پاس کر لو۔ شروع شروع میں ایسا ہی ہوتا ہے اور پھر وقت کے ساتھ سب کچھ نارمل ہو جاتا ہے۔''

عامر نے حسبِ عادت چھیڑ خانی کی۔

''نہیں یار..... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''تو پھر کیا بات ہے؟'' اس نے پوچھا۔ پھر اٹھ کر ٹیبل تک گیا اور نمکو کا پیکٹ میرے سامنے لا کر رکھ دیا۔ ''کھاؤ دماغ کو فریش کرو۔ کوئی بھی مسئلہ ہو تو دوستوں سے شیئر کر لیا کرو۔''

''کیوں؟'' ایک دم میرے منہ سے نکلا۔ ''اس لیے کہ مسائل کو شیئر کرنے سے نہ صرف مسئلے کا حل نکلتا ہے بلکہ ذہن کا بوجھ ڈپریشن بھی نہیں بنتا۔'' اس نے کسی پروفیسر کی طرح لیکچر دیتے ہوئے کہا تو میں نے اسے صبح ہونے والے واقعے کے بارے میں بتا دیا۔

''بس اتنی سی بات اور اتنا ٹینشن۔'' وہ ہنسنے لگا۔ ''آئی ہو گی گھر سے لڑ جھگڑ کر۔ شوہر کی ڈانٹ ڈپٹ کا غصہ تمہارے اوپر نکالا ہو گا بے چاری نے۔'' عامر نے کہا اور ٹی وی بند کیا۔ لائٹ آف کی اور مجھے بھی سو جانے کی ہدایت کر کے سو گیا۔

اگلے دو روز بعد میرا کسی کام سے صدر جانا ہوا تو بس اسٹاپ پر کچھ لوگ دائرہ بنائے کھڑے تھے۔ کسی مرد اور عورت کے لڑنے کی اونچی اونچی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں بھی معاملے کی نوعیت کو سمجھنے کی غرض سے اس جانب گیا اور وہ منظر دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ وہی لڑکی آج پھر ایک نوجوان سے الجھ رہی تھی۔ اس کا لہجہ اسی طرح تلخ اور آواز بلند تھی۔ جواب میں وہ نوجوان لڑکا بھی اس کے ساتھ تکرار کر رہا تھا۔ لڑکی کہہ رہی تھی۔ ''وہ تو میں نے خود اپنے آپ کو بچا لیا تھا ورنہ تم تو گھوڑے کی طرح دوڑے چلے آ رہے تھے۔''

''تو اچھا ہوا ناں! آپ نے اپنے آپ کو بچا لیا۔ خود کو کسی حادثے سے بچانا کوئی بری بات نہیں ہے۔'' لڑکے نے جواب دیا۔

''میں بکواس سننے کی عادی نہیں ہوں۔'' لڑکی نے کہا۔

''محترمہ شاید آپ گھر سے لڑ کر آئی ہیں یا پھر مجھ سے خوامخواہ لڑنے کے موڈ میں ہیں۔''

''میرا جی چاہا کہ میں معاملے کو رفع دفع کرا دوں اور

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اس لڑکے کو سمجھا دوں کہ یہ لڑکی ایسی ہی ہے۔ مت کرو اس کے ساتھ بحث، میں اس کو بھگت چکا ہوں۔'' مگر زبان نے ساتھ نہ دیا۔

''ارے چھوڑو نا یار..... کیوں لڑکی سے منہ لگ رہے ہو۔'' ایک صاحب نے اس لڑکے سے مخاطب ہو کر کہا۔

''کیا کہا؟ میں اس کے منہ لگ رہی ہوں۔ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔'' وہ لڑکی اس آدمی سے الجھ پڑی۔ وہ کوئی مزاج کا اچھا آدمی تھا جب ہی تو ہنسنے لگا۔ ہجوم کے لوگ بھی ہنستے ہوئے اِدھر اُدھر ہو گئے لیکن میرے لیے غور طلب بات یہ تھی کہ یہ لڑکی ہر ایک سے ایسا کیوں کرتی ہے۔ بہر حال یہ اس کا ذاتی مسئلہ ہے مجھے اس میں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ اس خیال سے میں آگے بڑھ گیا۔ چند ایک جنرل اسٹورز پر میں نے اپنی کمپنی کی پروڈکٹ متعارف کرائی مگر کوئی آرڈر نہیں ملا۔

گھر پہنچ کر لیٹا ہی تھا کہ پینٹ کی جیب میں رکھے موبائل نے وائبریشن شروع کر دی۔ میں نے جیب سے موبائل نکالا اور کال ریسیو کی۔

''السلام علیکم!'' میں نے سلام کیا۔ کال ابو کی تھی۔

''شہزاد خان کے ہاں چلے جانا۔'' رسمی گفتگو کے بعد انہوں نے کہا۔ ''شہزاد خان میرے دوست ہیں اس کی بیٹی سے میں نے تمہارا رشتہ پکا کر دیا ہے۔'' ابو نے بتایا۔

''ا..... اچھا.....'' میں نے جواب میں صرف اتنا ہی کہا۔

''شہزاد خان کی طبیعت بھی خراب ہے۔ ان کی طبیعت پوچھ لینا۔ میں نے فون پر تمہارے بارے میں بتا دیا ہے۔'' ابو نے کہا اور پھر انہوں نے شہزاد صاحب کا ایڈریس لکھوا دیا۔

یہ خبر میرے لیے خوب صورت تحفے سے کم نہ تھی۔ ایسا حسین تحفہ جو یقیناً ہر ایک کی زندگی میں بہت ہی اہمیت کا حامل ہوتا ہے جو زندگی کی ایک نئی راہ پر چلنے کا دعوت نامہ ہوتا ہے جس میں ایک تنہا مسافر کے ساتھ ایک نیا شریکِ سفر شامل ہوتا ہے اور پھر زندگی کے اس سفر میں دونوں ہم سفر زندگی کے ہر دکھ سکھ کو شیئر کرتے ہوئے اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہتے ہیں۔ دل میں ہونے والی خوشی آپ ہی آپ لبوں پر آئی تو چہرہ کھل اٹھا۔ دل کے کسی نہاں خانے میں چھپی ہوئی وہ خوشی جو کبھی محسوس ہی نہ کی تھی۔ آج اپنی تمام تر رازداریوں کو یکدم عیاں کر رہی تھیں۔ جی چاہ رہا تھا کہ ہوا کے دوش پر سوار ہو کر فوراً ہی اپنے سسرال پہنچ جاؤں اور دیکھوں تو سہی کہ وہ کون ہے جو میرے مقدر کو چمکانے آ رہی ہے۔

''کیا ہوا بھئی خیریت تو ہے ناں..... خود بخود مسکرائے جا رہے ہو، اب تھوڑی دیر میں رونا شروع مت کر دینا۔ یہ نفسیاتی مریضوں کی خاص علامت ہے۔''

عامر کی بات سن کر یکدم میری ہنسی کافور ہو گئی اور میں نے عامر کو ابو کی فراہم کردہ اطلاع کے بارے میں بتایا۔

''یعنی عنقریب میرے دوست کو عمر قید ہونے والی ہے۔'' عامر نے ہنس کر کہا۔

جاگتی آنکھوں میں تصورات لہرانے لگے اور خوب صورت شاداب چہرے اپنے حسن کی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ میری آنکھوں کے سامنے آنے لگے تھے۔ ان تصور میں آنے والی حسیناؤں میں سے کون میری شریکِ سفر ہونے والی تھی۔ اس بارے میں مجھے خود بھی معلوم نہ تھا۔ کیوں کہ اپنی مقدر کی لکھی ہوئی اس شریکِ سفر حسینہ کو ابھی تک میں نے نہیں دیکھا تھا۔ یہ تو ایک خوب صورت تصور تھا جو نت نئے روپ میں میرے سامنے آ رہا تھا۔

''واپس آ جاؤ۔ اپنے اس کباڑ جیسے مکان میں۔'' عامر نے مجھے جھنجوڑتے ہوئے کہا تو میں سچ مچ ہی تصورات کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں واپس آ گیا۔

''کھانے پینے کا بھی کچھ کرو۔ بھوک لگ رہی ہے۔'' اس نے کسی تھانیدار کی طرح رعب دار آواز میں کہا۔

''میں کچھ لے کر آتا ہوں۔'' میں نے کہا اور گھر سے باہر نکل گیا۔ مارکیٹ سے دو عدد برگر لیے اور چائے کا سامان لے کر آ گیا۔ چائے تیار کی اور برگر کھا کر شکر خدا کیا۔

کچھ دیر آرام کرنے کی غرض سے چارپائی پر لیٹ گیا۔ ابھی دن پوری طرح ڈھلا نہیں تھا لیکن سائے طویل ہو رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے لیے آنکھیں میچ کر لیٹا اور پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بے قراری بڑھ رہی تھی۔ دل تھا کہ بار بار سسرال کی چوکھٹ پر جانے کے لیے اکسا رہا تھا۔ ابو نے جو پتا لکھوایا تھا جیب سے وہ کاغذ کا پرزہ نکالا اور پڑھا اور پھر ایک دو بار نہیں بلکہ کئی بار اس پرزے پر نظریں جمائیں اور ہٹائیں۔ میں نے اس ایڈریس کو بار بار پڑھا۔

''شہزاد انکل کے ہاں جانا ہے۔ میرا وزٹ بھی اسی طرف کا ہے۔'' میں نے عامر سے کہا۔

مارکیٹنگ کے کام سے فارغ ہونے کے بعد حسب

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

عادت میں منصور سموسے پکوڑے والے کے پاس جا پہنچا۔ یہاں میں اکثر آیا کرتا تھا۔ میرے یہاں پہنچتے ہی وہ ایک پلیٹ میں کچھ پکوڑے ایک سموسہ رکھ کر میرے سامنے رکھتا اور خود ہی سامنے والے ہوٹل پر چائے کا آرڈر بھی دے آیا کرتا تھا۔ وہ اخلاق کا بہت اچھا تھا۔

میں نے سموسے کی پلیٹ لیتے ہوئے پوچھا۔ ''یار تم نے اب تک بتایا نہیں کہ تمہارے کتنے بچے ہیں۔''

میرا سوال سنتے ہوئے اس نے کہا۔ ''میری دو بیٹیاں ہیں لیکن اس کی بیوی بیٹیوں کو چھوڑ کر چلی گئی ہے۔''

''کہاں؟ میرے منہ سے یہ سوال بے اختیار نکل گیا تھا۔''

''اپنے گھر..... مجھ سے طلاق لے کر.....'' اس نے کہا۔

''طلاق..... مگر کیوں؟''

''میں نے اپنی مرضی سے طلاق تھوڑی ہی دی تھی، اس نے خود لی تھی زبردستی۔ کچہری جانے کی دھمکیاں دینے لگی تھی۔ اسے ٹی وی میں آنے کا شوق ہو گیا تھا۔ وہ بہت خوش تھی میرے ساتھ۔ مگر ایک شخص کی باتوں میں آ کر اس نے یہ قدم اٹھایا۔''

''کس کے کہنے میں؟''

''وہ بہت مالدار شخص تھا۔ ٹی وی کے اشتہاروں کے لیے اداکاروں کو بک کرتا تھا۔ خاص طور پر نئی نئی لڑکیوں کو۔ شروع میں اس نے مجھ سے مشورہ لیا تو میں اس پر بھڑک اٹھا، جواب میں اس نے میرے ساتھ رہنے سے انکار کر دیا۔ وہ صاف صاف بولی۔ مجھ سے نہیں ہوتا یہ پکوڑوں وکوڑوں کا کام۔ میں تو ٹی وی کے لیے کمرشل کروں گی جو عورت گھر کے کاموں میں مصروفیت کی وجہ سے دو دو دن بالوں میں کنگھا نہیں کرتی تھی۔ اپنے کپڑوں پر توجہ نہ دیتی تھی۔ گھر کی صفائی ستھرائی، بچیوں کی پڑھائی پر توجہ، پکوڑوں، سموسوں کی تیاری ہر کام کرتی تھی وہ۔ لیکن جب اس کی سوچ بدلی تو کپڑوں کو داغ تک نہ لگنے دیتی۔ بناؤ سنگھار ایسا کرتی کہ جیسے کسی فلم کی ہیروئن ہو۔ اس طرح لڑتے جھگڑتے سال گزر گئے۔ پھر کسی نے اسے شادی کا آسرا دے دیا تو وہ مجھ سے باقاعدہ طلاق کا مطالبہ کرنے لگی۔ میں نے اسے بہت سمجھایا۔ اس کے ماں باپ کو بتایا۔ انہوں نے بھی اس کو لعن طعن کی مگر وہ تھی کہ اپنی ضد پر اڑی رہی۔ پھر جب اس نے کورٹ کچہری کی دھمکی دی تو میں نے اسے طلاق دے دی۔ میں اسے چھوڑنا تو نہیں چاہتا تھا مگر یہ اس کی ضد تھی۔ اس کی مرضی تھی۔ اس کو دولت کی خواہش تھی۔ میڈیا میں شہرت کا شوق تھا۔ وہ خاموش ہو گیا۔''

''اب وہ کہاں رہتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اپنے باپ کے گھر، سنا ہے اسے بہکانے والے نے بھی اس سے قطع تعلق کر لیا ہے۔ شاید اسی لیے وہ سنکی ہو گئی ہے۔''

''سنکی ہو گئی ہے؟''

''ہاں وہ بالکل پاگلوں جیسی حرکتیں کرنے لگی ہے۔''

''طلاق کے بعد تم نے اس سے رابطہ کیا؟''

''اس کے والدین برابر والی گلی میں رہتے ہیں اس لیے اکثر نظر آ جاتی ہے۔'' پھر اس نے ایک لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

''وہ جا رہی ہے۔ نامراد۔''

میں نے اس کی انگلی کے اشارے کی طرف دیکھا تو یکدم ہی چونک گیا۔

''یہ تو وہی لڑکی تھی جو مجھے کئی جگہوں پر دکھائی دی تھی۔

''کیا نام ہے اس کا؟'' میں نے پوچھا۔

''تحریم۔'' اس نے بتایا۔ اس کے ساتھ ایک دوسری عورت بھی تھی جو اس سے کچھ بڑی عمر کی تھی۔

''یہ جو اس کے ساتھ دوسری عورت ہے ناں۔'' منصور نے کہا۔ ''اسی نے میری بیوی کو اکسایا تھا۔'' منصور نے کہا۔

وہ لڑکی اور اس کے ساتھ والی عورت کسی بات پر ہنستی ہوئی جا رہی تھیں۔ اس لڑکی نے نائٹ لباس پہنا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ والی خاتون نے بھی اپنے آپ کو خوب سنوارا ہوا تھا مگر اس لڑکی کی طرح اس عورت نے بھڑکیلا لباس نہیں پہنا تھا۔

''یہ اس ناگن کا نیا روپ ہے۔ یہ پورے شہر میں گھومتی ہے۔ کسی سے بھی خوامخواہ الجھ پڑتی ہے۔ سنا ہے کہ نفسیاتی ہو گئی ہے۔'' منصور نے کہا۔

منصور اپنے نئے آنے والے گاہک کو ڈیل کرنے میں مصروف ہو گیا اور میں اٹھ گیا میں نے ایڈریس والی پرچی نکالی اور شہزاد صاحب کے گھر کی تلاش میں چل پڑا۔ مجھے ان کا گھر ڈھونڈنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔ بس ایک دو گلیاں ہی پھرنی پڑیں تھیں۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

شہزاد صاحب کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلا۔ ایک بڑے صاحب نے سر باہر نکال کر مجھے دیکھا۔ میں نے سلام کیا۔ پھر پوچھا۔ ''شہزاد خان صاحب۔''

''جی بولیے۔'' انہوں نے کہا اور گھر سے باہر آکر سوالیہ نظروں سے مجھے گھورنے لگے۔

''میں مدثر ہوں۔ فرہاد صاحب کا بیٹا۔ انہوں نے آپ سے ملاقات کرنے کو کہا ہے۔'' میں نے اپنا تعارف کرایا تو ان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ فرطِ مسرت سے آگے بڑھے اور مجھے گلے سے لگا لیا۔ کچھ دیر تک انہوں نے مجھے اپنے ساتھ لپٹائے رکھا اور پھر الگ ہو کر کہا۔ ''ماشاء اللہ..... ماشاء اللہ..... خوب جوان ہو گئے ہو۔'' انہوں نے میری تعریف کی۔

وہ مجھے گھر کے اندر لے گئے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی میں فطرتِ انسانی کے تحت گھر کا جائزہ لینے لگا۔

''یہاں بیٹھو بلا تکلف۔'' انہوں نے چارپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور ہم دونوں چارپائی پر بیٹھ گئے لیکن کمروں کے داخلی دروازوں کی طرف ہماری کمر اور صدر دروازے کی طرف منہ تھا۔

''کون آیا ہے شہزاد؟'' کمرے سے نسوانی آواز سنائی دی۔

''آکر دیکھ لو۔ تمہارا بچھڑا ہوا بیٹا آیا ہے۔'' شہزاد صاحب نے کہا تو میں ادھر ہی دیکھنے لگا۔

ایک خاتون کمرے سے باہر نکلیں ان کی قمیص کی آستینیں چڑھی ہوئی تھیں۔ بال بکھرے ہوئے انہوں نے عجلت میں دوپٹا گلے میں لپیٹ لیا تھا۔ ان کی عمر شہزاد انکل سے کوئی دو یا تین سال کم یعنی پچاس سال کے قریب ہوگی۔ انہوں نے آگے بڑھ کر مسکراتے ہوئے میرا ماتھا چوما اور صدقے واری جانے کے قصیدے پڑھے۔

''ابو نے آپ کی طبیعت کی ناسازی کا بتایا تھا تو میں نے سوچا آپ کی خیریت معلوم کرلوں۔''

''اچھا تو صرف ان کی خیریت پوچھنے آئے ہو۔ میرا خیال نہیں آیا میرے پتر کو۔'' بلقیس آنٹی نے شکایتی انداز میں کہا ان کے چہرے پر مسکراہٹ رقصاں تھی۔

''تم ایک دم سے جلنے لگ جایا کرو۔'' شہزاد انکل نے مصنوعی غصہ دکھایا۔ ''تم اس وقت بہت چھوٹے تھے جب تمہارے ابا نے کراچی چھوڑا تھا۔ وہاں جا کر ایسے وہ مصروف ہوا کہ ہمیں بھی بھول گیا۔ یہ تو اتفاق ہے کہ ہمارے رابطے میں آگیا اب تو روز ہی فون پر باتیں ہوتی ہیں۔ آج صبح بھی ہوئی تھی۔'' شہزاد انکل نے کہا۔

''جی انکل۔'' میں نے ان کے جواب میں صرف اتنا ہی کہا تھا اور میرے پاس کہنے کو کوئی بات نہیں تھی۔

''آؤ آؤ۔'' شہزاد انکل نے کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر ایک لڑکی ٹرے اٹھائے ہمارے سامنے آگئی۔ ٹرے میں چائے کے بھرے ہوئے کپ اور ایک پلیٹ میں نمکور کھی ہوئی تھی۔

اس نے ٹرے سامنے رکھی اور تیزی سے کمرے کے اندر لوٹ گئی۔ میں حیرت زندہ تھا..... یہ وہی لڑکی تھی جس کو میں نے ایک اور خاتون کے ساتھ آتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس وقت اس نے جرسی کی فٹ شرٹ اور ٹراؤزر پہن رکھا تھا۔ اس نے آتے ہی یا ہمارے آنے کے بعد یا پھر یہ چائے ہمارے سامنے پیش کرنے سے پہلے کپڑے تبدیل کرلیے تھے۔ میک اپ دھو دیا تھا اور شرافت کا لبادہ اوڑھ لیا تھا..... میں نے سوالیہ نظروں سے شہزاد انکل کی طرف دیکھا۔ وہ بھی میری طرف ہی دیکھ رہے تھے۔ شاید انہوں نے میری نظروں میں چھپے سوالات کو پڑھ لیا تھا۔

''یہ تحریم ہے۔ میری بیٹی۔ ایک کمپنی میں سیلز کا کام کرتی ہے۔ کمپنی سے مال اٹھا کر اپنے طور پر سیل کرتی ہے۔ اس سلسلے میں اس کو مختلف علاقوں میں جانا پڑتا ہے۔ معاوضہ کے طور پر کمیشن لیتی ہے۔'' انہوں نے خود ہی سب کچھ بتایا۔

''چائے لو ناں بیٹا! ٹھنڈی ہو جائے گی۔'' بلقیس آنٹی نے چائے کا کپ اٹھا کر میری طرف بڑھایا تو میں نے چپ چاپ کپ پکڑ لیا۔

میرے دماغ میں ہتھوڑے برسنے لگے تھے۔ ایک طرف تو وہ تمام مناظر میری آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگے تھے۔ جب جب میں نے تحریم کو مختلف علاقوں میں لوگوں سے تکرار کرتے ہوئے دیکھا اور سنا تھا خود میرے ساتھ بھی اس کی جھڑپ ہو چکی تھی۔ منصور نے اس کے بارے میں بہت کچھ کہا تھا۔

''کیا ہوا بیٹا..... کیا سوچ رہے ہو۔'' بلقیس آنٹی نے میرے کندھے کو پکڑ کر کہا تو میں سوچوں کے سمندر سے باہر نکل آیا۔ اس لڑکی کے کتنے روپ ہیں میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ اس سے شادی کرنا اپنے ہاتھوں سے اپنے ہی منہ پر کالک ملنے والی بات ہے۔ اس کو شریکِ سفر بنا کر میں تو منزل تک نہیں پہنچ پاؤں گا۔ کیسے نباہ ہوگا اس کے ساتھ۔ یہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

تو ساری عمر مجھے الجھائے رکھے گی۔ قدم قدم پر ایک نیا مسئلہ کھڑا کرتی رہے گی۔ میری تو زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ لیکن ابو نے تو ہاں کردی ہے۔ ابو تو کہہ رہے تھے کہ انہوں نے ادھر میری بات بھی پکی کردی ہے مگر ابو کو کیا پتا کہ یہ لڑکی کیسی بہروپی ہے۔ وہ نہیں جانتے ہوں گے کہ اس کے بے شمار روپ ہیں۔

''کیا ہوا بیٹا؟'' شہزاد انکل نے مجھے چونکا دیا تھا۔

''کچھ نہیں۔'' میں نے مری مری سی آواز میں کہا۔

''تحریم کی شادی تو..... اس پکوڑے والے منصور کے ساتھ...'' میں نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا ہی چھوڑ دیا۔ میری بات پر ایک بار پھر ان دونوں نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا اور شہزاد انکل بولے۔ ''ہاں بیٹا! اس کی دو بچیاں بھی ہیں۔ مگر ان کی آپس میں بن نہ سکی۔''

''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

منصور نے تو بہت کچھ بتا دیا تھا لیکن میں ان کی زبان سے سننا چاہتا تھا۔ کیوں کہ ایک فریق کا کہا تو حرفِ آخر نہیں ہوتا۔

''بیٹا تم بھی ماشاء اللہ سے سمجھ دار ہو اور یہ بھی جانتے ہو کہ میاں بیوی میں ایسی کسی نہ کسی بات پر ان بن ہو ہی جاتی ہے۔'' بلقیس آنٹی نے کہا۔

''اب آپ اس کی دوسری شادی کرانا چاہتے ہیں۔'' میں نے پوچھا۔

''ہاں بیٹا! طلاق ہوگئی ناں۔ اب ساری عمر گھر بھی نہیں بٹھایا جاسکتا۔ اچھا ہے کہ اپنے گھر کی ہو جائے۔'' شہزاد انکل نے کہا۔ وہ بہت سنجیدہ تھے۔ ان کا انداز اور لہجہ منت کرنے کا سا تھا۔ وہ چہرے سے بہت مایوس اور بے بس لگ رہے تھے۔

''تم دونوں انشاء اللہ بہت خوش رہو گے۔'' آنٹی بلقیس نے کہا۔

ان کی باتیں سن کر تو میں پریشان ہونے لگا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ان کو میں کیا جواب دوں۔

''سوری آنٹی۔ میں ابھی اور پڑھنا چاہتا ہوں اور اپنا مستقبل بہتر بنانا چاہتا ہوں۔ اگر میں اس شادی وادی کے چکر میں پڑ گیا تو کچھ بھی نہ کر پاؤں گا اور میری یہ ملازمت بھی کوئی خاص نہیں ہے۔ اپنا کاروبار کرنے کا ارادہ ہے، کاروبار شروع کرنے کے بعد ہی شادی کے بارے میں سوچوں گا۔ اس میں ممکن ہے کہ چھ سات سال بھی لگ جائیں۔'' میں نے کہا اور چارپائی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

انہوں نے مزید کچھ کہنے اور مجھے روکنے کی کوشش نہ کی۔

''دراصل میں ایک گھریلو لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ جو گھر کی ذمہ داریوں کو سمجھے۔ اپنے شریکِ سفر کے ساتھ شانہ بشانہ چلے۔ ایسے اقدامات نہ کرے کہ جس سے گھر آباد ہونے کی بجائے برباد ہو جائے۔ مجھے ماڈلنگ اور اداکاری اور ڈراما وغیرہ سے بہت نفرت ہے۔ وہ ایسی مذہبی لڑکی ہو جو نماز روزہ کی پابند ہو جو مادی ضروریات کی لالچ نہ رکھتی ہو جو تھوڑی آمدنی کو بھی زیادہ سمجھ کر گزارہ کرے۔ پھر میں نے ان کو اپنے ساتھ ہونے والی تحریم کی پہلی ملاقات جو کہ ایک تکرار سے شروع ہوئی تھی اور جب جب میں نے اس کو جہاں جہاں لوگوں سے تکرار کرتے ہوئے سنا اور جو کچھ منصور نے بتایا سب کچھ بتا دیا۔ میں نے ایک بار پھر ان سے معذرت کی اور باہر نکل گیا۔

اس دن گھر آکر بھی میں بیزار ہی رہا۔ سب اللہ کی رضا سے ہونا ہے اور اللہ..... جو کچھ کرتا ہے وہ انسان کی بہتری کے لیے کرتا ہے کیوں کہ انسان کی سوچ کچھ اور اللہ کی مصلحت کچھ ہوتی ہے۔

یہی کچھ سوچتے ہوئے حسبِ عادت کمرے کے ٹھنڈے فرش پر لیٹ گیا۔ کافی دیر تک ذہن اِدھر اُدھر منتشر رہا اور پھر نہ جانے کس وقت آنکھ لگ گئی۔

جب آنکھ کھلی تو ابو حیدرآباد سے آچکے تھے۔ رسمی علیک سلیک ہوئی۔

''ابو فریش ہو جائیں۔ سفر کی تھکن ہو رہی ہوگی۔'' میں نے کہا۔

''سب کچھ ہو گیا ہے۔ فریش بھی ہو گیا ہوں اور چائے ناشتا بھی۔ اب تمہارا نمبر ہے یہ سب کرنے کا۔'' ابو نے دوستانہ انداز میں کہا۔

تھوڑی ہی دیر میں میں بھی فریش ہو کر کپڑے تبدیل کر چکا تھا۔ ابو اور عامر صحن میں ہی چارپائی پر بیٹھے تھے۔ دن تقریباً ڈھل چکا تھا۔ میں ان ہی کے پاس بیٹھ گیا۔

''ابو آپ بھی کراچی آجائیں۔'' میں نے کہا۔

''آجاؤں گا۔ ضرور آجاؤں گا لیکن جب تم تحریم کو میری بہو بنا کر لاؤ گے۔'' ابو نے گویا شرط رکھ دی۔

''ابو! تحریم کے بارے میں آپ کو حقیقت کا پتا نہیں ہے۔ آپ سنیں گے تو حیران رہ جائیں گے۔'' میں نے کہا۔

''میں سب جانتا ہوں بیٹا۔ تحریم کے بارے میں اس کی پوری فیملی کے بارے میں۔ ایک ایک بات جانتا ہوں۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ابو نے کہا۔

''پھر اس کے باوجود بھی ابو......'' میں نے کہا۔

''میرے پاس ان کے احسانوں کا بدلہ چکانے کا یہی ایک موقع ہے بیٹا۔''

''شادی اور احسان کا بدلہ۔'' عامر اور میں ایک دم چونکے اور ایک ساتھ ہی بول پڑے۔

''ہاں بیٹا! آج میں تمہیں ان کے وہ احسانات بتاتا ہوں جو انہوں نے مجھ پر اور تم پر کیے تھے۔'' اور پھر ابو بتانے لگے۔

''اس وقت ہم یہاں کراچی میں شہزاد صاحب کے پڑوس میں رہتے تھے۔ جب تم پیدا ہونے والے تھے۔ ہم یہاں کرائے کے مکان میں رہا کرتے تھے۔ تمہاری پیدائش کے وقت جب تمہاری ماں کی طبیعت بگڑ گئی تو میں کام پر گیا ہوا تھا۔ اس وقت تحریم کی پیدائش بھی قریب تھی۔ بلقیس بھابی نے اس حالت میں بھی تمہاری ماں کو قریبی سرکاری اسپتال میں پہنچایا۔ میں شام کو گھر آیا تو شہزاد نے بتایا کہ تمہاری ماں کی حالت ٹھیک نہیں ہے اور لحہ بہ لحہ بگڑتی جا رہی ہے۔ تمہاری پیدائش کے لیے آپریشن ضروری تھا اور تمہاری ماں کو خون کی اشد ضرورت تھی۔ میں جس ٹھیکے دار کے پاس کام کرتا تھا۔ وہ روز کے روز صرف خرچ دیتا تھا اور باقی رقم مہینا پورا کر کے ادا کرتا تھا۔ اس نے میرے چار ماہ کی رقم روکی ہوئی تھی۔ جو کم از کم بیس ہزار روپے بنتی تھی۔ میں نے ایک پڑوسی کو موٹر سائیکل دینے کو کہا تو اس نے اپنے چھوٹے بیٹے کو میرے ساتھ کر دیا جو مجھے ٹھیکے دار کے گھر لے گیا۔ میں نے ٹھیکیدار سے پیسوں کا مطالبہ کیا مگر اس نے پیسے دینے سے صاف صاف انکار کر دیا جب کہ وہ میرے ساتھ کے دوسرے مزدوروں کو ان کی تنخواہیں دے رہا تھا۔ اس وقت اس کے پاس چند پولیس والے بھی بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ان میں دو پولیس افسر بھی شامل تھے۔ شاید وہ کسی خاص لین دین کے لیے آئے تھے یا کوئی اور وجہ تھی۔ بہر حال میں نے اس کو تمہاری ماں کی حالت کے بارے میں سچ سچ بتایا تو اس خبیث نے مزاحیہ انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔'' اس میں کون سی بڑی بات ہے۔ اپنی گھر والی کو کہو ابھی پیسوں کا انتظام نہیں ہوا ہے جب پیسے مل جائیں گے تو بچہ پیدا کر لینا۔'' اس کی اس بات پر اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے پولیس والوں سمیت سب ہی لوگ زور زور سے ہنسنے لگے۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے غصے میں کہا۔

''اوئے شرم نہیں آتی تم کو۔'' میری اس بات پر ہمارا جھگڑا ہو گیا۔ میں نے اس کے منہ پر مکا مارا مگر وہ ہٹ گیا تو اس کے پیچھے کھڑے ہوئے پولیس افسر کو لگ گیا اور اس کی ناک سے خون جاری ہو گیا۔ پھر پولیس والے بھی مجھے مارنے لگے اور وہ مجھے پڑوسی کی اس موٹر سائیکل سمیت پولیس موبائل میں ڈال کر تھانے لے گئے۔ پڑوسی کا وہ لڑکا نہ جانے کس طرح گھر پہنچا اور اس نے اس واقعے کے بارے میں شہزاد کو بتایا۔ شہزاد محلے کے اثر رسوخ والے لوگوں کو لے کر تھانے آیا تھا مگر پولیس والوں نے میرا پرچہ کاٹ دیا تھا۔ پولیس والوں نے موٹر سائیکل بھی ضبط کر لی۔ اس کی قیمت بھی شہزاد کو ادا کرنی پڑی۔ شہزاد نے مجھے تھانے سے چھڑانے اور مک مکا کرنے کی بہت کوشش کی مگر انہوں نے مجھے جیل بھیج دیا۔ میرے خلاف دہشت گردی، ناجائز اسلحہ رکھنے اور ڈکیتی کے الزامات لگا دیئے تھے۔ دس پندرہ دن تک میری ملاقات کو کوئی نہیں آیا۔ میں جان گیا تھا کہ اس مصیبت کے وقت میرا کوئی ساتھ نہیں دے گا۔ مجھے تمہاری ماں کی فکر کھائے جا رہی تھی اور پھر وہی ہوا جس کا مجھے خدشہ تھا۔ اتنے دنوں بعد شہزاد اور بلقیس بھابی جیل میں آئے۔ انہوں نے تم کو ایک کپڑے میں لپیٹا ہوا تھا۔ اس وقت تم پندرہ دنوں کے ہو چکے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ تم تو پیدا ہو گئے مگر تمہیں پیدا کرنے والی زندہ نہ رہ سکی۔ انہوں نے بتایا تھا کہ تمہاری پیدائش کے دو دن بعد تحریم کی پیدائش ہوئی تھی۔ تمہاری ماں کے کفن دفن اور سوئم وغیرہ کے سارے معاملات شہزاد نے ہی نمٹائے۔''

''میرے بھائی، بہنیں اور دیگر رشتے دار شروع میں میری ملاقات کو آئے تو میں ان کو کہتا کہ وہ تم کو اپنے پاس رکھ لیں اور تمہاری پرورش کریں۔ مگر کسی نے بھی ہامی نہ بھری۔ کسی نے کہا کہ تمہیں اسپتال میں ہی چھوڑ دوں۔ کسی نے کہا کہ تمہیں یتیم خانے بھیج دوں۔ کسی نے کہا کہ تمہیں کسی بھیک منگے کے ہاتھوں فروخت کر دوں۔ ہر ایک نے اپنی رائے دی۔ مگر اس وقت شہزاد اور بلقیس بھابی نے اس اذیت ناک ذمے داری کو قبول کر لیا۔ بھائی بہنیں اور دیگر رشتہ دار پولیس کے لگائے ہوئے الزامات کو سچ سمجھ رہے تھے اور طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ شہزاد کی کوشش کے باوجود میری ضمانت نہیں ہو پا رہی تھی۔ شہزاد اور بلقیس بھابی ہفتے میں دو بار ملاقات کو آتے اور ہر بار تمہیں اپنے ساتھ لے آتے۔ میں تمہیں اس وقت تک اپنی گود میں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

لیے رہتا جب تک ہماری ملاقات کا وقت ہوتا۔ وہ مجھے بہت تسلی دیتے اور تمہاری طرف سے بے فکر رہنے کو کہتے۔ جب انہوں نے مجھے بتایا کہ ان کے ہاں تحریم پیدا ہوئی ہے تو میں خواب تو سہانے دیکھنے لگا تھا تم دونوں کی زندگی اور شادی کے بارے میں مگر میری اوقات مجھے گویائی سے محروم کر دیتی تھی اور میں خاموش ہو جاتا تھا۔ میری ضمانت ہوتے ہوئے چار سال گزر گئے۔ اس سے زیادہ کا عرصہ بھی گزر جاتا اگر شہزاد کوشش نہ کرتا۔''

''میری ضمانت ہونے اور جیل سے رہائی کے چند ہی دنوں بعد اپنے علاقے کی ایک مارکیٹ میں ڈکیتی ہوئی تھی۔ اس کیس میں مجھے بھی اٹھوا لیا گیا۔ اس بار بھی شہزاد نے میری ضمانت کرائی مگر اس بار صرف ایک سال میں ہی میری رہائی ہوگئی اور پھر شہزاد اور بلقیس بھابی کے مشورے سے میں کراچی چھوڑ کر حیدرآباد چلا گیا تاکہ پولیس والوں سے جان چھوٹے۔ وہاں شہزاد کے ایک جاننے والے اسحاق صاحب تھے۔ جن کا بک بائنڈنگ کا کاروبار تھا جہاں ابھی تک ہماری رہائش ہے۔ تم جب تھوڑے بڑے ہوئے تو میرے بھائی بہنوں اور دوسرے رشتے داروں نے تمہیں اپنے پاس رکھنے کی ذمہ داری لینے کی بات کی تو میں نے انکار کر دیا۔ کیوں کہ میں جان گیا تھا کہ اب وہ اپنے گھر اور بچوں کے لیے کام کرنے کے لیے تمہیں رکھنا چاہتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ تم ان لوگوں کے غلام بن کر زندگی گزارو اور پھر جب میرے برے اور مشکل وقت میں ان لوگوں نے تمہیں ٹھکرا دیا تو اب اس وقت کے ٹل جانے کے بعد مجھے کیا مجبوری تھی۔ میں خود تمہاری پرورش کرنا چاہتا تھا اور مجھ سے اس غربت کی حالت میں جو کچھ ہو سکا میں نے تمہارے لیے کیا۔ اب تم دونوں ہی بتاؤ ان لوگوں کا ہمارے اوپر کتنا بڑا احسان ہے۔'' ابو کچھ دیر خاموش رہنے اور پانی پینے کے بعد پھر گویا ہوئے۔

''مدثر بیٹا! تحریم کے بارے میں تم نے جو دیکھا اور جو سنا۔ وہ سب سچ ہے۔ تحریم کی جب شادی ہوئی تو میں اس شادی میں شریک تھا اور جب وہ کسی کے بہکاوے میں آ کر بھٹک گئی تو اس کی ہونے والی ہر غلطی کی شکایت بھی میرے علم میں آتی رہی۔ جب اسے طلاق ہوئی تو اس وقت بھی مجھے پتا چل گیا تھا۔ ہم منصور کو کیا سمجھاتے۔ اس میں ساری غلطی ہی تحریم کی تھی لیکن جب تم گئے اور شہزاد کو طعنے دیئے تو اس نے خودکشی کی کوشش کی۔ اتفاق ہے کہ میں بس سے اتر کر شہزاد کے گھر چلا گیا تھا۔ اسے سنبھالا اور تحریم کو کافی دیر تک سمجھایا، کچھ باپ کے ٹوٹ جانے سے کچھ میرے سمجھانے سے اور کچھ پہلے کے کھائے ہوئے دھوکے سے اس کی عقل ٹھکانے آ چکی ہے۔ اس نے وعدہ کر لیا ہے کہ وہ خود کو بدل لے گی۔ اس سے وعدہ لے کر میں یہاں آیا ہوں۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ اس گھرانے کو ٹوٹنے سے بچا لو یا مجھے ان کی نظروں میں احسان فراموش بنا دو۔

اس نے اپنی سوچ کو بدل لیا ہے۔ اب وہ اپنے کیے پر شرمندہ ہے۔ اپنے راستے سے بھٹکی ہوئی وہ تحریم اب سیدھے راستے پر چلنا چاہتی ہے۔ اب اسے زندگی کے اگلے سفر کے لیے اچھے شریکِ سفر کی ضرورت ہے۔ جوان سب باتوں کو جاننے کے بعد اسے قبول کرے اسے سدھرنے کا موقع دے بلکہ اس کا ساتھ دے کیوں کہ کسی بھی ڈوبتے ہوئے کو کسی کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ سہارا دینے والا اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ وہ خود بھی ڈوب جائے گا۔ میں نے ان ساری حقیقتوں کو جاننے کے باوجود بھی یہاں تمہاری بات اس لیے پکی کر دی تھی کہ تم اس کے لیے بہتر رہو گے۔ جب میں اور تم بے سہارا تھے۔ ہمیں انہوں نے سہارا دیا تھا اور اب ان کو۔ ان کی بھٹکی ہوئی تحریم کو سہارے کی ضرورت ہے اور ہم ان کا اس مشکل وقت میں سہارا بنیں گے اور یہ تمہیں قبول کرنا ہے۔'' ابو نے ساری بات بتانے کے بعد اپنا فیصلہ سنا دیا۔

اللہ جب بھٹکے ہوئے لوگوں پر اپنی رحمت فرماتا ہے تو ان کو سیدھی راہ پر آنے کا موقع دیتا ہے اور اس کا ذریعہ بھی وہ اپنے بندوں کو ہی بناتا ہے۔ مجھے بھی تو اپنی زندگی گزارنے کے لیے کسی ایسے سہارے کی ضرورت تھی کہ جو عمر بھر کے لیے ساتھ دے اور ادھر تحریم کو بھی میری ہی طرح سہارے کی ضرورت تھی۔

ابو کے کہنے پر میں شادی کے لیے رضامند ہو گیا اور پھر اسی ہفتے ہماری شادی ہوگئی۔

وہ میرے لیے ایک اچھی شریکِ سفر ثابت ہوئی ہے۔ وہ ٹھوکر پر ٹھوکر کھا چکی ہے۔ اس لیے اب ہر قدم پھونک پھونک کر رکھتی ہے۔ خود اس نے اپنی زبان سے اقرار کیا ہے کہ وہ جو ہر ایک سے جھگڑتی تھی اس کی واحد وجہ یہ تھی کہ دھوکے پر دھوکے نے اسے چڑچڑا بنا دیا تھا۔ اسے ہر مرد ایک جیسا ہوس کا پتلا نظر آتا تھا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

نجات

محترمہ عذرا رسول صاحبہ
سلام تہنیت

ایک ایسی سچ بیانی بہہ رہی ہوں جس کا چرچا اخبارات میں خوب رہا۔ اس واقعے میں کچھ تبدیلی کے بعد کہانی بنا کر ارسال کیا ہے۔ صرف اس لیے کہ لوگ سبق حاصل کریں۔

زویا اعجاز
(لاہور)

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

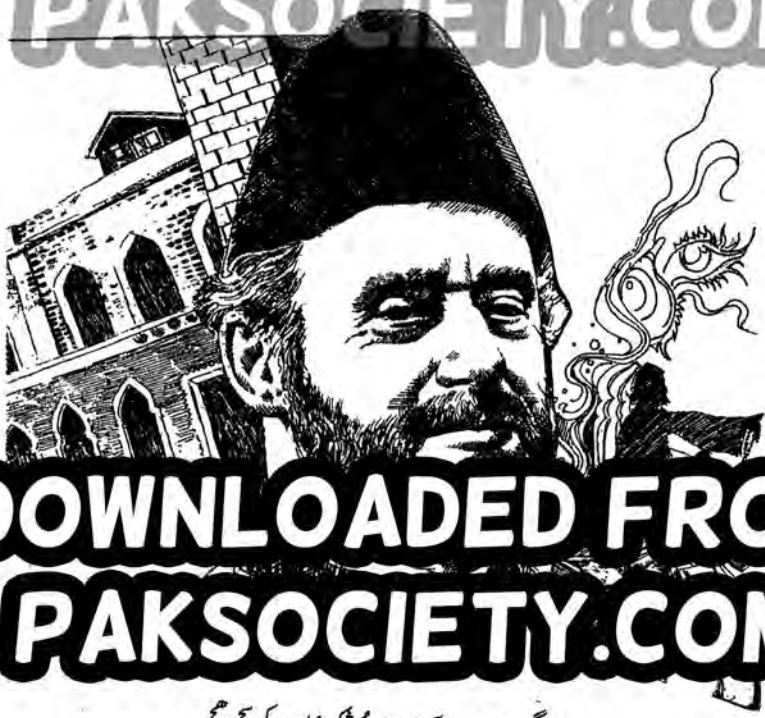

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

سنگ مرمر سے آراستہ اس پُرشکوہ عمارت کی سج دھج آج نرالی تھی۔

سادہ اور جاذب نظر تعمیر اعصابی فرحت اور نظروں کے لیے بے حد تراوٹ کا باعث تھی۔ یہاں داخل ہونے والا ہر فرد دستور اور قاعدہ کے مطابق اپنے جوتے بیرونی جانب ایک خصوصی پائیدان پر رکھ دیتا۔ مرکزی دروازے سے چند گز پہلے اسے ایک کاغذی ٹوکن مہیا کیا جاتا تھا جسے انتہائی عقیدت سے ہاتھ میں تھامے وہ برہنہ پا اندر بڑھ

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded from Paksociety.com

جاتا۔ سنگی فرش کی ٹھنڈک پاؤں کی ایڑیوں اور تلوؤں میں سرایت ہوکر جسم میں سرور بخش لہریں دوڑا دیتیں۔

اندرونی جانب ایک وسیع و عریض ہال نما کمرا تھا جس کی دیواروں پر مختلف تغرے آویزاں تھے۔ ان تغروں میں لوح قرآنی، قرآنی آیات اور احادیث کندہ تھیں۔ اس عمارت سے ایک ہی چیز وابستہ تھی، تقدس و سکون..... یہاں آمد کے بعد کوئی بھی شخص بے سکون نہیں لوٹتا تھا۔

وہ ایک وسیع و عریض آستانہ تھا۔ پچھلے احاطہ میں درختوں کی چھاؤں میں سنگ مرمر ہی سے تعمیر شدہ دو قبریں موجود تھیں۔ احاطہ سے باہر ایک مطبخ تھا جہاں زائرین کے لیے خصوصی لنگر کا اہتمام کیا جاتا۔

ہر جمعرات کو یہاں محفل کا انعقاد ہوتا تھا۔ آستانہ کے کرتا دھرتا فضل الٰہی لوگوں کی فریاد سنتے اور بھرپور دادرسی بھی کرتے۔

ویسے یہاں داخلہ بھی اب معمولی امر نہ رہا تھا۔ سینکڑوں زائرین کی آمد ایک معمول بن چکی تھی۔ اس لیے انتظامیہ نے مجبوراً چند قواعد و ضوابط لاگو کر دیئے۔ موجودہ صورت حال کے تحت حاضری کے لیے کم از کم ایک روز قبل آنا لازم تھا۔ انتظامی دفتر میں یک ورقی فارم پُر کیا جاتا۔ اس فارم میں سائل کا نام، ولدیت، تعلیم، کاروبار، نوکری، رہائش اور ذاتی فون نمبر کا اندراج کیا جاتا تھا۔

پنجاب کے نواحی قصبہ شجاع آباد میں موجود یہ آستانہ عوام کی خدمت اور مشکل کشائی کا بہت بڑا وسیلہ تھا۔ مشکلات و مصائب میں گھرے افراد کے لیے یہاں بے حد سکون تھا۔ آستانہ میں موجود قبر اور مدفن ہستی کی کرامات سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی آئی تھیں لیکن حقیقت اب بھی ایک سربستہ راز تھی۔

☆☆☆

آج خصوصی پنج شنبہ تھا۔

آستانہ کی روایات کے مطابق اس دن کا ظہور مدتوں بعد ہوتا ہے۔ عطارد، زحل اور مشتری ایک ہی مدار میں آجاتے ہیں اور یہی وہ وقت ہوتا ہے جب نحوست کی زد میں آئے انسانی قسمت کے ستارے تبدیل ہوجاتے ہیں، دعائیں کبھی رد نہیں ہوتیں اور کوششیں کبھی ناکام ثابت نہیں ہوتیں۔

خصوصی پنج شنبہ سے مستفید ہونے کے لیے دور دراز سے زائرین کا ہجوم امڈ آیا تھا۔ اُمید و آس سے چمکتے چہرے کبھی کسی لمحہ نا اُمیدی کی زد میں آکر بجھ سے جاتے لیکن انہیں یقین تھا کہ وہ بامراد ہی لوٹیں گے۔

آستانہ کے جانشین فضل الٰہی نے نماز ظہر کے بعد کئی سائلین کو نمٹا دیا تھا اور اب نماز عصر کے لیے اپنے حجرہ میں تشریف لے جا چکے تھے۔ ان کی شخصیت بہت سحر انگیز تھی۔ شاہانہ کروفر سے مبرا، سادہ مزاج، متبسم چہرہ، مقابل کے اندر تک جھانکتی آنکھیں اور نرم و مخلوص لب و لہجہ سائل کا دل موہ لیا کرتا اور اسے اپنا وجود کسی چھپر چھاؤں میں محسوس ہونے لگتا۔

ہال میں بیٹھے سائلین کو آستانہ کی روایات کے مطابق قہوہ پیش کرنے کے بعد دو باریش اہلکار شرقاً غرباً مستعد کھڑے ہوگئے۔ فضل الٰہی نماز سے فراغت کے بعد ایک بار پھر اپنے معتقدین سے ملنے کے لیے تیار تھے۔

سیٹھ نوید بنگش اپنے بے چین دل پر قابو پاتا حجرے کی طرف روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

سیٹھ نوید وسطی پنجاب کا ایک معروف بیوپاری تھا۔ وہ پھلوں کی تجارت کرتا تھا۔ تھل تھل کرتا وجود، نیم شفاف سر، بھاری بھرکم چہرہ اس کی سخت گیر طبیعت کے عکاس تھے۔ آنکھوں تلے ورم سے پہلی ہی نظر میں اندازہ ہوجاتا تھا کہ وہ ام الخبائث سے بھی مستفید ہوتا رہتا ہے۔

وہ اس وقت بے حد پریشانی میں مبتلا تھا۔

''کیسے آنا ہوا نوید بنگش؟'' فضل نے نرم لہجہ میں دریافت کیا۔

''حضرت جی! میں بہت بڑی مصیبت میں پھنس گیا ہوں..... میری عقل نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔'' نوید نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''ہر پریشانی اپنے ساتھ حل لے کر آتی ہے میرے بچے! اس فانی دنیا میں کوئی ایسا مسئلہ نہیں جو لاینحل ہو۔''

''اسی لیے تو میں آپ کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہوا ہوں حضرت جی! صرف آپ ہی میری واحد اُمید ہیں۔ آپ سے عظیم اور بلند میرے لیے کوئی بھی نہیں۔'' اس نے فضل الٰہی کے پاؤں تھام لیے۔

''سب میرے مولا کا کرم ہے..... تم بتاؤ کیا حاجت ہے تمہاری؟''

''میرے بینک اکاؤنٹ میں لاکھوں کا سرمایہ محفوظ رہتا ہے۔ میں ہر سال رمضان سے قبل یہ رقم نکلوا لیا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

http://paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

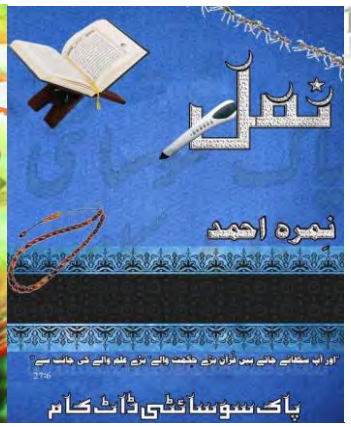

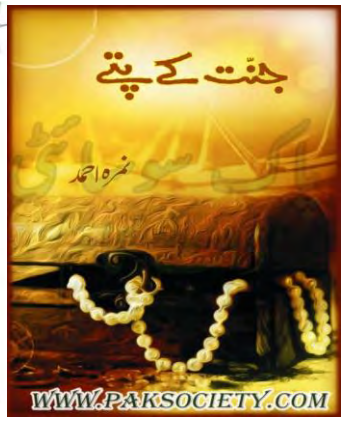

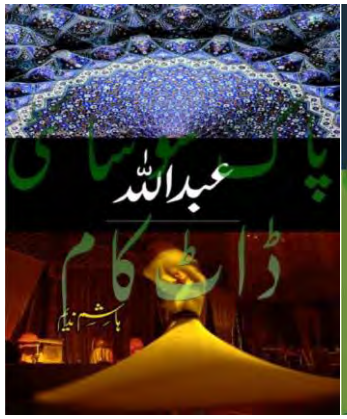

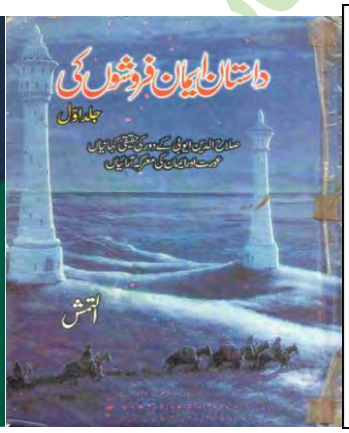

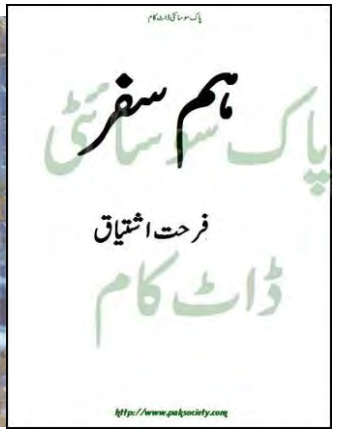

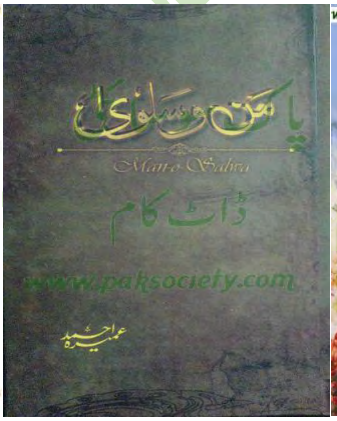

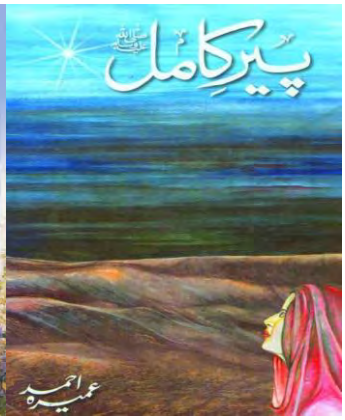

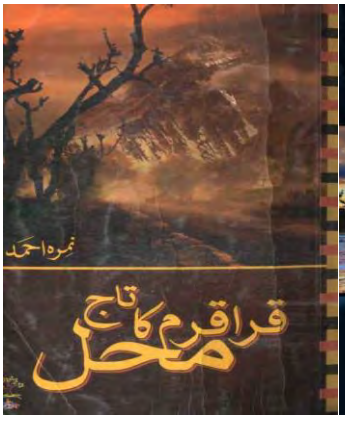

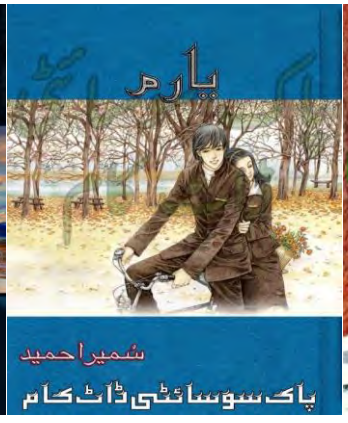

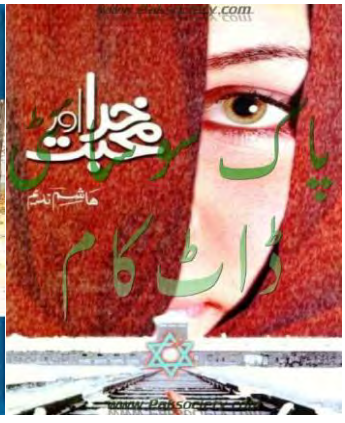

Downloaded from Paksociety.com

کرتا ہوں۔ بینک انتظامیہ بلا وجہ زکوٰۃ کی کٹوتی کرتی ہے۔ وہ یہ رقم کبھی بھی مستحقین تک نہیں پہنچاتے، میں اپنی نگرانی میں زکوٰۃ کا نصاب الگ کر کے اسے غریبوں کی بستی میں پہنچاتا ہوں۔'' نوید نے پہلے سے تیار کردہ ایک ملاوٹ شدہ کہانی سنائی۔

''انتہائی احسن حکمت عملی ہے۔''

''ہر سال میرا ایک بااعتماد مینیجر بینک سے رقم لے آتا تھا۔ کبھی ایک روپے کی ہیرا پھیری نہیں ہوئی لیکن اس بار جانے کیا ہوا؟ وہ تمام پیسے سمیٹ کر فرار ہو گیا ہے۔ میں تو بربادی کے دہانے پر پہنچ گیا ہوں حضرت جی! میرا زندگی بھر کا سرمایہ لٹ گیا ہے۔'' وہ رونے لگا۔

فضل الٰہی نے چند لمحوں کے لیے اپنی آنکھیں موندیں اور گہری سانس بھرتے مراقبے میں گم ہو گئے۔

''کراچی، حیدر آباد، سکھر، تمہارا مینیجر اس دائرے میں مقید ہے..... اسے فوری تلاش کر لو ورنہ وہ بیرونِ ملک اڑان بھرنے کی تیاریوں میں ہے۔''

نوید بنگش کے اعصاب میں برقی لہر دوڑ گئی۔

''بہت شکریہ حضرت جی! میں یہ آخری موقع ضائع نہیں کروں گا۔'' وہ فضل الٰہی کے قدموں میں سر جھکائے بولا۔ پھر لرزتے وجود سے اٹھا اور عقبی سمت میں سر جھکائے 'نمائندہ خصوصی' مجید کو ہدیہ کی رقم تھما کر الٹے پاؤں لوٹ گیا۔

☆☆☆

نوید بنگش کا چمکتا چہرہ اور خوشی سے لڑکھڑاتے قدم ہال میں بیٹھے اکرام خان کے لیے بہت مثبت تحریک ثابت ہوئے۔

اکرام خان ایک بارعب شخصیت کا مالک تھا۔ سرخ و سفید رنگت، شرعی داڑھی، ٹخنوں سے اونچی شلوار اسے مزید باوقار بناتی۔ اس کے ہاتھ میں ہمہ وقت ایک تسبیح اور سر پر گول جالی دار ٹوپی نظر آتی تھی۔

اس کا کاروبار سود سے منسلک تھا۔ اللہ کا دیا سب کچھ تھا مگر کچھ عرصہ سے جانے کس حاسد کی نظر بد نے آسیب کی طرح اس کا پیچھا لے لیا تھا۔ اس کی ذاتی زندگی تلاطم کا شکار ہو گئی تھی۔ پہلے تو اکلوتی بیٹی اپنے ایک ہم جماعت حسنین سے شادی کرنے کے لیے اس سے بغاوت پر آمادہ ہوئی۔ اکرام کے بے حد سمجھانے بجھانے کے باوجود جب اس نے اپنی روش ترک نہ کی تو اس نے دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

اس کی خاندانی روایات کے مطابق بیٹیوں کی شادی کسی بھی صورت خاندان یا برادری سے باہر نہیں کی جاتی تھی۔ مومنہ کی موت کے بعد وہ بہت پُرسکون تھا لیکن پھر ایک اور 'بغاوت' نے اس کے وجود کی بنیادیں ہلا دیں۔

وہ سر جھکائے حجرے میں داخل ہوا اور فضل الٰہی کی قدم بوسی کے بعد دوزانو بیٹھ گیا۔

''خیریت کیسے آنا ہوا اکرام خان؟'' فضل نے دریافت کیا۔

''آپ کی روشن ضمیری سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں قبلہ! آپ تو سب کچھ جان لیتے ہیں۔''

''بے شک..... بے شک..... لیکن ہم تمھاری زبانی سننا چاہتے ہیں۔''

''میرا اکیس سالہ بیٹا اپنی عمر سے کئی سال بڑی ایک ماڈل گرل کو میرے گھر کی زینت بنانا چاہتا ہے قبلہ!''

''تمھیں اعتراض کس بات پر ہے؟ شادی پر یا بیٹے کے انتخاب پر؟''

''مجھے صرف اس شادی پر تحفظات ہیں۔ وہ مرد بچہ ہے۔ جہاں بھی منہ مارے' میں نے کبھی کوئی روک ٹوک نہیں کی ایسے تعلقات تو مرد کی شان ہوتے ہیں لیکن ایسی غلاظت کو گھر میں لے آنا کہاں کی دانشمندی ہے؟ وہ ایک بدنام زمانہ ماڈل ہے۔ سوشل میڈیا پر اس کی فحش ویڈیوز ہزاروں لوگ دیکھ چکے ہیں۔ میں ایسی حرافہ کو اپنی بہو کیسے بنا لوں؟'' اکرام نے اپنی الجھن بیان کی۔ ''میں آپ کے پاس بڑی اُمید لے آیا ہوں، میرے احباب کا کہنا ہے کہ آپ کے سوا میری یہ پریشانی کوئی بھی حل نہیں کر سکتا۔ میرا بیٹا یونہی نا سمجھی میں مبتلا رہا تو کاروبار تباہ ہو جائے گا..... میری مدد کیجیے قبلہ!''

فضل الٰہی چند لمحوں کے لیے آنکھیں موند کر مراقبے میں گئے اور پھر گھمبیر لہجہ میں کہا۔ ''اس عورت کو چند کاروباری حاسدین نے تمھارے بیٹے کے پیچھے لگایا ہے۔ اس کے قلب و روح پر ناپاکی اور سحر کے اثرات ہیں لیکن تم فکر نہ کرو، بچے کو اگلی بار ساتھ لے آنا، میں اپنی خاندانی بید کی چھڑی سے ان اثرات کا مکمل خاتمہ کر دوں گا۔''

''بہت شکریہ قبلہ! بہت شکریہ!''

''یہ نقش لے جاؤ اور اسے کسی بھی طرح پلا دینا۔'' فضل الٰہی نے اپنے دائیں جانب موجود ایک منقش چوبی ڈبہ سے طے شدہ کاغذ نکال کر اسے تھمایا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اکرام نے اپنا سر اس کے قدموں میں جھکایا اور مجید کو ہدیہ کی رقم دے کر سرشاری سے بڑے کمرے میں لوٹ گیا۔

☆☆☆

عالیہ اور ہارون موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہ لیا جائے کہ وہ کسی خطرناک طبی مسئلہ کا شکار تھے۔ درحقیقت ان دونوں کو ایک ایسا مرض لاحق ہوگیا تھا جسے بظاہر طبی دنیا میں کوئی سنجیدہ مقام حاصل نہیں تھا لیکن یہ مرض انسانی زندگی کے لیے گھن ثابت ہوتا ہے۔

وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ خالص' بے ریا اور شدید محبت.....ان کے تئیں سانسوں کی ڈور باہم وابستہ تھی۔ ستم ظریفی تو یہ تھی کہ ان کے انمول جذبات ایلخانہ کے نزدیک قطعی بے مول ثابت ہوئے تھے۔

میل ملاقات میں بے احتیاطی اور جوانی کے جوش نے چند ایک بار قدم بھی بہکائے لیکن ان کی 'سچی محبت' میں شدت کی گنا بڑھ گئی۔ وہ ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ہو چکے تھے۔ کچھ ماہ بعد جب قربتوں کا نتیجہ ظاہر ہوا تو ہارون نے انتہائی سنجیدگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے والدین کو عالیہ کے گھر بھیج دیا۔ اسے کامل یقین تھا کہ وہ اس رشتہ کو بسروچشم قبول کریں گے۔

ان دونوں کے اس یقین اور اعتماد کا فلک بوس محل عالیہ کے والد نے ایک ہی جھٹکے سے مسمار کردیا۔ ''آپ کی آمد کا بہت شکریہ لیکن میں یہ جاننا چاہوں گا کہ آپ کا بیٹا ماہانہ کتنا کمالیتا ہے؟''

''وہ ابھی یونیورسٹی میں آخری سال کا طالبعلم ہے.....ڈگری ملتے ہی نوکری بھی مل جائے گی۔'' ہارون کی والدہ نے کہا۔

''نوکری ملنے تک وہ بیوی کے اخراجات کیسے پورے کرے گا؟ کسی دربار سے مانگ کر لائے گا یا ڈاکا ڈالے گا؟ اور اگر اپنے والد کی کمائی سے ہی بیوی بچوں کی ذمہ داری اٹھائے گا تو عالیہ میرے گھر میں مجھ پر بھاری نہیں، بہتر ہے کہ اپنے ہم پلہ لوگوں میں رشتہ دیکھ لیں۔ ہم اپنی برادری سے باہر رشتہ طے نہیں کرتے۔''

ہارون کے والدین کی روانگی کے بعد غلام رسول نے اپنی بیوی سے کہا۔ ''جس گھر میں بیری ہو وہاں پتھر ضرور آتے ہیں لیکن بزرگ یہ بھی کہتے ہیں کہ گھر کا بھیدی ہی لنکا ڈھایا کرتا ہے۔ اس رشتہ میں کہیں نہ کہیں عالیہ کی رضامندی بھی شامل ہے۔ اسے کل سے یونیورسٹی بھیجنے کی کوئی ضرورت نہیں میری بہن کئی بار اس کا ہاتھ مانگ چکی ہے۔ میں اگلے ماہ شادی کی تاریخ طے کردوں گا۔''

عالیہ کی ماں نے سر تسلیم خم کردیا اور بیٹی کو بھی اس کی تقدیر کے فیصلہ سے آگاہ کرنے میں تاخیر نہ کی۔ عالیہ نے اپنی کئی سہیلیوں سے آستانہ کی کرامات کے متعلق سنا تھا۔ اس نے خصوصی پنج شنبہ سے مستفید ہونے کے لیے ہارون کو ایک رات قبل ہی یہاں آمد کے لیے راضی کیا اور اب خود بھی اس کے ساتھ اپنی قسمت کی چال کو شکست دینے کے لیے آخری داؤ کھیلنے چلی آئی تھی۔

وہ دونوں فضل الٰہی کی جہاندیدہ نظروں کی زد میں سر جھکائے بیٹھے تھے۔

''والدین اولاد کے لیے کبھی غلط فیصلہ نہیں کرتے لیکن اولاد کو اپنی پسند' سمجھ اور عقل پر بہت مان ہوتا ہے۔ یہی مان اضطراب بن کر ان کی زندگیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔''

وہ فضل کی اس ذومعنی بات کا مطلب بخوبی سمجھ گئے۔ ''آپ ہماری آخری اُمید ہیں سرکار! آپ نے بھی ہاتھ نہ تھاما تو میری زندگی ایک گالی بن کر رہ جائے گی۔'' عالیہ رونے لگی۔

''شادی ایک مقدس بندھن کا نام ہے، دو نامحرم وجود اپنے خالق کو حاضر ناظر جان کر ایک دوسرے کے لیے 'حلال' قرار پاتے ہیں، قبل از وقت خوشیاں کشید کرنے سے انسان اپنی آئندہ راہیں کھوٹی کرلیتا ہے۔'' نرم لہجہ انہیں مزید تڑپ میں مبتلا کررہا تھا۔

''آپ سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں رہ سکتا سرکار! ہمیں اپنی سب کوتاہیوں کا اعتراف ہے۔ ڈاکٹرز ابارشن کا خطرہ مول نہیں لے سکتے اور عالیہ کے والد کے روابط کے باعث ہم کورٹ میرج بھی نہیں کرسکتے، بس اب آپ ہی ہمارا سہارا ہیں۔'' ہارون نے ندامت سے سر جھکالیا۔

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، تمہارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ تم لوگوں کو چار جمعراتیں یہاں آکر ایک خصوصی چلہ کاٹنا پڑے گا، تمہارے ستاروں کی نحوست خود بخود ختم ہو جائے گی۔''

''ہم ضرور آئیں گے سرکار! ہر کٹھنائی سے گزریں گے۔'' وہ اس کے قدم چھوکر بولے۔

''میں اس لڑکی کو اپنے حصار میں لے لیتا ہوں۔ یہ خصوصی حصار اسے دوسروں کی پسندیدگی کی نظر سے بچائے گا اور اس کا کہیں بھی رشتہ طے نہیں ہوسکے گا۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''جیسا آپ مناسب سمجھیں سرکار!'' ہارون خوشی سے دیوانہ ہونے لگا۔

فضل الٰہی نے عالیہ کو قالین پر لیٹنے کا اشارہ کیا اور سپاٹ چہرے سے اس کے بدن پر دائیں ہاتھ کی انگلی سے چند لکیریں کھینچتے ہوئے اپنی آنکھیں موند لیں۔

چند لمحوں بعد وہ مجید کو ہدیہ ادا کرنے کے بعد نہایت مطمئن بڑے کمرے میں لوٹ گئے۔ ان کی یہ سرشاری اور اطمینان اپنا ٹوکن اضطراب سے ہاتھوں میں مستی آمنہ کے وجود میں ایک نئی توانائی پیدا کر گیا۔

☆☆☆

ڈاکٹر آمنہ ایک کامیاب گائنا کولوجسٹ تھی۔

اس کی عمر پینتالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ خوش شکل اور جاذب نظر نقوش کی مالک تھی۔ اس کا تعلق نچلے طبقہ سے تھا جہاں وسائل کم اور ذہانت کے انبار ہوتے ہیں۔

اپنی اسی ذہانت کے بل بوتے پر وہ میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے میں کامیاب رہی۔

ڈگری ملتے ہی اس کے مزاج میں فرعونیت بھی در آئی۔ تعلیمی مراحل میں درپیش محرومیاں لاشعور میں کسی ناگ کی طرح کنڈلی مارے بیٹھ گئیں اور اس نے اخلاقیات کے سارے درس فراموش کر دیئے۔

سرکاری اسپتال میں روزانہ اپنی حاضری کا اندراج کرنے کے بعد وہ اپنے پرائیویٹ کلینک میں روانہ ہو جاتی۔ سخت مقابلہ کا دور تھا۔ اپنی خصوصی شناخت بنانے کے لیے ہر ڈاکٹر مختلف تراکیب کا استعمال کرتا۔ آمنہ نے بھی اپنے کلینک کی بقاء اور ذاتی شہرت کے لیے ایک منفرد رستہ اختیار کر لیا۔

اس نے مریضوں کے لیے غیر قانونی ابارشن کی سہولت فراہم کر دی۔

شہر بھر سے بے راہ رو لڑکیاں منہ مانگے معاوضہ پر اس کے پاس اپنے گناہوں کی نشانی ختم کروانے آتیں۔ ڈاکٹر آمنہ کی زندگی بے حد خوش و خرم گزرنے لگی۔ دولت اس کی باندی بن گئی۔ لیکن پھر ایک واقعہ نے اس کی زندگی اجیرن کر دی۔

ایک روز اس کے کلینک پر درمیانے طبقہ کی عورت آئی۔ وہ اپنی الٹراساؤنڈ رپورٹ سے بچہ کی جنس جاننے کی خواہشمند تھی۔ آمنہ نے بلا تامل اس کی یہ خواہش پوری کر دی۔

''مبارک ہو خاتون! اس رپورٹ کے مطابق آپ کی بیٹی بہت صحت مند ہے۔'' اس نے پیشہ وارانہ انداز میں کہا۔

عورت کے چہرے پر مردنی چھا گئی۔

''مجھے یہ اولاد نہیں چاہیے ڈاکٹر! اگر اسے جنم دیا تو میرا شوہر مجھے طلاق دینے میں ایک پل کی تاخیر نہیں کرے گا۔ میری پہلے بھی پانچ بیٹیاں ہیں۔ اس بیٹی کو بچانے کے لیے میں باقی ماندہ زندگیاں داؤ پر نہیں لگا سکتی۔''

آمنہ نے اس کے فیصلہ کا 'احترام' کرتے ہوئے ابارشن کر دیا۔ کلینک کے اوقات ختم ہونے سے پہلے وہ اپنی میز پر موجود اشیاء سمیٹنے لگی تو اس کی نظر ایک بار پھر اسی رپورٹ پر پڑی۔ بچی کے ہیولہ نے اسے ایک عجیب اضطراب میں مبتلا کر دیا۔ اسے دو ننھے منے ہاتھ اپنی گردن کی جانب لپکتے محسوس ہونے لگے۔

وہ بے اختیار گردن مسلتی واپس روانہ ہو گئی مگر اس بچی کے تصور سے کبھی بھی دامن نہ چھڑوا سکی۔ اسے اپنا وجود کسی شکنجہ میں جکڑا محسوس ہوتا۔ وہ اپنا ذہنی سکون کھو چکی تھی۔ سینکڑوں سکون بخش ادویات کے استعمال پر بھی جب کوئی افاقہ نہ ہوا تو وہ آستانہ پر چلی آئی۔

فضل الٰہی کے سامنے دوزانو بیٹھی وہ بلک بلک کر ایک ہی بات دہرا رہی تھی۔ ''مجھے سکون درکار ہے بابا جی! مجھے بس سکون درکار ہے۔ میں اپنی صلاحیتیں اور علم بھولتی جا رہی ہوں۔ ایک لمحہ کے لیے بھی مجھے چین میسر نہیں آتا..... میری گردن کے گرد بڑھتے دباؤ سے سانس رکنے لگتا ہے اور روح کے ریشے ادھڑتے محسوس ہوتے ہیں۔''

''یہ سب نظر بد کے اثرات ہیں، فکر نہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''مجھے آپ کے آستانہ شریف پر آمد سے جو سکون ملا ہے، ناقابل بیان ہے بس یہی سکون میری باقی زندگی پر حاوی ہو جائے تو میں آپ کی غلام بن جاؤں گی۔''

فضل الٰہی نے اسے بھی عالیہ ہی کی طرح حصار میں لیا اور نرمی سے استفسار کیا۔ ''روح کی پاکیزگی کے لیے کہیں کچھ عرصہ آستانہ پر گزارنا ہوگا۔ یہاں مریضوں کی دیکھ بھال کرنی ہوگی۔ کیا یہ سب کر سکو گی؟''

''میں ذہنی و روحانی سکون حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' آمنہ نے کہا۔

''تمہارا عروج اب دور نہیں۔ ایک نئی بلندی او

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

http://paksociety.com

عہدِ وفا

ایمان پریشے کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا مُنفرد ناول، مُحبت کی داستان جو معاشرے کے رواجوں تلے دب گئی، پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

بُجھ نہ جائے دِل دیا

سعدیہ عابد کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا شاہکار ناول، مُحبت، نفرت، عداوت کی داستان، پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

قفس کے پنچھی

سعدیہ عابد کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا شاہکار ناول، علم و عرفان پبلشرز لاہور کے تعاون سے پاکستان انٹرنیشنل بُک فیئر میں (3 تا 7 اگست 2017)، **کتابی شکل** میں جلوہ افروز ہو رہا ہے، خریدنے کے لئے تشریف لائیں۔ آن لائن پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

جہنم کے سوداگر

مُحمد جبران (ایم فِل) کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا ایکشن ناول، پاکستان کی پہچان، دُنیا کی نمبر 1 ایجنسی آئی ایس آئی کے اسپیشل کمانڈو کی داستان، پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

شہیدِ وفا

مُسکان احزم کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا ناول، پاک فوج سے مُحبت کی داستان، دہشت گردوں کی بُزدلانہ کاروائیاں، آرمی کے شب و روز کی داستان پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

آپ بھی لکھئے:

کیا آپ رائٹر ہیں؟؟؟۔ آپ اپنی تحاریر پاک سوسائٹی ویب سائٹ پر پبلش کروانا چاہتے ہیں؟؟؟
اگر آپکی تحریر ہمارے معیار پر پُورا اُتری تو ہم اُسکو عوام تک پہنچائیں گے۔ مزید تفصیل کے لئے یہاں کلک کریں۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام، پاکستان کی سب سے زیادہ وزٹ کی جانے والی کتابوں کی ویب سائٹ، پاکستان کی ٹاپ 800 ویب سائٹس میں شُمار ہوتی ہے۔

Downloaded from Paksociety.com

شہرت تمھاری منتظر ہے۔'' فضل الٰہی کی مسکراتی آواز اسے فرحت دینے لگی۔ اس کی قدم بوسی کرنے اور ہدیہ کی ادائیگی کے بعد وہ بھی بڑے کمرے میں لوٹ آئی۔

☆☆☆

بیالیس سالہ بھرپور مرد تھا۔

جنوبی پنجاب کا متمول زمیندار، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بااثر شخصیت، اس کی زندگی خوشیوں کے ہنڈولے میں گزری تھی۔ وہ اپنے علاقہ میں مختار کل تھا مگر گذشتہ ایک سال سے وہ ناقابلِ بیان اذیت سے دوچار تھا۔

اس کی مخصوص طاقت دھیرے دھیرے ختم ہونے لگی اور اب یہ صورتِ حال تھی کہ وہ اپنی چاروں بیویوں کے ساتھ وقت گذارنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ ملک گیر شہرت کے حامل ڈاکٹرز سے علاج کے بعد اس نے بین الاقوامی سطح پر بھی اپنا معائنہ اور علاج کروایا لیکن نتیجہ اب بھی صفر بٹا صفر ہی تھا۔

شرمندگی، اذیت، بے بسی اور لاچاری اس کے وجود اور آنکھوں میں گویا ثبت ہوکر رہ گئی تھی۔ ہر طرف سے مایوسی کے بعد وہ فضل الٰہی کے پاس اپنی بپتا لیے آیا تھا۔

''تمھاری حالیہ شادی یکطرفہ پسندیدگی کا نتیجہ تھی؟'' فضل نے استفسار کیا۔

''جی حضرت! مونا میرے مینیجر کی چھوٹی بہن تھی۔ اس کی منگنی بچپن ہی سے خالہ زاد سے طے تھی لیکن فہیم نے میرے رشتہ کو ترجیح دی۔'' وہ الجھ کر بولا۔ ''لیکن اس معاملہ کا مجھے درپیش مسئلہ سے کیا تعلق ہے؟''

''تعلق ہے، بہت گہرا تعلق ہے، تمھاری بیوی اور اس کے سابقہ منگیتر نے طبی و روحانی ماہرین کا سہارا لے کر تمھیں کھوکھلا شجر بنا دیا ہے تاکہ بوقت ضرورت عدالت میں تمھاری نااہلی ثابت کرکے علیحدگی حاصل کی جاسکے۔''

عبدالکریم اس انکشاف پر لرز گیا۔

''اگر ایسا ہوا تو میرے پاس خودکشی کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوگا۔''

''اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ میری خاندانی اور کرشماتی چھڑی تمھیں بھلا چنگا کر دے گی، ہاں! بس تمھیں تھوڑی اذیت برداشت کرنی ہوگی۔''

''میں اپنے علاج کے لیے ہر اذیت سہنے کے لیے تیار ہوں حضرت!'' وہ اس کے قدموں میں گر گیا۔

فضل الٰہی نے اسے برہنہ حالت میں قالین پر لیٹنے کا حکم دیا اور اپنی منقش چھڑی تھامے تخت سے نیچے اتر آیا۔ وہ ایک مخصوص انداز میں بید کی وہ چھڑی عبدالکریم پر رسید کرنے لگا۔ ہر ضرب کے بعد وہ بے اختیار سسک اٹھتا لیکن ضبط کا دامن تھامے وہ اپنی 'روحانی پاکیزگی' کے عمل سے گذرتا رہا۔

پندرہ منٹ کے اس صبر آزما علاج کے بعد وہ ہدیہ ادا کرکے اپنے قدموں کی لڑکھڑاہٹ پر قابو پاتے حجرہ سے لوٹ گیا۔

☆☆☆

مغرب کی اذان کا وقت ہوچلا تھا۔

فضل الٰہی نے تھکے تھکے انداز میں گاؤ تکیے پر اپنی پشت ٹکائی اور عقب میں کھڑے ملازم سے پوچھا۔ ''مزید کتنے افراد باقی ہیں مجید؟''

''دس سے پندرہ افراد ہیں جناب! لیکن ان کے مسائل معمولی نوعیت کے ہیں۔ کچھ خواتین ہیں جنہیں اپنے شوہر حضرات کی دوسری عورتوں میں دلچسپی کا خاتمہ درکار ہے اور چند افراد اپنی اولاد کے رشتوں کی بندش کے خاتمہ کے لیے آئے ہیں۔''

''ہنہ! ان سے بھی مل لیتے ہیں ابھی۔''

موبائل فون کی گھنٹی نے فضل کی توجہ اپنی جانب مبذول کرلی۔ اس نے مسکراتے ہوئے سبز بٹن دبایا اور بشاشت سے کہا۔ ''کیسے ہو سائیں؟ آج خادم کی یاد کیسے آگئی؟''

''اللہ کا کرم ہے..... تم سناؤ؟ دھندا کیسا چل رہا ہے؟''

''دھندا ایک دم زوروں پر ہے، ابھی آج ہی کی بات.....''

''فضل الٰہی! اس وقت تمھارے سر پر بہت بڑی مصیبت منڈلا رہی ہے۔'' مخاطب نے قطع کلامی کرتے ہوئے تیزی سے کہا۔ ''انٹیلی جنس کافی عرصہ سے تمھارے نیٹ ورک پر کام کر رہی تھی لیکن انہیں کوئی ثبوت نہیں مل رہا تھا۔''

''ثبوت تو اب بھی نہیں مل سکتا سائیں! میں نے کچی گولیاں نہیں کھیلیں۔''

''مجھے مستند اطلاع ملی ہے کہ آج آستانہ میں ایک خفیہ افسر بھی بھیس بدلے موجود ہے۔ زائرین کو پلایا جانے والا قہوہ اور کھانے کا نمونہ وہ ساتھ لے جائے گا اور ان اشیاء

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

میں نشہ آور اجزاء کی ملاوٹ لیبارٹری ٹیسٹ سے بآسانی عیاں ہوجائے گی۔''

''آج تو ویسے بھی خصوصی پنج شنبہ کی وجہ سے معمول سے کئی گنا زیادہ افراد آئے ہیں۔ میں اسے کس طرح تلاش کروں؟'' فضل بوکھلا گیا۔

''تلاش کا وقت نہیں رہا، مجھے بھی بہت تاخیر سے اطلاع ملی، وقت بہت کم ہے کسی بھی طرح مال وغیرہ بچانے کی کوشش کرو اور سب کچھ سمیٹ کر فوراً وہاں سے نکلو۔''

''اتنی دقت سے یہ سیٹ اپ بنا تھا، اب پھر نیا آغاز کرنا پڑے گا۔''

''ان فضول دکھڑوں میں وقت ضائع نہ کرو احمق انسان! موت تمھارے سر پر منڈلا رہی ہے۔'' مقابل نے طیش میں ایک گالی دیتے ہوئے فون بند کردیا۔

فضل کی رگوں میں خون سنسنا رہا تھا۔ انٹیلی جنس کا نام سن کر مجید بھی حواس باختہ تھا۔ ''یہ کیا ہوگیا فضلو؟ کہاں چوک ہوگئی ہم سے؟''

''بہت غلط ہوا ہے مجیدے! لیکن اب وقت بہت کم ہے۔ سہیل کے ساتھ مل کر احاطہ کی قبر سے سارا 'مال' نکالو۔ میں اندرونی کمرے سے سب سمیٹتا ہوں۔''

''اور یہ جو باہر بیٹھے ہیں' ان کا کیا کرنا ہے؟'' مجید نے پوچھا۔

''انہیں کچھ بھی کہنے' سننے کی ضرورت نہیں...... ہم تینوں تہہ خانہ کی سرنگ سے نکل چلتے ہیں۔''

''انھی میں کوئی خفیہ پولیس اہلکار موجود ہے۔ کیا اسے سزا نہیں دو گے؟ ہم پر یہ عتاب لانے والے کو اتنی آسان رہائی مل جائیگی؟'' مجید نے کینہ توز نظروں سے اسے دیکھا۔

''ہرگز نہیں! ان سب کا شافی علاج کر کے ہی جائیں گے۔ تہہ خانہ والی سرنگ میں میرا انتظار کرو، میرے گناہ گار کو سزا بہر صورت ملے گی۔'' فضل نے تنفر سے سر جھٹکا اور تیزی سے حجرہ کے بغلی دروازہ سے گذرتا ایک کمرا میں بڑھ گیا۔

اپنی خفیہ تجوری سے چند ضروری کاغذات اور رقم سمیٹنے کے بعد اس نے پلاسٹک کی ایک شفاف تھیلی تھامی اور احاطہ میں موجود باورچی خانہ کی طرف بڑھ گیا۔

''سرکار! آپ یہاں کیسے؟ مجھے طلب کر لیا ہوتا۔'' بخشو نامی باورچی اسے اپنے سامنے دیکھ کر خوشی سے بے حال ہونے لگا۔

''میں بڑے سرکار کے حکم پر یہاں آیا ہوں بخشو!'' فضل نے باوقار انداز میں کہا تو بخشو اس کے قدموں میں جھک گیا۔

فضل نے بڑی سرعت سے ہاتھ میں تھاما سفوف کھانے کے جہازی سائز پتیلے میں چھڑک دیا۔

''آج ہمیں خواب میں بڑے سرکار کی بشارت ہوئی تھی۔ وہ آستانہ کے لیے تمھاری خدمات سے بہت خوش ہیں۔ انہوں نے تمھیں مکہ مدینہ کی زیارت کی نوید دی ہے۔''

بخشو یہ سن کر مزید فدویانہ انداز میں اس کے قدموں میں لوٹنے لگا۔

''سب آپ کی دین ہے سرکار! آپ ہی کی نظر کرم ہے۔ یہ زندگی' نعمتیں آپ کے فضل سے ہیں۔'' بخشو فرط مسرت سے لرزنے لگا۔

''جیتے رہو! تمھارے لیے بڑے سرکار نے ایک خصوصی ذمہ داری تفویض کی ہے، آج تم نے آستانہ پر موجود سبھی زائرین اور ملازموں کو کھانا کھلانا ہے۔ حضرت جی کے در سے آج کوئی بھوکا نہیں جائے گا۔''

''ہو جائے گا سرکار..... میں یہ حکم ضرور پورا کروں گا۔'' وہ اس کے قدموں پر اپنی پیشانی اور رخسار رگڑنے لگا۔

☆☆☆

سہیل اور مجید نے قبر کی دیواروں اور فرش میں تختوں تلے پوشیدہ منشیات اور اسلحہ کے ذخائر سمیٹ لیے تھے۔ مجید اپنے چہرے پر مخصوص تاثرات طاری کیے ہال کمرا میں آیا اور وہاں موجود افراد سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ''سرکار مبارک نے نماز کے بعد آپ سب کی نجات اور پریشانیوں کے حل کے لیے وظیفہ کا آغاز کیا ہے۔ یہ وظیفہ اور چلہ دو گھنٹوں تک جاری رہے گا۔ آپ آستانہ کا متبرک کھانا تناول کیجیے' سرکار جلد ہی اپنے دیدار سے فیض یاب کریں گے۔''

بڑے کمرے میں موجود افراد اب قدرے پُرسکون ہو چکے تھے۔ فضل الٰہی اپنے دونوں کارندوں کے ساتھ تہہ خانہ کی سرنگ اتر گیا۔

فضلو اندرون سندھ کا رہائشی تھا۔ ایک سیاسی جماعت سے وابستگی کے بعد وہ اپنے حلقہ میں دہشت کی علامت بن چکا تھا۔ ملک میں سیاسی تبدیلیوں کے بعد اس کی جماعت کے اقتدار کا خاتمہ ہوا تو وہ قانونی عتاب کا شکار ہونے والوں میں سرفہرست تھا۔ اس کی ذات سے بے شمار قتل' بھتا خوری' اغواء برائے تاوان کے واقعات وابستہ تھے۔

جیل کی زندگی بہت سخت تھی۔ اس کے سیاسی آقا قید

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کے بعد اس سے مکمل بے نیاز ہو چکے تھے۔ مجید سے اس کی شناسائی وہیں ہوئی۔ وہ پستہ قامت' گٹھے ہوئے جسم اور کھردرے نقوش کا حامل تھا اور ٹارگٹ کلنگ میں اپنی مثال آپ تھا لیکن بدقسمتی سے ایک پولیس افسر کو قتل کرنے کے بعد وہ اپنی موٹر سائیکل خراب ہو جانے کے باعث فرار نہ ہو پایا۔

ان دونوں نے ایک طویل منصوبہ بندی کے تحت جیل سے اپنا فرار یقینی بنایا اور چھپتے چھپاتے پنجاب چلے آئے۔ سہیل سے ان کی ملاقات ایک آستانہ میں ہوئی تھی۔ وہ بھوک پیاس سے نبرد آزما کسی محفوظ ٹھکانہ کی تلاش میں بھٹک رہے تھے۔ ایک روز آستانہ پر لنگر کے کھانے سے پیٹ بھر کر اسی احاطہ میں سو گئے۔ رات کے آخری پہر سہیل ان کے پاس چلا آیا۔ وہ ان کے منتشر حلیہ اور اضطراب کی بدولت کسی گڑبڑ کا اندازہ لگا چکا تھا۔

''کہاں سے فرار ہوئے ہو؟'' اس نے ٹٹولتی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''سندھ جیل سے۔'' فضلو نے اطمینان سے کہا۔

''او تہاڈی خیر..... کس جرم میں قید تھے؟'' وہ بے ساختگی سے بولا۔

''کوئی ایک ہو تو بتائیں، بس یوں سمجھ لو کہ جرم کی دنیا کے پروفیسر ہیں ہم۔'' مجید نے بے نیازی سے کہا۔

''پھر تو قدرت نے تمہیں بروقت بہترین مقام پر بھیجا ہے، مجھے بھی جی دار ساتھیوں کی ضرورت تھی۔'' سہیل نے ان کے کندھے پر بے تکلفی سے ہاتھ دھرا۔

''کیا کروانا چاہتے ہو؟'' فضلو کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔

''آستانہ کے گدی نشین کا قتل۔ اس کی موجودگی میں یہاں میرا کاروبار نہیں پنپ سکتا۔''

''ہمیں کیا فائدہ ہوگا؟'' مجید نے سر کھجاتے ہوئے پوچھا۔

''تم ابھی اسے قتل کر دو۔ صبح ہوتے ہی میں یہاں مشہور کر دوں گا کہ فضلو ان کا خصوصی مرید اور قرابت دار ہے۔ اس کے نقوش میں بھی پنجابی جھلک موجود ہے۔ اس لیے کوئی بھی مشکوک نہیں ہوگا۔ دو چار روز صرف فضلو ہی ان کے حجرہ میں جایا کرے گا۔ پھر موقع دیکھ کر ان کی موت اور فضلو کی جانشینی کا اعلان کر دیں گے۔'' سہیل نے اپنا منصوبہ سمجھایا۔

''ہمیں کیا فائدہ ہوگا اس سے؟'' فضلو نے دریافت کیا۔

''فائدے ہی فائدے ہیں بادشاہو! ایک محفوظ ٹھکانہ اور کاروبار میسر آ جائے گا۔ میں کچھ ایجنسی سے واقف ہوں جو یہاں منشیات اور اسلحہ کی کھیپ ذخیرہ کرنے کے بعد صوبہ بھر میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔ لڑکیوں کی سپلائی ایک اور بونس پوائنٹ ہے، منافع میں ہم تینوں کا برابر حصہ ہوگا۔ آستانہ پر ملنے والے ہدیہ کی شرح الگ ہوگی۔''

''مجھے منظور ہے!'' فضلو نے ہامی بھر لی۔

''مجھے بھی منظور ہے بھائیو!'' مجید مسکرایا۔

سہیل انہیں اندرونی رستوں سے سجادہ نشین کے حجرے میں لے گیا۔ فضلو نے اپنے بھاری بھرکم ہاتھوں سے سجادہ نشین کا گلا گھونٹ دیا۔ سہیل اور مجید اس دوران ان کی ٹانگیں اور بازو دبوچے کھڑے رہے۔

منصوبے کے مطابق پانچویں روز ان کی موت کا اعلان کرنے کے بعد فضل الٰہی کو جانشین مقرر کر دیا گیا۔ سینکڑوں مریدوں کی موجودگی میں انہیں احاطہ میں ہی دفن کیا گیا تاہم اسی رات ان تینوں نے میت خاموشی سے قصبہ کے باہر قبرستان میں منتقل کر دی۔

منشیات اور اسلحہ کے لیے ایک محفوظ ترین آڑ میسر آتے ہی آستانہ میں کئی ایک تعمیری تبدیلیاں بھی کی گئیں۔ فضل الٰہی نے سابقہ غلطیوں سے بچاؤ کے پیش نظر چند اعلیٰ پولیس افسران کے لیے باقاعدہ 'حصہ' مقرر کر دیا۔ اسی احتیاط نے آج انہیں ایک یقینی گرفتاری و موت سے قبل از وقت آگاہ کر دیا تھا۔

اپنی خصوصی جیپ میں سوار وہ تینوں اب ہائی وے کی جانب عازم سفر تھے۔ اپنی شناخت اور حلیہ میں تبدیلی کرنے کے بعد ان کے اسلحہ ڈیلرز نے ایک نئے صوبہ و علاقہ میں

انسولین

انسولین ایک ہارمون ہے جو لبلبہ سے تیار ہوتا ہے یہ جسم میں شوگر کو کنٹرول میں رکھتا ہے اور ذیابیطس سے بچاؤ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ پروفیسر ڈیلا نے کہا ہے کہ مطلوبہ نتیجہ حاصل کرنے کے لیے ذیابیطس کے مریضوں کو اتنی دیر تک ورزش کرنی ہوگی جب تک جسم سے پسینا خارج ہونے لگے لیکن اگر پانچ روز تک ورزش نہ کی جائے تو اس کا فائدہ زائل ہونے لگتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ذیابیطس کے بیشتر مریض اپنی غذا پر تو بے حد دھیان دیتے ہیں مگر جسمانی ورزش کی اہمیت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

مرسلہ: ڈاکٹر عفت۔ کراچی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

اس کاروبار کے از سرِ نو آغاز کی یقین دہانی کروائی تھی۔
وہ بے فکر اور پُرسکون تھے۔

☆☆☆

آستانہ میں ایک قیامت برپا تھی۔

زائرین مجید کی ہدایات کے مطابق انتہائی صبر و سکون سے اپنی دلی مراد کی برآوری اور پریشانیوں سے نجات کے منتظر تھے۔ بخشو نے ایک ملازم کی مدد سے بہت محبت اور خلوص سے انہیں لنگر کا کھانا کھلایا۔

اگلے نصف گھنٹے میں ہال کا کمرا مختلف کراہوں، ابکائیوں اور آہ و بکا سے گونج رہا تھا۔ لذیذ کھانے میں موجود سریع الاثر زہر اور شکم سیری نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا۔ وہ سب اپنی قے کی غلاظت میں لتھڑے تھے۔ کئی افراد کے ناک اور منہ سے خون بہنے لگا۔ پل بھر میں ہی چھ افراد زندگی کی بازی ہار گئے۔ بخشو کی حالت بھی غیر تھی۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے ہمارے ساتھ؟'' عالیہ نے روتے ہوئے کہا۔

''ہمیں زہر دیا گیا ہے، اس کھانے میں زہر تھا، ہمارا وقت اب ختم ہونے والا ہے۔'' ڈاکٹر آمنہ نے بے تحاشا کھانستے ہوئے کہا۔

''لیکن ہمارا قصور کیا تھا؟ سرکار مبارک کہاں ہیں، ان کے زیرِ سایہ ہمارے ساتھ یہ سب کیونکر ہو سکتا ہے؟'' ہارون چلایا۔

یہی سوالات وہاں موجود ہر فرد کے ڈوبتے ذہنوں میں مچل رہے تھے لیکن جواب کسی کے پاس بھی نہ تھا۔

فضاء میں عشاء کی اذان کے کلمات گونجنے لگے اور پھر انہیں ایک بھرپور جواب مل گیا۔

''اللہ اکبر...... اللہ اکبر۔'' (اللہ سب سے بڑا ہے۔)

''آپ سے عظیم اور بلند میرے لیے کوئی بھی نہیں حضرت جی!'' سیٹھ نوید بنگش کی سماعت میں اپنے ہی کہے الفاظ گونجے۔ وہ ساکت رہ گیا۔

''لا الہ الا اللہ......'' (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں)

''آپ کی روشن ضمیری سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں قبلہ! آپ تو سب کچھ جان لیتے ہیں۔'' اکرام خان کے ذہن میں گونجتا یہ فقرہ اس کے لیے ایک تازیانہ ثابت ہوا۔

''اشھد ان لا الہ الا اللہ...... اشھد ان محمد الرسول اللہ......'' (میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں)

''آپ ہی ہماری آخری اُمید اور سہارا ہیں سرکار!'' عالیہ کو اپنے ہی کلمات کی بازگشت سنائی دی تو وہ ہارون کی طرف دیکھتے اذیت سے سر پٹخنے لگی۔

''حی علی الفلاح......'' (آؤ فلاح اور کامیابی کی طرف)

''میں یہاں سکون حاصل کرنے آئی ہوں بابا جی۔ مجھے بس سکون درکار ہے۔'' ڈاکٹر آمنہ نے موت کی ہچکیوں سے قبل اصل سکون اور فلاح کا ماخذ جانا تو اپنی مٹھیاں بھینچے دھاڑیں مار کر رونے لگی۔

''حی علی الصلوۃ...... اللہ اکبر...... اللہ اکبر......'' (آؤ نماز کی طرف، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ عظیم ترین ہے)

''یہ زندگی اور نعمتیں آپ ہی کا فضل ہیں سرکار!'' بخشو کو تصور میں اپنا وجود فضل الٰہی کے قدموں میں سجدہ ریز نظر آیا۔ اسے اپنے وجود سے کراہیت کا احساس ہونے لگا تھا۔

☆☆☆

آستانہ میں ہر سو لاشیں بکھری تھیں۔

افسران کے بھاری بوٹوں کی دھمک سے خاموش در و دیوار گرج رہے تھے۔ وہ سب کے چہرے بغور دیکھتے ایک شخص کے پاس رک گئے۔

بید کی چھڑی سے گہری سرخی مائل نشان لیے عبدالکریم کا وجود بھی اپنی آخری سانسیں لے چکا تھا۔ موت نے اسے صرف اتنی ہی مہلت دی تھی کہ وہ اپنے افسران کو کچھ ویڈیوز اور تصویری ثبوت بھیج سکے۔

افسران نے عبدالکریم کی نعش کو سیلیوٹ کیا اور نم آنکھوں سے سر جھکائے باقی افراد کی میتیں ایمبولینس میں منتقل کرنے لگے۔

شمارہ جولائی 2017ء کی منتخب سچ بیانیاں

ہماری پیش کش...... آپ کا انتخاب

☆ اول: قیمت...... سیما صفدر...... (کراچی)
☆ دوم: انتقام...... مریم...... (اسلام آباد)
☆ سوم: دیر آید...... کبیر عباسی...... (مری)

پہلے، دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ بیتی منتخب کیجیے
ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY